فہرست

انگلستان

۱۔ بہار فردوس، مصنفہ آسکر وائلڈ، مترجمہ محمد ہادی حسین
۲۔ پرسکیلا، مصنفہ ڈوراسگرسن، مترجمہ مرزا یاور علی۔

فرانس

۳۔ میں ہوں اپنی شکست کی آواز، مصنفہ پولیاں، مترجمہ ملک عطاءاللہ کلیم
۴۔ آخری سبق۔ مصنفہ الفانسے ڈوڈے۔ مترجمہ سید امتیاز علی تاج

جرمنی

۵۔ مجبور محبت۔ مصنفہ تھیوڈور سٹارم۔ مترجمہ شرف عالم آرزو جلیلی
۶۔ خزاں کی آمد۔ مصنفہ لڈویک ٹیک۔ مترجمہ محمد عتیق اللہ خاں۔

روس

۷۔ نوشتہ تقدیر۔ مصنفہ چیخوف، مترجمہ راجہ عبدالعزیز۔

۸۔ انتقام، مصنفہ پشکن، مترجمہ ملک عطا اللہ کلیم

اٹلی

۹۔ چھوٹی بہن، مصنفہ ماتیلدے سیراؤ، مترجمہ ابو محمد امام الدین رام نگری
۱۰۔ آخری دن۔ مصنفہ گیووانی پاپینی۔ مترجمہ طاہر قریشی۔

ڈنمارک

۱۱۔ خواب و خیال، مصنفہ گسٹاف وائیڈ۔ مترجمہ منصور احمد

سپین

۱۲۔ ابو حامد، مصنفہ شاتو بریاں۔ مترجمہ احمد دین مارہروی۔

امریکہ

۱۳۔ موریلا۔ مصنفہ ایڈگر ایلن پو۔ مترجمہ "شہید"
۱۴۔ گلاب کے چار پھول۔ مصنفہ او۔ ہنری، مترجمہ محمد نقی۔

نیوزی لینڈ

۱۵۔ چائے کی ایک پیالی } مصنفہ کیتھرین مینسفیلڈ، مترجمہ "خسرو"

جاپان

۱۶۔ میری ۔ مصنّفہ ای۔ ای سپیٹ، مترجمہ حامد علی خاں
۱۷۔ رقاصہ ۔ مصنّفہ لیفکاڈیو ہرن، مترجمہ راجہ عتیق اللہ خاں

چین

۱۸۔ قربانی ۔ مصنفہ چنگ، مترجمہ آفتاب شروانی۔
۱۹۔ مینارِ عزالاں ۔ مترجمہ ظفر قریشی۔

ترکی

۲۰۔ زر علیہ السلام، مصنّفہ رشاد نوری ۔ مترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی۔
۲۱۔ جب عورت غیرت دلائے، مصنّفہ خالدہ ادیب خانم ۔ مترجمہ مہر محمد خاں شہاب۔

مصر

۲۲۔ لوحِ گلی ۔ مصنّفہ طاہر جواد۔ مترجمہ سیدہ حسین
۲۳۔ ساربان کی داستان، مترجمہ مسعود حسن شمسی داناپوری۔

عرب

۲۴۔ خالد اور جبیدہ، مصنّفہ اصمعی، مترجمہ منصور احمد۔

ایران

۲۵- دماغ کی دوا، مترجمہ انیس الدین احمد رضوی امروہی۔

افغانستان

۲۶- دلاور خاں، مصنفہ کپلنگ، مترجمہ مظفر احمد

ہندوستان

۲۷- میرے بچے، میرے آقا (بنگالی)، مصنفہ رابندرناتھ ٹیگور، مترجمہ حامد علی خاں
۲۸- زود پشیمان (گجراتی)، مترجمہ امیر اللہ آسی رام نگری۔
۲۹- اُلٹ پھیر (ہندی)، مصنفہ و مترجمہ ہیم لتا اشٹھانہ
۳۰- بیڑی والی (مرہٹی)، مصنفہ ماما برہ گر، مترجمہ اظہر علی فاروقی۔

انگلستان

(۱)

بہارِ فردوس۔ مصنّفہ آسکر وائلڈ۔ مترجمہ محمد ہادی حسین ایم اے۔ آئی سی ایس

(۲)

پرسکیلا۔ مصنّفہ ڈورا سگرسن۔ مترجمہ۔ مرزا یادر علی۔

بہارِ فردوس

ہر روز سہ پہر کے وقت، جب بچے مدرسے سے چھٹی پا کر واپس آتے تو وہ دیو کے باغ میں چلے جاتے اور کھیلا کودا کرتے۔ یہ ایک خوش نما اور کشادہ باغ تھا۔ اس کی ہری ہری دوب میں کھلے ہوئے پھول یوں معلوم ہوتے تھے گویا آسمان پر ستارے جگمگا رہے ہیں۔ اس میں آڑو کے بارہ درخت تھے۔ بہار آتی تو وہ درخت گلابی رنگ کے ننھے ننھے شگوفوں سے لد جاتے۔ اور خزاں کے دنوں میں ان کی شاخیں میٹھے اور رس بھرے پھلوں سے جھک جاتیں۔ خزاں ہو کہ بہار۔ وہاں ہر وقت بہار تھی۔ پرندے شاخوں پر بیٹھ بیٹھ کر جھوجھولا جھولتے۔ اور ایسے سریلے گیت گاتے کہ بچے اپنے کھیل بھول کر اُن کے سننے میں محو ہو جاتے۔ اور ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر کہتے۔ "ہم یہاں کیسے خوش ہیں!"

ایک دن دیو واپس آ گیا۔ وہ اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ اور سات برس تک اس کے ہاں رہا تھا۔ جب سات برس ہو چکے۔ تو وہ اپنے دوست سے جو کچھ کہنا سُننا چاہتا تھا۔ کہہ سُن کر اور اُس سے

رُخصت ہو کر اپنے قلعہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ اپنے قلعہ میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ بچے اُس کے باغ میں کھیل رہے ہیں۔

اُس نے ایک درشت لہجے میں اُن سے پوچھا "یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اور وہ دوڑ کر بھاگ گئے۔

یہ میرا باغ ہے۔ اور صرف میرا۔ اس لئے میں اپنے سوا کسی اور کو یہاں کیوں کھیلنے دُوں؟" یہ سوچ کر دیو نے اپنے باغ کے اردگرد ایک اُونچی دیوار بنا دی۔ اور اس پہ ایک اشتہار چسپاں کر دیا:-

"بلا اجازت اندر آنا منع ہے"

وہ ایک نہایت خود پسند دیو تھا۔

اب غریب بچوں کے کھیلنے کی کوئی جگہ نہ رہی۔ وہ سڑک پہ کھیلنے کی کوشش کرتے۔ لیکن سڑک پہ گردو غبار تھا۔ اور نکیلے پتھر ان کے پاؤں میں چُبھتے تھے۔ اس لئے وہ وہاں نہیں کھیل سکتے تھے۔ بیچارے مدرسے سے دن بھر کے تھکے ہارے آتے۔ اور کوئی مشغلہ نہ پا کر باغ کی دیواروں کے گرد اگرد گھوما کرتے۔ اور ہر وقت باغ کے تذکرے کیا کرتے۔ اور ایک دوسرے سے کہتے "ہم وہاں کیسے خوش تھے"۔

پھر بہار آئی۔ چمن چمن پھول کھلے۔ اور پرندے گانے لگے۔ لیکن دیو کے باغ میں اب تک جاڑے تھے۔ جب کوئی دیکھنے اور سُننے والا نہ رہا۔ تو درختوں نے اپنی سج دھج ترک کر دی۔ اور پرندوں نے اپنے گیت بُن گائے چھوڑ دیئے۔ ایک بار ایک خوبصورت پھول نے گھاس میں

سے سر نکال کر اپنی پنکھڑیاں کھولیں۔ لیکن جب اُس کو وہ اشتہار نظر پڑا تو اُسے اِتنا رنج ہوا کہ اس نے پھر اپنا سر چھپا لیا۔ اور بچوں کی حالت پر افسوس کرتے کرتے گہری نیند سو گیا۔ بچوں کا نہ آنا اگر کسی کو پسند تھا۔ تو وہ صرف دو چیزیں تھیں۔ برف اور کہر۔ وہ خوش ہو ہو کر ایک دوسرے سے کہتیں "بہار اس باغ میں آنا بھول گئی ہے۔ اس لئے اب ہم بارہ مہینے یہاں رہیں گے"۔

برف نے اپنی سفید چادر گھاس پر بچھا دی۔ اور کہر نے بیل بوٹوں پر مینا کاری کر دی۔ پھر اُنہوں نے بادِ شمال کو اپنے ساتھ رہنے کے لئے بلا بھیجا۔ اُس نے ان کا بلاوا منظور کر لیا۔ اور اُن کے پاس آ گئی۔ دن بھر وہ باغ کے آس پاس شور و غوغا مچاتی۔ اور کھلے بندوں بربادی پھیلاتی پھرا کرتی۔ اُس کو یہ باغ اتنا پسند آیا کہ وہ تعریف کے جوش میں بول اٹھی "اہا، یہ کیسی اچھی جگہ ہے۔ آؤ اولوں کو بھی بلا لیں"۔ چنانچہ اولے بھی آ گئے۔ ہر روز وہ قلعہ کی چھت پر ٹوٹ پڑتے۔ اور تین گھنٹوں تک اپنی موسلا دھار بارش کا تار باندھے رکھتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے تمام کھپریل کو چکنا چور کر دیا۔ اور پھر وہ باغ کے چاروں طرف ایک دوسرے کے اوپر دھڑا دھڑ گرا کرتے۔ وہ بھورے رنگ کے کپڑے پہنے رہتے تھے۔ اور اُن کی سانس برف کی طرح ٹھنڈی تھی۔

خود پسند دیو جب اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر اپنے باغ کا یہ بگڑا ہوا نقشہ دیکھتا۔ تو وہ سوچا کرتا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ابھی تک بہار کیوں نہیں

آئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر تھوڑے دنوں میں رُت بدل جائے گی"۔

بہار آئی اور گزر گئی ۔ اور خزاں جا کر پھر آ گئی ۔ لیکن اُس باغ کے دن نہ بدلے ۔ دوسرے باغوں میں خزاں نے زرد زرد پھولوں کا سونا لٹایا لیکن دیو کے باغ کی طرف اُس نے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا ۔ وہ یہ کہکر اُس کے پاس سے گزر گئی ۔ کہ "یہ دیو بڑا خود پسند ہے" ۔ اس لئے وہاں بارہ مہینے جاڑے رہتے تھے ۔ بادِ شمال، کہر، برف اور اولے بے روک ٹوک لوٹ مار مچاتے پھرا کرتے ۔

ایک دن صبح سویرے دیو اپنے بستر پہ نیم بیداری کے عالم میں لیٹا تھا ۔ کہ اُس نے ایک دلکش راگ سنا ۔ وہ اُس کے کانوں کو ایسا بھایا ۔ کہ اُس نے خیال کیا ۔ کہ ضرور بادشاہ کے سازندے اپنے ساز بجاتے اس کی کھڑکی کے نیچے سے گزر رہے ہیں ۔ یہ راگ ایک چڑیا کا راگ تھا ۔ جو باغ میں بیٹھی اپنی بولی بول رہی تھی ۔ لیکن دیو کو کسی پرندے کا راگ سُنے اتنی مدت ہو گئی تھی ۔ کہ اس نے اس معمولی راگ کو دُنیا کا بہترین نغمہ سمجھا ۔ پھر اولوں نے اس کے سر پہ اپنی بوچھاڑ بند کر دی ۔ اور بادِ شمال نے اپنا شور دھیما کر دیا ۔ اور کھُلی کھڑکی میں سے اُسے ایک بھینی بھینی خوشبو آتی ہوئی محسوس آئی ۔ وہ خوشی سے پُکار اُٹھا "معلوم ہوتا ہے بہار آ گئی" ۔ اور وہ اپنے بستر سے اُچھل کر اُٹھا ۔ اور کھڑکی میں سے جھانکنے لگا ۔

جو کچھ اُس نے دیکھا ۔ وہ ایک عجیب و غریب منظر تھا ۔ دیوار کے

ایک چھوٹے سے سوراخ میں سے بچے اندر گھس آئے تھے۔ اور درختوں کی شاخوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ ہر درخت کی شاخوں میں سے ایک ننھا ننھا گلاب سا چہرہ مسکراتا ہوا نظر آیا۔ اور درخت بچوں کی اس بازگشت پر کچھ ایسی خوشیاں منا رہے تھے۔ کہ شگوفوں کے ہار سنگار سے بنے سجے کھڑے تھے۔ اور اپنے عزیز مہمانوں کے سر پر آہستہ آہستہ اپنی ہری بھری ٹہنیوں کا چھتر ہلا رہے تھے۔ پرندے ڈال ڈال پات پات پھدکتے پھرتے تھے۔ اور خوشی کے مارے چہچہا رہے تھے۔ اور پھول گھاس کی پتیوں میں سے جھانک جھانک کر اپنے ان پیارے ہمجولیوں کو دیکھتے تھے اور رہ رہ کر مسکراتے تھے۔ مگر وہ، باغ کا ایک کونہ اس جشنِ عالمگیر سے ناآشنا تھا۔ یہ باغ کا ایک دُور اُفتادہ کونہ تھا۔ اور اس میں ایک ننھا سا بچہ کھڑا تھا۔ وہ ایسا چھوٹا تھا۔ کہ اُس کا ہاتھ ٹہنیوں تک نہ پہنچتا تھا۔ اور وہ ہاتھ اُوپر اُٹھائے درخت کے چاروں طرف پھر رہا تھا۔ اور اپنی بے بسی پر رو رہا تھا۔ غریب درخت اب تک برف اور کہر سے جکڑا ہوا تھا۔ اور بادِ شمال اُس کے گرد غل مچاتی پھر رہی تھی۔ وہ اپنی شاخیں جھکا جھکا کر بچے سے کہتا۔ "آؤ، ننھے میاں، مجھ پر سوار ہو جاؤ۔" لیکن وہ بالکل زمین سے پیوست تھا۔ اور اس کا ہاتھ شاخوں تک نہ پہنچتا تھا +

اور جب دیو نے یہ منظر دیکھا تو اُس کا دل پسیج گیا۔ اُس نے اپنے کو بہت بُرا بھلا کہا اور سوچنے لگا "اب معلوم ہوا کہ بہار کبھی نہیں

آتی تھی۔ میں اس ننھے بچے کو درخت پر چڑھا دوں گا۔ پھر اس دیوار کو گرا دوں گا۔ اور میرا باغ ہمیشہ کے لئے بچوں کا ہو جائے گا۔" وہ اپنے کئے پر بہت پشیمان ہوا۔

اس لئے وہ سیڑھیوں سے اُترا۔ اور گھر کا دروازہ کھول کر باغ میں گیا۔ لیکن جب بچوں نے اُسے آتے دیکھا۔ تو وہ ایسے ڈرے۔ کہ بدحواس ہو کر بھاگ گئے۔ اور باغ پر پھر جاڑوں کا تسلّط ہو گیا۔ صرف وہ چھوٹا سا بچہ وہاں کھڑا رہ گیا۔ کیونکہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور وہ دیو کو نہ دیکھ سکا تھا۔ دیو دبے پاؤں اُس کی پُشت کی جانب سے اُس کے پاس پہنچا۔ اور اُسے چُپکے سے اُٹھا کر ایک ٹہنی پر بٹھا دیا۔ درخت پر اُن کی آن میں شگوفے ہی شگوفے نظر آنے لگے۔ اور پرندوں نے آآ کر اپنی راگنیاں چھیڑ دیں۔ اور ننھے بچے نے دیو کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس کی پیشانی پر پیار کا ایک بوسہ دیا۔

جب دوسرے بچوں نے دیکھا کہ دیو اب پہلے کی طرح ظالم نہیں رہا۔ تو وہ دوڑتے ہوئے واپس آ گئے۔ اور ان کے ساتھ ہی بہار آ گئی۔ دیو نے اُن سب کو مخاطب کر کے کہا "میرے بچو! اب یہ باغ تمہارا باغ ہے" اور اس نے ایک بڑی سی کدال اُٹھائی۔ اور دیوار کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ اور جب لوگ دن کے بارہ بجے بازار جا رہے تھے۔ تو وہ دیکھ کر متعجب ہو گئے کہ ایک دیو ایک ایسے باغ میں جس کی نظیر انہوں نے کبھی نہ دیکھی تھی ننھے ننھے بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

دن بھر وہ وہاں کھیلا کئے۔ اور جب شام ہوئی تو وہ دیو کو خدا حافظ کہنے کو آتے۔

اُس نے پوچھا "تمہارا وہ ننھا ہمجولی کہاں ہے۔ جسے میں نے درخت پر چڑھایا تھا؟" دیو کو وہ سب سے پیارا تھا۔ کیونکہ اُس نے اُسے پیار کا ایک بوسہ دیا تھا۔

بچوں نے جواب دیا "ہم نہیں جانتے۔ شاید وہ چلا گیا ہوگا۔"

دیو نے اُن سے کہا "اُس سے کہنا کہ کل یہاں ضرور آئے" اور اُس نے انہیں بہت تاکید کی۔ مگر بچوں نے جواب دیا "ہمیں معلوم نہیں، کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ہم نے اُس کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا" اور دیو پر غم کی افسردگی چھا گئی۔

ہر روز سہ پہر کے وقت جب مدرسے سے چھٹی پا کر واپس آتے۔ تو وہ دیو کے باغ میں چلے جاتے اور اُس کے ساتھ کھیلا کودا کرتے۔ مگر وہ ننھا بچہ جو دیو کو سب سے پیارا تھا۔ پھر کبھی نظر نہ آیا۔ دیو بچوں سے بڑی محبت کرتا تھا۔ مگر وہ آہیں بھر بھر کر اپنے بچھڑے ہوئے دوست کو یاد کیا کرتا تھا۔ اور اکثر کہا کرتا۔ "آہ، میرا جی اس سے ملنے کو کس قدر چاہتا ہے"۔

کئی برس گزر گئے۔ اور دیو پر بڑھاپے کی کمزوری غالب آ گئی۔ اب وہ پہلے کی طرح بچوں کے ساتھ نہ کھیل سکتا تھا۔ اس لئے وہ ایک بڑی سی آرام کرسی پر بیٹھ کر انہیں کھیلتے دیکھا کرتا۔ اور اپنے باغ کی تعریفیں

کیا کرتا - وہ اکثر کہا کرتا "میرے باغ میں طرح طرح کے خوبصورت پھول ہیں - لیکن یہ بچے اُن سب سے خوبصورت ہیں"۔

جاڑوں کی ایک صبح کو وہ اپنی کھڑکی میں کھڑا اپنے باغ کے نکھرے ہوئے جوبن کا نظارہ کر رہا تھا - اب اُسے جاڑوں سے نفرت نہ تھی - کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سردی کا موسم بہار اور بہار کے پھولوں کے لئے آرام کا وقت ہے۔

یکایک وہ حیران ہو کر اپنی آنکھیں ملنے لگا - کیونکہ جو کچھ اُسے نظر آرہا تھا - وہ ایک عجیب و غریب منظر تھا - باغ کے بعید ترین کنارے میں ایک درخت تھا - جو پھلوں کا نولکھا ہار پہنے کھڑا تھا - اس کی شاخیں سنہری تھیں - اور اُن پہ چاندی کے پھل پھول لٹک رہے تھے - اور درخت کے نیچے وہ ننھا بچہ کھڑا تھا - جو دیو کو سب بچوں سے پیارا تھا۔

خوشی کے مارے دیو بھاگا بھاگا سیڑھیوں سے اُتر کر باغ میں آگیا - اور گھاس پہ لمبے لمبے قدم دھرتا بچے کے پاس پہنچا - اور جب وہ بالکل قریب پہنچ گیا - تو اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا - اور وہ بولا "تجھے زخمی کرنے کی کس کو جرأت ہوئی ہے؟" کیونکہ بچے کی ہتھیلیوں میں ناخنوں کے نشان تھے - اور ایسے ہی ناخنوں کے نشان اُس کے ننھے ننھے پاؤں پر تھے۔

اُس نے پوچھا "تجھے زخمی کرنے کی کس کو جرأت ہوئی ہے؟ مجھ کو بتا تاکہ میں اپنی تلوار سے اس کا سر اڑا دوں"۔

بچے نے جواب دیا "آہ! یہ زخم نہیں - محبت کے داغ ہیں"۔

دیو نے پوچھا۔ "تو کون ہے؟" اور اس پر ایک پُر اسرار خوف چھا گیا اور وہ مرعوب ہو کر بچے کے سامنے دوزانو ہو گیا۔

اور بچہ دیو کو دیکھ کر مسکرایا۔ اور کہنے لگا: "آج کے دن تم مجھے اپنے باغ میں رہنے دو۔ کل میں تمہیں اپنے باغ میں لے جاؤں گا جسے جنت کہتے ہیں۔"

اور جب اس دن سہ پہر کے وقت بچے باغ میں دوڑتے ہوئے آئے تو انہوں نے دیکھا کہ درخت کے نیچے اُن کا پیارا دیو مُردہ پڑا ہے۔ اور اس کی لاش پر سفید شگوفوں کا ایک کفن ہے۔

پرسکیلا!

پرسکیلا مر گئی۔ اور گاؤں بھر کی عورتیں اُس کی ماتم داری کے لئے آئی ہوئی تھیں۔ وہ سب کی سب اس بڑے سے مکان میں جہاں پرسکیلا نے عرصے تک اطمینان و سکون کی زندگی گزار چکی تھی۔ اس طرح چل پھر رہی تھیں۔ گویا انہوں نے اس گھر کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا ——— اور واقعی انہوں نے اسے پرسکیلا کے بغیر کبھی نہ دیکھا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ بڑی احتیاط سے حرکت کرتی تھیں۔ اور کبھی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی شکل میں مرحومہ کے متعلق اظہار خیال کرنے لگتی تھیں۔ وہ جتنی اُداس تھیں۔ اتنی ہی متعجب بھی معلوم ہوتی تھیں۔ کون پرسکیلا کو مُردہ تصور کر سکتا تھا؟ یہ تو ایک اچنبھا ہو گیا تھا۔ وہ گاؤں کی معمّر ترین عورت ضرور تھی۔ مگر شاید اتنی بوڑھی نہ تھی۔ تاہم کسی نے کبھی گاؤں کو پرسکیلا کے بغیر نہ دیکھا تھا۔ اور نہ کسی نے کبھی پرسکیلا کو جوان پایا تھا۔ شاید وہ گاؤں والوں کی زندگی میں اس خاموشی سے داخل ہوئی تھی۔ کہ کسی کی توجہ اس کی طرف مبذول نہ ہو سکی۔ اور صرف اُسی وقت، جب

وہ کافی عمر حاصل کر چکی - لوگوں کی نظریں اُس پہ پڑیں ———
جیسے کوئی ننھا سا بیج تناور درخت بن جانے کے بعد لوگوں کی نظروں میں سما کر زمین کا نشان قرار پا جائے +

غالباً پرسکیلا نے اسی بڑے سے مکان میں اپنی جوانی کا خاموش زمانہ بھی گزارا تھا - اور صرف اسی وقت ذرا شخصیت حاصل کی تھی، جب اپنے ماموں کے انتقال کے بعد تنہا وارث قرار پانے کی حیثیت سے کل ترکہ اُسی کے ہاتھ آیا - اور جیسے ہی وہ عوام کے سامنے آئی اُس کے کمزور ہاتھوں نے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیا +

کیا وہ دولت مند تھی؟ کون جانے! تاریک سا بوسیدہ مکان اور خزاں رسیدہ پائیں باغ تو دولت کی بُو باس سے بالکل خالی تھے - مگر کبھی کوئی بچی یا عورت پرسکیلا کے پاس امداد کے لئے جا کر خالی ہاتھ واپس نہ ہوئی تھی - بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اسی سبب سے اُس کا مکان آئے دن زیادہ اُجاڑ ہوتا جاتا تھا ——— سامان آرائش قیمتی تصاویر گنگا جمنی ظروف اور زیور وغیرہ ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جاتے تھے +

لیکن بعض اور لوگوں کا خیال تھا کہ پرسکیلا کے پاس روپوں کا ایک صندوقچہ تھا جس پر احتیاط سے ڈوری باندھ کر مُہر بھی لگا دی گئی تھی - اور قفل بھی ڈال دیا گیا تھا - اور اس قسم کا ایک صندوقچہ تو واقعی اس کے پاس تھا بھی - کیونکہ ایک مرتبہ جب وہ بیمار پڑی تھی - نظام کی اُس نے

اُس کی تیمار داری کے دوران میں وہ صندوقچہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

اس وقت وہ مری پڑی تھی۔ اور اس چھوٹے سے گاؤں کی عورتوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی نہایت ہی عجیب بات وقوع پذیر ہوگئی ہے ———— جیسے کوئی قدیم منارہ جسے وہ ہر صبح اپنی کھڑکی سے دیکھتی ہوں دفعتہ ڈھے گیا ہو۔ یا جیسے گرجا کی گھڑی جو بلا ناغہ صبح چھ بجے اُنہیں جگا دیتی تھی۔ آج بجنا بھول گئی ہو۔

پرسکیلا بیمار ہو سکتی تھی یا کہیں باہر کسی کام سے یا سیر و تفریح کے لئے جا سکتی تھی۔ اور یوں چند روز کے واسطے گاؤں سے غائب رہ سکتی تھی۔ مگر مر جانا ———— آج تک کبھی کسی نے پرسکیلا کے متعلق یہ تو سوچا ہی نہ تھا۔ بلکہ اس وقت بھی چند لڑکے اپنے اپنے گھروں سے دوڑتے ہوئے اس اُمید میں سڑک پر آ رہے تھے کہ پانچ بجتے ہی وہ سینچر کے لئے بازار سے سودا لے کر آتی ہو گی۔ اور ان کے واسطے بھی ضرور کچھ نہ کچھ اپنی جیبوں میں چھپا کر لائی ہو گی ———— مگر اُنہیں سمجھا دیا گیا کہ اب وہ کبھی سڑک پر سے نہ گزرے گی۔ اور وہ دیکھو وہ دیکھو مسلین بچی بچاری جینی۔ اپنا رخ کھڑکی کی طرف کئے دلنواز تبسم اور خوشگوار باتوں کا انتظار کر رہی ہے ———— مگر یوں اُسے بھی بتا دیا گیا کہ اب پرسکیلا اس کھڑکی سے کبھی نہ جھانکے گی۔

یہ سب عورتیں جو اس کی لاش کے گرد حلقہ باندھے بیٹھی تھیں سوچ

رہی تھیں۔ کہ کل ہی وہ چادر اوڑھ کر بھاگی ہوئی اپنے دکھ سکھ کی خبر کرنے صلاح مشورہ کرنے کی غرض سے پرسکیلا کے پاس آئیں گی جیسا کہ اسوقت سے اُن کا دستور تھا۔ جب پہلے پہل انہیں پرسکیلا کی موجودگی کا احساس ہوا ہے۔ مگر آہ! وہ کل آئیں گی تو پرسکیلا کو اپنے عجیب تبسم بھرے کے ساتھ بیٹھا ہوا پائیں گی —— اپنے قریب مگر اپنی دسترس سے دور!

کیا پرسکیلا واقعی اتنی بوڑھی تھی؟ اس کا چہرہ تو فی الحقیقت ایسا ہی تھا کہ تم خیال بھی نہ کر سکتے تھے کہ کبھی جوان ہوگا —— سکڑا ہوا جھریوں سے اٹا ہوا ایسا جس میں شباب اور تر و تازگی اور حسن کی رنگینی تمہارا تصور بھی نہ بھر سکے۔

ایک مرتبہ پرسکیلا نے ایک بچی سے کہا تھا کہ جب میں تمہاری طرح کم سن تھی تو چڑیا جیسی ہلکی پھلکی تھی۔ اس بچی کو یہ جھوٹ سخت ناگوار گزرا تھا۔ کیونکہ گاؤں کے کل بچوں کی طرح اسے بھی یہ بات معلوم تھی کہ پرسکیلا کبھی کم سن تھی ہی نہیں۔

پرسکیلا سب کے متعلق سب کچھ جانتی تھی۔ مگر کوئی اس کے متعلق اس کے سوا کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ کہ وہ ایک بوڑھی بن بیاہی عورت تھی کسی نے کبھی پرسکیلا کو اپنے عاشق کے ساتھ تو خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ لوگوں کے نزدیک عشق اور پرسکیلا ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی تھے۔ اکثر گاؤں کی عورتوں نے پرسکیلا کے متعلق خیال آرائی کی تھی۔ کہ وہ

بچپن میں کیسی ہوگی ——— ایک سیدھی سی لڑکی جو ہمیشہ اپنا سبق یاد رکھتی ہوگی۔ بال سنوارے رہتی ہوگی۔ ننگے پاؤں نہ پھرتی ہوگی۔ اور کپڑوں کے بٹو تمام لگائے رکھتی ہوگی۔ جس کی کمر سے کبھی تنگ لباس کس نہ ہوا ہوگا۔ اور جس کی بھوری بھوری ذہین آنکھیں ہوں گی۔ گوری سی بلند پیشانی ہوگی۔ بڑی سی ناک، پتلی گردن، خوشنما دہانہ اور لمبے بال ہوں گے ——— بس! کچھ ایسی ہی ہوگی پرسکیلا اپنی کم سنی میں +

مگر عوام کے خیال میں، پرسکیلا کے دورِ شباب کی کہانی میں ایک چاہنے والے کی بڑی کمی تھی۔ کیونکہ اُسے مردوں سے سخت نفرت تھی۔ شریر لڑکوں تک سے وہ ہمیشہ دور رہتی تھی۔ اُس نے کبھی کسی گبرو جوان کے اُبلتے ہوئے شباب کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا تھا +

واقعی اُسے مردوں کی جنس ہی سے بڑی نفرت تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے لڑکوں تک سے بمشکل مہربانی کا برتاؤ کر سکتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ یہ شریر میری بلی پر بہت ظلم ڈھاتے ہیں۔ لیکن لڑکیوں کو وہ بہت چاہتی تھی۔ گاؤں میں کوئی زچہ ایسی نہ ہوتی جس کے نوزائیدہ بچے کو دیکھنے کے لئے پرسکیلا سب سے پہلے نہ جاتی ہو۔ اگر لڑکا پیدا ہوا ہوتا تو وہ اُس کے گول چہرے کو گھورا کرتی اور جب وہ رو دیتا تو ہنس کر کہتی "ہاں چیخو! بس چیخے جاؤ تو تمہیں بھی ملے گا ایک چمکتا ہوا روپیہ! لگاؤ اور چیخو۔ خوب جی بھر کر چیخو۔ پھر اس کی ننھی سی مٹھی میں ایک روپیہ تھما کر واپس چلی آتی ——— اور اگر کہیں لڑکی پیدا ہوئی ہوتی تو پرسکیلا

اُسے فوراً گود میں اُٹھا لیتی اور اتنی محبت سے اُس کا بوسہ لیتی کہ رونا بھول جائے۔ فرطِ محبت سے اُس کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں۔ اور آنسو کا ایک آدھ قطرہ لڑکی کے سُرخ سُرخ رخساروں پر ٹپک کر اُسے چونکا دیتا۔ واپس آتے وقت پرسکیلا اس کے ہاتھ میں ایک گنی دے دیتی۔ اور کہتی۔ "تیرے اُداس دل کے لئے، میری بچی، تیرے اُداس دل کے لئے!" لوگ اس بچی کو بھی پرسکیلا کے چہیتوں کی فہرست میں شامل کر لیتے ؛

مگر سب سے زیادہ اُس کا دل محبت کی ماری دوشیزاؤں کی طرف کھینچتا تھا۔ جو اکثر اُسے اپنی ناکامیٔ محبت کی پُر درد داستانیں سنانے آیا کرتی تھیں۔ ان میں سے کئی بے چاری جو محبت کے جوش میں اپنی خودداری اور غرور تک سے ہاتھ دھو چکی تھیں۔ اور جن کے عاشق ان کی صبر آزما محبت سے تنگ آکر کشیدگی اختیار کر چکے تھے۔ پرسکیلا کے مشورے پر عمل کرنے کے بعد از سرِ نو مغرور و خوددار بن کر اپنے چاہنے والوں کو دوبارہ محبت کی زنجیروں میں جکڑ چکی تھیں ؛

پرسکیلا کے مکان کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ اُس میں شباب کے گزرنے کا خیال تک نہ ہو سکتا تھا۔ یہ توقع ہی نہ کی جا سکتی تھی کہ یہاں جوانی جیسی بھی کوئی لطیف شے ہو سکتی ہے ——— تاریک، بوسیدہ، اُداس!! بس پرسکیلا ہی کے لئے وہ ایک مناسب جائے سکونت اور موزوں پس منظر ہو سکتا تھا +

چھوٹی چھوٹی بچیاں جو کبھی کبھی جی کڑا کر کے اُس مکان میں جایا کرتی

تھیں۔ اُس کے ہولناک سکوت سے بہت ڈرتی تھیں۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے میں دوڑتی ہوئی گزرتی تھیں۔ ہراسان و پریشان! جب وہ پرسکیلا کے روبرو جا پہنچتیں۔ تو انہیں ذرا اطمینان ہوتا۔ مگر ہر لحظہ اُن کے ننھے ننھے دلوں کو یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں کسی تاریک گوشے سے پرانے زمانے کی کوئی ہیبت ناک بلا اُن پہ نہ جھپٹ پڑے۔ وہ کبھی نہ آتیں۔ مگر اچھی اچھی مٹھائیوں اور میٹھی میٹھی باتوں کا لالچ ہی تھا۔ جو اُنہیں کھینچ لاتا۔ تاہم وہ ہمیشہ کم سے کم تین اکٹھی ہو کر آتیں۔ ایک دوسری کا ہاتھ تھامے ہوئے۔ چوکس سی۔ کبھی کھلکھلاتی اور کبھی محض سکوت توڑنے کے لئے شور مچاتی ہوئی۔

جب پرسکیلا مر گئی۔ تو کہیں سے اُس کی ایک چچا زاد بہن نکل پڑی جو ایک درشت مزاج، ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کے پاس نہ آنسو تھے نہ مسکراہٹیں۔ اور نہ کوئی الٰہی جذبہ۔ بس لے دے کے صرف ایک ادھیڑ عمر کی درشتی ہی رہ گئی تھی، کیونکہ جوانی کی نرمی جا چکی تھی۔ اور بڑھاپے کی نرمی ابھی آئی نہ تھی۔ وہ اس طرح حکم چلاتی تھی۔ گویا عمر بھر پرسکیلا کے مکان میں مالکانہ حیثیت سے رہی ہو۔ گاؤں والوں کو فکر تھی کہ کیا پرسکیلا کے روپوں کا صندوقچہ بھی وہ لے لے گی! ———

مگر اس کے علاوہ پرسکیلا کا کوئی اور رشتہ بھی تو نہیں۔ وہ ہر وقت پرسکیلا کے متعلق اپنی افسردگی ظاہر کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ وہ کہتی کاش! بہن پرسکیلا کی تیمارداری کرنے کے لئے میں پہلے ہی آ گئی

ہوتی"۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی پر ڈاکٹر کو بلانے میں تاخیر کا الزام دھرے مگر اسے معلوم ہونا چاہیئے تھا۔ کہ پرسکیلا ڈاکٹر سے کیسی پناہ مانگتی تھی وہ تو ہر ایک ڈاکٹر سے ڈرتی تھی۔ کیسی کیسی بیمار پڑی مگر ڈاکٹر تو نہ بلانا تھا نہ بلایا۔ اور گاؤں میں ایک ہی ڈاکٹر تھا پرسکیلا ہی کا ہمنا بوڑھا وہ اہل و عیال رکھتا تھا۔ اور اس کی اولاد بھی شادی شدہ اور کمانی مُسن ہو کر اپنے اپنے کام دھندوں میں لگ چکی تھی۔

ایک مرتبہ ایک پڑوسن نے پرسکیلا کو اس ڈاکٹر کے ماضی کی ایک داستان سنائی تھی ــــــ کس طرح ڈاکٹر نے عین شادی کے دن ایک بیچاری الھڑ دوشیزہ سے کسی دولت مند عورت کے لئے قطع تعلق کر کے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ اور پھر کیسے وہ غریب اپنا ٹوٹا ہوا دل لئے کہیں گم ہو گئی ــــــ چونکہ یہ واقعہ اس گاؤں میں پیش نہ آیا تھا۔ اس لئے گاؤں والوں کو انہیں معلوم نہ تھی۔ جب پرسکیلا نے یہ واقعہ سُنا تو اس کی جھریوں والی پیشانی پر اور بھی بل پڑ گئے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ پڑوسن سمجھی شاید تنگ آگئی ہے۔ اور دل ہی دل میں پرسکیلا کی اس ناراضی کو مردوں سے اس کی فطری نفرت پر محمول کر کے "مردا دنہ اُن کی بے وفائی" کا موضوع گفتگو چھوڑ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ مگر چلتے وقت وہ اتنا اور کہہ گئی کہ ڈاکٹر اور اس کی بیوی کی بنتی نہیں آئے دن کے لڑائی جھگڑوں نے اُس کی زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ قدرت

نے اسے اچھی سزا دی" اور اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ جب یہ سُن کر پرسکیلا نے دبی آواز سے ہمدردانہ لہجے میں کہا "بے چارہ! بے چارہ!"

جیتے جی تو پرسکیلا نے ڈاکٹر کو پاس پھٹکنے نہ دیا۔ مگر جب وہ مر گئی تو ڈاکٹر کا آنا لازمی ہو گیا۔ جو لوگ ڈاکٹر کو لائے تھے۔ انہیں اس کے ہاتھوں میں کپکپی دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ وہ تو ہزاروں کو مرتے دیکھ چکا ہو گا۔ اُسے تو موت کا عادی ہونا چاہیئے تھا۔ پھر وہ کیوں ڈر رہا تھا؟

جس کمرے میں پرسکیلا کی نعش رکھی تھی۔ اُس کے دروازے کے سامنے وہ ٹھہر گیا گویا داخل ہونا نہیں چاہتا۔ وہ جھجک رہا تھا۔ مگر بمجبوری دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اور بستر مرگ کے پاس خاموش کھڑا ہو گیا۔ وہ مرحومہ کے چہرے کو حسرت و یاس کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے اسے ایک مرتبہ آہستہ سے کہتے سُنا۔ "پرسکیلا!" اور دوبارہ زور سے، گویا اب کی سننا ہی پڑے گا۔ "پرسکیلا!"

مگر پرسکیلا مر چکی تھی۔ اور گاؤں بھر کی عورتیں اُس کی ماتم داری کو آئی ہوئی تھیں —— دو راتیں وہ شب بیداری میں گزار چکی تھیں۔ اور آج تیسری اور آخری رات تھی۔ وصیت نامہ پڑھا گیا گو پرسکیلا کے پاس بہت کچھ نہ تھا۔ پھر بھی اُس نے قریب ہر ایک کے لئے کچھ نہ کچھ چھوڑا تھا۔ اور مکان چچا زاد بہن کے نام لکھا تھا —— مگر روپوں کا صندوقچہ؟ وہ صندوقچہ جس پر

ڈوری بندھی اور مُہر لگی تھی۔ لوگوں کو یقین تھا کہ اسی میں ساری نقدی بند ہے۔ چچازاد بہن کی اُنگلیاں کئی بار قفل کو چھو چکی تھیں اور گاؤں والوں کی نظریں بارہا مُہر تک جا چکی تھیں ——— یک بیک انہیں معلوم ہُوا کہ پرسکیلا کی وصیت کے مطابق یہ صندوقچہ اس کے ہمراہ قبر میں جانا چاہیے۔ کیسی لغویات! کبھی کسی نے سُنا ہے کہ روپوں کا صندوقچہ قبر میں دفن کر دیا گیا ہو؟ کون خیال کر سکتا تھا کہ پرسکیلا وہ چیز ساتھ لے جائے گی، جو اب کبھی اُس کے کام نہ آسکے گی؟ مرنے کے بعد روپیہ کس کے کام آیا ہے؟ کون سمجھتا تھا کہ پرسکیلا کنجوس ثابت ہو گی؟

سب عورتیں کھانے کے کمرے میں جا چکی تھیں۔ اور چچازاد بہن بیٹھک میں تنہا رہ گئی تھی۔ اوپر کے کمرے میں پرسکیلا ابدی نیند سو رہی تھی۔ اُسے کیا معلوم ہوگا کہ مُہر توڑ دی گئی تھی یا ڈوری کاٹی گئی تھی اور قفل کھولا گیا تھا۔ یقیناً صرف صندوق کھول کر دیکھنا تو کوئی جرم نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس میں سے ایک پیسہ بھی نہ لیا جائے! اور کون پیسے کو ہاتھ لگانا گوارا کرے گا جب پرسکیلا کی مرضی ہی یہ نہ تھی۔ مگر صرف صندوقچہ کھولنا! محض دیکھنے کے لئے! ———

عورتوں کا جذبۂ تجسس! کبھی کسی عورت نے کھول کر دیکھے بغیر کوئی صندوقچہ دفن کیا ہے؟ ——— چنانچہ یہ صندوقچہ بھی کھول ڈالا گیا۔

چچازاد بہن کے چہرے پر حیرت واستعجاب کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اُس کے پیش نظر کیا چیز تھی؟ زرد مال کا انبار نہیں بلکہ صرف ایک شادی کا جوڑا ——— ایک شادی کا مکمل جوڑا جس میں سے اب تک حنا کی ہلکی سی مہک بوسیدگی کی آمیزش کے ساتھ نکل رہی تھی یہ پرسکیلا ہی کا معلوم ہوتا تھا۔ آہ! بے رحم زمانے نے جس طرح پرسکیلا کے افسانۂ محبت کو برباد کیا تھا۔ اُسی طرح اس خوش نما شادی کے جوڑے کو بھی تباہ کر ڈالا تھا ——— مگر کیا سبب تھا کہ چچازاد بہن کو اس ہونے والی شادی کی خبر نہ ہوئی؟ آخر دولہا کون تھا؟ اور پرسکیلا نے تو کبھی شادی کی ہی نہ تھی!

دراصل چچازاد بہن کو پرسکیلا کی جوانی کے واقعات بخوبی معلوم نہ تھے۔ وہ صرف اتنا ہی جانتی تھی۔ کہ پرسکیلا بن ماں باپ کی بچی تھی اپنے ماموں کے پاس پلی تھی۔ اور کانونٹ کے اسکول میں تعلیم پائی تھی اور اپنا سارا وقت دوسروں کی توجہ سے دور گزار دیتی تھی۔ اس کا کوئی ساتھی تھا نہ ہمجولی۔ وہ ہمیشہ خاموش اور تنہا رہا کرتی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کسی کو اُس بے چاری کی اتنی پروا ہی نہ تھی۔ کہ غریب کو تنہائی کی قید سے چھڑاتا ——— ہاں! چچازاد بہن کو ایک بات اور تھوڑی بہت یاد پڑتی تھی۔ ایک مرتبہ پرسکیلا اور ایک نوجوان ڈاکٹر کے متعلق کچھ افواہ سننے میں آئی تھی۔ کچھ عاشقانہ خطوط اسکول میں پکڑے گئے تھے۔ اور دو چار خفیہ ملاقاتوں کا بھی پتہ چلا تھا اور بالآخر

معلوم ہوا تھا کہ شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ مگر شادی تو ہوئی نہیں ——— کیوں؟ ——— غالباً یہ ہوا تھا کہ ادھر پہ شکیلا خوشی خوشی اپنے لباسِ عروسی کی تیاری میں مصروف ہی اور ادھر بیوفا ڈاکٹر اپنا عہد و پیمان بھول کر ایک دولتمند لڑکی سے شادی کر بیٹھا ——— مگر یہ بہت عرصے کا واقعہ تھا۔ اس لیے چچا زاد کو ٹھیک طرح یاد نہ تھا۔

صندوقچے میں اور کچھ نہ تھا ——— زر و مال کی قسم میں سے ایک پائی بھی نہیں ——— اگر جو اب رہی اس پُراسرار افسانے کی کلید! پرانے خطوط کا ایک بنڈل ——— عاشقانہ خطوط کیونکہ وہ ایک ریشمی تاگے میں بندھے ہوئے تھے ——— آہ غریب شکیلا آہ! وہ اُمیدیں جو بَر نہ آسکیں! ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

جب چچا زاد بہن نے خطوط کا بنڈل اُٹھایا۔ تو اس کا خیال ہے کہ اس کے کانوں میں کسی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ شاید یہ آواز مرحومہ کے کمرے سے آئی تھی۔ غالباً یہ شکیلا کی کوئی سہیلی اس کی لاش کے پاس بیٹھی سسکیاں بھر رہی ہوگی۔ چچا زاد بہن نے بنڈل کی گرہ پر ہاتھ ڈالا۔ مگر کیا ایک مجبور دبے کس مردے کا راز معلوم کرنا شرافت اور اخلاق سے بعید نہ تھا؟ لیکن عورت کا تجسس شرافت اور اخلاق پر حاوی ہوتا ہے۔ اس نے گرہ کھول ہی ڈالی۔ گرہ کا

کھلتا تھا۔ کہ کمرے میں ایسی خاموشی چھائی تھی اور سب کی نگاہیں خطوط پر تھیں اُس کے ہاتھوں تھے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے پر وہاں کوئی نہ تھا۔ یہ آواز اُوپر سے آئی تھی۔ پرسکیلا کے کمرے سے ——— لمبی سی دردناک چیخ ہوں ——— کسی عورت کی درد بھری آواز۔

اُس نے خطوط اپنی جیب میں ڈال لیے اور لوگوں کو پکارنے لگی "جلدی دوڑو۔ اُوپر کمرے میں جاؤ۔ فوراً گرم کمبل اور دوڑو پرسکیلا مری نہیں۔ اُسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ زندہ ہے ابھی ابھی پرسکیلا ہوتی ہے۔ اور خود کو مُردوں کی طرح پڑا پایا کہ بے اختیار چیخ رہی ہے جلدی دوڑو" یہ کہہ کر وہ دوڑتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ اور پکاری "پرسکیلا! میں آ رہی ہوں۔ ڈرو نہیں پرسکیلا! میں ابھی آئی۔

وہ سمجھتی تھی کہ پرسکیلا کفن پہنے بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر گھورتی اور روتی ہو گی۔ مگر جب وہ کمرے کے دروازے تک پہنچی۔ تو رونے کی آواز موقوف ہو گئی۔ اور دروازہ کھولتے ہی وہ حیرت کے مارے کھڑی کی کھڑی رہ گئی ——— پرسکیلا حسب سابق کفن میں پڑی تھی۔ اس کا چہرہ ویسا ہی سخت تھا۔ اور ہاتھ اسی طرح جڑے ہوئے تھے ——— کمرے میں ہر طرف موت چھائی ہوئی تھی۔

چچا زاد بہن ساکت و صامت کھڑی تھی۔ اور سب عورتیں کی طرح لخلخہ اور پانی وغیرہ لیے اُسے گھیرے تھیں۔ "غلطی ہو گئی" آخر اُس نے عذر خواہی کے انداز میں کہا۔ "میرا وہم تھا۔ کان بجے تھے۔ اور اُس

نے کمرے کا دروازہ آہستہ سے بند کر دیا ۔

وہ فوراً اُنچے کے کمرے میں آ گئی ۔ اور خطوط اُسی طرح بغیر پڑھے ہوئے صندوقچے میں رکھ دے ۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک ایک کر کے شادی کے کل کپڑے نہایت احتیاط سے صندوقچے میں بند کر قفل لگا دیا اور ڈوری بھی باندھ دی ۔

دوسرے دن جب پرسکیلا اپنی دائمی خوابگاہ کو سدھاری ۔ تو اس کے ساتھ ایک صندوقچہ بھی تھا جو قبر میں اس کی پائینتی کی طرف رکھ دیا گیا ۔ اس صندوقچے میں اس کی مردہ ارمانوں کی دُنیا دفن تھی ۔

فرانس

(۱)

میں ہوں اپنی شکست کی آواز مصنفہ موپساں مترجمہ ملک عطاء اللہ کلیم ایم۔اے

(۲)

آخری سبق مصنفہ الفانسے ڈوڈے۔ مترجمہ۔ سید امتیاز علی تاج

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

رواں کے شہر میں متواتر کئی دن سے شکست خوردہ فوج کے بچے کھچے سپاہیوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ طبل و علم کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ سپاہیوں کی ڈاڑھیاں غلیظ اور بڑھی ہوئی تھیں۔ وردیاں پھٹ کر چیتھڑے ہو رہی تھیں۔ کسی کے حواس بجا نہ تھے۔ محض عادت کے تقاضے سے گرتے سنبھلتے جا رہے تھے۔ ان میں سے اکثر نازوں کے پلے شہری تھے جنہیں جبری بھرتی کے قانون نے میدانِ جنگ میں دھکیل دیا تھا۔ یہ بے چارے اپنی رائفلوں کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ کس جوش و خروش سے گھروں سے نکلے تھے۔ اور کس بے سروسامانی سے پسپا ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ کہیں کہیں باقاعدہ فوج کا اِکّا دُکّا سپاہی بھی اپنی سُرخ وردی سے پہچانا جاتا تھا۔ پانچ سات توپچی بھی تھے۔ مگر توپیں ندارد۔ اور رسالے کے سپاہی بھی تھے۔ لیکن پیدل، وزنی جُوتے پہنے بڑی مشکل سے پیادہ فوج کے ساتھ قدم بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے پیچھے رضاکار تھے۔ جو شکل و صورت سے اوباش معلوم ہوتے

تھے۔ لیکن نام اور القاب سے سکندر اور نپولین کو شرماتے تھے" جیشِ انتقام"، "شہیدی جتھا"، "جاں نثار" سب باری باری گزرے۔ ان کے افسر جو زرق برق وردیاں پہنے تھے۔ اصل میں بنیئے، بزاز اور بساطی تھے۔ لیکن روپیہ یا اچھے دار مونچھوں کے رُعب سے افسر منتخب ہوگئے تھے۔ یہ شیر قالین یوں تو فوجی نقل و حرکت کے معاملات پر اس جسارت سے گفتگو کر رہے تھے۔ گویا نیم جان فرانس انہی کے سہارے جی رہا ہے۔ لیکن جی میں اپنے غنڈے ہمراہیوں سے بھی ڈر رہے تھے جو اپنے ہی اہل وطن کی دولت اور عصمت پر ڈاکہ ڈالنے سے باز نہ آتے تھے۔

شہر میں یہ افواہ گشت لگا رہی تھی کہ جرمن روآن میں داخل ہوا ہی چاہتے ہیں۔ اس افواہ کے پھیلتے ہی سب سے پہلے "قومی فوج" بھاگی جو پچھلے دو مہینوں سے دشمن کی تلاش میں جنگل جنگل چھان چکی تھی۔ اگر کسی خرگوش کے چلنے سے پتہ بھی کھڑکتا تھا۔ تو اس کے سپاہی تیار و ہوشیار ہو کر ہتھیار سنبھال لیتے تھے۔ لیکن اب وہ گوشۂ عافیت میں جا چھپے۔ اور ان کے اسلحہ، وردیاں۔ وہ تمام بہروپ کا سامان جس سے انہوں نے کوسوں تک لوگوں کو دہشت زدہ کر رکھا تھا۔ گویا جادو کے عمل سے غائب ہوگئے۔

فرانسیسی فوج پسپا ہوتی دریائے سین کو عبور کر گئی۔ سب سے پیچھے فوج کا جرنیل دو افسروں کے ساتھ سر جھکائے جا رہا تھا۔

اُس کا دل نہ صرف اپنی ناکامی کے غم سے لبریز تھا۔ بلکہ اپنے وطن کی مصیبت پر خون ہو رہا تھا۔ فرانس کا فوجی وقار، اس کی شاندار عسکری روایات سب خاک میں مل چکی تھیں ؞

اب شہر پر لرزے کی حالت طاری ہو گئی۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا شہر کے موٹے سوداگر جنہیں تجارت نے بُزدل بنا دیا تھا حملہ آور کے ڈر کے مارے کونوں میں دبکے جاتے تھے۔ ان کا خون اس خوف سے خشک ہو رہا تھا۔ کہ مبادا فاتح کو اُن کے چاقو چھری پر اسلحہ کا شبہ ہو۔ تمام کاروبار بند تھا۔ بازار سنسان تھے۔ کہیں کہیں کوئی اِکا دُکا راہگیر دیوار کے سائے میں سہما ہوا جا رہا تھا۔ اضطراب کی یہ کیفیت تھی۔ کہ غنیم کی آمد انتظار کی ان گھڑیوں کے مقابلے میں راحت معلوم ہوتی تھی دوسرے دن سہ پہر کے وقت جرمن سواروں کا ایک دستہ بمرق کی سُرعت سے شہر میں داخل ہوا۔ پھر جرمن فوج سیلاب کی طرح چاروں طرف سے شہر میں اُمڈ آئی۔ اور سب دستے سرکاری دفتروں کے سامنے مربع میدان میں آ ملے۔ مرکز کی طرف جانے والی تمام سڑکیں قدم ملا کر چلنے والے سپاہیوں سے رُک گئیں ؞

جرمن افسر اپنی غیر مانوس زبان میں احکام نافذ کر رہے تھے۔ ان کی کرخت آوازیں سنسان مکانوں سے ٹکرا کر ایک دہشت انگیز کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ مکانوں میں موت کی خاموشی چھائی تھی۔ اگرچہ لکین بند کھڑکیوں کی درزوں سے ڈر ڈر دیدہ نگاہوں سے اپنے فاتحین کو دیکھ

رہے تھے۔ جو قانونِ جنگ کی رُو سے نہ صرف شہر کے مالک تھے۔ بلکہ شہر والوں کی جان و مال کے بھی مختار تھے۔ مفتوحین کے لئے صبر و رضا کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ مصیبت سماوی حادثات کی طرح تھی جن کے سامنے انسان کی طاقت اور عقل کی کوئی پیش نہیں جاتی جس طرح ایک زلزلہ امیر و غریب، معصوم و گنہگار سب کے مکانوں کو برباد کر دیتا ہے۔ اور بچوں، بوڑھوں، عورتوں، مردوں کو اُنہی کے مکانوں تلے دفن کر دیتا ہے۔ یا ایک دریا اپنے کناروں کو توڑتا ہوا کسانوں کے جھونپڑوں، فصلوں اور مویشیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے۔ اسی طرح ایک فتحمند فوج جس کا قانون تلوار اور جس کا مذہب توپ کا مذہب ہے۔ مقابلہ کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اُتارتی اور بقیہ مِلّیت کو غلام بناتی، لوٹ مار کرتی بڑھی چلی جاتی ہے۔ یہ واقعات ہیں جو انسان کے اس عقیدے کو متزلزل کر دیتے ہیں۔ کہ ہمیشہ انصاف کی فتح ہوتی ہے۔ اور بے گناہ ہمیشہ رحمتِ ایزدی کے طفیل محفوظ و مامون رہتے ہیں۔

سپاہیوں کے چھوٹے چھوٹے دستے مکانوں کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ اور دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہو گئے۔ فتح کے بعد مفتوح ملک پر اسی طرح قبضہ کیا جاتا ہے۔ اور اس حالت میں مفتوح کا فرض ہوتا ہے کہ ہر طرح فاتح کے آرام کا خیال رکھے۔ اور اس کی خوشنودی میں کوئی کسر نہ چھوڑے ۔

جب عوام کے دلوں سے دہشت کا اثر جاتا رہا۔ تو امن کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جرمن افسر از راہِ اخلاق فرانس والوں سے ہمدردی اور جنگ سے نفرت کا اظہار کرنے لگا۔ اور فرانسیسی میزبان بھی مصلحت کو مدِ نظر رکھ کر اس کی خوشامد کرنے لگا۔ یہ طریقِ کار دو صورتوں میں مفید تھا۔ ایک یہ کہ اگر جرمن افسر خوش ہوا۔ تو وہ میزبان پر تھوڑے آدمیوں کا خرچ ڈالے گا۔ دوسرے اس کو خفا کرنے سے کچھ فائدہ بھی نہ تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ فرانسیسیوں کی زندگی اور موت کے احکام صادر کر سکتا ہے۔ اس سے جھگڑا مول لینا نہ صرف حماقت بلکہ حماقت کا فعل ہوتا۔ اور اس قسم کی جرأت روآں کے لوگوں کے اوصاف میں نہ تھی۔ فرانسیسی اخلاق اور مہمان نوازی کا بہانہ رکھ کر انہوں نے جرمن افسروں کی خوب خاطر و مدارات کی۔ اگرچہ وہ سرِ عام جرمنوں سے غیریت کا اظہار کرتے تھے۔ مگر اپنے گھروں میں اُن کی اس طرح تواضع کرتے تھے کہ جرمن ان کے گھروں کو اپنا گھر سمجھنے لگے۔ اور پہروں ان کی انگیٹھی کے پاس بیٹھے دل کو گرمانے لگے۔

آہستہ آہستہ شہر کی اصلی رونق لوٹ آئی۔ اگرچہ ابھی فرانسیسی گھروں سے کم نکلتے تھے۔ لیکن بازاروں میں جرمن سپاہیوں سے کافی چہل پہل رہتی تھی۔ فرانسیسی اور جرمن کا اختلاف بھی رفتہ رفتہ کم ہو رہا تھا۔ کیونکہ جرمن افسروں کا سلوک پچھلے سال کے

فرانسیسی افسروں سے بُرا نہ تھا۔ بلکہ فرانسیسی افسر ہوٹلوں میں شراب اور طعام کے معاملات میں جرمن افسروں سے زیادہ دست درازی کا ثبوت دے چکے تھے۔ البتہ کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا۔ کہ زندگی بے مزہ ہے۔ کھانے پینے کا لطف نہیں۔ فضا مکدر ہے۔ اور وطن میں رہ کر جلاوطنی کا گمان ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی کسی غیر ملک میں وحشیوں کا قیدی ہو۔

جرمن روپے کا تقاضا کرتے تھے۔ اور فرانسیسی بے چون وچرا دیئے جاتے تھے۔ اور روپے کی اُن کے پاس کمی بھی نہ تھی۔ لیکن لوگوں والوں کا خاصہ ہے کہ جتنے امیر ہوتے ہیں۔ اتنا ہی انہیں روپیہ دینا گراں گزرتا ہے۔ بعض ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آتے۔ کہ ماہی گیر دریا سے مچھلیاں پکڑنے گئے۔ اور جال میں مچھلی کی بجائے جرمن سپاہی کی لاش نکلی۔ دریا کی کیچڑ نے انتقام کے ایسے کئی واقعات پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ بہادری کے ایسے کارنامے جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ اور اُن سے شہرت اور انعام کی بھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لیکن کوئی محبِّ وطن جوش میں آکر ایسے کام کر ہی گزرتا ہے۔ اور جان پر کھیل جاتا ہے۔

حملہ آوروں سے جن مظالم کی توقع تھی محض ایک ہیبت ناک خواب ثابت ہوتے۔ وہ سخت گیر ضرور تھے۔ لیکن میدانِ جنگ سے باہر درندے نہ تھے جب عوام پر یہ حقیقت افشا ہوئی۔ تو اُن کے

دلوں سے خوف جاتا رہا۔ حوصلے بڑھ گئے۔ اور محبت وطن پر تجارتی مفاد غالب آنے لگے۔ بعض ایسے بھی تھے جن کا کاروبار اوریں بھی تھا۔ جس پر ابھی فرانسیسی قبضہ تھا۔ اس لیئے وہ اس تاک میں تھے کہ موقع ملے تو خشکی کے راستے ڈیپ کی بندرگاہ تک جائیں۔ اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر ہاور جا پہنچیں۔ مقامی جرمن افسروں کی وساطت سے جرنیل کا پروانہ حاصل کرنا مشکل کام نہ تھا۔

اس سفر کے لیئے چار گھوڑوں کی ایک گاڑی کرایہ پر لی گئی۔ دس اشخاص نے اپنا اپنا کرایہ پیشگی ادا کر کے جگہ روک لی۔ اور طے ہوا۔ کہ منگل کو پو پھٹنے سے پہلے ہی گاڑی چل دے۔ تاکہ لوگوں میں بات زیادہ نہ پھیلے۔ چند دنوں سے کہر بہت پڑ رہی تھی۔ پیر کی شام کو کالے کالے بادل گھر آئے۔ اور تمام رات برف پڑتی رہی۔ ساڑھے چار بجے کے قریب جب ہر طرف اندھیرا چھایا تھا۔ مسافر سرائے نارمنڈی میں جمع ہوئے۔ جہاں سے گاڑی کو روانہ ہونا تھا۔ سب نیند کے غلبے سے اونگھ رہے تھے۔ اور سردی کے مارے چغوں میں سمٹے جاتے تھے۔ دو مسافروں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اور بات چیت ہونے لگی۔ اُن کی آواز کو پہچان کر ایک اور مسافر گفتگو میں شریک ہو گیا۔

ایک نے کہا: "میری بیوی بھی میرے ساتھ جا رہی ہے"۔

دوسرا بولا: "میں بھی اپنی بیوی کو ساتھ لایا ہوں"۔

تیسرے نے کہا: "میری بیوی بھی ہمراہ ہے"۔

پہلے نے کہا:۔ "میرا یہاں واپس آنے کا ارادہ نہیں۔ اگر جرمن ہالور تک بڑھتے چلے گئے۔ تو میں انگلستان چلا جاؤں گا" دوسرے بھی اس کے ہمنوا بن گئے۔ سب کا ایک ہی ارادہ تھا۔

گھوڑے ابھی کہیں نظر نہ آتے تھے۔ فٹن والا لالٹین ہاتھ میں لئے کبھی ایک پُراسرار دروازے سے غائب ہو جاتا تھا۔ گھوڑے کے سُم کی آواز اصطبل کی لید میں دب کر نکلتی۔ اصطبل کے پرے سے گاہے گاہے کوچبان کی آواز آتی تھی۔ جو کبھی گھوڑوں کو چمکارتا اور کبھی گالیاں دیتا تھا۔ گھنگروؤں کی جھنکار سے معلوم ہوتا تھا کہ گھوڑوں پر ساز ڈالا جا رہا ہے۔ تھوڑے سے وقفہ کے بعد یہ آواز گھوڑوں کے چلنے کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی گئی۔ اس کے بعد اصطبل کا دروازہ بند ہوا۔ اور چند لمحوں کے لئے کامل خاموشی چھا گئی۔ کانپتے ٹھٹھرتے مسافر سلسلہ گفتگو کو قطع کر کے ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔ برف کی ایک سفید چادر زمین پر گری۔ جاندار اور جمادات سب نے یہ براق چادر اوڑھ لی۔ شہر جاڑے کی تاریکی میں سنسان پڑا تھا۔ صرف برف کے گالوں کی زمین سے سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں۔ بلند و پست سب نے برف کا لباس پہن لیا تھا۔

لالٹین والا ایک اڑیل مریل قسم کے گھوڑے کو گھسیٹتا نکلا۔ گھوڑے کو فٹن میں جوتتے وقت بہت دیر لگی۔ کیونکہ کوچبان کا صرف ایک ہاتھ کھلا تھا۔ دوسرے میں لالٹین تھی۔ جب دوسرے گھوڑے کو لینے چلا۔ تو برف سے ٹھٹھرتے مسافروں پر نظر پڑی۔ اور اُن سے کہا

آپ گاڑی میں چل بیٹھئے۔ کم از کم برف سے تو آرام رہیگا۔ مسافروں کو یہ بات نہ سوجھی تھی۔ سب کے سب ایک جست کر کے گاڑی کے پاس جا پہنچے۔ بیویوں والوں نے پہلے انہیں آرام دہ جگہ پر بٹھایا۔ اور پھر آپ بھی بیٹھ گئے۔ دوسروں کو جہاں جہاں جگہ ملی خاموشی سے بیٹھ گئے۔

گاڑی میں سوکھی گھاس بچھی تھی۔ لیکن خواتین، جو اپنے ساتھ کانگڑیاں لائی تھیں۔ انہیں سُلگا کر پاؤں گرم کرنے لگیں۔ اور بہت دیر تک کانگڑیوں کی تعریف کرتی رہیں۔ اور اُن کے فوائد اس طرح بیان کرتی رہیں۔ گویا یہ کوئی اہم ترین انکشاف ہے۔

آخر گاڑی تیار ہو گئی۔ چار گھوڑوں کی جگہ چھ گھوڑے جوتے گئے۔ کچھ سڑکوں کی بُری حالت کو دیکھتے ہوئے اور کچھ گھوڑوں کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ پھر باہر سے کسی نے کہا "سب بیٹھ لئے؟" اندر سے آواز آئی "ہاں" اور گاڑی چل دی۔

گاڑی رینگتی چلی۔ پہئے برف میں دھنسے جاتے تھے۔ اور گاڑی کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی ہی دور جا کر گھوڑے پسینے میں شرابور ہو کر ہانپنے لگے۔ تو کوچبان کا چابک ہوا میں لہرایا۔ کبھی آگے اور کبھی پیچھے کے گھوڑوں پر چابک برسے۔ اور گاڑی کی رفتار میں کسی قدر تیزی آ گئی۔

صبح ہونے لگی یہ برف باری بند ہو گئی۔ گہرے بادلوں میں سے زرد زرد روشنی جھلکنے لگی۔ بادلوں کی سیاہی برف سے ڈھکے

ہوئے درختوں اور مکانوں کے مقابلے میں عجیب منظر پیدا کر رہی تھی۔ گاڑی کے اندر مسافر دھندلی روشنی میں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگے ۔

سب سے آرام دہ جگہ پر موسیو اور مادام لوئیسیو قابض تھے۔ موسیو لوئیسیو روآن کی مشہور شراب کی دکان کا مالک تھا۔ اس کی ابتدا ایک کلرک کی حیثیت سے ہوئی۔ لیکن جب مالک دیوالیہ ہو گیا۔ تو موسیو لوئیسیو نے تمام کاروبار سنبھال لیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں بہت مالدار ہو گیا۔ اس کی شہرت اس امر پر مبنی تھی۔ اور اس کی تجارت کا راز یہ تھا کہ وہ بہت گھٹیا قسم کا بھرا گھٹیا قسم کے دکانداروں کے ہاتھ بہت ارزاں نرخ پر فروخت کیا کرتا تھا۔ لوئیسیو کے دوست اس کی عیاریوں اور ستم ظریفیوں سے اچھی طرح واقف تھے وہ کسی حرکت سے باز نہ آتا تھا۔ اسی وجہ سے محفلوں میں بھی اس کی ابلہ فریبیوں کے چرچے تھے۔ لوئیسیو خود بذلہ سنجی اور مذاق میں کسی سے کم نہ تھا۔ اگرچہ اس کے مذاق کو مذاقِ سلیم سے وہی نسبت تھی۔ جو اس کے کھرے کو شراب سے باایں ہمہ اسے ہر مجلس کی روح رواں اور جانِ ظرافت سمجھا جاتا تھا۔ موسیو لوئیسیو کی ہیئت ہی سے مسخرہ پن ٹپکتا تھا۔ اس کا پست قد، نمایاں توند اور سرخ چہرہ، جس پہ کھچڑی کی طرح مونچھیں عجب بہار دکھا رہی تھیں۔ اس کی گوناگوں صفات کا مکمل اشتہار تھا۔

مادام لوئیسیو اُس کے مقابلہ میں بلند قامت، بارُعب، بلند آواز، اور سنجیدہ تھی۔ ہنسوڑ میاں اور سنجیدہ بیوی کا جوڑا کاروبار کے لئے بہت موزوں ثابت ہُوا تھا۔

موسیو لوئیسیو کے ساتھ جو صاحب تن کر بیٹھے تھے، وہ روئی کے مشہور سوداگر موسیو کارے لامادون تھے۔ جو نہ صرف روئی کے تین کارخانوں کے مالک تھے۔ بلکہ خطاب یافتہ اور کونسل کے رُکن بھی تھے کہ اپنا ووٹ مخالف کے ہاتھ زیادہ سے زیادہ قیمت پر بیچ سکیں۔ ان کا دعوےٰ تھا کہ میری مخالفت عناد پر مبنی نہیں ہوتی۔ اس لئے مجھے اپنے مخالفین سے راہ و رسم رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں، مادام کارے لامادون جو عمر میں اپنے شوہر سے بہت چھوٹی تھیں۔ روآں میں اعلےٰ خاندان کے فوجی افسروں کے لئے تفریح کا سامان بہم کرتی رہی تھیں اب وہ جسم نازنین کو سمور میں چھپائے اپنے شوہر کے سامنے بیٹھی تھیں اور وقت کی تاریک فضا میں چیں بجبیں ہو رہی تھیں؛

موسیو کارے لامادون کے سامنے کاؤنٹ ہوبرٹ دابریول بیٹھے تھے جو ایک قدیم خاندان کے فرد تھے۔ کاؤنٹ نے جن کی شکل سے بڑھاپے میں بھی وجاہت کے آثار نمایاں تھے۔ بہت کوشش سے اپنے خدوخال میں شاہ ہنری سے مشابہت پیدا کی تھی۔ ان کے خاندان کے متعلق یہ قصہ مشہور تھا۔ اور کاؤنٹ فخریہ انداز میں اس کا ذکر کیا

کرتے تھے۔ کہ شاہ ہنری نے اُن کی جدۂ محترمہ کو خلوت میں سرفراز فرمایا تھا۔ اور اُس کے صلے میں اُن کے جدِ امجد کو کاؤنٹ کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ کاؤنٹ موسیو کارے لا ما دون کی طرح کونسل کے رُکن تھے جب اُنھوں نے ایک معمولی تاجر کی لڑکی سے شادی کی۔ تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا۔ لیکن اُن کی بیوی کا حُسن و جمال، سلیقہ اور مہمان نوازی دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ اور پھر جب یہ سُنا کہ ایک شہزادے کی نظرِ انتخاب بھی ایک زمانہ میں کاؤنٹس پر پڑ چکی ہے۔ تو سب کی گردنیں جھک گئیں۔ کاؤنٹس کی دعوتیں اس علاقے میں سب سے زیادہ بارونق ہوا کرتی تھیں۔ عوام کے لئے وہاں رسائی بہت مشکل تھی۔ صرف اسی کے گھر میں پرانی شاہانہ رسوم کا رواج تھا۔ کاؤنٹ کی جاگیر سے لاکھوں روپیہ کی آمدنی تھی۔

یہ چھ اشخاص جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ سماج کے ممتاز نمائندے تھے۔ انہیں اپنی دولت، رُسوخ اور اعلےٰ نسب پر ناز تھا۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو شرافت، عزت اور تہذیب کا اجارہ دار سمجھتا تھا۔

اتفاق سے سب عورتیں ایک ہی طرف بیٹھی تھیں۔ کاؤنٹس کے ساتھ دو راہبہ عورتیں تسبیح خوانی میں مصروف تھیں۔ ان میں سے ایک جو زیادہ عمر کی تھی، چیچک رُو اور کریہہ المنظر تھی۔ دُوسری دُبلی پتلی اور مدقوق معلوم ہوتی تھی۔ گویا مذہب کے جنون میں گُھل کر

جی رہی ہے۔ اُن کے سامنے ایک مرد تھا۔ اور ایک عورت جنہیں سب گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ مرد کا نام کارنوڈے تھا۔ وہ اپنی انقلاب پسندی اور آزاد خیالی سے بہت رسوا ہو چکا تھا۔ شرفاء اس کو نام سُن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ اس کی سیاسی زندگی رندی سے وابستہ تھی۔ اور اس کی رندانہ زندگی سیاست سے۔ بیس سال سے وہ اپنی ڈاڑھی ٹھرے سے تر کرتا رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ انقلاب کا درس بھی دیتا رہا تھا۔ اس کا باپ جو سرمایہ چھوڑ گیا تھا۔ وہ ان مشاغل کی نذر ہو گیا۔ اب کارنوڈے کی زندگی کا سہارا یہ تھا کہ جلد سے جلد انقلاب برپا ہو۔ اور جمہور اُسے صدرِ حکومت منتخب کر لیں۔ ایک دفعہ یار لوگوں نے اسے دارالحکومت میں بٹھا کر اس کے انتخاب کا اعلان بھی کروا دیا تھا۔ مگر جب صدر کارنوڈے عنانِ حکومت سنبھالنے لگا تو پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے نکال دیا گیا۔ لیکن اُس نے ہمت نہ ہاری۔ جب روآں پر جرمن فوج کی یورش ہوئی۔ تو کارنوڈے نے بزعمِ خود تمام دفاعی انتظامات مکمل کر کے جرمن فوج کو حیران کر دیا۔ جا بجا خندقیں کھودیں۔ درخت کاٹے۔ سڑکوں کو مسدود کیا۔ اور یہ سمجھ لیا کہ اب جرمن فوج ہرگز روآں میں داخل نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اور جرمن فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ تو کارنوڈے نے سوچا کہ اب جا کر ہاروے کی حفاظت میں حصہ لینا چاہیے۔ اگر وہاں کے لوگوں کو مجھ سا تجربہ کار انجنیئر نہ ملا۔ تو معلوم نہیں۔ اُن کا کیا

حشر ہو؟

عورت اُس طبقے میں سے تھی۔ جسے اصطلاحِ عام میں اربابِ نشاط کہتے ہیں۔ وہ اُٹھتی جوانی ہی میں بھاری بھرکم ہو گئی تھی اور "دبنی" کے نام سے مشہور تھی۔ پستہ قد ہونے کی وجہ سے وہ بالکل گول دکھائی دیتی تھی۔ تنگ قبا ہونے کے باوجود آثارِ شباب غیر معمولی طور پر نمایاں تھے۔ اہلِ نظر اُسے چربی کا تودہ بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس "چربی کے تودے" میں بھی وہ کشش تھی کہ زبان سے چاہے کچھ کہہ لو، دل اس کی طرف بے اختیار کھنچا جاتا تھا۔ اس کی غزالی آنکھوں اور لمبی پلکوں میں ایک سحر تھا۔ اُس کے رخسار گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ تھے۔ اور ہونٹ ایک کلی کی طرح تھے جو کھل کر بلبل کو دعوت دیا ہی چاہتی ہے۔ ہونٹوں کے کھلتے ہی آبدار موتیوں کی دو قطاریں نظر آتی تھیں۔ اُس کا حُسن غارت گر۔ اس کا کافر شباب زہد و ایمان پر بے پناہ بجلیاں گرا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس سے بعض اور اوصاف بھی منسوب کئے جاتے تھے۔ جو بیان سے باہر ہیں ع

صد شیوہ ہاست حُسنِ بتاں را کہ نام نیست

طوائف کو پہچانتے ہی سُہاگنیں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں "بیسوا" "عصمت فروش" اور اس قسم کے چند الفاظ طوائف کے کان تک بھی پہنچے اس نے ایک بے باک نگاہ سب پر ڈالی۔ تو مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ سب نے گردنیں جھکا لیں۔ صرف لوئیسو دزدیدہ نظروں سے

اُسے دیکھتا رہا۔

ابھی زیادہ وقت نہ گزرنے پایا تھا۔ کہ سُہاگنیں پھر اتحادِ ثلاثہ قائم کر کے طوائف کے خلاف ایک مشترک محاذ کے لئے گفت وشنید میں مشغول ہو گئیں۔ وہ اسے اس لئے حقارت سے دیکھتی تھیں۔ کہ ان کی محبت کو سماج کی اجازت حاصل تھی۔ اور طوائف کی محبت سماج سے بغاوت تھی۔ اسی طرح تینوں "میاں" بھی کارنوڈے کے خلاف متحد ہو گئے۔ وہ سماج کے اجارہ دار تھے۔ اور کارنوڈے باغی۔ کاروبار کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ اُن کے ہر لفظ سے غرور کی بُو آتی تھی۔ کاؤنٹ ہیوبرٹ نے جنگ میں فصلوں اور جانوروں کی تباہی کی شکایت کی۔ لیکن اس انداز سے کہ اپنی کثیر آمدنی کا اظہار مقصود تھا۔ جس کے مقابلے میں فصلوں کا نقصان ہیچ تھا۔ موسیو کارے لامادون نے کہا میں نے چھ لاکھ فرانک انگریزی بنک میں جمع کرا دئیے تھے۔ تاکہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔ لوئیسیو نے کہا۔ میں نے بھی جنگ کا انتظام پہلے ہی سے کر لیا تھا۔ جتنی ارزاں شراب میرے پاس تھی۔ میں نے فوجی محکمہ کو بیچ دی تھی۔ اب حکومت میری قرض دار ہے میں ہاور جا کر قرضہ جمع کروں گا۔ اسی طرح دوستانہ گفتگو ہوتی رہی اگرچہ ان تینوں کے مراتب میں فرق تھا۔ لیکن سب دولت کی سنہری زنجیر میں جکڑے تھے۔ سب کا تعلق اُس آسودہ حال برادری سے تھا جس کے فرد پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر روپوں کی چھن

چھن سُنا کرتے ہیں ؛

فٹن اتنی آہستہ جا رہی تھی۔ کہ دس بجے تک وہ بمشکل دس میل سے آگے بڑھے۔ مرد بیٹھے بیٹھے اکتا گئے۔ تو گاڑی سے نکل کر چلنے لگے۔ تین مرتبہ پہاڑیوں کے چکر کاٹے۔ مگر پریشانی بڑھتی ہی گئی۔ پہلے ارادہ تو یہ تھا کہ توٹس پہنچکر دوپہر کا کھانا کھائیں گے۔ لیکن موجودہ رفتار سے وہاں شام تک پہنچنے کی اُمید بھی نہ تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ کوئی سرائے نزدیک ہو تو وہیں چل کر کھانا کھائیں۔ دوسری طرف فٹن تھی کہ برف میں دھنس گئی۔ اور دو گھنٹے کی کشمکش کے بعد نکلی۔ میلوں تک کوئی شراب کی دکان یا سرائے نظر نہ آتی تھی ؛

جرمنوں کے ڈر سے بہت لوگ بھاگ گئے تھے۔ باقی بھوکے فرانیسی فوجیوں کے تقاضوں سے گھبرا کر دکانیں بند کر گئے تھے۔ کسانوں سے گوشت روٹی کے لئے درخواست کی جائے۔ تو وہ سوکھے ٹکڑے سے بھی انکار کرتے تھے۔ بھوکے سپاہیوں کے ڈر سے انہوں نے کھانے کی چیزیں چھپا رکھی تھیں۔ بچارے مسافروں کو مجبوراً صبر کرنا پڑا لیکن ایک بجے کے قریب لوئیسیو بے قرار ہو گیا۔ اور کہنے لگا میرے پیٹ میں ایک بہت تکلیف دہ خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھیوں کو بھی یہی شکایت تھی۔ لیکن بھوک نے سلسلہ گفتگو منقطع کر دیا تھا۔ کبھی ایک جمائی لیتا تھا۔ اور دوسرے اُس کی تقلید کرتے تھے۔ اپنی تربیت اور اطوار کے لحاظ سے ہر ایک بھوک کا اظہار کرتا تھا۔ لیکن کوئی جمائی لیتے

ہی منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیتا تھا۔ اور کوئی مسلسل اور پُر شور جمائی لیتا تھا۔ غرضیکہ معدے کا بخار سب منہ سے خارج کر رہے تھے۔ اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آتا تھا۔

طوائف نے کئی مرتبہ جُھک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ گویا کسی چیز کو ڈھونڈ رہی ہے۔ اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ رہی۔ سب مسافروں کے چہرے زرد اور پژمُردہ ہو گئے تھے۔ لوئیسیو نے کہا اگر ایک سیر گوشت ایک ہزار فرانک میں بھی ملے، تو خدا کی قسم لوئیسیو نہیں جو نہ خرید لوں۔ اس کی بیوی نے یہ سُن کر غضب ناک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ اُسے فضول خرچی پر بہت طیش آتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ مذاق میں بھی اس کی روادار نہ تھی۔

کاؤنٹ نے کہا مجھ سے بھی کیا غلطی ہوئی۔ کوئی کھانے کی چیز ساتھ لے آتا تو کیسا اچھا ہوتا۔ ہر ایک نے اس فروگذاشت پر اپنے آپ کو بُرا بھلا کہا۔ البتہ کارنوڈے اپنے ساتھ ایک صراحی میں ٹھرا بھر لایا تھا۔ اُس نے سب کو پیش کیا۔ کاؤنٹ اور موسیو کارے لاماڈون نے حقارت سے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ لیکن لوئیسیو نے غٹ غٹ آدھی صراحی چڑھا لی۔ اور ٹھرے کی خوب تعریف کی "یار دارو ہے یہ۔ دارو! بھوک کی دوا۔" پھر جُوں جُوں نشہ چڑھتا گیا اُس کی مسخرگی عود کرنے لگی "سنو یارو! تم نے وہ کہانی تو سُنی ہوگی چند آدمی ایک کشتی میں جا رہے تھے۔ کنارہ تھا بہت دُور اور بھوک ستا رہی تھی

اور کھانے کو پاس کچھ تھا نہیں۔ آخر تدبیر یہ ہوئی کہ مسافروں میں جو سب سے موٹا ہو، وہ قربانی کا دُنبہ بنے۔ خوب تجویز ہے کہ نہیں۔ ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی۔" کارنوڈے مُسکرایا۔ کاؤنٹ اور کارے لاماودں نے کوئی توجہ نہ کی۔ طوائف نے جس پر یہ پھبتی کہی گئی تھی۔ باوقار خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔ راہبائیں تسبیح خوانی ختم کر کے گٹھڑی بنی بیٹھی تھیں۔ اور فاقے کو روزہ سمجھ کر ثواب کی اُمید لگائے ہوئے تھیں۔

اسی طرح دو گھنٹے اور گزر گئے۔ لیکن دُور تک آبادی کا کوئی پتہ نہ لگتا تھا۔ طوائف نے جلد جلد سیٹ کے نیچے سے ایک بڑا سا دیگچہ دستر خوان میں بندھا ہوا نکالا۔ دیگچے میں انواع و اقسام کے کھانے چھوٹے بڑے خوانچوں میں بند تھے۔ ان کے علاوہ پھل، چٹنیاں، مربہ، اچار غرض قسم قسم کی نعمتیں تھیں۔ جو تین دن کے سفر کے لئے کافی تھیں عمدہ شراب کی چار بوتلوں کی جھلک بھی کام و دہان کو دعوت دے رہی تھی۔

طوائف ایک بھنا ہوا مرغ، نان کے ٹکڑے کے ساتھ کھانے لگی۔ کھانے کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔ تمام نگاہیں "دبنی" پر جم گئیں نتھنے پھول گئے۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ اور جبڑے میں خفیف سی حرکت پیدا ہو گئی۔ سُہاگنوں کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ یہ چاہتی تھیں۔ کہ اس نا شدنی کو پیٹ لے اور دیگچے سمیت اُٹھا کر گاڑی

سے باہر برف میں پھینک دیں۔

لوئیسیو بھوکی نظروں سے مُرغ کو دیکھ رہا تھا۔ آخر نہ رہا گیا۔ تو کہنے لگا "مادام! آپ تو ہم سے زیادہ پیش بیں نکلیں" اُس نے جواب دیا "آپ بھی شوق فرمائیے۔ روزہ رکھ کر تو سفر نہیں کیا جا سکتا"۔

لوئیسیو نے کہا "تسلیم! انکار کرنے کی تاب نہیں رکھتا۔ میں تو جان بلب ہو رہا ہوں۔ طوفان میں کوئی بندرگاہ بھی ہولناک انداز ہوتے کے لئے اچھی ہے" پھر چاروں طرف دیکھ کر" اور مصیبت میں ایسا رفیق تو لیسا غنیمت ہے" یہ کہہ کر گھٹنوں پر اخبار بچھایا۔ اور جیب سے ایک چاقو نکال مرغ کی ایک ٹانگ اس صفائی سے کاٹی کہ دوسروں کو اس وقت معلوم ہوا جب وہ آدھی ٹانگ چبا چکا تھا۔ بچارے آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔

طوائف نے نرم و لطیف آواز سے دونوں راہبہ عورتوں کو شرکت کی دعوت دی۔ اُنھوں نے جھٹ قبول کر لی۔ نیچی نظریں کئے شکریہ ادا کیا۔ اور دست و دہاں کی عبادت میں مشغول ہو گئیں۔ کار نوڈے نے بھی کوئی عذر نہ کیا۔ اخباروں کو دستر خوان کی طرح بچھا کر مرغوں پر جھپٹ پڑے۔ لوئیسیو نے اپنی بیوی کو چپکے سے شامل ہونے کو کہا۔ پہلے تو وہ رضامند نہ ہوئی۔ لیکن جب آنتوں میں درد محسوس ہونے لگا۔ تو مجبور ہو گئی۔ لوئیسیو نے اپنے مخصوص انداز میں طوائف کی "فیاضی" کی تعریف کرتے ہوئے اپنی بیوی کو شریک کرنے کی اجازت

چاہی۔ اُس نے بخوشی بھرا خوان مادام لوئیسیو کو پیش کر دیا۔
شراب کی تقسیم میں یہ مشکل پیش آئی کہ پیالہ ایک ہی تھا لیکن سب نے باری باری پینا شروع کیا۔ اور کار کوڈے نے اپنی فیاض رفیقِ سفر کے ہونٹوں سے تر کئے ہوئے پیالے کو کمال اشتیاق سے بوسہ دیا۔

ادھر اکل و شراب کا شغل جاری تھا۔ اُدھر کاؤنٹ بریول اور کاؤنٹس اور موسیو کارے لاما دوں اور اُس کی بیوی کا بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا بیٹھے بیٹھے مادام کارے لا مادوں غش کھا کر گر پڑی۔ میاں نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو برف کی طرح سرد۔ سب سے امداد کے لئے درخواست کی۔ باقی تو ہکا بکا ہو گئے۔ لیکن بوڑھی راہبہ نے جلدی سے طوائف کا پیالہ اٹھا کر "مریضہ" کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ دو گھونٹ حلق تک پہنچے ہی تھے۔ کہ اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر کہنے لگی۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔ راہبہ نے احتیاطاً اُسے شراب کا پورا پیالہ پلایا اور کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بھوک سے ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔

"ڈبی" نے چاروں عالی قدر مسافروں کی طرف دیکھا جواب تک بھوکے تھے اور ڈرتے ڈرتے کہا۔ "کاش میں اس قابل ہوتی کہ شرفاء کو دعوت دے سکتی . . . . ." اتنا کہہ کر وہ رُک گئی کہ کوئی جھڑک نہ دے۔

لوئیسیو کی بذلہ سنجی اس موقع پہ کام آئی۔ اُس نے خواتین سے مخاطب ہو کر کہا "ایسے موقع پر ہمیں سب اتنیازنہ بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے۔ اور یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ ہمارا تعلق ایک ہی برادری سے ہے۔ تکلف اور وضعداری کا خیال ترک کیجیئے۔ اور یہ پیشکش قبول کیجیئے۔ اب ساتھ کھانے میں عذر ہے۔ معلوم نہیں رات کو سونا بھی یہیں پڑے۔ اس رفتار سے تو ہم کل دوپہر سے پہلے توتس نہ پہنچ سکیں گے"۔

خواتین جھجک رہی تھیں پہلے "ہاں" کون کہے۔ کاؤنٹ نے یہ مشکل حل کر دی۔ اُس نے شاہانہ انداز اختیار کر کے طوائف سے کہا "مادام! ہم آپ کی پیشکش شکریے کے ساتھ قبول کرتے ہیں"۔

ابتدائی مرحلہ ہی سب سے دشوار تھا۔ جب دسترخوان پہ بیٹھ گئے۔ تو تکلف برطرف خوان کے خوان خالی ہوتے گئے۔ اور سوائے اچار، چٹنی اور ہڈیوں کے کچھ بھی نہ رہا۔ یہ ممکن نہ تھا۔ کہ طوائف کا کھانا کھائیں۔ اور اس سے بات نہ کریں پہلے کچھ حجاب رہا۔ لیکن پھر بے تکلفی سے گفتگو ہونے لگی۔ کاؤنٹس اور مادام کارے لاماڈون زمانہ شناس تھیں۔ اس لئے گفتگو میں تہذیب اور اخلاق کا لحاظ رکھتی تھیں خصوصاً کاؤنٹس نے مشفقانہ اور مربیانہ لہجہ اختیار کر رکھا تھا۔ لیکن مادام لوئیسیو گنوار ان تھی۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکالتی تھی۔ کہ ایک لقمہ کم نہ ہو جائے۔

قدرتی طور پر گفتگو کا موضوع جنگ ہی تھا جرمنوں کے مظالم اور فرانسیسیوں کی بہادری کے تذکرے ہونے لگے۔ لطف یہ کہ خود بھاگ رہے تھے۔ اور نہ بھاگنے والوں کی تعریف کا راگ الاپ رہے تھے۔ جب ذاتی تجربات کی طرف رجوع ہوا تو طوائف نے اُس جوش اور فصاحت سے جو اس طبقے کا خاصہ ہے۔ اپنے روآں چھوڑنے کے وجوہ اس طرح بیان کئے۔

جب شہر پر دشمن کا قبضہ ہوا۔ تو پہلے میں نے یہی سوچا کہ جلاوطنی میں جنگل جنگل چھلنے سے تو شہر میں رہنا بہتر ہے۔ گھر میں کھانے پینے کا سامان اتنا زیادہ تھا کہ مہینوں ختم نہ ہوتا۔ لیکن جب میں نے وحشی جرمنوں کو دیکھا تو میرا خون کھولنے لگا۔ غیرت کے مارے دن بھر روتی رہی۔ کاش میں مرد ہوتی تو ان بدمعاشوں کو مزا چکھاتی۔ کھڑکی میں سے ان موئے سوروں کو اکڑ اکڑ کر چلتے دیکھتی تھی۔ تو یہی جی چاہتا تھا کہ کرسی اٹھا کر ان کے سر پر پھینک دوں۔ میری خادمہ نے مشکل سے مجھے اس حرکت سے باز رکھا۔ پھر چند جرمنوں کی رہائش اور خوراک کا انتظام میرے سپرد ہوا۔ میں نے ایک جرمن کو گلے سے دبوچ لیا۔ اور قریب تھا کہ اُس کا کام تمام کر دیتی۔ لیکن دوسرے جرمن مجھے بالوں سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ بہت مصیبتوں کے بعد میں اُن کے پنجے سے نکلی۔ چند دن روپوش رہی۔ پھر موقع ملتے ہی روآں سے راہِ فرار اختیار کی۔ بعد کے حالات تو آپ

جانتے ہی ہیں"۔
ہر طرف سے احسنت و مرحبا کی صدا آئی۔ اور سب نے اُس کی جرأت اور قومی احساس کی تعریف کی۔ لیکن کارنوڈے صرف مسکرا دیا۔ جس طرح ایک بد خود غلط پادری کسی سادہ لوح شخص کو مصروفِ عبادت دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔ کارنوڈے کی قسم کے لیڈر اپنے آپ کو اسی طرح وطن پرستی کے واحد علمبردار سمجھتے ہیں جس طرح پادری مذہب کے اجارہ دار بنے پھرتے ہیں۔ "دنبی" کی جرأت کا اعتراف کرنے کی بجائے اس نے ملوکیت پسندوں کے خلاف ایک دھواں دھار تقریر شروع کر دی۔ "دنبی" کا رجحان شاہ پسندوں کی طرف تھا۔ کارنوڈے کی تقریر سُن کر اُس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ آنکھیں آگ کی طرح روشن ہو گئیں۔ منہ سے شعلے لپکنے لگے۔ اس نے کارنوڈے کو غدار، بدمعاش اور اسی قبیل کے دو چار اور القاب سے مخاطب کرتے ہوئے کہا "اگر تم ایسے لفنگے فرانس میں برسرِ اقتدار ہوئے تو فرانس کا خدا حافظ" لیکن کارنوڈے کی یہ مثال تھی۔ چکنے گھڑے پر بوند پڑی اور پھسل گئی اور گالیاں سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ "دنبی" کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ اور کارنوڈے کی شان میں ایک اور منظوم قصیدہ کہنے کو تھی۔ لیکن کاؤنٹ نے حکمتِ عملی سے کام لے کر اُس کے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ اور کہا ہمیں ایک دوسرے کے سیاسی عقائد کا احترام کرنا چاہئے۔ اور اگر کسی

کا اختلاف نیک نیتی پر مبنی ہو تو اُسے ہدفِ طعن بنانا درست نہیں۔
کاؤنٹس اور مادام کارےلامادوں کے احساسات کاؤنٹ کے برعکس تھے۔
عورتیں قدرتی طور پر ملوکیت پسند ہوتی ہیں۔ کیونکہ انہیں دربار کی شان و
شوکت میں اپنے حُسن کی نمائش کا اچھا موقع ملتا ہے۔ اس لئے وہ ملوکیت
کی حمایت اور جمہوریت کی مخالفت میں طوائف کی ہمنوا تھیں +

یہ سیاسی بحث زیادہ طول پکڑتی اگر کھانا ختم نہ ہو جاتا۔ سب کو
یہی افسوس رہا کہ "دنبی" دیگچے کی بجائے دیگ کیوں نہ پکوا کر ساتھ لائی۔
طعام کے بعد کلام میں وہ پہلی سی گرمی نہ رہی۔ اور تھوڑی دیر بعد
سلسلہ گفتگو بالکل منقطع ہو گیا۔ اب دن ڈھل چکا تھا۔ رات کی تاریکی
کے ساتھ سردی اپنا اثر زیادہ دکھانے لگی۔ اور اب کھانے کے بعد قدرتی
طور پر سردی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ کاؤنٹس بریول نے "دنبی" کو
اپنی کانگڑی پاؤں گرم کرنے کے لئے پیش کی۔ اس کے پاؤں برف
کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ اس لئے اُس نے جھٹ کانگڑی لے لی۔
مادام کارےلامادوں اور مادام لوئیسیو نے اپنی کانگڑیاں راہبہ عورتوں
کو دے دیں +

کوچوان نے فٹن کی بتیاں جلائیں۔ اُن کی روشنی گھوڑوں کی عرق
آلود پشت اور برف سے ڈھکی ہوئی سڑک پر پڑی۔ لیکن فٹن کے اندر
بالکل اندھیرا تھا۔ کارنوڈے اور طوائف میں کچھ چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ لوئیسیو
نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ تو کارنوڈے چندیا سہلاتا دکھائی

دیا۔

دور اندھیرے میں چراغ ٹمٹماتے نظر آئے۔ یہ تولس کا شہر تھا تیرہ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ تولس میں داخل ہوئے اور تجارتی سرائے کے سامنے رُکے۔ سڑک پر نیام سے گرنے کی آواز آئی۔ مسافر خوف کے مارے کانپنے لگے۔ کسی نے جرمن زبان میں انہیں مخاطب کیا۔ مسافروں کو گاڑی سے اُترنے کی ہمت نہ ہوئی۔ گویا اُترتے ہی قتل کر دئیے جائینگے کوچبان نے لالٹین لے کر سب مسافروں پر روشنی ڈالی۔ وہ بیچارے یاس وحسرت کی تصویر بنے دو طرفہ بیٹھے تھے۔ لالٹین کی روشنی میں ایک نوعمر اکہرے بدن کے جرمن افسر نے مسافروں کا ملاحظہ کیا۔ اُس نے فرانسیسی زبان میں مسافروں کو گاڑی سے اُترنے کا حکم دیا۔ سب سے پہلے بوڑھی راہبہ اور اس کی چیلی نے تعمیل کی۔ کیونکہ انہیں فرمانبرداری کی تعلیم دی گئی تھی۔ پھر کاؤنٹ اور کاؤنٹس اور روئی کا تاجر اور اس کی بیوی اُترے۔ پھر لوئیسیو اپنی بیوی کو آگے دھکیلتے ہوئے نکلے اس نے اُترتے ہی ازراہِ اخلاق نہیں بلکہ ازراہ خوشامد جرمن افسر کو سلام کیا۔ لیکن اُس نے ایک رعونت آمیز نگاہ ڈالی۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔ کارنوڈے اور "دبنی" جو دروازے کے قریب بیٹھے تھے۔ سب کے بعد اُترے۔ اور باوقار متانت سے جرمن افسر کے مقابل ہوئے۔ "دبنی" نے اپنے غصہ کو بہ جبر دبایا۔ کارنوڈے نے اپنی سُرخ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ یہ سوچ کر کہ ایسے موقع

یہ ایک فرد کی بزدلی تمام قوم کے لئے بدنامی کا باعث ہوتی ہے وہ قومی وقار کے تحفظ کے لئے باوقار رویہ اختیار کرنا چاہتے تھے اپنے ساتھیوں کی روباہ مزاجی دیکھ کر اُنہیں بہت افسوس ہوا بلکہ لطف سہاگنوں سے بہتر مثال قائم کرنا چاہتی تھی۔ اور کارنوڈے اس وقت کو یاد کر کے جب اُس نے رواں کی حفاظت کے لئے خندقیں کھودی تھیں۔ ہر ممکن طریقے سے مدافعت جاری رکھنا چاہتا تھا۔ سب مسافر سرائے کے باورچی خانے میں جمع ہوئے۔ جہاں جرمن افسر نے اُن کے پروانہ راہداری کا بغور ملاحظہ کیا۔ اُس نے ان کا نام، پلیننہ اور کیفیت پڑھ کر ہر ایک کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور بہت اچھا" کہہ کر چلا گیا۔

سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ سرائے کی خادمہ کو کھانا لانے کو کہا۔ اُس نے کہا ابھی آدھ گھنٹے میں حاضر کرتی ہوں۔ وہ کھانا پکانے میں مصروف ہوئی۔ اور یہ اپنے اپنے کمرے دیکھنے گئے۔ کمرے سب ایک قطار میں تھے۔ اور اُن کے سامنے ایک برآمدہ تھا۔

جب کھانا کھانے کو بیٹھے تو سرائے والا آیا اور بھاری جسم کا آدمی تھا۔ لیکن دمہ کا مارا ہوا بات کرتے ہوئے گلا صاف کرتا۔ کھانستا اور تھوکتا تھا۔ اُس نے آتے ہی پوچھا" کیا مادموزیل الیزبتھ روسے یہاں تشریف رکھتی ہیں۔" "دلہنی" نے کہا "ہاں"۔

مادموزیل! جرمن افسر نے آپ کو اسی وقت ملاقات کے لئے

بلایا ہے"۔

"مجھے بلایا ہے؟"

"ہاں! اگر آپ ہی ما دموزیل ایلز بتھ رو سے ہیں"۔

"چند لمحوں تک "ڈبنی" خوف کے مارے کچھ کہہ نہ سکی۔ پھر تن کر بولی۔ "وہ مجھے ہزار بار بلائے میں نہیں جاؤں گی"۔

مجلس میں سنسنی پھیل گئی۔ ہر ایک نے اپنے فہم کے مطابق بلاوے کے وجوہ پہ رائے زنی کی۔ کاؤنٹ نے "ڈبنی" کو بہت سمجھایا "دیکھئے مادام! ایسے معاملات میں انکار کرنا بڑی غلطی ہے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف آپ کے بلکہ آپ کے رفقاء کے حق میں بھی بہت برا ہوگا۔ کبھی حکام بالا دست کی مخالفت نہ کرنا چاہئے۔ تعمیل حکم میں کوئی نقصان نہیں، ممکن ہے کہ آپ کے پروانہ راہداری میں کوئی معمولی فرد گذاشت ہو"۔

سب نے اس پہ زور دیا کہ ضرور جرمن افسر سے جا کر ملنا چاہئے۔ آخر ان کے اصرار سے مجبور ہو کر وہ چلنے پہ رضامند ہو گئی۔ لیکن یہ کہتی گئی۔ کہ آپ کے کہنے پہ جا رہی ہوں۔ ورنہ ہرگز نہ جاتی۔ کاؤنٹس نے سب کی طرف سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی واپسی تک کسی نے کھانا نہ کھایا۔ ہر ایک یہی چاہتا تھا۔ کہ ملاقات کا اعزاز اسی کو حاصل ہوتا۔ دس منٹ کے بعد ایلز بتھ ہانپتی کانپتی واپس آئی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ گلا خشک

ہو رہا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا " پاجی! حرامزادہ!"

اُس کے رفقاءِ سفر ملاقات کی تفصیل سننے کے لئے ہمہ تن شوق تھے۔ لیکن وہ ایک لفظ بھی کہنے کو تیار نہ تھی۔ جب کاؤنٹ نے اصرار کیا تو اُس نے اکڑ کر کہا " آپ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں آپ کو ہرگز نہیں بتاؤں گی " ۔

اس ناخوشگوار واقعہ کے باوجود الیزبتھ کے سوا سب نے مزے لے کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد سیب کا شربت آیا۔ موسیو اور مادام لوئیسیو اور راہبہ نے کفایت شعاری کے خیال سے اُسے پسند کیا باقی سب نے شراب منگائی۔ صرف کارنوڈے نے بیئر کے لئے فرمائش کی۔ اُس نے اپنے مخصوص انداز میں بوتل کھول کر گلاس میں انڈیلی۔ اور گلاس کو روشنی میں لاکر رنگ کی تعریف کرتا رہا۔ پھر گلاس کو ہونٹوں سے اس طرح لگایا کہ تمام ڈاڑھی تر ہو گئی۔ ہر گھونٹ کے ساتھ ڈاڑھی کے ہلنے کا منظر قابل دید تھا۔ بیئر پینا اور انقلاب کے خواب دیکھنا۔ اُس کی زندگی کے یہی دو مقصد تھے۔ اور دونوں لازم و ملزوم تھے ۔

سرائے کا مالک موسیو فالنوی اور اس کی بیوی میز کی دوسری طرف کھانا کھا رہے تھے۔ فالنوی دمہ کا مریض تھا۔ اس سے کھاتے ہوئے باتیں نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس بیوی گراموفون کی طرح رکنے میں نہ آتی تھی۔ اُس نے جرمنوں کو جی بھر کے گالیاں دینا شروع کیں

اُس کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ کہ اُسے اُن کا خرچ اٹھانا پڑتا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ اس کے دو بیٹے فوج میں ملازم تھے۔ اور اُسے ان کی سلامتی کی فکر تھی۔ مادام فالنوی کی تمام تر توجہ کاؤنٹس پر مرکوز تھی۔ کیونکہ ایک عالی مرتبہ خاتون سے ہم کلام ہونا اُس جیسی عورت کے لئے باعث فخر تھا۔ موسیو فالنوی نے اُسے فاتح فوج کی مذمت سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ گراموفون کی طرح لگاتار کہتی گئی: "ان جرمنوں کو کھانے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اب آلو کھا رہے ہیں۔ پھر کباب منگاتے ہیں۔ پھر کباب کھا چکتے ہیں۔ تو آلو منگاتے ہیں۔ اور پھر کبابوں کی فرمائش کرتے ہیں۔ کھانے اور قواعد کے سوا انہیں کوئی کام ہی نہیں۔ کاؤنٹس صاحبہ! ان سپاہیوں سے آخر ملک کو کیا فائدہ۔ کھیتی باڑی یہ نہیں کرتے۔ تجارت یہ نہیں کرتے۔ ہم غریبوں کو مفت میں ان کا بار اُٹھانا پڑتا ہے۔ کسان اور تاجر مفید کام کرتے ہیں۔ اور یہ ہیں کہ فصلوں کو برباد کرتے ہیں۔ تجارت کو تباہ کرتے ہیں دوسرے ملک کے لوگوں کو بے وجہ قتل کرتے ہیں۔ اگر کسی نے ان کے باپ یا بھائی کو قتل کیا ہو۔ اور یہ انتقام لیں تو کوئی بات بھی ہے لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو سب سے زیادہ انسانوں کو قتل کرے۔ وہی تمغہ کا مستحق قرار دیا جاتا ہے"۔

کارنوڈے نے بلند آواز میں کہا "ایک پُرامن ہمسایہ کے خلاف جنگ کرنا ایک مذموم فعل ہے۔ لیکن اپنے وطن کے تحفظ کے لئے

جنگ کرنا ایک مقدس فرض ہے۔" مادام فالنوی نے کہا۔" ہاں! وطن کی حفاظت اور بات ہے۔ لیکن جو بادشاہ اپنی شہرت اور ہوس ملک گیری کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں واجب القتل ہیں۔" کارنوڈے کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ موسیو کلارے لامادول گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر یہ تمام بے کار سپاہی روئی کے کھیتوں اور کارخانوں میں کام پر لگا دیئے جاتے۔ کپڑے کی تجارت کو کتنا فروغ حاصل ہوتا۔

بوئیسیو چپ چاپ سرائے والے کے ساتھ باہر کھسک گیا۔ اور باتوں باتوں میں اُسے اپنے ڈھب پہ لگا لیا۔ فالنوی اُس کے چٹکلوں پہ بہت ہنسا۔ اور اُس سے شراب کی چھ پیٹیاں خریدنے کا وعدہ کیا۔

دوسرے مسافر تو تھکے ماندے تھے۔ کھانا ختم کرتے ہی سو گئے۔ لیکن لوئیسیو دروازے کی درزوں سے جھانکتا اور کان لگا کر سنتا رہا کہ شاید کوئی راز درون پردہ منکشف ہو جائے۔ قریب آدھ گھنٹے کے گزرا ہوگا۔ کہ سرسراہٹ سنائی دی۔ اور طوائف نیلا کشمیری لباس جو رات کے وقت پہنا جاتا ہے پہنے ہاتھ میں بتی لئے باہر نکلی۔ ایک اور دروازہ کھلا اور کارنوڈے اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ دو چار منٹ سرگوشیاں ہوئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ لوئیسو تمام گفتگو نہ سن سکا۔ لیکن اتنا سمجھ گیا کہ طوائف کارنوڈے کی اس حرکت پہ معترض ہے۔ کہ اس کی خوابگاہ میں کیوں داخل ہوا ہے۔

کارنوڈے حصولِ مقصد کے لئے اصرار کر رہا تھا۔ "ماں بھی جاؤ۔ تمہارا اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

طوالقف نے برافروختہ ہو کر جواب دیا "چلے جاؤ۔ یہ وقت بوس و کنار کا نہیں ہے"۔

کارنوڈے نے کہا "یہی تو وقت ہے"۔

طوالقف نے چیخ کر کہا "دیکھتے نہیں۔ یہاں جرمن مقیم ہیں۔ انہیں خبر ہو تو فرانسیسیوں کے متعلق کیا رائے قائم کریں"۔

کارنوڈے کی رگِ حمیت بھی پھڑک اٹھی۔ حسرت و ارمان دل میں دبائے دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف واپس چلا گیا۔

لوئیسیو اس منظر سے بہت لطف اندوز ہوا۔ اور ایک قلابازی لگا کر مادام لوئیسیو کے پاس پہنچ گیا۔ جو خوابِ شیریں میں مدہوش تھی۔ وہ اُسے ایک بوسے سے جگا کر اس نئے راز سے آگاہ کرنے کو تھا۔ کہ ایک ناخوشگوار صدا نے جو انجن کے دُود کش کے شور سے مشابہ تھی راز و نیاز کا لطف کرکرا کر دیا۔ یہ موسیو فالسوی کے خراٹوں کی آواز تھی۔ جو ایک دل خراش تسلسل کے ساتھ صبح تک جاری رہی۔

دوسرے دن آٹھ بجے روانگی کا ارادہ تھا۔ وقت سے پہلے ہی مسافر باورچی خانے میں جمع ہو گئے۔ فٹن صحن میں کھڑی تھی۔ اُس کی چھت برف سے ڈھکی تھی۔ مگر نہ گھوڑے تھے نہ کوچبان۔ گھوڑے تو خیر اصطبل میں تھے۔ لیکن کوچبان نہ اصطبل میں تھا نہ سائیس گھر میں۔ سرائے کا

کونا کونا چھان مارا۔ لیکن بے سود۔ آخر یہ طے ہوا۔ کہ شہر کی سیر کو نکلا ہوگا۔ وہیں چل کے ڈھونڈنا چاہئے۔ اس پر مرد شہر کے بڑے بازار کی طرف گئے۔ تو عجیب منظر دیکھا۔ دکانوں سے ہٹ کر ایک گرجا تھا۔ جس کے نواح میں چھوٹے چھوٹے دو ردیہ مکان تھے۔ جن میں جرمن سپاہی مقیم تھے۔ ان میں سے ایک آلو چھیل رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک اور جرمن حجام کی دکان دھو رہا تھا۔ تھوڑی دور اور چل کر ایک ڈاڑھی والا جرمن سپاہی ایک فرانسیسی بچے کو لوریاں دے رہا تھا۔ فرانسیسی عورتیں جن کے خاوند جنگ کی وجہ سے گھر سے باہر بھیجے جا چکے تھے۔ جرمن سپاہیوں سے خانگی امور میں مدد لے رہی تھیں۔ کوئی لکڑیاں کٹواتی تھی۔ کوئی مسالہ پسواتی تھی۔ کوئی روٹیاں پکواتی تھی۔ اور ایک نیک بخت تو اپنے میلے کپڑے دھلوا رہی تھی۔

کاؤنٹ نے متعجب ہو کر گرجے کے پادری سے پوچھا۔ "یہ کیا معاملہ ہے"؟ بوڑھے پادری نے جواب دیا۔ یہ جرمن سپاہی بہت نیک دل ہیں۔ دوسرے سپاہیوں کی طرح نہیں ہیں۔ یہ گھر بار، بیوی، بچوں کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ آخر انہیں یہ احساس تو ہے۔ کہ ان کے بیوی بچے بھی اسی طرح روتے ہوں گے جس طرح فرانسیسی سپاہیوں کے مصیبت زدہ بچے اور بیویاں رو رہی ہیں۔ اس وجہ سے کسی کو ایذا نہیں پہنچاتے بلکہ فرانسیسی عورتوں اور بچوں کی اسی طرح خدمت کرتے ہیں۔ جس طرح اپنی بیوی اور بچوں کی کرتے۔ غرباء مصیبت میں ایک

دوسرے کے کام آتے ہیں ۔ لڑائی تو بڑے بڑے لوگ کرواتے ہیں ۔

کارنوڈے فاتح اور مفتوح کے دوستانہ تعلقات دیکھ کر بہت جھلایا ۔ اور اسی وقت واپس چلا گیا ۔ لونیتیو نے اس موقع پر اپنے مخصوص انداز میں یوں تبصرہ کیا " جنگ کی وجہ سے آبادی کم ہو گئی تھی ۔ اب شہر کو پھر آباد کیا جا رہا ہے " ۔

موسیو کاسے لا بادوں نے اپنی مخصوص متانت سے کہا " یہ تلافیٔ مافات ہے " ۔

کوچبان ایک قہوہ خانے میں جرمن افسروں کے ملازموں کے ساتھ خوش گپیاں کرتا دکھائی دیا ۔ کاؤنٹ نے کہا " تمہیں ہم نے حکم نہیں دیا تھا کہ آٹھ بجے سے پہلے گاڑی تیار ہو جانی چاہئے " ؟

اُس نے کہا " حضور ! حکم تو آپ نے دیا تھا ۔ لیکن اس کے بعد دوسرا حکم ملا " ۔

" کیسا حکم " ؟

" یہ حکم کہ گاڑی تیار نہ کی جائے " ۔

" کس نے حکم دیا تھا " ؟

" جرمن افسر نے " ۔

" وجہ " ؟

" اسی سے چل کر پوچھئے ۔ مجھے حکم ملا تھا کہ گاڑی تیار نہ کی جائے ، سو

گاڑی تیار نہیں کی"۔

"اس نے خود حکم دیا تھا؟"

"نہیں حضور! سرائے والے نے اُس کا حکم سنایا تھا"۔

"کب کی بات ہے؟"

"رات کی۔ جب میں سونے چلا تھا"۔

پریشان حال مسافر سرائے کو واپس ہوئے۔ موسیو فالنوی سے ملنے کی کوشش کی۔ لیکن خادمہ نے کہا۔ وہ دس بجے سے پہلے نہیں اُٹھتے اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی اُنہیں دس بجے سے پہلے جگانے کی کوشش کرے۔ ہاں آگ لگ جانے کی صورت میں اُنہیں اطلاع دی جا سکتی ہے۔ یہاں سے مایوس ہو کر وہ جرمن افسر کی ملاقات کو گئے۔ لیکن معلوم ہوا کہ موسیو فالنوی کی معرفت ہی سے اُس تک رسائی ہو سکتی ہے۔ آخر ہر طرف سے ہار کر بیٹھ گئے"۔

کارنوڈے باورچی خانے میں آتش دان کے قریب بیٹھ گیا۔ اُس کے سامنے میز پر بیئر کا ایک گلاس تھا۔ اور ہاتھ میں اس کا مشہور پائپ جسے قوم پرستوں کے حلقے میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ پائپ بہت خوبصورت اور قیمتی تھا۔ اگرچہ اُس کا رنگ کارنوڈے کے دانتوں کی طرح سیاہ تھا۔ پائپ کے بغیر کارنوڈے کی تصویر نامکمل رہ جاتی ہے۔ یہ خادم قوم آتش دان کے پاس بیٹھا کبھی بھڑکتی آگ کو دیکھتا تھا۔ کبھی بیئر کے جھاگ کو، کبھی اپنی لمبی پتلی اُنگلیوں کو اپنے غلیظ بالوں میں پھیرتا

تھا اور کبھی اپنی مونچھوں سے شراب کے جھاگ کو چاٹ چاٹ کر بادہ نوشی کی داد دیتا تھا ۔

لوئیسیو سیر کے بہانے پرچون فروشوں کے پاس جا پہنچا اور انہیں اپنا گاہک بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ کاؤنٹ اور روئی کا تاجر سیاسیات اور فرانس کے مستقبل پر بحث کرنے لگے۔ کاؤنٹ شاہ پسند تھا۔ اور تاجر چاہتا تھا کہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"۔ کوئی نپولین اعظم یا ژاں دارک ظاہر ہو کر فرانس کی بگڑی تقدیر بنا دے۔ کار ذونٹے ان دونوں سرمایہ داروں کی باتیں سُنتا تھا۔ اور پائپ کا کش لے کر جی میں کہتا تھا۔ ع

محرمِ رازِ درونِ روزگار مم کردہ اند

دس بجے موسیو فالنوی جاگے۔ مسافروں کے سوالات کا صرف ایک جواب اُس کے پاس تھا۔ "جرمن افسر نے مجھ سے کہا تھا۔ موسیو فالنوی! دیکھو یہ مسافر میری اجازت کے بغیر یہاں سے جانے نہ پائیں۔ کوچوان کو حکم دے دو کہ صبح ہرگز گاڑی تیار نہ کرے"۔

اس پر کاؤنٹ اور ملک التجار جرمن افسر کی ملاقات کو گئے۔ کاؤنٹ نے اپنا کارڈ بھیجا جس پر موسیو کارے لامادوں نے اپنا نام اور اعزازت لکھے تھے۔ لیکن فرعون مزاج جرمن نے کہلا بھیجا۔ کہ دوپہر کے کھانے کے بعد ملاقات ہو سکتی ہے۔

اس پریشانی کے باوجود بیاہتا عورتوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

طوائف البتہ بہت مغموم اور رنجیدہ خاطر تھی۔ کھانا کھلتے ہی جرمن افسر کا چپراسی اسلام لے کر آیا۔ لوئیسیو بھی کاؤنٹ اور ہوسیو کا رے لاباؤون کے ساتھ شامل ہوگیا۔ وہ کار نوڈے کو بھی ساتھ ملانا چاہتے تھے۔ مگر اس نے یہ کہکر انکار کردیا کہ میں جرمنوں کے عدم تعاون کی حکمت عملی پر کاربند ہوں۔ اس لئے جی حضوری بن کر اُن کے سامنے نہیں جاسکتا وہ جرمن افسر کے پاس گئے۔ اور یہ بیئر پینے بیٹھ گیا ؛

وفد کے اراکین سیڑھیوں سے چڑھ کر جرمن افسر کے دیوانِ خاص میں پہنچے۔ وہ آرام کرسی پر دراز تھا۔ اور پاؤں ملاقاتیوں کی طرف تھے۔ اس نے لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ جو لوٹ کا مال معلوم ہوتا تھا۔ اراکین وفد نے سلام کیا۔ اُس نے نہ اُن کے سلام کا جواب دیا نہ اُن کی طرف دیکھا۔ جو فاتح فوج کی بے تمیزی کا عمدہ نمونہ تھا ؛

چند لمحوں کے بعد اس نے پوچھا "یہاں آنے کی غرض؟"

کاؤنٹ نے وفد کی طرف سے جواب دیا "ہم روانگی کی اجازت چاہتے ہیں" ؛

جرمن نے اکڑ کر کہا "ہم اجازت نہیں دیتے"

کاؤنٹ :۔ "کیا میں اس کی وجہ دریافت کرسکتا ہوں"؟

جرمن :۔ "ہماری مرضی!"

کاؤنٹ :۔ "میرا مؤدبانہ التماس ہے کہ سالارِ اعظم نے ہمیں پروانہ راہداری دیا ہے جس میں لکھا ہے۔ کہ پروانے کے حامل کو ڈیپ

تک جانے کی اجازت ہے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم پر یہ سختی کیوں کی جا رہی ہے۔"

جرمن :۔ "ہماری مرضی! بس ہم اس سے زیادہ نہیں کہنا چاہتے۔ اچھا جاؤ"۔

تینوں نمائندوں نے جھک کر سلام کیا۔ اور بے نیل مرام واپس آ گئے۔

مسافر تمام شام فکر مند رہے۔ متلون مزاج جرمن افسر کا رویہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ قسم قسم کے بے بنیاد وسوسے رہ رہ کر ستانے تھے۔ باورچی خانے میں جمع ہو کر سب اپنا اپنا قیاس دوڑانے لگے۔ کسی نے کہا ہمیں بطور یرغمال قید کر لیا جائے گا۔ یہ سن کر امیروں کو تو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ دولت کی بربادی کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی۔ جرمن افسر کہتا ہے۔ تھیلیوں کے منہ کھول کر یہاں ڈال دو۔ ورنہ جیتے جی آزادی نصیب نہ ہوگی۔ تینوں سرمایہ دار دماغ لڑانے لگے۔ کہ کوئی اچھا سا جھوٹ گھڑ کر جرمن کو یہ یقین دلائیں کہ ہم حقیقت میں نادار اور مفلس ہیں۔ لوئیسیو نے گھڑی کی طلائی زنجیر اتار کر جیب میں رکھ لی۔ اندھیرا زیادہ ہوا۔ تو سرمایہ دار اور بھی گھبرائے۔ طبیعت بہت پریشان تھی۔ مادام لوئیسیو نے کہا۔ تاش کی ایک بازی ہو جائے۔ تو طبیعت بہل جائے۔ سب نے یہ تجویز پسند کی۔ کاؤنٹ نے تاش تقسیم کی۔ طوائف پہلی بازی ہار گئی۔ کھیل کی دلچسپی میں تفکرات محو ہونے

لگے۔ لیکن کارنوٹے نے تاڑ لیا۔ کہ لوئیسیو اور اُس کی بیوی دوسروں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں +

کھیل دو گھنٹے میں ختم ہوا۔ اس کے بعد کھانے کی میز پر بیٹھے ہی تھے کہ لوئیسیو فالنوی جرمن افسر کا قاصد بن کر آیا۔ اور یہ پیغام لایا۔ کہ بادموزیل ایلزبتھ روتے سے رضامند ہے۔ تو اطلاع دے +

طوالف کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ پھر یکلخت آگ بھبھوکا ہو کر بولی "اس حرامزادے سے کہدو، مجھ سے یہ اُمید نہ رکھے سُنتے ہو، میں ہرگز ہرگز اس کی بات نہ مانوں گی"+

ہرکارہ تو یہ سُن کر چلا گیا۔ لیکن دوسرے لوگ طوالف کو سوالات سے دق کرتے رہے۔ آخر یہ کیا اسرار ہے؟ کونسی چھپانے کی بات ہے؟ جرمن افسر کس لئے بے قرار ہے؟ پہلے تو وہ ضبط کرتی رہی۔ مگر جب ان کا اصرار حد سے زیادہ بڑھا۔ تو چلّا کر بولی "تم پوچھتے ہو۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ وہ مجھے اپنی خوابگاہ میں بلانا چاہتا ہے۔ اور کیا چاہتا ہے؟"

فرانسیسیوں کی آتش غیرت بھڑک اُٹھی۔ کارنوڈے کے ہاتھ سے بیئر کا گلاس گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس بد طینت جرمن افسر پر سب نے لعن طعن کی۔ اور اُس کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہر ایک نے قسم کھائی۔ کہ ہم ہر ممکن قربانی کر گزرینگے۔ اور کسی صورت میں اس توہین کو برداشت نہ کریں گے۔ کاونٹ نے جرمن کے رویے

پر نفرین کرتے ہوئے کہا "اس شرمناک واقعہ نے قرون وسطیٰ کے وحشیوں کی یاد تازہ کر دی ہے" خواتین نے بھی ایڈز بتھ کے ساتھ کمال فیاضی سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ البتہ بوڑھی بیا ہیبہ اور اس کی چیلی جو صرف کھانے کے وقت اِن سے ملتی تھیں چُپ سادھے تسبیح گردانی میں مصروف رہیں۔

جب غصّے کی آگ قدرے فرو ہوئی۔ تو سب نے کھانا کھایا۔ لیکن کسی نے سلسلہ گفتگو چھیڑنے کی کوشش نہ کی۔ کھانا ختم کرتے ہی عورتیں تو اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو رہیں۔ مرد کچھ دیر پائپ اور سگریٹ کے کش لگاتے رہے۔ پھر تاش کا کھیل شروع ہوا۔ موسیو فالنوی کو شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ مطلب یہ تھا کہ اسے باتوں میں لگا کر یہاں سے نکلنے کی تدبیر پوچھی جائے۔ لیکن وہ پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتا تھا۔ نہ ان کے سوالات سنتا تھا۔ نہ ان کی باتوں کا جواب دیتا تھا اسے کھیل کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ وہ ان سے یہی کہے جاتا تھا "میں آپ کے کھیل میں خلل انداز نہیں ہونا چاہتا۔ آپ کھیل جاری رکھیے۔ میں دیکھ دیکھ کر بہت محظوظ ہو رہا ہوں۔" وہ کھیل میں اتنا محو ہو گیا کہ کھانسنا بھی بھول گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اس کے سینے سے باجے کی سی آوازیں نکلنے لگیں۔ اس کی بیوی انتظار سے اُکتا کر اُسے بلانے آئی۔ تو اس نے انکار کر دیا۔ اُسے جلدی سونے کی عادت تھی اس لیے وہ اسے وہیں چھوڑ کر چلی۔ فالنوی نے اس سے کہا "میرے لیے

انڈے تل کر سونا" یہ کہکر وہ پھر کھیل دیکھنے لگا۔ مسافروں نے دیکھا کہ اس کے چھوٹے منہ سے تو کام کی بات نہیں نکلتی۔ ناچار وہ بھی کھیل ختم کرکے سونے چلے گئے۔

دوسرے دن وہ سویرے ہی جاگے۔ سب یہی دعا مانگتے اٹھے۔ کہ الہٰی تو کارساز ہے۔ اس منحوس سرائے سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا کر۔ لیکن بدقسمتی سے گھوڑے اصطبل میں بندھے رہے۔ اور کوچبان حسب سابق غائب رہا۔

دوپہر کا کھانا بہت بے لطفی سے کھایا گیا۔ طوائف کی جانب روکھا پن ظاہر ہونے لگا۔ سرمایہ داروں اور رباہیتا عورتوں کے خیالات میں گزشتہ رات کے وقفے میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا تھا۔ وہ دل میں اسے کوس رہے تھے۔ کہ اس نے رات کے پردے میں جرمن افسر کی خواہشات کیوں پوری نہ کر دیں۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی۔ اور صبح مسافروں کی روانگی کی اجازت بھی مل جاتی۔ وہ افسر کے سامنے یہ بہانہ پیش کر سکتی تھی۔ کہ میں اپنے ہم وطن مسافروں کی خاطر تمہاری خواہشات کی تکمیل کر رہی ہوں۔ اور اس کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی۔ یہ خیالات ابھی ان کے ذہن میں پراگندہ تھے۔ اور ابھی انہوں نے الفاظ کی صورت اختیار نہ کی تھی۔

سہ پہر کو عورتیں اور تین مرد بیٹھے بیٹھے اکتا کر سیر کو نکلے۔ کارنوڈے آگ کے پاس بیٹھا رہا۔ اور راہبہ تسبیح گردانی کے لئے الگ بیٹھ رہیں۔

چاروں عورتیں آگے آگے چلیں۔ اور تینوں مرد کچھ فاصلے پر رہے۔ موسیو نے صورتِ حال پر تبصرہ کیا ہمیں کب تک اس رنڈی کی وجہ سے نظر بند رہنا پڑے گا۔ کاؤنٹ نے اپنی شرافت اور عالی دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا "ہم ایک عورت کو اپنی عزت قربان کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتے۔ ہاں اگر وہ خود رضامند ہو جائے۔ تو اور بات ہے"۔

لوئیسیو نے پیادہ پا بھاگ چلنے کی رائے دی۔ لیکن کاؤنٹ نے کہا "ایسا اقدام مصلحت کے خلاف ہوگا۔ برف میں اپنی بیویوں سمیت بھاگ نکلنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ دس منٹ میں جرمن ہمارا تعاقب کر کے ہمیں گرفتار کر لیں گے۔ اور پھر ہماری خیر نہیں"۔ لوئیسیو سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اور چند منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔ اس عرصے میں خواتین تازہ ترین فیشن کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔ موجودہ حالات میں ان کی گفتگو میں شگفتگی تو پہلے ہی نہیں تھی۔ اچانک جرمن افسر ان کے پاس سے گزرا۔ تو رہا سہا سکون بھی جاتا رہا۔ وہ خواتین کو دیکھ کر مسکرایا اور تعظیماً سر جھکا کر چل دیا۔ لیکن مردوں کے قریب پہنچا۔ تو ایک حقارت کی نظر ڈالی۔ اور ان کے سلام کا انتظار نہ کیا۔ ایلزبتھ کا منہ سرخ ہو گیا۔ اور باقی عورتیں اس خیال سے جھینپ گئیں۔ کہ انہیں اس گستاخ عورت کے ساتھ دیکھ کر خدا جانے کیا کیا شکوک جرمن افسر کے دل میں پیدا ہوں۔ جب جرمن افسر دور چلا گیا۔ تو اس کی جیبت کذائی پر تنقید ہونے لگی۔ مادام کارے لامادوں نے

دوسروں سے اتفاق نہ کیا۔ اور کہا وہ قطعاً بدصورت نہیں ہے۔ اس نے اپنے تجربہ کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی۔ کہ اگر وہ فرانسیسی ہوتا تو کوئی عورت بھی اُس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتی۔

سیر کے بعد سرائے میں واپس آئے۔ تو جی نہ لگتا تھا۔ بات بات پر جھگڑتے تھے۔ پھر چپ چاپ کھانا زہر مار کیا۔ اور سیدھے اپنی اپنی خوابگاہ میں چلے گئے۔ کہ شاید نیند سے طبیعت بہل جائے۔ سو کر اُٹھے تو سب کے چہرے اُترے ہوئے اور مزاج برہم تھے۔ عورتیں طوائف سے کنارہ کش نظر آتی تھیں۔ اور اُس سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتی تھیں۔ وہ بھی گھبرا کر چلی گئی۔ گرجے میں کسی بچے کے بپتسمہ لینے کی رسم تھی۔ اسے بھی اپنا بچہ یاد آگیا۔ جو ایک عرصہ سے اس سے بچھڑا ہوا تھا۔ اور ایک کسان کے گھر میں پرورش پا رہا تھا۔

طوائف تو گرجا کو چل دی۔ اور اُس کی پیٹھ پھیرتے ہی اُس کے رفقاء میں اشارے ہونے لگے۔ گویا کہ اس بدبخت عورت کے خلاف سازش کرنے کا یہی وقت ہے۔ غیب سے کسی نے لوئیسو کے کان میں پھونکا کہ طوائف کو جرمن افسر کے حوالے کر کے چل دو۔ موسیو فالنوی کی وساطت سے یہ پیغام جرمن افسر تک پہنچایا گیا۔ لیکن قاصد اپنے قدموں واپس آیا تو سمجھ گئے کہ تیر خطا گیا۔ جرمن افسر نے جواب بھیجا کہ جب تک میں اپنا مدعا حاصل نہ کر لوں۔ تم میں سے کسی کو شہر چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ جواب سن کر مادام لوئیسو سے نہ رہا

گیا۔ اُس کی باطنی خباثت آتش فشاں پہاڑ کے مادے کی طرح پھوٹ پڑی۔ اس بیسوا کی وجہ سے یہ مصیبت ہم پہ نازل ہوئی ہے کوئی اس فاحشہ سے پوچھے کہ تجھے اس جرمن سے کیوں شرم آ رہی ہے۔ تیرے لئے تو زید، بکر یا عمر سب ایک جیسے ہیں تجھے مردوں میں تمیز کرنے کا کیا حق ہے۔ روآں میں تو تو شارع عام بنی ہوئی تھی۔ کوچبانوں تک کو تو کھلی اجازت تھی۔ کتنے کوچبانوں کو تو میں جانتی ہوں جو اس کے مستقل گاہک تھے۔ یہ لوگ ہم سے شراب خریدنے آتے تھے۔ اس لئے مجھ سے کوئی بات چھپی نہیں۔ اب جو ہمیں اس مصیبت سے چھڑانے کا سوال آیا۔ تو یہ لگی گرہستنوں کی طرح رونے چلانے سچ پوچھو تو میں تو جرمن افسر کی تعریف کرتی ہوں۔ کہ وہ مہینوں سے عورت کو ترس رہا ہے۔ لیکن گرہستنوں پہ ہاتھ نہیں ڈالتا۔ اس نے شرافت سے کام لے کر ایک پیشہ ور عورت کو پسند کیا ہے۔ ورنہ کیا ہم اس عورت سے کسی طرح کم ہیں۔ وہ ایک اشارہ کردے۔ تو ہم میں سے جس کو چاہے اپنی ہوس کا آلۂ کار بنا سکتا ہے۔

یہ سن کر دوسری خواتین تنترا اٹھیں۔ اور مادام کارے لا بادوں کا چہرہ زرد ہو گیا۔ گویا وہ حقیقت میں اس مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اس موقعہ پر مرد بھی گفتگو میں شریک ہو گئے۔ لوئیسو نے اس پہ زور دیا کہ "دُبنی" کو دست و پابستہ قربانی کے لئے جرمن افسر کے حوالے کر دیا جائے لیکن کاؤنٹ جس نے سیاست میراث میں پائی تھی حکمت عملی سے کام

لینا چاہتا تھا۔ اُس کی یہ رائے تھی۔ کہ طوائف کو پچکار کر منا لینا چاہیئے۔ اس کے بعد مشورہ ہونے لگا کہ کونسی تدبیر کی جائے کہ طوائف خود اپنی خدمات رفاہِ عام کے لئے پیش کر دے۔

عورتیں سرجوڑ کر باتیں کرنے لگیں۔ ہر ایک نے اپنی اپنی رائے دی۔ تشبیہہ و استعارہ کے پردے میں راز کی باتیں ہونے لگیں شرم کا مصنوعی پردہ اس شرمناک بحث میں حائل نہ ہوا۔ عورتیں اس دلچسپ مضمون سے اس طرح لطف اندوز ہو رہی تھیں جس طرح ایک باکمال باورچی مزیدار کھانے پکاتے وقت چکھنے کے بہانے اُن سے جی بھر کر لذت اندوز ہوتا ہے۔

اس شگفتہ مضمون نے مصیبت زدہ مسافروں کی کلفت دور کر دی۔ کاونٹ نے مہذبانہ پیرائے میں اس غیر مہذب موضوع پر ظریفانہ تبصرہ کیا۔ لوئیسیو نے اپنے مخصوص انداز میں تہذیب و اخلاق سے بے نیاز ہو کر داد ظرافت دی۔ لیکن کسی مدعیِ اخلاق نے اُسے نہ ٹوکا۔ سب مادام لوئیسیو کے اس فقرے کو دہرا رہے تھے۔ کہ یہ تو اُس کا پیشہ ہے اُسے مردوں میں تمیز کرنے کا کیا حق ہے؟

مادام کاریے لامادون تو ہونٹ چبا کر جی میں کہہ رہی تھی کاش! طوائف کی بجائے نظرِ انتخاب مجھ پر پڑتی۔ طوائف کے خلاف ایک گہری سازش کی گئی۔ ناکہ بندی کے مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق کے بعد ہر ایک کو اپنے فرائض سے آگاہ کیا گیا۔ جس طرح ایک جرنیل کسی

مستحکم قلعہ کی تسخیر کے لئے اپنے افسروں سے مشورہ کرتا ہے۔ اور ہر ایک کو ضروری داؤ گھات بتاتا ہے۔ اسی طرح کاؤنٹ نے اپنی فطری دانشمندی سے کام لیتے ہوئے طوائف کی مدافعت کو ختم کرنے کے لئے تدابیر سوچیں۔ اور اپنے رفقاء کو اس مہم میں اپنا شریک کر لیا۔

جب طوائف واپس آئی۔ تو سازش مکمل ہو چکی تھی۔ کاؤنٹ نے سب کو اشارہ کیا کہ خاموش ہو جاؤ۔ مبادا شکار ہاتھ سے نکل جائے۔ عورتوں نے اچانک طوائف کو موجود پایا تو کچھ حیران سی ہو گئیں۔ کانفرنس یک لخت بند ہو گئی۔ اور کسی کو طوائف سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت نہ ہوتی لیکن کاؤنٹس جو ریاکاری میں طاق تھی۔ ایک منٹ میں سنبھل گئی۔ اور طوائف سے بے تکلف باتیں کرنے لگی۔ گرجا میں خوب رونق ہوگی۔ تمہارا عبادت میں جی تو لگ گیا ہوگا۔ طوائف نے کہا۔ ہاں! جب جب موقع ملے خدا کو یاد کر لینا اچھا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دوپہر تک خواتین نے طوائف سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ تاکہ اس کا اعتماد حاصل کر لیں۔ جب میز پہ کھانا آیا تو طوائف کا محاصرہ شروع ہوا۔ پہلے جذبہ ایثار کی تعریف ہوتی رہی۔ پھر تاریخ سے قربانی کی مثالیں پیش کی گئیں۔ قدیم زمانے کی ان عورتوں کی تعریف کی گئی جنہوں نے جان وآبرو کو خطرے میں ڈال کر اپنی قوم کو دشمن کے پنجے سے چھڑایا تھا۔ مصری ملکہ کلیوپیٹرا کا ذکر آیا جس نے فاتح رومن جرنیلوں کے دلوں کو اپنے حُسن سے مفتوح

کر لیا تھا۔ اس کے بعد ایک رنگین افسانہ تراشا گیا کہ اعلےٰ خاندان کی رومن عورتوں نے حملہ آور ہنی بال اور اس کے سپاہیوں کو اپنی متاعِ حُسن نذر کر کے اپنے ملک کی آزادی خریدی تھی۔ اس افسانے سے اور افسانے پیدا ہوئے۔ ہر ایک نے اپنے تخیل کی بہار آفرینی کا ثبوت دیا۔ ان تمام اخلاق آموز افسانوں کا ایک ہی موضوع تھا۔ کہ اگر عورت حُسن فروشی پہ اُتر آئے۔ تو مُلک اور قوم کی بہترین خدمات سرانجام دے سکتی ہے۔ اور کوئی اعلےٰ مقصد نہیں جو اپنی آبرو کے عوض خرید سکے

یہ داستانیں سنتے وقت خواتین کی متانت میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ وہ ہر طرح اپنے خلوص کے مصنوعی آثار پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ اس اثناء میں راہبہ عورتیں عبادت میں مصروف رہیں اور طوائف خاموشی سے سنتی رہی۔

سہ پہر کے وقت طوائف کو وعظ سنایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اُسے سوچنے کا موقع ملے۔ تو شاید "راستی" پہ آ جائے۔ گفتگو کے دوران میں البتہ وُہ اُسے مادام کی بجائے مادموزیل کہہ کر مخاطب کرتی رہیں۔ غالباً اس لئے کہ اُسے احساس ہو جائے۔ کہ وہ بیاہتا عورت نہیں ہے۔ شام کو وہ کھانا کھا رہے تھے۔ تو موسیو فالنذی پھر آیا۔ اور حسبِ معمول پوچھا "جرمن افسر کا ارشاد ہے کہ مادموزیل ایلزبتھ رُوسے نے اپنا ارادہ بدلا ہے یا نہیں"۔

طوائف نے رُوکھا پھیکا جواب دیا "نہیں"۔

اس پر سازشیوں کی تھوتھنیاں لٹک آئیں۔ لوئیسیو نے اپنے ساتھیوں کو ہنسانے کی ناکام کوشش کی۔ کسی کو ایثار کی نئی مثال نہ سوجھتی تھی۔ کاؤنٹس نے اس لئے بوڑھی راہبہ کی طرف رجوع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بزرگانِ مذہب سے بعض ایسے واقعات منسوب کئے گئے ہیں۔ جو مہذب ملکوں میں جرائم سمجھے جاتے ہیں۔ اور جن کو عام طور پر ہر شخص ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ لیکن بزرگانِ مذہب کے بارے میں ان واقعات سے اس لئے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ کہ ان اعمال کا محرک خدمتِ خلق یا حکمِ ربانی کی تعمیل کا جذبہ تھا۔ ہمارے پادری اور بزرگانِ ملت اپنے مذموم افعال کی انہی تاویلوں سے پردہ پوشی کیا کرتے ہیں۔ اور اپنی غلطیوں کے بارے میں "روح کی آواز" اور اپنی سادگی کا بہانہ پیش کر کے معصوم بنے رہتے ہیں۔ کاؤنٹس نے اس حقیقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ بوڑھی راہبہ آسانی سے کاؤنٹس کے جال میں پھنس گئی۔ اُس نے غیر معمولی وضاحت سے وہی باتیں کہیں۔ جو کاؤنٹس اُس سے کہلانا چاہتی تھی۔ یعنی خدا کو کوئی فعل ناپسند نہیں۔ جو نیک نیتی سے کیا گیا ہو۔ اس پر کاؤنٹس نے کہا: "آپ کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ جو گناہ خلوص نیت سے کیا جائے خدا اُسے معاف کر دے گا"۔

راہبہ نے کہا: "اس میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ اگر نیک نیتی سے کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اُسے بھی کارِ ثواب کہنا چاہیئے"۔

یہ مذہبی بحث نہایت متانت سے جاری رہی۔ اس کے دوران

میں ہر قسم کی غیر متعلق اور بے ہودہ باتیں خدا سے منسوب کی گئیں۔ اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ گنہگار طوائف کو نئے گناہ پہ مائل کیا جائے۔

راہبہ کا ہر لفظ مدافعت کے حصار میں رخنہ پیدا کر رہا تھا۔ جب گفتگو کا موضوع بدلا تو راہبہ نے کہا: "ہم زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کے لئے ہاور جا رہی تھی۔ لیکن اس متلوّن مزاج جرمن افسر نے ہمیں روک رکھا ہے۔ معلوم نہیں اس کی حرکت سے کتنے سپاہیوں کی جان پہ بن رہی ہو گی۔ بوڑھی راہبہ کریمیا، اٹلی اور آسٹریا میں ہزاروں سپاہیوں کی تیمارداری کر چکی تھی۔ جب اُس نے ان واقعات کا ذکر کیا۔ تو اُس کا جھریوں سے مستور چہرہ جنگ کی تباہ کاریوں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ اُس کی باتوں سے سب اس حد تک متاثر ہوئے۔ کہ جب اُس نے اپنا تذکرہ ختم کیا۔ تو کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ کھانا ختم ہوتے ہی سب اپنے اپنے کمروں کو واپس ہوئے۔ اور دوسرے دن دیر سے اُٹھے۔ دوپہر کا کھانا سب نے خاموشی سے کھایا کہ جو بیج پچھلی شام کو بویا گیا ہے۔ اسے پھوٹنے کا موقع ملے۔

سہ پہر کو کاؤنٹس کے کہنے پر سب سیر کو نکلے۔ دوسرے تو آگے نکل گئے۔ لیکن کاؤنٹ مصلحت کو مدِّ نظر رکھ کر طوائف کا بازو پکڑے پیچھے رہ گیا۔ اُس نے موقع پا کر بزرگانہ انداز میں طوائف سے کہا: "بیٹی! تم اب بھی راہِ راست پر آ جاؤ تو اچھا ہے۔ سوچو تو اگر تم اپنی ضد پہ قائم رہیں۔ تو ہماری حالت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ ہماری عزّت

کوڑی کی نہ رہے گی۔ ہماری آبرو برباد ہو جائے گی تم اس جرمن افسر کو کیوں اپنا ممنونِ احسان نہیں بنانا چاہتیں جب ہر کس و ناکس کو سرفراز کرنا تمہارا ہر روز کا کام ہے؟

اُس نے نرمی، لجاجت، خوشامد، ہر طرح سے طوائف کو راضی کرنے کی کوشش کی۔ جب کوئی حیلہ کارگر نہ ہوا تو اُس نے اپنے ترکش کا آخری تیر نکالا۔ اور نہایت بے تکلفی سے "ڈبنی" سے کہا "اگر تم مان جاؤ۔ تو جرمن افسر تمام عمر اس واقعہ پہ فخر کرے گا۔ اور کہا کرے گا۔ کہ مجھے ایک ایسی نازنین نے سرفراز فرمایا ہے۔ جو اپنی مثال آپ ہے۔ اور جو تمام جرمن عورتوں سے حسین ہے"۔

"ڈبنی" نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجروح ہو کر اُس سے الگ ہو گئی۔ اور دوسری عورتوں سے جا ملی۔ سرائے پہنچکر وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی۔ اور بہت دیر تک باہر نہ نکلی۔ اس کے رفقائے سفر گھبرا گئے کہ اگر وہ اب بھی اپنی ہٹ پہ قائم رہی۔ تو کوئی چارۂ کار نہیں۔

کھانے کا وقت آیا۔ سب اُس کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن بے سود اتنے میں سرائے والے نے آکر کہا "آپ کھانا کھائیے۔ ان کی طبیعت ناساز ہے۔" سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ کاؤنٹ نے آہستہ سے موسیو فالنوی سے پوچھا "سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا؟" اس نے کہا "ہاں" کاؤنٹ نے دوسروں کو بتانا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن اس کے چہرے سے حقیقت کا اظہار ہو گیا۔ اس پر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور کھلائے

ہوئے چہرے شگفتہ ہو گئے۔ لوئیسیو نے اچھل کر کہا۔ اس تقریب پر میں آپ سب کو شمپین کی دعوت دیتا ہوں۔ بشرطیکہ سرائے میں شمپین موجود ہو۔ اتفاق سے سرائے والے کے پاس شمپین کی چار بوتلیں نکل آئیں۔ مادام لوئیسیو نے اپنے شوہر کی فضول خرچی دیکھی تو بہت جھلائی۔ اس کے پیٹ میں رہ رہ کر مروڑ اٹھتا تھا۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مادام لوئیسیو کے سوا سب نے داد دے نوشی دی۔ اور اس کے بعد کاؤنٹ نے مادام کارے لا مادوں سے اور موسیو کارے لا مادوں نے کاؤنٹس سے اظہار محبت کیا۔ ہر فرد مسرور اور مخمور ہو گیا بے باک قہقہے نقرئی نغمے فضا میں گونجنے لگے۔

لوئیسیو نے یک لخت ہاتھ اٹھا کر کہا، "خاموش" سب حیران رہ گئے، کہ یہ کیا بات ہے۔ اس نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر ہمہ تن توجہ ہو کر چھت پہ نظریں گاڑ دیں۔ اور کوئی آواز سننے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا، "گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔" اس کے رفقاء کو یہ اشارے سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ لیکن جب اس کا مطلب کھلا۔ تو سب محظوظ ہوئے اور مسکرانے لگے۔

دس پندرہ منٹ کے بعد لوئیسیو نے پھر اسی طرح اشارے کیے اور اس عمل کو کئی بار دہرایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اوپر کی چھت والوں کو کوئی مشورہ دے رہا ہے۔ کبھی نرمی سے کہتا تھا۔ "بس کافی ہو چکی! اب مجھے جانے دو۔" پھر افسوس کرتے ہوئے کہتا تھا۔ "جمہوریت زندہ

اس نازنین کی جان لے کر چھٹے گا"۔

اگرچہ یہ حرکات انتہائی بدمذاقی کی آئینہ دار تھیں۔ لیکن شرفا اور بیاہتا عورتیں ان سے بہت لطف اندوز ہوتی رہیں۔ اور کسی مدعی اخلاق و تہذیب کو صدائے احتجاج بلند کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ سچ یہ ہے کہ تہذیب و اخلاق پر ماحول کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس سرائے کی فضا حد درجہ مکدر ہو چکی تھی۔ پھر شراب کے نشے میں مردوں کا تو کہنا ہی کیا۔ بیاہتا عورتیں بھی شرم کو بالائے طاق رکھ کر بوس و کنار کی باتیں کرنے لگیں۔

کاؤنٹ نے اس طوفانِ بے تمیزی میں اپنی وضعداری اور متانت کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہماری حالت قطب شمالی کے اُن مسافروں کی طرح ہے جن کی راہ برف باری سے بند ہو گئی ہو۔ اب خوش قسمتی سے برف کا تودہ کٹ گیا ہے۔ اور راہ صاف ہو گئی ہے"۔ لوئیسیو اس اچھوتی تشبیہ پر اچھل پڑا۔ شراب کا گلاس بلند کرتے ہوئے اُس نے کہا "میں اپنی نجات کی تقریب پر یہ گلاس پیتا ہوں"۔ سب نے اس کی تقلید کی۔ یہاں تک کہ بوڑھی راہبہ جس نے کبھی شراب کو نہ چھوا تھا۔ مفت کی شراب یہ کہہ کر غٹ غٹ پی گئی کہ یہ تو لیمونیڈ کی طرح۔ لیکن کچھ نشہ آور ہے۔

سب کو یہ حسرت رہی کہ کاش پیانو ہوتا تو گاتے بجاتے اور رقص کرتے۔

کارنوڈے اس دوران میں بالکل خاموش رہا تھا۔ اور گہری سوچ میں پڑا تھا کبھی زیادہ پریشان ہوکر اپنی لمبی ڈاڑھی کو نوچتا تھا۔ آدھی رات کے وقت جب مجلس برخاست ہونے کو تھی۔ لُوئیسیو نے شرارتاً اُسے گدگدا کر کہا آج خیریت تو ہے یا زبان بندی کا حکم ملا ہے۔ کارنوڈے نے اکڑ کر کہا "تم سب نے ایک شرمناک حرکت کی ہے۔ چُلّو بھر پانی لے کر ڈوب مرو۔" یہ کہہ کر اس نے دروازے کا رُخ کیا۔ اور باہر نکلتے وقت دوبارہ کہا! "ڈوب مرو"۔

سب کو غصہ آیا کہ اُس نے ہماری توہین کی ہے۔ بالخصوص لوئیسیو پر تو جیسے بجلی گر گئی جب کچھ سنبھلا تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اور کہنے لگا "یار! جو کہو بجا ہے۔ لیکن انگور کھٹے ہیں"۔

دوسرے اس کا مطلب نہ سمجھے۔ تو اس نے وضاحت کے لئے تمام واقعہ من و عن کہہ سنایا۔ رازِ درون پردہ سُن کر سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ لیکن کاونٹ کو یقین نہ آیا۔ اُس نے لوئیسیو سے دوبارہ سہ بارہ پُوچھا "کیا یہ سچ ہے؟" لوئیسیو نے کہا "سُنی سنائی بات نہیں۔ اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے۔ مَیں قسم کھانے کو تیار ہوں۔ طوائف نے اسی وجہ سے انکار کر دیا تھا۔ کہ جرمن کو خبر ہوئی تو فرانسیسیوں کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا۔ اب آپ سمجھے کہ کارنوڈے صاحب آج کیوں اتنے مغموم تھے۔" یہ کہکر لوئیسیو پھر ہنس پڑا۔ اور کاونٹ اور کارے لاماڈون بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ پھر مجلس برخاست

ہوئی اور سب اپنے اپنے کمروں کو چلے۔ مادام لوئیسیو نے موقع پاکر اپنے خاوند سے کہا "مادام کارے لاما دوں آج مصنوعی ہنسی ہنس رہی تھی۔ وہ تو فوجی افسروں پر مرتی ہے۔ اور اس کے لئے فرانسیسی اور جرمن کی کوئی تخصیص نہیں۔ اُسے تو ارمان ہی رہا۔ کہ جرمن نے اُسے کیوں پسند نہ کیا"۔

مخمور فرانسیسیوں کی سرگرمیاں صبح تک جاری رہیں۔ شمپین تمام رات اپنا اثر دکھاتی رہی۔ اگلی صبح گاڑی دروازے پر تیار کھڑی تھی، مسافر بھی سامان باندھ کر تیار ہو گئے۔ اب اگر کسر تھی۔ تو "دبنی" کی وجہ سے تھی وہ سب سے آخر میں شرماتی لجاتی آئی۔ اُسے دیکھ کر سب نے پیٹھ موڑ لی جیسے دیکھا ہی نہیں۔ کاؤنٹ نے اپنی بیوی کا بازو پکڑ کر اُسے ایک طرف کو ہٹا دیا۔ تاکہ نجس طوائف کہیں اُس کے لباس سے چھو نہ جائے۔ "دبنی" ایک منٹ کے لئے ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پھر دل کڑا کر کے کاؤنٹس کو سلام کیا۔ اس شریف زادی نے فرطِ غرور میں سر ہلایا اور غضب آلود نظروں سے اُس دخترِ گناہ کو دیکھا۔ دوسرے مسافر بھی اپنے اپنے کام میں اس قدر منہمک معلوم ہوتے تھے کہ کسی کو اُس سے بات کرنے کی فرصت نہ تھی۔ دوسرے اُنہیں ڈر تھا کہ اس کے ساتھ لگ کر ملوث نہ ہو جائیں۔ سب کے سب دوڑ کر فٹن میں جا بیٹھے۔ تاکہ اُنہیں اس آبرو باختہ عورت کے ساتھ نہ بیٹھنا پڑے۔ سب سے آخر میں "دبنی" اُسی جگہ آکر بیٹھ گئی۔ جہاں وہ سفر کی پہلی منزل میں

بیٹھی تھی ۔ یعنی بیاہتا عورتوں سے الگ سماج کے باغی کارنوڈے کے ساتھ ۔

بیاہتا عورتوں کے رویے سے یہ ظاہر ہوتا تھا ۔ کہ یا تو انہوں نے طوائف کو دیکھا نہیں ۔ اور اگر دیکھا ہے تو پہچانا نہیں ۔ البتہ مادام لوئیسیو نے اپنی بلند آواز میں شوہر سے کہا ،، اچھا ہوا کہ وہ بیسوا میرے پاس نہیں بیٹھی ،، فٹن آہستہ آہستہ چل دی پہلے تو سب خاموش رہے پچھلی شب کی ذلت کے بعد طوائف کی آنکھیں نہ اٹھتی تھیں اور اسے اپنے رفقائے سفر کی منافقت پر رہ رہ کر غصہ آتا تھا ۔ کہ انہی کی خاطر میں جرمن درندے کی خواہشات کے آگے جھک گئی ۔ اور یہی سب مجھے حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں ۔

کاؤنٹس اور سوداگر کی بیوی اپنی عالی نسب سہیلیوں کی باتیں کرنے لگیں ۔ اور کاؤنٹ اور موسیو کارے لامادوں سرمایہ ، سود ، منافع اور حصص کے متعلق تبادلہ خیالات کرنے لگے ۔ لوئیسو جو چلتے وقت سرائے سے تاش کا ایک دستہ چرا لایا تھا ۔ اپنی بیوی کے ساتھ بزلق کھیلنے لگا ۔ راہبہ اور اس کی چیلی تسبیح گردانی اور تسبیح خوانی میں منہمک ہو گئیں ۔ ان میں مقابلہ ہو رہا تھا کہ کس کی دعائیں جلد ختم ہوتی ہیں ۔ کارنوڈے اپنے خیالات کے سیلاب میں گم ہو گیا ۔

اسی طرح تین گھنٹے گزر گئے ۔ لوئیسو نے تاش سنبھال کر کہا ۔ ،، مجھے تو بھوک لگی ہے ،، مادام لوئیسو سرائے سے گوشت بھنوا کر ساتھ لائی

تھی۔ دونوں میاں بیوی اکٹھے کھانے لگے۔ کاؤنٹس نے اپنے شوہر سے کہا: "آؤ ہم بھی کھانا کھالیں"۔ اس نے کہا: "دیر ہی کیا ہے"۔ کاؤنٹس اور مادام کارے لاماڈوں نے سالم خرگوش پکوائے تھے۔ سرمایہ دار اپنی بیویوں کے ساتھ کھانے میں شامل ہو گئے۔ بوڑھی راہبہ نے بھی کباب نکالے اور اپنی چیلی کو دعوتِ طعام دی۔ کارنوڈے نے دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنی جیبوں سے سامانِ رسد نکالا۔ اُس کے پاس چار اُبلے انڈے اور ایک روٹی کا ٹکڑا تھا۔ وہ اپنی طبعی بے تکلفی سے انڈے کھاتا گیا۔ اور اُن کی زردی سے ڈاڑھی کو رنگین کرتا گیا۔

پچھلی رات کے ہنگامے نے "دُنبی" کی قوتِ فکر کو معطل کر دیا تھا صُبح اُسے سُدھ بُدھ نہ تھی۔ اور زادِ سفر کا خیال نہ رہا تھا۔ اپنے رُفقا کو دادِ اکل و شرب دیتے دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ غصے سے دیوانی ہو گئی تھی۔ اس نے ان منافقوں کی کمینگی واشگاف کرنے کے لئے منہ کھولا۔ جی چاہتا تھا کہ گالیوں کا ایک تار باندھ دے۔ لیکن جذبات کے اُمڈے ہوئے طوفان نے زبان بند کر دی۔ کسی نے اس کی پروا نہ کی۔ اور نہ اس کی طرف دیکھا۔ وہ ان کمینوں کے رفیقے سے زندہ درگور ہو رہی تھی۔ ان شریف کمینوں نے اُسے قربانی کا دُنبہ سمجھ کر ہوس رانِ جرمن کے حوالے کر دیا تھا۔ اور اب ایک نجس مُردار کی طرح ایک طرف کو پھینک دیا۔ وہ اس خیال سے جل رہی تھی کہ چند دن پہلے انہی مہذب وحشیوں نے اُس کے دیگچے پر خوانِ یغما کی طرح ہاتھ صاف کیا

تھا۔ اس کی بھنی ہوئی مرغیوں کو چٹخارے لے لے کر کھایا تھا اور اس کی شراب کو شیر مادر سمجھ کر اپنے اوپر حلال کیا تھا۔ بہت مشکل سے اپنے غصے کو دبایا۔ مگر آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ضبط کرنے کی بہت کوشش کی لیکن آنسو تھمنے ہی میں نہ آتے تھے۔ اس کے سُرخ رُخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ آنسوؤں کے قطرے اس کی پلکوں اور رُخساروں پر چمکنے لگے۔ اور چند قطرے اس کے لباس پر ڈھلک آئے۔ اُس نے آنسو پونچھ کر دوسروں سے اپنی حالت چھپانا چاہی لیکن کاؤنٹس نے دیکھ لیا۔ اور اپنے شوہر کو آگاہ کیا۔ اُس نے اس طرح سر ہلایا گویا ہمیں اس سے کیا؟ ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟ مادام لوئیسیو نے طنزاً کہا۔ "یہ اشکِ ندامت ہیں"۔ راہبہ عورتوں نے بچے کھچے کباب احتیاط سے کپڑے میں لپیٹ لئے اور عبادت میں مشغول ہو گئیں۔ کارنوڈے انڈے ہضم کر رہا تھا۔ اُس نے پاؤں پھیلائے اور انقلابی گیت گانے لگا۔ جمہوری ترانہ سُن کر سرمایہ دار جھلا اٹھے۔ اور آستینیں چڑھا کر لڑنے کو تیار ہو گئے۔ لیکن کارنوڈے بے خوف وخطر گاتا گیا ؎

کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

ہلا دو۔ ہلا دو

آزادیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ   جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

مٹا دو۔ مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
جلا دو - جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
اُٹھا دو - اُٹھا دو

برف جم کر سخت ہوگئی - توفان زیادہ تیزی سے چلنے لگی۔ کارنوڈے کا گانا زیادہ بلند ہوگیا۔ جتنی دیر سفر جاری رہا۔ وہ اس انقلابی گیت سے ارادتاً شرفاء کی سمع خراشی کرتا رہا۔ گویا ان کے متکبرانہ رویے کا انتقام لے رہا ہے۔ وہ اس گیت کا ہر مصرع اور ہر لفظ ایک میخ کی طرح ان کے دماغ میں ٹھونک دینا چاہتا تھا - اس دوران میں "ڈبنی" لگاتار روتی رہی - اور جب کارنوڈے گاتا گاتا رک جاتا تھا۔ تو اس بد قسمت عورت کی دلخراش آہیں تاریک میں سنائی دیتی تھیں +

آخری سبق

اُس روز صبح میں بہت دیر میں اسکول روانہ ہُوا تھا۔ اور دل ہی دل میں سہم رہا تھا۔ کہ ماسٹر صاحب آج ضرور بگڑیں۔ اور برسیں گے زیادہ ڈر اس خیال سے تھا۔ کہ مسیو ہیمل نے کہہ رکھا تھا۔ کہ آج وہ ہم سے گردانیں سنیں گے۔ اور میری یہ کیفیت تھی۔ کہ ان کا ایک لفظ بھی یاد نہ تھا۔ ذرا دیر کو یہ خیال میرے دل میں آیا۔ کہ بھاگ چلوں۔ اور آج کا دن کہیں ادھر ادھر پھر کر گزار دوں۔ سردیوں کا ہلکا ہلکا گرم اور روشن دن تھا۔ بن کے کنارے چڑیاں درختوں پر بیٹھی چہچہا رہی تھیں۔ چکی کے پچھواڑے کھلے میدان میں جرمن سپاہی قواعد کر رہے تھے۔ یہ چیزیں گردانوں سے زیادہ رُومان انگیز تھیں۔ لیکن میں دل کا اتنا کمزور نہ تھا۔ کہ ان خواہشوں پر غالب نہ آسکتا۔ چنانچہ میں جلدی جلدی قدم اٹھا کر اسکول روانہ ہوگیا۔

میں ٹاؤن ہال کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ تو میں نے دیکھا کہ جس تختے پر اشتہار لگائے جاتے ہیں۔ اس کے سامنے لوگوں کی ایک بھیڑ

لگی ہوئی ہے پچھلے دو سالوں سے جو بُری خبر بھی آتی تھی۔ وہ اشتہارات کے اسی تختے پر پہلے پہل پڑھی جاتی تھی۔ فوجل کونسلٹ کی خبریں اعلانات، فوجی افسروں کے احکام وغیرہ۔ چنانچہ گزرتے گزرتے میں نے سوچا "اب کیا قصہ ہوا؟"

میں بڑی پھرتی سے قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا کہ واچڑ لوہار نے جو اپنے ایک شاگرد سمیت وہاں موجود تھا اشتہار پڑھنے کے بعد پکار کر مجھ سے کہا "میاں صاحبزادے! اتنی جلدی میں کیوں ہو۔ ابھی اسکول پہنچنے کے لئے بہت وقت ہے۔" میں نے سوچا یونہی میری ہنسی اڑا رہا ہے چنانچہ میں نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اور ہانپتا ہانپتا موسیو ہیمل کے ننھے سے باغیچے میں جا پہنچا۔

عام طور پر جب اسکول میں پڑھائی شروع ہوتی تھی۔ تو ایسی گہما گہمی ہوتی جس کی آواز باہر سڑک پر سے سنائی دیتی تھی۔ کہیں ڈسک کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ کہیں سب مل کر بڑی اونچی آواز میں سبق دہراتے اور ہاتھ کان پر رکھ لیا کرتے تھے۔ کہ زیادہ اچھی طرح سنائی دے۔ ساتھ ساتھ استاد کا بھاری رُول بار بار میز پر برستا رہا کرتا تھا۔ لیکن آج ہر طرف چپ چاپ تھی۔ میرا خیال تھا کہ شور و غل میں بغیر کسی کی نظر پڑے اپنے ڈسک پر جا بیٹھوں گا۔ مجھے کیا علم تھا کہ مدرسے میں اتوار کی سی خاموشی کا عالم نظر آتا تھا۔ کھڑکی میں سے اندر جھانکا تو دیکھا کہ تمام ہم جماعت اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ چکے ہیں۔

اور موسیو ہیمل اپنے لوہے کا ہیبت ناک رُول بغل میں دبائے جماعت میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ دروازہ کھول کر سب کی نظروں کے سامنے اندر داخل ہوں۔ آپ خود تصوّر فرما سکتے ہیں۔ کہ شرم اور خوف کے مارے میری کیا حالت ہو رہی ہوگی۔

پر کچھ بھی نہ ہوا۔ موسیو ہیمل نے مجھے دیکھا۔ اور بڑی شفقت سے کہا "فرنیز میاں! اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ ہم تو تمہارے بغیر ہی سبق شروع کر دینے والے تھے"۔

مَیں جلدی سے بنچ پھلانگ کر گزرا۔ اور اپنی جگہ پر جا بیٹھا جب ڈر ذرا کم ہوا۔ اور میرے حواس درست ہو گئے۔ تو اُس وقت میں نے دیکھا کہ ماسٹر صاحب نے آج اپنا خوش نما ہرا کوٹ جھالردار قمیص اور سیاہ ریشم کی ننھی سی کامدار ٹوپی پہن رکھی ہے۔ یہ وہ لباس تھا جسے وہ صرف معائنہ یا تقسیم انعام کے روز پہنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تمام مدرسہ کچھ عجیب طرح انوکھا اور متین سا نظر آرہا تھا۔ لیکن جس بات پر مجھے سب سے زیادہ اچنبھا ہوا۔ وہ یہ تھی کہ پچھلی نشستیں جو عام طور پر خالی رہا کرتی تھیں۔ آج اُن پر ہماری طرح گاؤں کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بوڑھا ہوسر اپنی تکونی ٹوپی پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ شہر کا پرانا میئر۔ پرانا پوسٹ ماسٹر اور کئی اور لوگ بھی موجود تھے۔ ہر شخص اُداس نظر آتا تھا۔ بوڑھا ہوسر بازار سے ایک قاعدہ لے آیا۔

تھا۔ اُسے کھول کر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا تھا۔ اور اس کے مضمون پر اُس کی عینک رکھی ہوئی تھی۔

میں ان انوکھی باتوں پر حیران ہو رہی رہا تھا۔ کہ موسیو ہیمل اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور اسی متیں اور شفیق آواز سے جس میں مجھ سے بات کی تھی بولے "میرے بچو! آج میں تمہیں آخری سبق دوں گا۔ برلن سے احکام آ چکے ہیں کہ السائس اور لورین کے مدرسوں میں صرف جرمن زبان پڑھائی جائے۔ کل نیا ماسٹر آ جائے گا۔ یہ تمہارا فرانسیسی کا آخری سبق ہے۔ میں چاہتا ہوں آج تم بہت متوجہ رہو"

یہ لفظ ایسے بجلی کی طرح میرے دل پر آ کر پڑے آہ کمبختو! اسی بات کا اعلان تم نے ٹاؤن ہال کے باہر لگا رکھا تھا۔

میرا فرانسیسی کا آخری سبق! مجھے تو ابھی لکھنا بھی نہ آیا تھا۔ اب میں اور کچھ بھی نہ سیکھ سکوں گا۔ جہاں ہوں وہیں رُک کر رہ جاؤں گا۔ مجھے کتنا قلق ہوا۔ کہ اپنا سبق بھی یاد نہ کیا کرتا تھا۔ گھونسلوں سے چڑیوں کے انڈے چرانے اور دوسرے کھیلوں میں وقت کھونے نکل جاتا تھا کتابیں جو ذرا دیر پہلے میرے لئے مصیبت بن رہی تھیں اور اٹھائے نہ اٹھتی تھیں۔ گرامر اور تاریخ کی کتابیں اب ایسی پرانی دوست معلوم ہو رہی تھیں جن سے رشتہ توڑنا کسی طرح ممکن نظر نہ آتا تھا۔ اسی طرح موسیو ہیمل کی بابت یہ خیال کہ اب وہ جا رہے ہیں اور پھر کبھی نہ ملیں گے اُن کے تُند، اور اُن کی سخت مزاجی کی یاد کو دل سے مٹائے دیے رہا

تھا۔

کم نصیب شخص! اس آخری سبق کے اعزاز میں آج تو نے اپنا بہترین جوڑا پہن رکھا ہے۔ اب میں نے سمجھ لیا کہ شہر کے بوڑھے لوگ آج کیوں پچھلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ آج انہیں بھی رہ رہ کر قلق ہو رہا ہے۔ کہ زیادہ دنوں اسکول کیوں نہ گئے۔ وہ اپنے طریق پہ اس شخص کا شکریہ ادا کر رہے تھے جس نے چالیس سال تک نہایت خلوص و دیانت سے اُن کی خدمات انجام دی تھیں۔ وہ اپنی سمجھ کے مطابق اس مادرِ وطن کی تعظیم کرنے کو جمع ہوئے تھے جس کے اب وہ مالک نہ رہے تھے۔

میں سب کچھ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ اتنے میں میرا نام لیا گیا۔ اب سبق سنانے کی میری باری تھی۔ اس وقت کوئی مجھ سے میرا سب کچھ لے لیتا، اور تمام خوفناک گردانیں مجھے ایسی طرح سکھا دیتا کہ میں بلند آواز سے واضح طور پر بغیر کبھی غلطی کے انہیں دُہرا سکتا۔ لیکن چند الفاظ بول کر میں رہ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے ڈسک کو پکڑ رکھا تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ نظریں اُٹھانے کی جرأت نہ پڑتی تھی۔ موسیو ہیمل نے مجھ سے کہا "فرینز میاں! میں تمہیں بُرا بھلا نہ کہوں گا۔ تمہارا جی بُرا ہو گا۔ پھر دیکھو ہر روز تم اپنے دل میں کہتے رہے۔ کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ میں کل اپنا سبق یاد کر لوں گا۔ اور آج اُس کا کیا نتیجہ نکلا۔ آہ! السا س کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے۔ کہ وہ اپنی تعلیم کو کل پر ٹالتا رہتا ہے

اب دشمن کیا کہا کریں گے۔ کہ یہ لوگ اپنے آپ کو کہتے تو فرانسیسی ہیں لیکن انہیں فرانسیسی بولنا آتا ہے نہ لکھنا۔ لیکن ننھے بچے! اس میں صرف تیرا ہی قصور نہیں۔ ہم سب کے سب مجرم ہیں۔

"تمہارے ماں باپ کو تمہیں تعلیم دینے کا کچھ زیادہ شوق نہ تھا۔ وہ اس بات کو ترجیح دیتے تھے۔ کہ تم کسی کھیت یا چکی میں کام شروع کر دو۔ کہ گھر کی آمدنی میں تھوڑا بہت اضافہ ہو جائے۔ اور میں؟ میں بھی قصوروار ہوں۔ کئی مرتبہ بجائے اس کے کہ میں تمہیں سبق پڑھاؤں۔ میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ جاؤ میرے باغیچے کے گملوں میں پانی دے آؤ؟ جب میں مچھلی کے شکار کو جانا چاہتا تھا تو اس روز اسکول میں چھٹی نہ کر دیا کرتا تھا؟"

اسی طرح ایک بات سے دوسری بات نکالتے نکالتے موسیو ہیمل نے فرانسیسی زبان پر گفتگو شروع کر دی۔ اور کہا یہ دنیا کی سب سے پیاری سب سے واضح اور منطق کے مطابق زبان ہے۔ اس وقت اس لیے ہمیں زبان کی حفاظت اور اسے اپنے میں زندہ رکھنا ہمارا فرض ہے جو غلام قومیں اپنی زبان کو یاد رکھتی ہیں اپنے قیدخانے کی چابی گویا اُن کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ اس کے بعد موسیو ہیمل نے قواعد کی کتاب کھولی اور ہمیں سبق پڑھایا۔ میں حیران تھا کہ آج سبق کیوں دل میں اُترا چلا جا رہا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہتے بہت سہل اور آسان معلوم ہوتا تھا۔ میرا یہ بھی خیال ہے۔ کہ نہ میں نے اپنا سبق کبھی ایسی توجہ سے

سُنا تھا اور نہ کبھی اُنہوں نے ایسے صبر اور تحمل سے پڑھایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ رخصت ہو جانے سے پیشتر یہ دردمند شخص چاہتا ہے کہ جو کچھ خود جانتا ہے۔ ہمیں بھی سکھا دے۔ اور کسی طرح سب باتیں ایک ہی بار ہمارے دلوں میں اُتار دے ۔

قواعد کے بعد ہمیں خوش خطی کا سبق ملا۔ اُس روز موسیو ہیمل ہمارے لئے نئی کاپیاں لائے تھے جن میں الفاظ فرانس السا س ، فرانس السا س بڑے خوش خط لکھے ہوتے تھے۔ ہمارے ڈسک کے اُوپر ننھی ننھی چھڑیاں کھڑی کرکے کاپیاں ان پر ٹانگ دی گئی تھیں۔ اور ٹنگی ہوئی وہ ایسی معلوم ہوتی تھیں۔ گویا تمام کمرے میں ننھی ننھی جھنڈیاں لہرا رہی ہیں۔ اُس روز آپ دیکھتے کہ ہر طالب علم کس طرح اپنے کام میں مصروف تھا۔ اور جماعت میں کیسا سکوت طاری تھا۔ آواز تھی تو محض قلم کے کاغذ پر چلنے کی۔ ایک بار چند بھنورے کمرے میں گھس آنے پر کسی نے ان کا خیال بھی نہ کیا۔ ننھے بچوں نے بھی اُن کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ اپنی کاپیوں میں مچھلی پکڑنے کے کانٹوں کی تصویر ایسے انہماک سے ٹریس کر رہے تھے۔ گویا یہ بھی فرانسیسی سیکھنے کا ایک موقع تھا۔ باہر چھت کے کنگروں پر کبوتر بیٹھے ہلکے ہلکے غٹرغوں کر رہے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ لوگ کبوتروں کو بھی جرمنی میں غٹرغوں کرنا سکھائیں گے؟"

جب کبھی بھی لکھائی کے کام پر سے سر اُٹھاتا تو دیکھتا کہ موسیو ہیمل بے حس و حرکت کرسی پر بیٹھے ہیں۔ کبھی ایک چیز کو دیکھتے ہیں کبھی دوسری

کو۔ گویا یہ بات اپنے دل میں جما لینا چاہتے ہیں۔ کہ اس ننھے سے کمرے میں ہر چیز کیسی نظر آ رہی ہے۔

سوچئے تو! چالیس سال تک یہ شخص یہیں رہا تھا۔ سامنے جماعت بیٹھی رہتی تھی۔ اور دریچوں میں سے اُس کا ننھا باغیچہ نظر آیا کرتا تھا۔ ڈسکیں اور بنچ اس کی نظروں کے سامنے گھس گھس کر پرانے ہو گئے تھے۔ باغیچے میں بلوط کے پیڑ اس کے دیکھتے دیکھتے بلند ہوئے تھے۔ انگور کی بیلیں خود اُس نے اپنے ہاتھ سے لگائی تھیں دریچوں کے گرد بل کھاتی ہوئی چھت تک جا پہنچی تھیں۔ ہائے ان سب چیزوں کو چھوڑ کر چلے جانے سے اُس کا دُکھیا دل کیسا خون خون ہو رہا ہوگا۔ اوپر کی منزل میں اس کی بہن کے اِدھر اُدھر پھرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اسباب باندھنے میں مشغول تھی۔ بس اگلے دن اس شخص کو السا‌س سے رُخصت ہو جانا تھا۔

لیکن پھر بھی اس شخص میں اتنا حوصلہ تھا کہ آخری دم تک ہر سبق سُنتا رہا۔ خوشخطی کے بعد ہمیں تاریخ کا سبق ملا۔ اور اس کے بعد ننھے بچے ابجد دُہراتے رہے۔ پچھلی نشستوں پر اب بوڑھے ہوسر نے عینک لگالی تھی۔ اور اپنا قاعدہ دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر بچوں کے ساتھ ہجوں کی مشق کر رہا تھا۔ آپ موجود ہوتے تو دیکھتے کہ وہ پڑھ رہا تھا۔ اور رو رہا تھا۔ اُس کی آواز شدتِ جذبات سے کانپ رہی تھی۔ ایسی عجیب معلوم ہوتی تھی کہ کبھی ہم چاہتے ہنس پڑیں اور کبھی چاہتے کہ اس کے ساتھ مل کر رونے لگیں۔ آہ وہ آخری سبق مجھے کیسی اچھی

طرح یاد ہے۔

اتنے میں یکایک گھڑی نے بارہ بجائے۔ اُس کے ساتھ ہی جرمن سپاہیوں کے بگل کی آواز سنائی دی۔ جو قواعد سے فارغ ہو کر گزر رہے تھے موسیو ہیمل کرسی پر سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُس وقت اُن کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ مگر جیسے بلند بالا وہ اُس وقت نظر آتے تھے پہلے کبھی نظر نہ آئے تھے۔

وہ بولے "میرے دوستو! میں ——— میں" کسی چیز نے اُن کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وہ اور کچھ نہ بول سکے۔ پھر بلیک بورڈ کی طرف مڑ گئے۔ چاک کا ایک ٹکڑا لیا۔ اور اپنی پوری قوت سے کام لے کر جس قدر بڑے الفاظ میں لکھ سکتے تھے اُنہوں نے بلیک بورڈ پر لکھ دیا:۔

زندہ باد فرانس

پھر وہ رک گئے۔ اپنا سر دیوار سے ٹیک دیا۔ اور بغیر کوئی لفظ منہ سے نکالے صرف ہاتھ سے ایسا اشارہ کیا جس کے معنی تھے:۔

"اسکول بند ہو گیا۔ اب تم جا سکتے ہو"۔

جرمنی

(۱)

مجبورِ محبت :- مصنفہ تھیوڈور سٹارم - مترجمہ شرف عالم آرزو جلیلی ایم اے

(۲)

خزاں کی آمد :- مصنفہ لڈویک ٹیک - مترجمہ ٹکہ عتیق اللہ خاں

مجبورِ محبّت

(۱)

بُوڑھا آدمی

موسم خزاں میں ایک دن سہ پہر کے وقت ایک بُوڑھا آدمی عُمدہ لباس زیبِ تن کئے سڑک پر آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اُس کے جُوتوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ اور وہ سُنہرے دستے کی ایک خوبصورت چھڑی کو بغل میں دبائے ہوئے تھا۔ اُس کی آنکھیں سیاہ تھیں۔ بالکل سیاہ۔ اُن کے مقابلے میں اُس کے بال برف کی مانند سفید تھے۔ اُن سیاہ اور مخمُور آنکھوں سے جن میں اُس کا گم شدہ شباب پناہ گزیں تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ بتدریج اُس کی نگاہیں شہر کے مکانوں پر جو شام کے سنہرے کُہر میں ملفوف تھے جم گئیں۔ وہ غالباً اجنبی تھا۔ کیونکہ راہگیروں میں شاید ہی کوئی اُس کی طرف مخاطب ہوتا تھا۔ اگرچہ اکثر لوگوں کی توجہ اس کی سنجیدہ، مخمور اور سیاہ آنکھوں کی طرف

منعطف ہو جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک اونچے مکان کے دروازے
پر پہنچا۔ اور شہر پر ایک آخری نظر ڈال کر مکان کے اندر داخل ہو گیا۔
دروازے کی گھنٹی بجنے پر بیٹھک کے کمرے میں ایک سبز پردہ ہلا دیا۔ اور
اُس کے پیچھے سے ایک بوڑھی عورت کا چہرہ نمودار ہوا جس کی طرف
اُس شخص نے چھڑی سے اشارہ کیا اور کہا "ابھی لیمپ روشن نہ کرو"۔
اس پر بڑھیا نے پردہ گرا دیا۔ ہمارا اجنبی اس کمرے اور اس کے سامنے
والی کوٹھڑی میں سے گزرتا ہوا ایک دروازے کے سامنے پہنچا۔
یہاں سے سیڑھیوں کو طے کرتا ہوا وہ مکان کے بالائی حصے میں پہنچا۔
اور ایک وسیع کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں اطمینان اور راحت کا سامان
موجود تھا۔ ایک دیوار میں الماریاں نصب تھیں جو کتابوں سے بھری
پڑی تھیں۔ دوسری دیواروں پر تصویریں آویزاں تھیں۔ میز پر چند کتابیں
منتشر تھیں۔ ایک آرام کرسی بھی تھی جس پر سرخ مخمل کے گدے تھے۔
بوڑھے آدمی نے ٹوپی اتاری اور آرام کرسی پر بیٹھ کر کسی خیال میں گم
ہو گیا۔ تاریکی بتدریج بڑھتی گئی۔ اور آخر کار چاند کی روپہلی شعاعوں
نے دریچے سے داخل ہو کر ان تصویروں کو منور کر دیا۔ جو سامنے
کی دیوار پر آویزاں تھیں۔ اس شخص کی نظریں غیر اختیاری طور پر
اُن روپہلی شعاعوں کے ساتھ دیوار کی طرف گئیں۔ اور ایک چھوٹی سی
تصویر پر جم گئیں۔ جو سیاہ چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی "الزبتھ!" بوڑھے
آدمی نے آہستہ سے کہا اور اس نام کے لیتے ہی زمانہ بدل گیا۔ وہ پھر عہد

شباب میں واپس چلا گیا *

(۲)

بچپن کی دوستی

ایک ننھی سی لڑکی اُس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اُس کا نام الزبتھ تھا۔ اور اس کا سن غالباً پانچ سال کا ہو گا۔ اس وقت ہمارے اجنبی نے شاید اپنی زندگی کے دسویں سال میں قدم رکھا ہو۔ لڑکی کے گلے میں سُرخ رنگ کا ایک ریشمی رومال لپٹا ہوا تھا لڑکی کی بھوری بھوری آنکھیں اس سُرخی کے توازن سے اور بھی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ لڑکی نے کہا "رائن ہارٹ! چھٹی ہے۔ آج چھٹی ہے اور کل بھی چھٹی ہے۔ اسکول بند ہے" *

رائن ہارٹ نے بغل سے سلیٹ نکال کر دروازے کے پیچھے رکھ دی۔ اس کے بعد وہ اور الزبتھ دونوں، دوڑتے ہوئے باغ میں پہنچے۔ اور باغ کے پھاٹک سے باہر نکل کر سبزہ زار میں آگئے۔ یکایک اسکول بند ہو جانے کی وجہ سے دونوں بہت خوش تھے۔ رائن ہارٹ نے یہاں ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ہر سال گرمی کے زمانے میں یہیں رہا کرے۔ مگر ابھی اس مکان میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ رائن ہارٹ نے ہتھوڑی کانٹی اور لکڑی کے تختے لے کر ایک کرسی بنائی۔ الزبتھ سبزہ زار میں اِدھر اُدھر چند خاص قسم کے پھولوں کی

تلاش میں مصروف ہوگئی تاکہ اپنے گلے کے لئے ہار تیار کرے۔ رائن ہارٹ کرسی تیار کر چکا مگر اس وقت تک الزبتھ واپس نہ آئی۔

اس نے پکارنا شروع کیا "الزبتھ! الزبتھ!" اور وہ دوڑتی ہوئی آئی اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

"چلو ہمارا گھر تیار ہوگیا۔ تم بہت تھک رہی ہو۔ مکان کے اندر آجاؤ۔ ہم دونوں نئی کرسی پر بیٹھیں گے اور میں تمہیں کوئی قصہ سناؤں گا۔"

دونوں مکان کے اندر داخل ہوئے۔ اور نئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ الزبتھ نے گود میں سے پھل نکال کر ہار تیار کرنا شروع کیا۔ اور رائن ہارٹ قصہ بیان کرنے لگا "کسی ملک میں تین جلاہے رہتے تھے۔......"

الزبتھ نے کہا "یہ قصہ تو میں بارہا سن چکی ہوں۔ تم ہمیشہ ایک ہی قصہ دہرایا کرتے ہو۔"

رائن ہارٹ شرما کر خاموش ہوگیا۔ پھر اس نے اس شخص کا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ جو شیروں کے غار میں پھینک دیا گیا تھا۔ گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور جتنے شیر غار کے اندر تھے۔ سب محوِ خواب تھے۔ مگر کبھی کبھی وہ انگڑائی لیتے تھے۔ اور اس وقت وہ شخص ڈر جاتا تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ صبح کا وقت آرہا ہے۔ یکایک اس کے چاروں طرف روشنی ہی روشنی ہوگئی۔ اور جب اس نے غور سے دیکھا۔ تو اسے ایک فرشتہ نظر آیا۔ فرشتے نے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اور پھر لمحوں میں غائب ہوگیا۔"

الزبتھ ہمہ تن گوش ہو کر سُن رہی تھی۔ اُس نے حیرت سے کہا "فرشتہ! اُس کے پر بھی تھے؟"

رائن ہارٹ نے جواب دیا "یہ تو محض خیالی افسانہ ہے حقیقت میں فرشتوں کا وجود ہی نہیں ہے۔"

الزبتھ نے کہا "شرم کرو، رائن ہارٹ" اور حیرت سے اس کا مُنہ تکنے لگی۔ مگر جب رائن ہارٹ کے چہرے پر غصّے کے آثار نمایاں ہو گئے۔ تو الزبتھ نے مشکوک لہجے میں کہا "لوگ تو کہا کرتے ہیں۔ کہ فرشتوں کے وجود میں کچھ بھی شک نہیں ہے۔ امّاں جان خالہ جان اور پھر اسکول کے استادوں کا بھی یہی خیال ہے"۔

"مَیں نہیں کہہ سکتا کہ فرشتوں کے وجود پر انہیں کیوں یقین ہے"۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ شیر بھی واقعی کوئی جانور ہے یا نہیں؟"

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ ہندوستان میں یہ جانور کثرت سے ہوتا ہے۔ وہاں مندر کے پجاری شیر کو گاڑی میں جوتتے ہیں۔ اور اس گاڑی پر سوار ہو کر جنگل کا سفر کرتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ جوان ہونے پر ہندوستان جاؤں۔ یہ ملک ہمارے وطن سے ہزار درجے بہتر ہے وہاں جاڑا کبھی نہیں ہوتا۔ تم بھی میرے ساتھ چلو گی ــــ چلو گی نا؟"

ضرور چلوں گی۔ مگر میری والدہ بھی ساتھ جائیں گی۔ اور تمہاری والدہ کو بھی چلنا ہوگا"۔

رائن ہارٹ نے کہا "نہیں وہ تو اس وقت تک بہت ضعیف ہو

جائیں گی۔ وہ نہیں جا سکیں گی"۔

"میں تنہا جانے کی ہمت نہیں کر سکتی"۔

"لیکن تمہیں ہمت کرنی چاہیے۔ اُس وقت تک تم میری بیوی بن جاؤ گی۔ اور تم کو کوئی بھی کچھ کہہ نہ سکے گا"۔

"میری والدہ میری جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں گی"۔

رائن ہارٹ نے غصے میں آ کر کہا۔ "ہم پھر واپس آ جائیں گے۔ صاف صاف کہہ دو کہ تم میرے ساتھ ساتھ سفر کرنا چاہتی ہو یا نہیں؟ ورنہ میں تنہا چلا جاؤں گا۔ اور پھر کبھی واپس نہ آؤں گا"۔

الزبتھ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ اور اس نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھ کو اس طرح گھور کر نہ دیکھو۔ میں تمہارے ساتھ ہندوستان ضرور چلوں گی"۔

خوشی کے جوش میں رائن ہارٹ نے الزبتھ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور سبزہ زار کی طرف دوڑا اور ناچ ناچ کر گانے لگا۔ "جائیں گے ہم ہندوستان۔ ہندوستان جائیں گے ہم۔

ہندوستان آآآں۔ آآآآ ہندوستان۔

ہم جا آ آ آئینگے۔ ہم جائیں گے ہندوستان۔

ہم . . . ."

گاتے گاتے وہ یکایک خاموش ہو گیا۔ اور الزبتھ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور پھر اس نے الزبتھ سے کہا "مگر کیا فائدہ؟ تم بہت پست ہمت ہو"۔

باغ کے پھاٹک سے کوئی پکار رہا تھا: "الزبتھ! رائن ہارٹ!"

دونوں نے جواب دیا: "ابھی آئے۔ بس آ ہی رہے ہیں" اور ایک دوسرے کی گردن میں اپنے ہاتھ حمائل کئے اچھلتے۔ کودتے مکان کے اندر داخل ہو گئے۔

اس طرح یہ دونوں اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی الزبتھ بہت مغموم ہو جاتی اور رائن ہارٹ حد سے زیادہ خوش و خرم رہتا۔ مگر باوجود اس کے دونوں میں کبھی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ فرصت کے اوقات دونوں ساتھ ہی گزارتے تھے موسم سرما میں مکان کے اندر ہی اور گرمی کے زمانے میں سبزہ زاروں اور میدانوں میں۔ ایک دفعہ جب رائن ہارٹ کی موجودگی میں اسکول کے استاد نے الزبتھ پر غصے کا اظہار کیا۔ تو رائن ہارٹ نے سلیٹ اٹھا کر میز پر دے ماری۔ کہ شاید استاد اس کی اس حرکت سے خفا ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اور الزبتھ کو استاد کے عتاب سے نجات ملے۔ لیکن استاد کی توجہ رائن ہارٹ کی طرف منعطف نہ ہوئی۔ گویا اس نے سلیٹ کے گرنے کی آواز سنی ہی نہیں۔ رائن ہارٹ کو اس دن جغرافیہ کے سبق میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ بلکہ اس نے ایک طویل نظم لکھی جس میں اس نے اپنے کو ایک عقاب کا بچہ تصور کیا تھا۔ استاد کو سیاہ کوّے سے تشبیہ دی تھی۔ اور الزبتھ کو قمری قرار دیا تھا عقاب کے بچے نے قسم کھائی تھی کہ طاقتِ پرواز ہو جانے پر کوّے سے خوفناک انتقام لے گا۔ نظم لکھنے کے بعد نوجوان شاعر کی آنکھوں

سے آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگے۔ اور وہ بہادری اور جانبازی کے خواب دیکھنے لگا۔ گھر پہنچ کر اُس نے بیاض میں اس نظم کو خوبصورت حرفوں میں لکھا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد وہ دوسرے اسکول میں چلا گیا۔ وہاں اُس نے اپنے ہم سن لڑکوں سے دوستی پیدا کرلی۔ لیکن پھر بھی الزبتھ سے دوستانہ تعلقات حسب دستور قائم رہے۔

اب وہ اِن قصّوں کا ایک مجموعہ لکھنے لگا جنہیں وہ اکثر الزبتھ کو سنایا کرتا تھا۔ اُس کی خواہش ہوتی تھی کہ ان قصّوں میں اپنے خیالات کا بھی اظہار کرے۔ مگر وہ ناکام رہتا تھا۔ اس کی وجہ وہ خود نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے ان قصّوں کو وہ بجنسہٖ لکھ ڈالتا تھا۔ جیسا کہ اس نے خود دوسروں سے سُنا تھا۔ اس مجموعہ کو اُس نے الزبتھ کے حوالے کر دیا۔ اور اُس نے اس کو اپنے صندوق میں حفاظت سے بند کر دیا۔ رائن ہارٹ یہ سُن کر بے حد خوش ہوتا کہ کبھی کبھی الزبتھ اس مجموعہ کے بعض افسانے اپنی ماں کو سنایا کرتی تھی۔

سات سال گزر گئے۔ رائن ہارٹ اپنی تعلیم کے سلسلے میں شہر سے باہر جانے والا تھا۔ الزبتھ اس خیال کو اپنے ذہن میں نہیں آنے دینا چاہتی تھی کہ رائن ہارٹ سے جدائی کا وقت عنقریب آنے والا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئی جب رائن ہارٹ نے اس سے وعدہ کیا۔ کہ میں تمہارے لئے اب بھی افسانے لکھتا رہوں گا۔ اور جب کبھی اپنی والدہ کو خط لکھوں گا۔ تو کوئی نہ کوئی افسانہ تمہارے لئے ضرور بھیجوں گا۔ اس

کے عوض، تم خط کے جواب میں ان افسانوں پر تنقید کیا کرنا۔ رائن ہارٹ کی روانگی کا وقت قریب آنے لگا۔ مگر اس سے قبل ہی اُس کی بیاض میں متعدد نظموں کا اضافہ ہو گیا۔ بیاض کے وجود کی الزبتھ کو خبر نہ تھی۔ اگرچہ خود اسی کی وجہ سے رائن ہارٹ نے نظم لکھنا شروع کیا تھا۔

(۴)
جنگل میں منگل

جون کا مہینہ تھا۔ دوسرے دن رائن ہارٹ روانہ ہونے والا تھا۔ اُس کے دوستوں نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے جانے سے قبل بزم عیش و طرب گرم ہو۔ تاکہ سب کو اس سے آخری بار ملنے کا موقع ملے۔ یہ طے پایا کہ قریب کے جنگل میں جا کر جشن منایا جائے۔

گاڑیوں پر سوار ہو کر وہ جنگل کے کنارے پہنچے۔ اور وہاں سے کھانے پینے کی چیزوں کو ٹوکریوں میں لے کر وہ پیدل چلنے لگے۔ ان کے سامنے تھوڑے فاصلے پر درختوں کی کئی قطاریں تھیں۔ اُن سے گزرتے ہوئے اور آدھ گھنٹے تک اِدھر اُدھر گشت لگانے کے بعد یہ سب ایک سبزہ زار میں پہنچے۔ بہت ہی خوش نما منظر تھا۔ کہیں کہیں آفتاب کی سنہری کرنیں درختوں کے جھنڈ کو چیرتی ہوئی سطح زمین سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ درختوں پر گلہریاں اِدھر سے اُدھر اچکتی پھرتی تھیں۔ ایک جگہ درختوں کی شاخوں نے مل کر محراب کی شکل اختیار

کرلی تھی۔ یہیں سب آ کر ٹھہر گئے۔ ایک بوڑھا آدمی اس "یومِ تفریح" کا صدر مقرر کیا گیا۔ اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔ "نوجوانو! میری بات غور سے سنو۔ تم میں سے ہر شخص کو دو سوکھی روٹیاں کھانے کو ملیں گی کیونکہ ہم مکھن لانا بھول گئے۔ ان سوکھی روٹیوں کے ساتھ کھانے کی کوئی چیز تمہیں خود مہیا کرنی ہوگی۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر سٹرا بیری کے درخت ملیں گے۔ بشرطیکہ تم انہیں ڈھونڈ نکالو۔ جو کوئی ان درختوں کا پتہ نہ لگا سکے گا۔ اُسے سوکھی روٹی کھانی پڑے گی۔ دنیا کا یہی دستور ہے۔ تمہاری بدقسمتی ہوگی اگر تم ناکام واپس آئے۔ غالباً تم نے میرا مطلب سمجھ لیا ہوگا؟"

نوجوانوں نے یک زبان ہو کر کہا "ہاں ہاں! بالکل درست ہے۔"

"ابھی تم سے کچھ اور کہنا ہے۔ ہم ضعیفوں نے اپنے شباب میں بہت زحمتیں اٹھائی ہیں۔ اس لئے ہم لوگ آج گھر ہی پر رہیں گے۔ یعنی ان درختوں کے سائے کے نیچے جب تک تم واپس آؤ ہم لوگ آلو کی ترکاری بنائیں گے۔ دسترخوان بچھائیں گے۔ اور بارہ بجے کے قریب انڈے بھی اُبال لیں گے۔ ان خدمتوں کے عوض تم سٹرابیری کا حصہ ہمیں دے دو گے۔ اب میں تمہیں کافی ہدایتیں دے چکا ہوں۔ بس روانہ ہو جاؤ۔ پُورب۔ پچھم۔ جدھر جی چاہے چلے جاؤ۔ اور اپنی پھرتی اور چالاکی کا ثبوت دو۔"

نوجوانوں نے اس تجویز کو پسند کیا اور جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

رائن ہارٹ نے کہا "آؤ الزی مجھے سٹرابیری کے درختوں کا پتہ معلوم ہے۔ تمہیں سوکھی روٹی کھانی نہ پڑے گی"۔

الزبتھ نے اپنی ٹوپی کے سبز فیتوں کو گرہ دے کر اپنے بازو پر لٹکا لیا۔ اور بولی "چلو۔ رائن ہارٹ۔ دیکھو۔ ٹوکری تیار ہے"۔

وہ جنگل میں چلے گئے۔ گھنے اور تاریک جنگل میں، جہاں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف اوپر ہوا میں باز کے چیخنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر اُن کا گزر جھاڑیوں سے ہوا۔ جہاں رائن ہارٹ کو راستہ بنانے کے لئے جنگلی پودوں کی شاخوں کو توڑنا پڑتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کے کانوں میں آواز آئی "رائن ہارٹ! رائن ہارٹ!" آواز الزبتھ کی تھی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا کہ الزبتھ پیچھے رہ گئی ہے۔ اور کانٹوں اور جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ واپس گیا اور اُسے جھاڑیوں سے نکال کر کھلی جگہ میں لے آیا۔ یہاں تیتریاں پرواز کر رہی تھیں۔ ایک پھول سے دوسرے پھول پر ——— آزاد و بے پروا ——— رائن ہارٹ نے الزبتھ کے بالوں کو سلجھایا اور بڑے اصرار کے بعد اُس کی ٹوپی پہنا دی۔

الزبتھ نے پوچھا "مگر سٹرابیری کہاں ہے"؟

رائن ہارٹ نے جواب دیا "ملنے کی جگہ تو یہی تھی۔ لیکن ہمارے آنے سے قبل شاید پریوں یا جانوروں نے پھلوں کو کھا لیا ہے"۔

الزبتھ نے کہا "ہاں۔ درختوں میں سٹرابیری کا ایک دانہ بھی نظر

نہیں آتا۔ مگر پریوں کا تذکرہ نہ کرو۔ چلو ادھر کہیں چل کر تلاش کریں
میں ابھی تکان نہیں محسوس کرتی"۔

سامنے چھوٹا سا چشمہ تھا۔ اس کے بعد پھر جنگل۔ رائن ہارٹ
الزبتھ کو کندھے پر چڑھا کر اس پار لے گیا۔ جنگل کا کچھ حصہ طے کرنے
کے بعد وہ ایک وسیع سبزہ زار میں پہنچ گئے۔

الزبتھ نے کہا "یہاں سٹرابیری تلاش کرو۔ بھینی بھینی خوشبو آ
رہی ہے"۔

انہوں نے بہت تلاش کی۔ مگر ناکام رہے۔

رائن ہارٹ نے کہا "یہ خوشبو کسی دوسری چیز کی ہے"۔

راسبری کے پودے کثرت سے ادھر ادھر نظر آتے تھے۔ درمیان
سبزہ زار تھا۔ اور اس کے بعد پھر پودوں کی قطاریں۔

الزبتھ نے کہا۔ "یہ بہت تنہا مقام ہے۔ باقی لوگ معلوم نہیں
کدھر چلے گئے؟"

رائن ہارٹ نے واپس جانے کے راستے پر غور نہیں کیا تھا۔
اُس نے الزبتھ سے پوچھا "ہوا کس سمت کو چل رہی ہے؟" اور
ہاتھ کو سر کے اوپر ہلا کر ہوا کا رُخ دریافت کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن
اس وقت ہوا ساکن تھی۔

الزبتھ چیخ اُٹھی "سنو! میں نے کچھ آوازیں سُنی ہیں! اِس طرف ..."
رائن ہارٹ نے چیخ کر کہا۔ "یہاں آؤ"۔

جواب ملا۔ "یہاں آؤ"۔

"الزبتھ نے خوش ہو کر کہا۔ "انھوں نے تمہاری آواز سن لی"۔

"نہیں۔ یہ تو میری ہی آواز کی بازگشت تھی"۔

الزبتھ نے رائن ہارٹ کے قریب آکر کہا۔ "مجھے تو ڈر لگتا ہے"۔

رائن ہارٹ نے کہا۔ "نہیں۔ تمہیں ڈرنا نہ چاہیئے۔ کیسا پر فضا مقام ہے۔ آؤ درختوں کے سائے میں بیٹھ کر تھوڑی دیر آرام کریں۔ ہم لوگ راستہ نہیں بھول سکتے۔ تمہاری پریشانی فضول ہے"۔

الزبتھ ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئی۔ اور خاموشی سے ہر سمت آنے والی آوازوں پر غور کرنے لگی۔ رائن ہارٹ درخت پر چڑھ کر ایک مضبوط شاخ پر بیٹھ گیا۔ اور الزبتھ کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا۔ آفتاب نصف النہار پر تھا۔ دھوپ میں تمازت تھی۔ نیلے اور سنہرے رنگ کی ننھی ننھی مکھیاں ہوا میں بھنبھناتی پھرتی تھیں۔ کبھی کبھی ہُد ہُد اور دوسری چڑیوں کی چیخ پکار ادھر اُدھر سے سنائی دیتی تھی۔

الزبتھ نے کہا۔ "سنو گھنٹہ بج رہا ہے"۔

"کہاں؟"

"ہمارے سامنے ــــــ تم سن رہے ہو؟ ــــــ بارہ بج چکے"۔

"جب تو شہر اُسی طرف ہے جہاں سے گھنٹے کی آواز آرہی ہے۔ اگر ہم اس سمت کو چلیں تو دوسروں کے ساتھ مل جائیں گے"۔

دونوں شہر کی طرف واپس چلے۔ انہوں نے مایوس ہو کر سٹرابیری کی تلاش چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ الزبتھ پریشان ہو گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ دوستوں کی محفل کے قریب پہنچ گئے۔ قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ زمین پر ایک سفید چادر بچھی ہے۔ یہی چادر کھانے کی میز تھی۔ چادر پر سٹرابیری کافی مقدار میں تھی۔ بوڑھا صدر تقریر کر رہا تھا۔ اور کباب کے ٹکڑے سیخ سے نکال کر کھاتا بھی جاتا تھا۔

الزبتھ اور رائن ہارٹ کو آتے دیکھ کر سب چیخ اُٹھے "قافلے سے بھٹکے ہوئے مسافر آ گئے"۔

بوڑھے صدر نے کہا: "چلو اپنے رومال کھولو۔ اور جو کچھ تم لائے ہو میز پر رکھ دو۔ کہو تم کیا لائے ہو؟"

رائن ہارٹ نے جواب دیا: "صرف بھوک اور پیاس ساتھ لائے ہیں"

صدر نے کہا: "اگر یہ بات ہے تو پھر تم بھوکے ہی رہو گے۔ یہاں ناکاروں کو غذا نہیں ملتی۔ تم تو شرائط سے اچھی طرح واقف ہو"۔

لیکن آخر اُسے رحم آیا اور الزبتھ اور رائن ہارٹ کو بھی کھانا ملا۔ سب خوش ہو کر کھانے لگے۔ ساتھ ساتھ گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ اور کبھی کبھی قہقہے بھی بلند ہو جاتے تھے۔ جھاڑیوں میں سے خوش الحان پرندوں کے نغمے کی آواز آ رہی تھی۔

دن اسی طرح گزرا۔ آج کی صحرا نوردی میں رائن ہارٹ کو بھی

کچھ مل ہی گیا۔ اگرچہ سٹرابیری نہیں ملی۔ مگر اُس چنیر نے بھی اسی جگہ میں نشوونما پائی تھی۔ مکان واپس آکر اس نے اپنی بیاض میں لکھا:۔

جنگل کی شہزادی

"ہوا ساکت ہے۔ اِس خاموش و پُرامن وادی میں درختوں کی شاخیں جھول رہی ہیں۔

ایک حسین دوشیزہ درختوں کے نیچے بیٹھی ہے۔

وہ خوشنما جھاڑیوں سے گھری ہوئی ہے۔

فضا میں جنگلی پھولوں اور پودوں کی خوشبو پھیل رہی ہے۔

حسین سُنہری مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔

چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہے۔

اس کے بالوں کو سورج کی سنہری کرنیں چوم رہی ہیں۔

دُور سے کوئل کی کوک سُنائی دیتی ہے۔

اور اِس سہانے منظر میں۔

یہ حسین دوشیزہ جنگل کی شہزادی معلوم ہوتی ہے"۔

آج اُس کی زندگی میں انقلاب عظیم کا دن تھا۔ ایسا انقلاب جسے وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا۔ اگر کوئی اُس کی حالت پوچھتا تو وہ بیان نہ کر سکتا تھا اور زبانِ حال سے صرف اتنا کہہ دیتا کہ

"مرے جذبات کی دُنیا زمانے سے نرالی ہے"

(۴۱)

کرسمس

کرسمس کا دن آگیا۔ سہ پہر کے وقت رائن ہارٹ اور چند دوسرے طلبا ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چراغ روشن تھے۔ کیونکہ کمرہ ذرا تاریک تھا۔ لیکن بہت کم لوگ آئے تھے۔ ہوٹل کے ملازم دیوار سے ٹیک لگا کر خاموش کھڑے تھے۔ ایک گوشے میں ایک گویا بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ جسے بیلہ بجانے میں کمال حاصل تھا۔ وہ صورت تصویر خاموش بیٹھی تھی۔

طلبا کی میز پر شراب کی بوتل کھلی ...... ایک خوش رُو نوجوان نے اُس لڑکی کی طرف شراب کا پیالہ بڑھا کر کہا "تمہارے صدقے! آج ایک جام تم بھی پی لو"

اُس نے خاموشی اور متانت سے جواب دیا "میں نہیں پی سکتی"

نوجوان نے کہا "نہیں پی سکتیں تو گا نا گاؤ" اور لڑکی کی گود میں ایک روپیہ پھینک دیا۔ لڑکی اپنے گیسو سنوارنے لگی۔ اور مغنّی نے اُس کے کان میں کچھ کہا۔ مگر اُس نے سر ہلا کر جواب دیا "میں اِس شخص کی فرمائش پر نہیں گاؤں گی"

رائن ہارٹ اپنا گلاس ہاتھ میں لئے ہوئے لڑکی کے پاس پہنچا۔ لڑکی نے تُرش رُو ہو کر پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟"

رائن ہارٹ نے کہا۔ "تمہاری آنکھیں دیکھنا چاہتا ہوں" ؁

"میری آنکھوں سے تمہیں کیا تعلق"؟

رائن ہارٹ نے خشمگین نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا "میں جانتا ہوں کہ تمہاری آنکھیں جھوٹی ہیں، قتالہ ہیں، خونخوار ہیں" ؁

لڑکی محوِ حیرت ہو کر رائن ہارٹ کو دیکھنے لگی ؁

رائن ہارٹ نے شراب کے پیالے کو اپنے منہ سے لگا کر کہا "تمہاری خوبصورت اور موذی آنکھوں کا جامِ صحت" اور شراب پینے لگا ؁

لڑکی نے ہنس کر کہا "جام مجھے دے دو" اور اپنی سیاہ آنکھوں کو رائن ہارٹ کے مقابل کر کے، گلاس میں جتنی شراب بچ گئی تھی، پی گئی اس کے بعد اُس نے گہری اور دردناک آواز میں گانا شروع کیا۔

میری چشم خونفشاں ہے دردِ دل کی رازداں
خونِ دل آنسو بن کر حالِ دل کرتا ہے بیاں
جانتی ہوں کہ یہ کل تک نہیں رہنے والا — حُسن پر اپنے نہیں ناز کبھی کرتی ہوں
مجھ کو معلوم ہے تم بھول مجھے جاؤ گے — پھر بھی میں صبح و مسا یاد تمہیں کرتی ہوں
غم کی ماری میں دُکھیاری کوئی نہ میرا ہوئے
میری چشم خونفشاں ہے دردِ دل کی رازداں
میری چشم . . . . "

لڑکی گا رہی اور مغنی بیلہ بجا رہا تھا۔ مجمع پر خاموشی چھائی تھی۔ رائن ہارٹ پر عجیب قسم کا کیف طاری تھا۔ اتنے میں ایک شخص

ہوٹل کے اندر داخل ہوا۔

اُس نے کہا "رائن ہارٹ! میں تمہارے ساتھ یہاں آنا چاہتا تھا مگر تم پہلے ہی سے آ چکے ہو۔ ہاں! تمہارے مکان پر کرسمس کی تیاری ہو رہی ہے"۔

رائن ہارٹ نے متعجب ہو کر کہا "کرسمس! اب میں کرسمس کی خوشیاں منانے کے لائق نہیں رہا"۔

"مگر تمہارے کمرے میں سے تو کرسمس کیک کی خوشبو آ رہی تھی"۔

رائن ہارٹ نے گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ اور اپنی ٹوپی اُٹھا لی۔ لڑکی نے دریافت کیا۔ "تم کہاں چلے"؟

"ابھی واپس آتا ہوں"۔

لڑکی کی پیشانی پر بل پڑ گیا۔ اُس نے خاص انداز سے میٹھے اور سُریلے لہجے میں کہا "ٹھہر جاؤ"۔

رائن ہارٹ نے پس و پیش کے بعد کہا "میں نہیں ٹھہر سکتا"۔

لڑکی نے قہقہہ لگایا اور رائن ہارٹ کو دھکا دے کر دروازے کی طرف بڑھا دیا اور کہا "جاؤ، تم ناکارہ ہو۔ تم میں سے کوئی بھی کسی قابل نہیں"۔

لڑکی علیحدہ جا کر بیٹھ گئی۔ اور رائن ہارٹ آہستہ آہستہ ہال سے باہر نکلنے لگا۔

باہر نکل کر وہ بہت مسرور ہوا۔ ابھی شفق کی روشنی باقی تھی۔ ہوا کے

سرد جھونکے چل رہے تھے۔ مکانوں کی کھڑکیاں روشنی سے جگمگا رہی تھیں۔ کہیں سے سیٹی اور ٹین کا ڈھول بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں کہیں سے بچوں کے کھیلنے کا شور وغوغا سنائی دیتا تھا۔ سڑک پر ننھے ننھے غریب بچوں کی کثرت تھی۔ جو دربدر مارے مارے پھرتے تھے۔ اکثر یہ کسی مکان کے سامنے کھڑے ہو کر اندرونی ساز و سامان کی جھلک سے ہی اپنی طبیعت خوش کر لیتے۔ کیونکہ وہ مکان کے اندر جا کر کرسمس کی چہل پہل میں حصّہ نہ لے سکتے تھے۔ کبھی کوئی دروازہ کھلتا اور دربان کی کرخت آواز ان ننھے مہمانوں کو سڑک پر بھگا دیتی۔ ایک جگہ سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ مگر راتن ہارٹ کی توجہ کسی چیز کی طرف منعطف نہ ہوتی۔ وہ تیزی سے اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا۔ جب وہ اپنے مکان پر پہنچا تو بالکل اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ سیڑھیوں کو ٹٹولتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ اور دھیمی دھیمی خوشبو محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنا گھر یاد آ گیا۔ کہ کرسمس کے دن اس کی ماں کے کمرے میں ایسی ہی خوشبو ہوتی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے لمپ روشن کیا۔ میز پر ایک پارسل رکھا ہوا تھا۔ اس نے پارسل کھولا۔ وہی کرسمس کیک جو اسے بہت مرغوب تھے۔ اور جنہیں وہ کبھی نہ بھول سکتا تھا۔ پارسل میں موجود تھے۔ ان میں سے اکثر پر اس کا نام لکھا تھا۔ روشنائی سے نہیں بلکہ چینی کے شیرے کے حروف کیک پر جما دیئے گئے تھے۔ پارسل کے اندر چند رومال، دستانے اور دو خط بھی ملے۔ ایک خط اس کی ماں نے لکھا تھا۔ اور دوسرا الزبتھ نے۔

رائن ہارٹ نے الزبتھ کا خط پہلے کھولا اور پڑھنے لگا۔ الزبتھ نے لکھا تھا۔

کیک پر جو خوبصورت حروف لکھے ہیں۔ انہوں نے تم کو بتا دیا ہوگا۔ کہ کیک کس نے تیار کیا۔ اُسی نے ان رومالوں کو بھی بنایا۔ اس دفعہ کرسمس کا دن یہاں خاموشی سے گزریگا۔ والدہ ہمیشہ ساڑھے نو بجے شب تک چرخہ کاتنے سے فارغ ہو جاتی ہیں۔ میں تنہائی محسوس کرتی ہوں۔ تمہاری عدم موجودگی شاق گزرتی ہے۔ تم نے جو لنٹ مجھے دیا تھا۔ وہ پچھلے اتوار کو مر گیا۔ میں دیر تک روتی رہی۔ کیونکہ مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ ہر روز سہ پہر کے وقت گایا کرتا تھا۔ تم تو جانتے ہو۔ کہ والدہ اکثر اس کے پنجرے پر کپڑا ڈال دیتی تھی۔ تاکہ وہ خاموش رہے۔ اب تو وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس لئے گھر میں اور بھی سناٹا چھایا رہتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی تمہارا دوست ایرک ہم لوگوں سے ملنے آیا کرتا ہے۔ تم نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ کہ وہ اپنے بھورے رنگ کے اوورکوٹ سے مشابہ ہے جب کبھی میرے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے دیکھتے ہی مجھے یہ تشبیہ بے ساختہ یاد آ جاتی ہے۔ واللہ۔ کیسی مضحکہ خیز تشبیہ ہے۔ مگر کبھی والدہ صاحبہ سے نہ کہہ دینا ممکن ہے کہ اُن کو بُرا معلوم ہو۔ اچھا ذرا سوچو تو سہی کہ میں تمہاری والدہ کو کرسمس میں کیا تحفہ دونگی! انہیں سوچ سکتے۔ ان کا تحفہ میں خود ہی ہوں۔ ایرک میری تصویر سیاہ کھلی سے

تیار کر رہا ہے۔ اس تصویر کے لئے میں تین دفعہ بیٹھ چکی ہوں۔ ہر بار کم سے کم ایک گھنٹہ بیٹھنا پڑا تھا۔ مجھے یہ تجویز پسند نہ تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی۔ کہ کوئی اجنبی میرا چہرہ اس قدر گھور گھور کر دیکھے کہ میرے خدوخال کا خاکہ اس کے ذہن میں اتر جائے۔ لیکن میری والدہ نے مجبور کیا۔ انہوں نے کہا۔ کہ تصویر دیکھ کر مسٹر ورنر بہت خوش ہوں گی۔

"لیکن، وائن ہارٹ! تم اپنا وعدہ نہیں وفا کر رہے ہو۔ اب تک تم نے کوئی افسانہ نہیں بھیجا۔ میں نے اکثر تمہاری والدہ سے شکایت بھی کی۔ انہوں نے کہا کہ تم کسی زیادہ اہم کام میں مشغول ہو گئے۔ مگر میں نہیں یقین کر سکتی۔ تمہاری خاموشی کی وجہ کچھ اور ہی معلوم ہوتی ہے"!

اس کے بعد وائن ہارٹ نے اپنی ماں کا خط پڑھا۔ اور پھر ان خطوں کو حفاظت سے رکھ دیا۔ وہ یکایک گھر جانے کی زبردست خواہش محسوس کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تک وہ کمرے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ٹہلتا رہا۔ پھر دھیمی آواز میں بے اختیار گانے لگا۔

وہ میرا آشیاں، وہ زمزمۂ گل، وہ آزادی
قفس میں یاد آتا ہے مجھے رہنا گلستاں کا
بہار آئی ہے میں شغلِ جنوں کرتا ہوں کہہ دو
نہیں معلوم پھر کیا رنگ ہو یارو گلستاں کا
وہ میرا آشیاں وہ ...."

گاتے گاتے وہ یکایک خاموش ہو گیا۔ میز کی دراز میں سے کچھ روپیہ نکالا۔ اور سیڑھیوں پر سے نیچے اُتر کر پھر سڑک پہ پہنچ گیا۔ یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لڑکوں کا ہجوم نہ تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ بوڑھے اور جوان سب اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسمس کی شام اختتام کو پہنچ رہی تھی۔

ہوٹل کے قریب پہنچنے پر رائن ہارٹ نے بیلہ بجانے والی لڑکی کی آواز سُنی۔ وہ گا رہی تھی۔ ہوٹل کا دروازہ کھلا اور تھوڑی دیر کے بعد کوئی شخص باہر نکلتا ہوا نظر آیا۔ رائن ہارٹ مکان کے سائے میں چھپ گیا۔ اور اُس شخص کے چلے جانے کے بعد آگے بڑھا۔ ایک جوہری کی دوکان سے سنگِ سُرخ کی ایک صلیب خرید کر وہ اُسی راستے سے واپس گیا۔ جس سے وہ آیا تھا۔

اپنے مکان کے قریب اُس نے ایک کم سن لڑکی دیکھی۔ جو پھٹے ہوئے کپڑے پہنے تھی۔ اور مکان کے دروازے پہ دستک دے رہی تھی رائن ہارٹ نے پوچھا "میں دروازہ کھولنے میں تمہاری مدد کردوں؟" لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ رائن ہارٹ نے دروازہ کھول دیا۔ اور لڑکی سے کہا۔ "لیکن میں تم کو اندر نہ جانے دونگا۔ ممکن ہے۔ کہ لوگ وہاں سے تم کو نکال دیں۔ آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔ تمہیں کیک اور مٹھائی کھلاؤں گا۔" اس نے دروازہ بند کر دیا۔ لڑکی خاموشی سے اُس کے ساتھ ہو لی اور اُس کے مکان تک گئی۔

کمرہ روشن تھا۔ جاتے وقت اُس نے روشنی گُل نہیں کی تھی۔ کیک اور مٹھائیوں کا آدھے سے زیادہ حصہ اُس نے لڑکی کو دیا۔ مگر اپنے نام والا کیک نہیں۔ پھر اُس نے لڑکی سے کہا۔" اب دوڑ کر گھر چلی جاؤ۔ اور اپنی ماں کو بھی تھوڑی سی مٹھائی دو۔" لڑکی نے استعجاب سے رائن ہارٹ کی طرف دیکھا۔ غریب لڑکی کے ساتھ کوئی کبھی ایسی مہربانی سے پیش نہ آیا تھا۔ وہ اپنے معصومانہ جذبات کا اظہار نہ کر سکی۔ رائن ہارٹ نے لمپ لے کر دروازے تک لڑکی کو پہنچایا۔ وہ بہت خوش وخرم اُچھلتی کودتی ہوئی چلی گئی۔

رائن ہارٹ نے آتشدان میں آگ سلگا دی اور اپنا بوسیدہ رومال نکال کر میز پر رکھا۔ اپنی والدہ اور الزبتھ کو طویل خط لکھنے میں اُس نے رات گزار دی۔ وہ ابھی خط لکھ ہی رہا تھا کہ آفتاب طلوع ہو گیا۔ اور اُس کی شعاعیں کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر باہر برف جم گئی تھی۔ اس لئے یہ شیشے آئینے کا کام دے رہے تھے۔ رائن ہارٹ نے جب کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ تو ایک روغمگین چہرہ اُسے گھورتا ہوا نظر آیا۔

(۵)

وطن

ایسٹر کی تعطیلات میں رائن ہارٹ اپنے گھر گیا۔ جب وہ دوسرے

دن الزبتھ سے ملنے گیا۔ تو وہ مسکراتی ہوئی اُس کی طرف دوڑی۔ وہ شرمائی ہوئی تھی۔ رائن ہارٹ نے الزبتھ سے کہا "تمہارا قدِ رعنا تو صنوبر کو بھی شرماتا ہے"۔ وہ خاموش رہی۔ رائن ہارٹ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور الزبتھ کے ہاتھ کو دیر تک اپنے ہاتھ میں دبائے رکھا الزبتھ نے کوشش کی کہ آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ کو چھڑا لے۔ رائن ہارٹ کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ الزبتھ نے کبھی ایسا نہ کیا تھا۔ قرینے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے درمیان کوئی چیز حائل ہو گئی تھی۔ وہ روزانہ الزبتھ سے ملا کرتا تھا۔ مگر اُس نے محسوس کیا کہ اب وہ اگلی سی بات نہ تھی جب کبھی دونوں ساتھ بیٹھتے تو گھنٹوں تک خاموشی طاری رہتی۔ رائن ہارٹ سخت پریشان تھا کہ اس کشیدگی کا باعث کیا ہے۔ چھٹیوں کو آسانی سے گزار دینے کے لئے وہ الزبتھ کو نباتات پڑھانے لگا۔ اس علم کو اُس نے یونیورسٹی میں بڑی دلچسپی سے حاصل کیا تھا۔ الزبتھ نے خوش ہو کر پڑھنا شروع کیا۔ اور بہت جلد ترقی کرنے لگی۔ ہفتے میں دو تین بار وہ سبزہ زاروں اور میدانوں میں چلے جاتے تھے۔ اور پودوں اور پتیوں کا ایک ذخیرہ لے آتے تھے۔ پھر خوردبین سے اُن کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس غرض سے رائن ہارٹ دوپہر کے وقت الزبتھ کے پاس جایا کرتا تھا۔

ایک روز الزبتھ کے کمرے میں داخل ہوتے وقت اس نے دیکھا کہ ایک سنہرا پنجرا لٹکا ہوا ہے۔ یہ پنجرا اس سے قبل وہاں نہ تھا۔ الزبتھ

اس کے اندر گھاس رکھ رہی تھی۔ پنجرے میں ایک کینیری تھی۔ جو اپنے پروں کو پھڑپھڑا رہی تھی۔ اور چیخ چیخ کر الزبتھ کی انگلیوں پہ چونچ مار رہی تھی۔ رائن ہارٹ کا "لنٹ" بھی اسی جگہ رہا کرتا تھا۔

اُس نے مُسکرا کر الزبتھ سے پوچھا۔ "میرا غریب لنٹ مرنے کے بعد گولڈ فش سے مُبدّل ہو گیا؟"

الزبتھ کی ماں نے کہا۔ "لنٹ مر کر دوسری شکل نہیں اختیار کر لیتا۔ تمہارے دوست ایرک نے آج دوپہر کے وقت یہ چڑیا الزبتھ کو اپنے فارم سے تحفۃً بھیجدی ہے۔" الزبتھ کی ماں اس وقت کرسی پر بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔

رائن ہارٹ نے پوچھا "کونسا فارم؟"

"تم نہیں جانتے؟"

"کیا؟"

"کہ ایرک نے اپنے باپ والا فارم۔ جو ایبنزری میں ہے۔ لے لیا ہے۔ اور ایک مہینے سے وہیں رہتا ہے۔"

"مگر آپ نے اس کے متعلق مجھ سے کبھی تذکرہ نہیں کیا۔"

"اور تم نے بھی تو کبھی اپنے دوست کے متعلق مجھ سے کچھ دریافت نہیں کیا۔ وہ ایک ہوشیار، سنجیدہ اور ذی شعور لڑکا ہے۔" یہ کہکر الزبتھ کی ماں قہوہ تیار کرنے چلی گئی۔

الزبتھ ابھی تک پنجرے کو درست کرنے میں مصروف تھی۔

اس نے رائن ہارٹ سے کہا "ذرا ٹھہر جاؤ میں ابھی فارغ ہو جاؤں گی"۔

مگر رائن ہارٹ نے خلافِ معمول کوئی جواب نہ دیا۔ الزبتھ دوڑ کر اُس کے پاس آئی۔ رائن ہارٹ کے چہرے پر پریشانی کے ایسے آثار نمایاں تھے۔ جس کا تجربہ کبھی الزبتھ کو نہ ہوا تھا۔

الزبتھ نے پوچھا "رائن ہارٹ! تمہیں کیا تکلیف ہے۔ تم بیمار ہو؟"

"نہیں بیمار ہوں؟"

"تم اس قدر غمگین کیوں معلوم ہوتے ہو؟"

اس نے کہا "الزبتھ! میں اس زرد چڑیا کو دیکھنے کا روادار نہیں"۔

وہ محوِ حیرت ہو کر رائن ہارٹ کو دیکھنے لگی۔ اُس نے کچھ سمجھا نہیں۔ بولی "تم عجیب قسم کی باتیں کر رہے ہو!"

رائن ہارٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف الزبتھ کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ اتنے میں الزبتھ کی ماں قہوہ لے کر آ گئی۔ قہوہ پی کر وہ پھر چرخہ کاتنے لگی۔ الزبتھ اور رائن ہارٹ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ یہاں وہ پتیوں اور پھولوں کو شناخت کر کے علیحدہ کرنے لگے۔ جب کبھی الزبتھ کسی پودے کے لاطینی نام کا صحیح تلفظ ادا نہ کر سکتی تھی تو رائن ہارٹ اُسے بتا دیتا تھا۔

جب الزبتھ پھولوں اور پودوں کی شناخت ختم کر چکی۔ تو اُس نے رائن ہارٹ سے کہا "مجھے لالہ کے ایک پھول کی بھی ضرورت ہے"۔

رائن ہارٹ نے ایک سفید کاپی جیب میں سے نکالی۔ اور اُس کے

اوراق کے درمیان سے چند سوکھی ہوئی پتیاں نکال کر الزبتھ کو دیں۔

اس کاپی میں کچھ لکھا ہوا دیکھ کر الزبتھ نے پوچھا "تم نے پھر کچھ افسانے لکھے ہیں"۔

رائن ہارٹ نے کہا "یہ افسانے نہیں ہیں" اور کاپی الزبتھ کو دے دی۔

اس کاپی میں رائن ہارٹ کی چند نظمیں لکھی ہوئی تھیں۔ الزبتھ نے نظموں کی سرخیوں کو پڑھنا شروع کیا "جب اُستاد اُس پر خفا ہوا تھا۔۔۔۔۔" "جب وہ جنگل میں راستہ بھول گئے تھے۔۔۔۔" "اور اُس کا پہلا خط۔۔۔"

رائن ہارٹ الزبتھ کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ خاموش، سر جھکائے کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھی۔ کبھی کبھی اُس کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی دوڑ جاتی تھی۔ مطالعہ ختم کرنے کے بعد اُس نے خاموشی سے کتاب کو رائن ہارٹ کے سامنے رکھ دیا۔

تعطیل کے دن اسی طرح گزرے۔ آخر رائن ہارٹ کی واپسی کا دن آپہنچا۔ الزبتھ نے اپنی ماں سے اجازت حاصل کر لی کہ وہ اپنے دوست کو اسٹیشن تک پہنچا آئے۔ دروازے سے باہر نکل کر رائن ہارٹ نے الزبتھ کے بازو میں اپنا بازو ڈال دیا۔ اور اس طرح یہ دونوں اسٹیشن کی طرف چلے۔ اسٹیشن کے قریب پہنچ کر رائن ہارٹ کے دل میں یہ خیال گزرا۔ کہ جُدا ہونے سے پہلے الزبتھ سے کچھ گفتگو کر لینی چاہیئے۔ اس کی

زندگی اور آئندہ خوشی کا دار و مدار اسی گفتگو پر تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر الفاظ یارا نہ دیتے تھے۔ وہ پریشان تھا کہ یہ طلسمِ خاموشی کس طرح ٹوٹے۔ اسی فکر میں اُس کی رفتار سُست ہو گئی۔ اب وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگا۔

الزبتھ نے اُس کو مخاطب کر کے کہا "سینٹ میری کے گرجا میں دس بج چکے ہیں۔ کہیں تمہارے پہنچنے سے قبل گاڑی نہ چھوٹ جائے۔" مگر پھر بھی رائن ہارٹ نے اپنی رفتار کو تیز نہ کیا۔ آخر اس نے رقّت آمیز لہجے میں کہا۔ "الزبتھ! دو برس تک اب تم مجھے نہ دیکھ سکو گی۔ نہیں معلوم جب میں دوبارہ یہاں آؤں گا۔ تو مجھ سے اسی طرح محبّت کرو گی جیسا اب کرتی ہو یا نہیں"۔

الزبتھ نے کہا۔ "میں تمہیں بھول کیوں جانے لگی؟ میں نے کل ہی تمہارے لئے جنگ کی ہے"۔

"تم نے میرے لئے جنگ کی؟ بھلا یہ تو بتاؤ۔ کہ کس سے جنگ کی۔ اور کیوں جنگ کی؟"

"کل رات میرے اور والدہ صاحبہ کے درمیان تمہارے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ رائن ہارٹ میں اب وہ اگلی سی بات باقی نہیں رہی"۔

تھوڑی دیر تک رائن ہارٹ خاموش رہا۔ پھر اُس نے کہا۔ "میں اب بھی وہی ہوں جو پہلے تھا۔ الزبتھ! تمہارا خیال میرے متعلق

کیا ہے؟"

"میں تم کو اب بھی ویسا ہی پاتی ہوں جیسے تم پہلے تھے"۔

اب رائن ہارٹ تیزی سے چلنے لگا۔ اُس کے چہرے سے انبساط و سرور کے آثار نمایاں تھے۔ الزبتھ نے اُس سے پوچھا "تم اس قدر مسرور کیوں نظر آ رہے ہو؟"

"ایک راز ہے۔ ایک لطیف راز، جو میں تم کو ابھی نہ بتاؤں گا۔ دو سال کے بعد جب واپس آؤں گا۔ تو اس راز کا انکشاف کروں گا"۔

اسٹیشن پہنچ کر الزبتھ رائن ہارٹ سے رخصت ہو گئی اور واپس مکان آ گئی۔

(۶)

ایک خط

دو سال کے بعد ایک دن رائن ہارٹ مطالعہ میں مصروف تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ رائن ہارٹ نے دروازہ کھول دیا۔ ڈاکیئے نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا کر کہا "مسٹر وائنر[۱]! آپ کے نام کا ایک خط ہے"۔

وطن سے واپس آنے کے بعد رائن ہارٹ نے الزبتھ کو کوئی

---

[۱] رائن ہارٹ کا پورا نام رائن ہارٹ وائنر تھا (مترجم)

خط نہ لکھا تھا، نہ الزبتھ نے رائن ہارٹ کو خط سے یاد کیا تھا۔ یہ خط رائن ہارٹ کی والدہ نے بھیجا تھا۔ رائن ہارٹ نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا خط کا مضمون یہ تھا:۔

"میرے بچے! تم ابھی جوان ہو۔ اور جوانی ہی انسان کی زندگی میں تغیر و تبدل کا وقت ہوتا ہے۔ یہاں بھی بہت سے تغیرات رونما ہوئے ہیں۔ جن سے غالباً تم کو صدمہ ہوگا۔ کل الزبتھ نے ایرک سے شادی کرنا منظور کر لیا۔ پچھلے دو مہینوں میں وہ برابر انکار کرتی رہی تھی۔ لیکن آخر کار وہ کسی طرح راضی ہو گئی شادی بہت جلد ہو جائے گی۔ اور اُس کی ماں بھی اُس کے ساتھ چلی جائے گی +

(۷)

امینزی

چند سال اور گزر گئے۔ بہار کا موسم اور سہ پہر کا وقت تھا۔ سڑک کے دونوں جانب بڑے بڑے درخت تھے۔ ایک نوجوان اس سڑک پر سفر کر رہا تھا۔ اُس کی سیاہ آنکھیں کسی راہ چلنے والے کو تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن کوئی نظر نہ آتا تھا۔ گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک کسان بیل گاڑی پر سوار نظر آیا۔ نوجوان مسافر نے اُس سے پوچھا:۔

"میرے دوست! الیمینزی کو یہی راستہ گیا ہے؟"

"سیدھے چلے جائیے۔ آپ بہت جلد الیمینزی پہنچ جائینگے۔ اب قریب ہی ہے۔"

مسافر نے رفتار تیز کر دی۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ ایسی جگہ پہنچا، جہاں سڑک پہاڑی کے اُوپر چلی گئی تھی۔ پہاڑی پر پہنچ کر اُسے ایک نہایت خوشنما منظر نظر آیا۔ دوسری طرف پہاڑی کے دامن میں ایک وسیع جھیل تھی۔ جو سرسبز و شاداب پودوں سے بھری تھی جھیل کے دوسرے کنارے پر بھی نیلگوں پہاڑیاں تھیں۔ سامنے جنگل میں درخت پھلوں سے لدے تھے۔ اور درختوں کے پیچھے کسی مکان کی سُرخ دیواریں نظر آ رہی تھیں۔ ایک بگلا مکان کی چھت پر سے اُڑ کر جھیل کے اُوپر چکر لگانے لگا۔ مسافر کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔ "الیمینزی" تھوڑی دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا اور جھیل کے دوسرے کنارے پانی میں جو مکان کا عکس تھا اُس کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھایا۔

اب سڑک بالکل ڈھلوان ہو گئی تھی۔ جھیل نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ مگر درختوں کے درمیان سے کبھی کبھی جھیل کی جھلک نظر آتی تھی۔ اب سڑک پھر اوپر کی جانب چڑھنے لگی۔ یہاں جنگل کے بجائے سڑک کے کنارے انگور کی لتیاں نظر آتی تھیں۔ انواع و اقسام کے پھل کے درخت بھی تھے۔ شہد کی مکھیاں فضا میں بھنبھنا رہی تھیں۔ اتنے میں

ایک شخص بھورے رنگ کا اوورکوٹ پہنے مسافر کی طرف آیا۔ جب وہ مسافر کے قریب پہنچا تو فرطِ مسرّت سے چیخ اُٹھا "خوش آمدید خوش آمدید رائن ہارٹ! خوش آمدید"

"ایرک! خدا تم کو خوش رکھے۔ میں کس زبان سے تمہارے اخلاق کا شکریہ ادا کروں؟"

اس کے بعد ان دونوں نے ہاتھ ملایا اور معانقہ کیا۔

ایرک نے اپنے دوست کے سنجیدہ چہرے کو غور سے دیکھ کر کہا۔

"کیا یہ واقعی تم ہو؟"

"ہاں ایرک! میں ہی ہوں۔ یعنی رائن ہارٹ۔ تم تو بالکل ویسے ہی ہو جیسے پہلے تھے۔ صرف کسی قدر زیادہ خوش معلوم ہوتے ہو۔"

ایرک نے مسکرا کر کہا۔ "رائن ہارٹ! میری خوشی کا اندازہ تم اس سے کر سکتے ہو کہ میں نے بہت بڑی بازی جیتی ہے۔ وہ تم کو دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔ تمہارے آنے کی اُس کو مطلقاً خبر نہیں ہے۔"

"کس کو خبر نہیں ہے؟"

"الزبتھ کو۔"

"تم نے الزبتھ کو میرے آنے کی خبر نہ دی تھی؟"

"میں نے تم کو خط لکھ دیا تھا۔ مگر الزبتھ یا اُس کی والدہ کو اس کے متعلق کچھ نہ کہا تھا۔ الزبتھ تم کو یکایک دیکھے گی۔ تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔"

رائن ہارٹ متفکر ہو گیا۔ جیسے جیسے وہ فارم کے قریب ہوتا گیا۔ اُس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ اب سڑک کے کنارے انگور کی لتّیاں نظر نہ آتی تھیں۔ اُن کی جگہ ایک وسیع باغ نظر آیا۔ ایک بگلا پودوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ ایرک نے تالی بجا کر اُس کو اُڑا دیا۔ بگلا ایک نئے مکان کی چھت پر جا کر بیٹھ گیا۔ جس کے چاروں طرف شفتالو اور خوبانی کے درخت تھے۔

ایرک نے کہا "یہ بھٹی ہے، جس کو میں نے دو سال قبل بنوایا تھا۔ مکان جو نظر آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک میرے جدّ امجد اور ایک میرے والد نے بنوایا تھا۔ غرض ہم لوگ ہمیشہ ترقی کرتے چلے آ رہے ہیں۔"

اسی طرح گفتگو کرتے ہوئے وہ مکان کے صحن میں پہنچ گئے۔ خوشنما پھولوں اور پودوں سے صحن آراستہ تھا۔ کچھ لوگ اِدھر سے اُدھر جا رہے تھے انہوں نے جھک کر ایرک اور اُس کے دوست کو سلام کیا۔ اب وہ مکان کے بڑے کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ ایرک نے ایک دروازہ کھولا جس سے وہ ایک چھوٹے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے سے باغ کا نہایت ہی دلفریب منظر نظر آتا تھا۔ جھیل اور پہاڑیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔

باغ میں ایک چبوترے پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ اُٹھ کر ایرک کی طرف بڑھی۔ مگر اجنبی پر نظر پڑتے ہی محوِ حیرت ہو کر کھڑی ہو گئی۔ رائن ہارٹ نے مسکرا کر اُس سے ہاتھ ملایا۔ وہ فرطِ مسرت سے چیخ اُٹھی۔

"رائن ہارٹ! تم یہاں آ گئے؟ تم سے ملے ہوئے مدت دراز گزر گئی تھی"۔
"کچھ ایسی طویل مدت تو نہیں گزری..." رائن ہارٹ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ ایلزبتھ کی آواز سن کر اس کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ اس کو وہ گھڑی یاد آ گئی جب اس نے چند سال قبل اپنے شہر میں ایلزبتھ کو الوداع کہی تھی۔

ایرک خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اس نے کہا "ایلزبتھ! تم کو رائن ہارٹ کے آنے کی ہرگز توقع نہ رہی ہو گی"۔
"ایرک! تمہاری مہربانیوں کا شکریہ میں کس طرح ادا کروں"۔
ایرک نے ایلزبتھ کے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "اب ہم رائن ہارٹ کو یہاں سے بھاگ نہ جانے دیں گے۔ ہم اس کو اس طرح یہاں رکھیں گے۔ کہ وہ اس گھر کو اپنا ہی گھر تصور کرے۔ دیکھو رائن ہارٹ کیسا، جیہہ اور سنجیدہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے عرصے سے اسے نہ دیکھا تھا"۔ ایلزبتھ نے شرمیلی نگاہوں سے رائن ہارٹ کی طرف دیکھا رائن ہارٹ نے مسکرا کر کہا "چونکہ میں عرصہ دراز تک تم سے جدا رہا۔ اس لئے میری شکل و شباہت میں تم کو فرق معلوم ہوتا ہے"۔
اتنے میں ایلزبتھ کی ماں پہنچ گئی۔ اس نے رائن ہارٹ کو دیکھتے ہی کہا "مسٹر وانر! خوش آمدید!" اب سوال و جواب کا سلسلہ چھڑ گیا۔ عورتیں اپنے کاموں میں مشغول ہو گئیں۔ رائن ہارٹ نے ناشتہ کیا۔ ایرک سگار پینے لگا اور روزمرہ کی گفتگو ہونے لگی۔

دوسرے دن رائن ہارٹ، ایرک کے ساتھ باغ اور کھیتی وغیرہ دیکھنے گیا انتظام بہت اچھا تھا۔ مزدور سب تندرست اور خوش و خرم معلوم ہوتے تھے۔ دوپہر کے وقت دونوں واپس آئے۔

رائن ہارٹ کا مشغلہ یہ تھا۔ کہ وہ مقامی محاورے اور گیت جمع کرتا تھا۔ اس کا ارادہ اس مجموعہ کو شائع کرلینے کا تھا۔ ایلزبتھ اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتی تھی۔ رائن ہارٹ روز شام کو جھیل کے کنارے ٹہلنے جاتا تھا جھیل کا راستہ باغ کے کنارے کنارے تھا اخیر میں ایک چبوترا بنا ہوا تھا۔ جس کے تین طرف خوش نما درخت تھے۔ اس جگہ کا نام ایلزبتھ کی ماں نے "شام کی نشست گاہ" رکھا تھا۔ کیونکہ یہاں سے غروب آفتاب کا منظر نہایت پر لطف ہوتا تھا۔

رائن ہارٹ ایک دن اسی راستے سے ٹہل کر واپس آرہا تھا۔ کہ پانی برسنے لگا۔ وہ ایک درخت کے نیچے جاکر ٹھہرا رہا۔ مگر یہاں بھی وہ پانی کے تریڑوں سے بچ نہ سکا جب وہ "شام کی نشست گاہ" کے قریب پہنچا۔ تو اس نے دیکھا کہ کوئی عورت وہاں اس طرح بیٹھی ہے۔ گویا کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ رائن ہارٹ سمجھا شاید ایلزبتھ ہو اور تیزی سے اُس کی طرف بڑھا مگر وہ یکایک اُٹھی اور درختوں کی آڑ میں خدا جانے کدھر چلی گئی۔ رائن ہارٹ اس کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ نہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ایلزبتھ ہی تھی، وہ اُس سے پوچھنا بھی نہ چاہتا تھا۔ مکان میں داخل ہوتے وقت اس نے باغ کے پھاٹک،

کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس خوف سے کہ کہیں ایلزبتھ پہ نظر نہ پڑ جائے ؏

(۸)

یہ میری ماں کا قصور تھا

ایک دن شام کے وقت گھر کے لوگ باغ والی کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ رائن ہارٹ سے لوگوں نے فرمائش کی کہ وہ اپنے مجموعہ میں سے بعض گیت پسند کر کے سنائے۔ رائن ہارٹ کمرے میں گیا۔ اور کاغذ کا ایک گٹھا لے کر واپس آیا۔ ایلزبتھ رائن ہارٹ کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اور دونوں نے مل کر ان کاغذات کا مطالعہ شروع کیا ؏

رائن ہارٹ نے کہا "یہ کاغذ میرے ایک دوست نے بھیجے ہیں ابھی میں نے خود نہیں دیکھا۔ کہ ان میں کیا لکھا ہے"

ایلزبتھ نے ایک گیت پسند کر کے رائن ہارٹ سے گانے کی فرمائش کی ؏

رائن ہارٹ نے گانا شروع کیا ؏

الزبتھ نے پوچھا "ان خوبصورت نغموں کا مصنّف کون ہے"؟

رائن ہارٹ نے جواب دیا "ان نغموں کا مصنّف نہیں ہوتا۔ یہ آپ ہی آپ پیدا ہو جاتے ہیں۔ خود بخود سڑکوں پہ لوگ ان کو گاتے پھرتے

ہیں - اور ہر جگہ کے لوگ ان سے واقف ہو جاتے ہیں۔ بعض ٹکڑے ایسے ہوتے ہیں جن میں ہمیں خود اپنی زندگی کا عکس نظر آتا ہے"۔

رائن ہارٹ نے ایک پرچہ اٹھا کر پڑھا:-

حوادث سے بن گزارا نہیں یاں

ایلزبتھ نے خوش ہو کر کہا "میں اس گیت سے واقف ہوں۔ اس کو گاؤ رائن ہارٹ"

ایلزبتھ اور رائن ہارٹ نے مل کر گانا شروع کیا۔

حوادث سے بن گزارا نہیں یاں — بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں
پھول ہو یا کہ ہو شبنم نہیں یکساں کوئی — کوئی خنداں ہے چمن میں تو ہے گریاں کوئی
ہیں مصائب ہی تو دیباچہ عیش و راحت — عقل اگر ہو تو بنے طالب حرماں کوئی

حوادث سے بن گزارا نہیں یاں

حوادث سے . . . .

ایلزبتھ کی ماں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہی تھی۔ جب گانا ختم ہو گیا۔ تو رائن ہارٹ نے دوسرا پرچہ تلاش کر کے نکالا۔ اتنے میں باہر سے آواز آئی۔

"بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں"

رائن ہارٹ نے مسکرا کر کہا "سنو! بچے بچے کی زبان پر یہ گیت موجود ہے۔ کوئی کسان اس گیت کو گاتا ہوا جا رہا ہے"۔

ایرک نے کہا "یہ نغمے بہت قدیم ہیں۔ جنگل کی گہرائیوں

بیں سے نکل پڑتے ہیں۔ فضائے بسیط میں سے ٹپک پڑتے ہیں۔
خدا جانے اِن نغموں کا بنانے والا کون تھا"
اس کے بعد رائن ہارٹ نے دوسرا گیت گانا شروع کیا:۔

"یہ میری ماں کا قصور تھا۔"
اُس نے مجھے مجبور کیا۔
کہ میں اپنے عاشق سے دستبردار ہو جاؤں۔
اور دُوسرے شخص کو اپنا شوہر بنا لُوں۔
مَیں نے بہت آرزو کی۔ منت وسماجت کی۔
مگر اُس نے ایک نہ سُنی۔
اب میری زندگی سے خوشی مفقود ہو گئی ہے۔
کاش مَیں پھر آزاد ہو جاؤں۔
یا عہدِ رفتہ لوٹ آئے"

رائن ہارٹ گاتے وقت ایک عجیب کیف محسوس کر رہا تھا۔
جب وہ گانا ختم کر چکا۔ تو ایلزبتھ اُٹھ کر باغ میں چلی گئی۔ ابرک بھی
اُٹھ کر ساتھ جانے لگا۔ تو ایلزبتھ کی ماں نے اُسے روک دیا۔ کہ "ایلزبتھ
کسی کام کی غرض سے باہر گئی ہے"۔

تاریکی بتدریج بڑھ رہی تھی۔ باغ سے ہوا کے جھونکے پھولوں
کی خوشبو سے بھرے ہوئے مکان کے اندر آرہے تھے۔ پانی
میں مینڈک ٹرّا رہے تھے۔ درختوں پر سے بلبلوں کے گانے کی

آواز آ رہی تھی ؎

نہ کھیل موسم گل میں شکار اے صیاد　　چمن کی دیکھ لوں میں بھی بہار اے صیاد
جفا و جور کا گلچیں کے میں نشانہ ہوں　　کوئی نہیں ہے مرا غمگسار اے صیاد

چاند کی روپہلی کرنیں درختوں میں سے چھن چھن کر زمین پر آ رہی تھیں سائمن ہارٹ نے کاغذات کو اُٹھا لیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں سے وہ جھیل کے کنارے کی طرف سیر کی غرض سے چل دیا ؎

جھیل پر جنگل کے درختوں کے طویل سائے پڑ رہے تھے۔ صرف جھیل کا مرکزی حصہ چاند کی دھیمی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کے نرم جھونکے درختوں سے ٹکرا کر لطیف نغمے کی کیفیت پیدا کر دیتے تھے رائن ہارٹ جھیل کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ اُس نے پانی کے اندر کنول کے ایک پھول کو دیکھا۔ اور کوٹ اتار کر پانی میں کود پڑا۔ کنارے کے قریب پانی بہت کم تھا۔ کانٹوں اور پتھر کے ٹکڑوں سے اُس کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد پانی اتنا گہرا تھا کہ وہ اس میں تیر سکتا تھا۔ تیرنے کی جو اُس نے کوشش کی تو دو تین غوطے کھائے۔ پھر سنبھل کر وہ پانی کی سطح پر آیا اور تیرنے لگا۔ اب وہ کنول کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ تیرتا جاتا تھا۔ مگر کنول اُس سے دُور ہٹتا جاتا تھا۔ آخر کار وہ اس قدر قریب پہنچ گیا۔ کہ کنول صاف نظر آنے لگا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر پھول کو پکڑ لینا چاہا۔ مگر وہ یکایک جالے میں پھنس گیا اور غوطے کھانے لگا۔ اُس نے مشکل سے اپنے آپ کو

سنبھالا۔ اور تیرتا ہوا کنارے کی طرف واپس گیا۔ کنول کا پھول اب بھی اُسی جگہ پانی میں نظر آرہا تھا۔ اُس نے کپڑے پہن لئے اور آہستہ آہستہ مکان کی جانب چلا۔ جب باغ سے کوٹھڑی کے اندر داخل ہوا۔ تو دیکھا کہ ایبرک اور ساس کی ساس سفر کی تیاری میں مشغول ہیں۔ کسی ضرورت سے اُنہیں دوسرے دن کہیں جانا تھا۔

"اتنی رات گزرے تم کہاں گئے تھے۔ اور کیا کر رہے تھے؟" ایلزبتھ کی ماں نے رائن ہارٹ سے پوچھا۔

"میں جھیل سے کنول کا پھول لینے گیا تھا۔ مگر ناکام رہا"۔

ایبرک نے پوچھا "کنول کے پھول کی تم کو کیا ضرورت تھی؟"

"کسی زمانے میں یہ پھول مجھے بہت محبوب تھا"۔

(۹)

ایلزبتھ

دوسرے دن سہ پہر کے وقت رائن ہارٹ مکان کے اُس پار جھیل کے کنارے ایلزبتھ کے ساتھ سیر کر رہا تھا۔ ایبرک نے ایلزبتھ کو ہدایت کر دی تھی کہ اُس کی غیر حاضری میں رائن ہارٹ کو مکانات کا باقی حصہ اور جھیل کے دوسری جانب کے مناظر دکھا دے۔ دونوں گھنٹوں تک اِدھر اُدھر گشت لگاتے رہے۔ آخر ایلزبتھ تھک کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ اس وقت رائن ہارٹ نے کہیں دور سے کوئل کی آواز

تھی۔ معاً اس کو کوئی واقعہ یاد آگیا۔ اُس نے ایلزبتھ کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر کہا، "چلو، سٹرابیری تلاش کریں"۔

ایلزبتھ نے جواب دیا۔ "یہ سٹرابیری کا موسم نہیں ہے"۔

رائن ہارٹ نے کہا۔ "لیکن اب موسم قریب ہی ہے"۔

ایلزبتھ سر ہلا کر خاموش ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں سیر و تفریح میں مصروف ہوگئے۔ کچھ دُور چلنے کے بعد رائن ہارٹ نے جُھک کر زمین پر سے کوئی چیز اُٹھائی۔ اُس کے چہرے پر رنج و غم کے آثار نمایاں ہوگئے۔ اُس نے ایلزبتھ سے پوچھا۔ "تم اس پھول کو پہچانتی ہو؟"

ایلزبتھ نے جواب دیا۔ "اس کو لالہ کہتے ہیں۔ مَیں اکثر جنگل سے یہ پھول لایا کرتی ہوں"۔

رائن ہارٹ نے کہا۔ "میرے پاس ایک بیاض ہے جس میں لالے کا ایک پھول ہے۔ مگر اب اُس کی پتیاں مُرجھا چکی ہیں۔ تم کو معلوم ہے کہ وہ پھول مجھ کو کس نے دیا تھا؟"

ایلزبتھ کی نظریں اُس پھول پر جم گئیں۔ جو رائن ہارٹ کے ہاتھ میں تھا۔ اور اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

رائن ہارٹ نے یکایک کہا۔ "ایلزبتھ! ہمارا عہد شباب کہاں گیا؟"

ایلزبتھ خاموش رہی ——— آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔

ایلزبیتھ نے کہا۔ دکان کا سائبان نظر آرہا ہے"
دونوں تیزی سے چلنے لگے اور جھیل کے کنارے پہنچ کر کشتی میں سوار ہوگئے ؛

رائن ہارٹ یکایک ایلزبیتھ کے ہاتھوں کو غور سے دیکھنے لگا ہاتھوں نے دل کا، راز فاش کردیا ——— وہ راز جسے ایلزبیتھ کے چہرے نے ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔ جب عورت مغموم ہوتی ہے اور اپنے جذبات پر قابو پانا چاہتی ہے۔ تو اس کے ہاتھوں میں خفیف سا لرزہ پیدا ہوتا ہے ایلزبیتھ نے جب محسوس کیا۔ کہ رائن ہارٹ اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھ رہا ہے تو اس نے اپنے ہاتھوں کو کشتی سے باہر پانی میں لٹکا دیا ؛

جب وہ مکان پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص چاقو دان پر چڑھا رہا ہے۔ اور چکی گھماتے وقت کچھ گاتا بھی جاتا ہے۔ ایک حسین لڑکی جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ ایلزبیتھ سے بھیک کی طالب ہوئی۔ رائن ہارٹ جیب ٹٹولنے لگا۔ مگر ایلزبیتھ نے آگے بڑھ کر جتنی رقم اس کے پاس موجود تھی اُس لڑکی کو دے دی۔ اور تیزی سے مکان میں داخل ہو گئی وہ سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی ؛
بھیک مانگنے والی لڑکی وہیں کھڑی رہی ؛
رائن ہارٹ نے اس سے پوچھا تم اور کیا چاہتی ہو ؟
اس نے رائن ہارٹ کو تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا نہیں کچھ بھی نہیں

چاہتی"۔ اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ رائن ہارٹ نے اس کا نام لے کر پکارا۔ مگر اس نے جواب نہ دیا۔

"میری چشم خونفشاں ہے درد دل کی رازداں"

لڑکی دردناک آواز سے گا رہی تھی۔

رائن ہارٹ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کانوں میں ایک پرانے گیت کے الفاظ گونجنے لگے۔ اسے وہ موقع یاد آگیا جب اس نے یہ گیت سنا تھا۔

"میری چشم خونفشاں ہے . . . . . ."

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور آرام کرنا چاہا۔ لیکن جذبات کا ایک دریا چلا آتا تھا۔ خیالاتِ پریشاں نے اسے بےچین کر دیا۔ وہ نیچے بیٹھک کے کمرے میں گیا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ میز پر وہ سُرخ مالا رکھی تھی جو صبح کے وقت ایلزبتھ کے گلے میں تھی۔ رائن ہارٹ نے اس کو اُٹھا کر دیکھا۔ مگر پھر فوراً ہی رکھ دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مالا کے دانے آگ کے انگارے تھے۔ جو اس کے ہاتھوں کو جلا ڈالتے۔ وہ جھیل کے کنارے چلا گیا۔ اور کشتی کھول کر جھیل کی خوب سیر کی۔ وہ اُن تمام مقامات پر گیا۔ جہاں جہاں ایلزبتھ کے ساتھ گیا تھا۔ واپس آکر وہ پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور دریچے کے قریب آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ نیچے باغ میں ایک بلبل نغمہ زن تھا۔ رائن ہارٹ نے بلبل کے نغمے سے لُطف اندوز ہونا چاہا۔ مگر اُسے صرف اپنے دل کے دھڑکنے

کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اب گھر میں سناٹا چھا گیا تھا۔ رات زیادہ آ گئی تھی۔ وہ گھنٹوں اسی طرح بیٹھا رہا جب وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ تو صبح صادق کا وقت ہو چکا تھا۔ اب ظلمتِ شب کافور ہو چکی تھی۔ رائن ہارٹ نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پنسل سے کچھ لکھ کر میز پر رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنی چھڑی لے لی اور خاموشی سے دروازہ کھول کر نیچے کے کمرے میں اُتر آیا۔ اتنے میں سیڑھیوں پر سے کسی کے اُترنے کی آواز آئی۔ رائن ہارٹ نے اس طرف پھر کر دیکھا۔ تو ایلزبتھ نظر آئی۔ اُس نے رائن ہارٹ کا شانہ پکڑ کر کہا۔ "تم اب واپس نہ آؤ گے میں جانتی ہوں۔ تم ہرگز واپس نہ آؤ گے"۔ اس کی آواز میں اس قدر رقت تھی کہ وہ مشکل سے بول سکی۔

رائن ہارٹ نے کہا۔ "میں اب کبھی نہ آؤں گا"۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ چند قدم جانے کے بعد اس نے ایلزبتھ کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ اور پھر تیزی سے بھاگ نکلا۔ اس طرح جیسے کوئی اُسے پکڑنے کے لئے آ رہا ہو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مگر رائن ہارٹ کے خون میں ہیجان برپا تھا۔ وہ تیز تیز چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر آفتاب کی سنہری شعاعیں اُفق سے نمودار ہوئیں۔ اب رائن ہارٹ ایمینزی سے بہت دور نکل گیا تھا۔ اور اس کے قلب کو کسی قدر اطمینان تھا۔

---

(۱۰)

بوڑھا آدمی

اب چاند کی روشنی کمرے میں نہ آتی تھی۔ بالکل اندھیرا ہو گیا تھا۔ بُوڑھا آدمی اسی طرح آرام کرسی پر بیٹھا محوِ خیال تھا۔ بتدریج کمرے کی سیاہ فضا نے ایک جھیل کی شکل اختیار کر لی جھیل کے اُس کنارے پر، جہاں تک نگاہ کام کر سکتی تھی۔ کنول کا ایک پھول نظر آ رہا تھا۔ یکایک دروازہ کھُلا اور کمرے میں روشنی پھیل گئی۔

بوڑھے آدمی نے کہا "برجیٹ! تم نے اچھا کیا کہ لمپ لے آئیں میز پر رکھ دو"۔

اُس نے کرسی میز کے قریب کھینچ لی اور مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔

خزاں کی آمد

سرزمینِ جرمنی کے ایک باغ پر خزاں کی ایک شام کو شفق کا ملگجا سا خونی رنگ چھا رہا تھا۔ گذشتہ دو برس سے یورپ جنگِ عظیم کے مغرور قدموں تلے بے رحمی سے روندا جا رہا تھا۔ لیکن اس سرسبز و شاداب باغ کی سایہ دار روشیں ابھی جنگ کی ہولناک تباہ کاریوں سے محفوظ تھیں۔ پتھر کی ایک نشست پر دو محبت کرنے والے دل بیقراری سے دھڑک رہے تھے۔ اور سورج کی آخری ہلکی گلابی شعاعیں اُن کے مغموم اور زرد چہروں پر ضیا پاشی کر رہی تھیں۔ دونوں جوان تھے۔ گریچن نازک اور دُبلی پتلی تھی۔ اور لمبے لمبے گھنے ریشمیں سیاہ بال متلاطم پانی کی طرح کندھوں پر لہرائے ہوئے تھے۔ پائیٹر نے اپنی زندگی میں بیس سے زیادہ بہاریں نہ دیکھی تھیں۔ خدمتِ وطن کا بار اُس کے کندھوں پر پڑ چکا تھا۔ اُس کی فوجی وردی پر لفٹنٹ کے ستارے درخشاں تھے۔

گریچن کہہ رہی تھی، "میرے پیارے! مسرت کے سات روز پلک جھپکتے ہی ختم ہو گئے۔ محبت کی ابتدا میں مجھے یہ گمان بھی نہ تھا۔

کہ میں کسی شخص کے دامِ اُلفت میں اس طرح اور اتنی جلدی گرفتار ہو جاؤں گی"۔

"مجھے کیوں بناتی ہو"۔

"میں سچ کہتی ہوں۔ کہ تم نے ہمیشہ میرے جذبات کا احترام کیا ہے۔ اور میری خوشی کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ خدا کرے جدائی کا زمانہ جلدی کٹے اور ہم پھر ایک دوسرے سے ملیں"۔

"ہاں اگر ہمیں اس کا موقع دیا گیا تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"پائیٹر! ابا تو ہماری شادی سے بے حد شاداں ہیں۔ وہ کل ہی کہہ رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پائیٹر نے زہر خند ہنسی سے کہا:"میرا اشارہ تمہارے ابا جان کی طرف تو نہ تھا"۔

"تو اور کس کی طرف تھا؟"

"انگریزوں کی طرف"۔

"خدارا بدشگونی کی باتیں زبان پر نہ لاؤ۔ وہ تمہیں ۔ ۔ ۔ ۔ گرفتار نہیں کر سکیں گے۔ تمہارے بغیر میری زندگی بے لطف ہے، بیکار ہے" یہ کہتے ہوئے اُس نے مایوسانہ انداز میں بے قراری سے پائیٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور جب اُس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پائیٹر کے چہرے کی طرف اُٹھیں۔ تو اُن کی افسردہ و غمناک گہرائیوں میں آرزوؤں اور ارمانوں کی ایک دُنیا جھلکتی ہوئی نظر آئی۔

پائیٹر اُن لوگوں میں سے تھا جن کے لب اکثر محبت آمیز الفاظ سے نا آشنا رہتے ہیں۔ ایک کرنیل کے بیٹے کی حیثیت سے اس کی تمام تربیت فوجی نظام کے ماتحت ہوئی۔ وہ تمکنت، سنجیدگی اور ہنود ور خاندان کی شاہانہ اور شاندار روایات کا حامل تھا۔ اُنیس برس سے اُس نے ایک باقاعدہ نظام کے مطابق زندگی بسر کی تھی۔ اور اب وہ اس کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ کہ انسانوں پر حکومت کر سکے۔ ایک ماہ کے اندر روسی برفوں اور فلینڈرز کی غلیظ دلدلوں کے درمیان اُس کی قابلیت اور قوتِ برداشت کا امتحان ہونے والا تھا۔ ان حالات میں اس جیسے متین و سنجیدہ شخص کا شاہراہِ محبت پر جہاں قدم قدم پر ذاتی قربانیوں کی بھینٹ چڑھانی ہوتی ہے۔ اور نامرادیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ گامزن ہونا ایک عجیب بات تھی +

لیکن ایک شاندار ہفتے کے لئے اُس نے اُلفت کی اور جواب میں محبت سے نوازا گیا۔ دُنیا کی حاسد نظروں سے اوجھل دونوں چاہنے والے اُس پر فضا باغ میں مصروف راز و نیاز رہے۔ اور دُنیا اپنے محور کے گرد گھوم گھوم کر ہر صبح کو کنارِ شام تک لے آتی رہی۔ ...... صبح سنہری دُھند سے جھلملاتی ہوئی اور شام خون آشام شوخ رنگوں سے گھبرائی ہوئی +

ان سات دنوں میں گریچن نے دُنیا کو ایک نئے رنگ میں ڈوبے ہوئے دیکھا۔ اس مختصر سے وقت میں اس نے جان لیا،

کہ محبت کیا ہے۔ محبت میں کیا لطافتیں پنہاں ہیں۔ اور نسائیت کا منتہا کیا ہے۔

اب یہ رنگین باب ختم ہو رہا تھا۔ کل پائیٹر اپنی رجمنٹ میں شریک ہونے جا رہا تھا۔ اور شقی القلب جنگ اُسے چھین کر گریچن کی دسترس سے دُور، اُلفت کی دلنوازیوں سے بہت دُور لے جا رہی تھی۔ شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں دونوں دلوں کو اُداسی نے گھیر لیا۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے یہ باور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہ ان کا مستقبل بالکل تاریک نہیں۔

گریچن نے کہا۔ "میں سوچ رہی ہوں، سینکڑوں برس سے یہ باغ چلا آ رہا ہے۔ کیا پہلے بھی اس نے کبھی ایسا تماشا دیکھا ہے؟"

"میرے خیال میں تو اس محبت کی مثال ملنی محال ہے"۔

"ہمارے علاوہ بھی تو عشاق ہو گزرے ہیں"۔

"لیکن ہماری طرح کے نہیں"۔

"وہ کیوں؟"

"صرف تمہاری وجہ سے، تمہارا نہ کوئی ثانی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے"

یہ الفاظ پائیٹر نے ہچکچاتے ہوئے کہے اور اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ یہ الفاظ اُس کے دل کی گہرائیوں میں سے نکلے تھے۔ اور گریچن اس کے جذبات کو بخوبی محسوس کر رہی تھی۔

گریچن نے کچھ توقف کے بعد کہا ——— آہ پائیٹر! تم بہت

ہی پیارے ہو۔ لیکن آئندہ سال کیا ہوگا ——— شاید جنگ ختم ہو چکی ہوگی۔ اور ہم تم دونوں اسی طرح یہاں بیٹھے ہنسی خوشی زندگی کے دن بسر کر رہے ہوں گے۔ دُنیا کی تمام مسرتیں اس وقت ہمارے قدموں میں کھیل رہی ہوں گی"۔

اگر انہوں نے ہمیں اس کی مہلت دی"۔ اس نے پھر اپنا خیال دُہراتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

"وہ ضرور مہلت دیں گے۔ وہ اتنے بے رحم نہیں ہو سکتے۔ کہ تمہیں مجھ سے چھین لیں۔ اگلے سال اس موسم میں انشاءاللہ تم واپس آ گئے ہو گے"۔

"شاید . . . . لیکن مجھے خوف ہے کہ کہیں تمہیں اس سیبوں سے لدے ہوئے باغ میں اگلے سال اکیلے ہی چہل قدمی نہ کرنی پڑے"۔

گریچن نے بہ جبر مسکرا کر کہا۔ "اچھا تو پھر میں تمہیں سیبوں کا ایک بہت بڑا بکس بھیجوں گی۔ انہیں کھا کر تمہارے ذہن میں ان ایام مسرت کی یاد تازہ ہو جائے گی . . . . . . اور باغ کا ایک حصہ ایک طرح سے تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ اور جب میں یہاں باغ میں ہوں گی۔ تو ہم تم دونوں ایک ہی باغ میں یکجا ہو جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا"۔ یہ کہکر وُہ ہنسنے لگی۔ لیکن شدتِ جذبات اور وفورِ غم سے اس کی حسین آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ یہ اس کے لئے ایک نیا تجربہ تھا اس کا محبت بھرا دل غمِ مفارقت کے بوجھ سے بیٹھا جا رہا

تھا۔ اور وہ اپنے جذبات کو چھپانے سے قاصر تھی ؛

"آہ، پائیٹر! جان سے پیارے پائیٹر! ہم کتنے خوش تھے۔ اور اب مسرت کا دور ختم ہو رہا ہے" ؛

"نہیں ہرگز نہیں" ؛

"خدا خیر کرے تمہارا خیال درست ثابت ہو۔ میرا دل خوف سے دھڑک رہا ہے" ؛

جنگ کے حالات سے وہ گریچن سے بھی زیادہ باخبر تھا۔ اس لئے خاموش رہا۔ صرف اپنی باہیں اُس کی گردن کے گرد حمائل کر دیں۔ ہراساں گریچن اس کے کندھے سے چمٹی ہوئی تھکے ہوئے زخمی جانور کے مانند ہانپ رہی تھی۔ اس کی نسوانی کمزوریاں مردانہ استقلال سے سکون مستعار لے رہی تھیں ؛

بتدریج شفق کی سرخی سرد رات کی تاریکی میں منتقل ہو گئی۔ گریچن نے کانپتے ہوئے کہا "چلو اندر چلیں۔ سردی ہو رہی ہے" ؛

چند منٹ کے سکوت کے بعد انہوں نے مکان کا رُخ کیا۔ دروازے پر پہنچ کر انہوں نے کچھ توقف کیا۔ اور پیچھے پھر کر باغ پر جس کی آغوش میں اُن کی ہزاروں مسرتیں اور آرزوئیں کھیل چکی تھیں۔ ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی ؛

گریچن نے کہا "کیا اچھا زمانہ تھا" ؛

"بیتتے ہوئے دنوں میں کوئی بات بھی ایسی نہیں۔ جس میں ذرہ بھر

کبھی تغیر کی آرزو کروں۔ گریچن! میری حسین تتلی! مجھے تم سے اُلفت ہے۔ بے حد اُلفت۔ تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا" یہ کہتے ہوئے نوجوان نے اسے اپنی مضبوط باہوں میں تھام لیا۔ اور اس کے نرم و نازک کانپتے ہوتے لبوں کو چوما۔

اس نے پھر دبی زبان سے کہا "کاش وہ ہمیں مہلت دیں کاش ہمیں پھر موقع ملے"!

(۲)

اکتوبر کے آخری ایام نے پائیٹر کو شب و روز کی محنت و مشقت کے باعث رومانیہ میں تھکا ماندہ اور خستہ حال دیکھا لیکن اس کی تربیت آڑے وقت اس کے کام آتی۔ جنگ کی جگر پاش تباہ کاریاں اور ہولناک ہلاکت آفرینیاں وہ اپنی آنکھوں سے روزمرہ بغیر کسی خوف و ہراس کے دیکھ رہا تھا۔ اپنی زندگی سے بے نیازی اور بے پرواہی اس کی فطرت میں ودیعت ہو چکی تھی۔ تمام عمر اُسے خاموشی اور متانت سے احکام کی تعلیم دی گئی تھی۔ اور یہ سبق اس نے خوب سیکھ لیا تھا۔ لیکن ہر ہلاکت خیز دن اور بے خواب رات گو گریچن کی شیریں یاد اس کے ہمراہ رہتی تھی۔ محبت اس کے لئے گڑیوں کا کھیل نہ تھا۔ محبت سے پہلے اس کا دل فولاد کے مانند سخت رہ چکا تھا۔ اور بالآخر جب اس سنگلاخ زمین میں محبت کے محل کی بنیاد رکھی گئی۔ تو وہ استقدر مضبوط اور پائدار تھی۔ کہ تیز و تند طوفان کی زد میں بھی متزلزل نہ ہو سکتی تھی۔

یہی وجہ تھی۔ کہ احساس گُش جنگ طوفان زدہ دریا کی مانند ہر شے کو خس و خاشاک کی طرح بہلے لئے جا رہی تھی اس پر اثر انداز نہ ہو سکی تھا۔

کرسمس کے قریب وہ معمولی طور پر زخمی ہوا اور اسے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ گرتیجن کی تیمار داری اس کے زخموں کے لئے مرہم سے کم نہ تھی۔ اکثر وہ آگ کے سامنے بیٹھ کر ماضی و مستقبل پر غور کیا کرتے تھے۔ اور دہکتے ہوئے کوئلوں کی روشنی میں آرزوؤں سے لبریز حسین و مسرت آگیں۔ لیکن شبنم کی طرح گریز پا خوابوں کو ترتیب دیا کرتے تھے لمحاتِ مسرت اپنی ضرب المثل تیز رفتاری سے گزر گئے۔ اور ایک مرتبہ پھر وہ فرقت کے صدمے سہنے پر مجبور تھے :

پائیٹر نے کھڑکی سے پھلدار درختوں کی شاخوں کو جن سے بارش کے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ دیکھ کر کہا "اس مرتبہ تو ہم جی بھر کے باغ کی سیر نہ کر سکے :

"سرما کی شدت گزر جانے کے بعد بہار کے خوشگوار دن دور نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک مجھے رخصت کا حق حاصل ہو چکا ہو گا۔"

"خدانخواستہ اگر تمہیں چھٹی نہ ملی تو میں سیب ضرور بھیجوں گی"

"ہاں گذشتہ مسرتوں کی یاد کے لئے یہ نعمت غیر مترقبہ ہو گی۔"

۳

فروری کا مہینہ آیا اور چلا گیا۔ موسم بہار نے بھی یورپ میں قدم رکھا

لیکن کشت و خون کا بازار بدستور گرم رہا۔ لساوقات ہجوم مصائب سے گھبرا کر پائیٹر کے پائے استقلال میں بھی لغزش پیدا ہو جاتی۔ گردوپیش کے روح فرسا واقعات زندگی کی بے اعتباری اور بے ثباتی کے آئینہ دار تھے۔ ستمبر کے مہینے میں اس کے پہلو بہ پہلو لڑنے والے ساتھیوں میں سے ایک بھی میدان جنگ میں باقی نہ تھا۔ کچھ زخمی ہو چکے تھے۔ کچھ ناکارہ اور اکثر حشرات الارض کی خوراک بن چکے تھے۔ بھلا ہزاروں نفوس کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اُترتے دیکھ کر وہ خود کو روزمرہ کے آفات سے محفوظ کیونکر خیال کر سکتا تھا۔ آج سے ایک برس پہلے اُسے اپنی زندگی کی پرواہ نہ تھی۔ مگر اب وہ اپنی زندگی کا مالک خود نہ تھا۔ بلکہ گریچن اس کی مالک تھی۔

پائیٹر، اشرف المخلوقات کو جسے خدا نے دنیا میں امن قائم کرنے کے بھیجا تھا۔ خاک وخون میں غلطاں، کبھی قاتل اور کبھی مقتول دیکھتا، تو ان بہیمانہ افعال کے خلاف اس کی پاکیزہ روح صدائے احتجاج بلند کرتی اور اسے ان برے افعال سے باز رہنے کی تلقین کرتی لیکن یہ کمزوری کی گھڑیاں بھی گزر جاتیں۔ اور اس کی جابر طبیعت ضمیر کی اس آواز کو دبا دیتی۔

آہستہ آہستہ کڑاکے کا جاڑا ختم ہو گیا۔ اور مختصر سی بہار کے بعد چلچلاتی دھوپ کے دن آ گئے۔ اگست جب جرمنی میں خزاں کی آمد ہوتی ہے۔ اور زمستانی سرد ہوائیں باغوں کے پتوں میں سرسراہٹ اور

پژمردگی پیدا کرتی ہیں۔ پاینٹر کے لئے امیدوں کا مہینہ تھا۔ کیونکہ اسی مہینے سے اُسے رُخصت کا حق حاصل ہونے والا تھا۔

گربچن نے لکھا: "میرے پیارے پاینٹر! آنے والے دن یقیناً ہمیں ایک مرتبہ پھر یکجا دیکھیں گے۔ جدائی کے ایام بے شک ہمارے لئے سوہانِ روح ہیں۔ لیکن آنے والی مسرتوں کا دھیان ہمیں اس بات پر مجبور کرتا ہے۔ کہ قسامِ ازل کے خلاف ایک حرف شکایت بھی زبان پر نہ لائیں۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ تکالیف کے بعد معمولی سی خوشی بھی غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے۔ کہ زمانہ حال سے بے نیاز ہو کر مستقبل پر نگاہ رکھیں"۔

پاینٹر کی چھٹی منظور ہونے سے پیشتر انگریزی فوجوں نے فلینڈرز پر پے در پے شدت سے حملے کرنے شروع کر دیئے۔ اور پاینٹر کی رجمنٹ کو نہایت عجلت سے شمال کی جانب بھیج دیا گیا۔

روانگی سے تین روز بعد وہ عین میدانِ جنگ میں ایک پہرہ چوکی میں متعین تھا۔ یہاں ٹھہرنا موت سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ کیونکہ اگر غنیم فتحیاب ہو کر ان کی حد سے گزر بھی جائے۔ تو بھی انہیں وہاں ٹھہرے رہنا چاہیئے۔ ان کے لئے پسپائی کا کوئی حکم نہ تھا۔ اب اُن کی اُمیدیں صرف اس بات سے وابستہ تھیں کہ جب تک وہ کسی دوسری جگہ منتقل نہ کر دیئے جائیں دشمن حملہ نہ کرے۔

خوف کے دن ایک ایک کر کے گزرتے گئے۔ دونوں جانب سے سخت

گولہ باری ہوتی رہی۔ لیکن عام یلغار جس کا خطرہ تھا معرضِ وجود میں نہ آئی۔ اور مُردہ امیدوں میں پھر جان پڑنے لگی۔

ان کو اس محاذ سے سبکدوش ہونے میں دو دن باقی تھے۔ پائیٹر کو سامان رسد کے ہمراہ ایک بہت بڑا سیبوں کا پارسل گریچن کی جانب سے موصول ہوا۔ ساتھ ہی گریچن کا خط تھا جس میں تحریر تھا۔ "میرے پیارے پائیٹر! آخر مجھے بھی دکھائی دیتا ہے۔ کہ اس سال تم گھر نہیں آسکو گے۔ وعدے کے مطابق اپنے پیارے باغ سے سیب بھیج رہی ہوں۔ تمہاری جدائی میرے لئے بے حد مایوس کن اور شاق ہے۔ لیکن اِسی اُمید پر جی رہی ہوں کہ ایک نہ ایک دن جنگ ختم ہوگی اور اس وقت یہ فرقت کا زمانہ نہایت ہی مختصر معلوم ہوگا۔"

"نہایت ہی مختصر" پائیٹر نے الفاظ کو دہرایا۔ "نہایت ہی مختصر۔"

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

اگلی صبح سارجنٹ نے پائیٹر کو بیدار کرتے ہوئے کہا۔ "آج بمباری نہایت شدت سے ہو رہی ہے۔"

"وہاں آج قدرے شور زیادہ ہے۔ لیکن ایک گھنٹے کے اندر اندر معمول کے مطابق خود ہی خاموش ہو جائیں گے۔"

لیکن ہلاکت خیز گولہ باری کا سلسلہ پیہم بڑھتا گیا۔ توپوں کی دھنا دھن مشین گنوں اور رائفلوں کی بے پناہ بوچھاڑ، شور، چیخ پکار اور گرد و غبار کو دیکھ کر روزِ محشر کا منظر پیشِ نظر ہو رہا تھا۔

"زخمیوں کی مت پروا کرو" "سمت مت بھولو" "دیکھو وہ آرہے

ہیں"

پائنیٹر اور سارجنٹ ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں"۔

"وہ دیکھو فوج پسپا ہو رہی ہے سارجنٹ! کون لوگ ہیں یہ؟"

"اپنی فوج ہے جناب۔ اگر اجازت ہو تو ان پر توپ چھوڑ دوں۔ شاید بھگوڑوں کا رُخ بدل جائے"۔

"نہیں، کوڑے کرکٹ کو گزر جانے دو"۔

پائنیٹر بے باک نگاہوں سے حلیفوں کی پسپائی، توپوں کی آتشباری اور موت کے ہاتھوں انسانوں کی ذلت و رسوائی کو خاموشی سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ دشمن دھوئیں اور گرد و غبار کی اوٹ میں تھا۔ توپ کا استعمال بے سُود تھا کیونکہ دشمنوں کی بجائے اپنے آدمیوں کو مار گرانے کا زیادہ احتمال تھا چُپ چاپ انتظار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ وہ گریچن کو اُس کے محبت نامہ کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔

سپاہی سرگوشیاں کر رہے تھے۔

"قیاس تو کرو دشمن کون ہیں؟"

"خدا کرے کینچوس سکارچ نہ ہوں"۔

"وہ گرفتار نہیں کرتے"۔

"کیا ہم ڈٹ کر اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟"

"شاید"

پائنیٹر نے یہ سُن کر دانت پیسے اور زیرِ لب کہا "کسی جرمن کی قومی حمیت

یہ گوارا نہیں کر سکتی۔ کہ وہ گرفتار ہو کر قیدی بنے۔ تمہیں ہرگز قیدی نہ بننے دوں گا"۔

سارجنٹ نے چیخ کر کہا: "خندق کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں"۔

پائینٹر خط زمین پر پھینک کر کھڑا ہو گیا۔ بڑھتے ہوئے غنیم کی قطاریں کھڑکی میں سے مدھم دکھائی دے رہی تھیں۔ چند منٹ وہ نہایت ہوشیاری اور قابلیت سے توپ چلاتا رہا۔ اُس نے پیدل فوج کا ایک حصہ صحیح نشانے پر گولوں کی بوچھاڑ سے ریزہ ریزہ کر دیا۔ لیکن دشمن بھی غافل نہ تھا۔ دشمن کا ایک گولہ آ کر توپ کے قریب گرا۔ توپ اور سارجنٹ دونوں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

پائینٹر نے پُر عزم اور بلند آواز سے دست بدست لڑائی کی تیاری کا حکم دے دیا۔ خندق کے چاروں سمت دشمن قابض تھا۔ دستی بم ہاتھوں میں تھامے ایک ایک کر کے سپاہی موت کے منہ میں کود رہے تھے۔ آخری آدمی خوف سے کانپتا ہوا باہر نکلا۔ اور پائینٹر اس کے عقب میں روانہ ہونے کو تیار ہوا۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کو خیال آیا کہ اس عیار دُنیا نے چند مہینوں کے لئے کیا کیا خوش نما رنگ اس کے سامنے پیش کئے۔ مجسمۂ محبت گریچن کی تصویر، باغ کی سایہ دار روشوں کا خاکہ اور عیش کے بیتے ہوئے دن اُس کے پیش نظر تھے۔ اُسے خوش آئند اُمیدوں اور آرزوؤں کا دھیان آیا۔ گریچن کے فرستادہ سیب بغیر چھوئے رکھے ہی دھرے تھے . . . . . . پھر یہ ہجوم اُس کی آنکھوں سے اوجھل

ہو گیا، دنیا تاریک دکھائی دینے لگی۔ اور وہ چھلانگ لگا کر خندق سے باہر آ گیا۔

چند منٹ تک تو اُس نے دستی بموں اور پستول کی گولیوں سے دشمن کو روکے رکھا۔ پھر کثرت نے غلبہ پایا اور سنگینوں نے جی بھر کر خون پیا۔

(۴)

اسی شب اس نئے فتح کردہ محاذ کو مضبوط کرنے کی غرض سے دشمن نے مشین گن کا ایک دستہ یہاں متعین کر دیا۔ کیچڑ میں لت پت اور تھکے ماندے سپاہی دروازے پر جمع تھے۔

ایک نے کہا۔ "اسے فتح کرنے میں کافی دقت اٹھانی پڑی"۔

"ہاں! اور ذرا دشمن کے نقصان کا بھی اندازہ لگاؤ۔ ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں"۔

"اچھا خاصہ لالہ زار بن رہا ہے"۔

ایک افسر نے پکار کر کہا۔ "سپاہیو! ان تمام لاشوں کو گولہ باری سے پیدا شدہ گڑھوں میں پھینک دو۔ اس جگہ کو ہر طرح سے آرام دہ بنانے کی کوشش کرو۔ خیال رہے کہ ہمیں چند دن یہاں قیام کرنا ہے"۔

آج سے تین برس پہلے سپاہی لاشیں اُٹھاتے ہچکچاتے تھے۔ لیکن اب جنگ نے انہیں احساس ندامت سے بے نیاز کر دیا تھا۔ گھٹنوں تک اور غرّیاں مذاق کرتے ہوئے وہ چھلنی ہو چکی ہوئی لاشوں کو دفن کرنے میں مصروف ہو گئے۔

"ان میں سے ایک افسر ہے"۔

"خوب۔ اس کی چیزیں اس معرکے کی یادگار کے طور پر کام آئینگی۔ پچھلے سال "سوم" کے معرکے میں۔ مجھے ایک سنہری گھڑی ملی تھی لیکن جب میں زخمی ہؤا تو ہسپتال کے ایک حرام خور اردلی نے اڑالی"۔ افسر نے گرج کر کہا۔ "یادگاریں جمع کرنے کو کل بہت وقت ہوگا۔ آج پہلے ان جرمنوں سے نپٹ لو۔"

مشرق میں صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ سپاہی نہایت اشتیاق سے یادگاریں ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔ ہر نئی دریافت پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ سارجنٹ نے اچانک کہا۔ "اہاہا! ادھر آؤ سیبوں کے اس بکس کو دیکھو" سپاہی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس کی بڑھیا نے یہ تحفہ بھیجا ہوگا"۔

"اگر اس وقت وہ ہمیں یہ سیب کھاتے دیکھے تو کیا کہے"۔

"اس تحفے پر اس نے بڑی رقم خرچ کی ہوگی"۔

سارجنٹ نے کہا "جناب ایک آپ بھی کھا لیجئے"۔

افسر نے سیب لے لیا۔ مگر اس کا دھیان ادھر نہ تھا۔ وہ ساکت و صامت بیٹھا پانیٹھر کا ناتمام خط پڑھ رہا تھا۔ وہ جوان تھا۔ اور عشق کا زخم خوردہ بھی۔ خط کے چست فقروں اور موزوں لفظوں کے پیچھے وہ عشق کی آگ کے شعلے دہکتے دیکھ رہا تھا جن کے سامنے الفاظ محض چنگاریاں تھیں۔ عین اس کھڑکی کے سامنے جرمن افسر کی لاش دفنائی گئی تھی . . . .

مُردہ ۔ ۔ ۔ ۔ بے کار محض حشرات الارض کی خوراک بننے کے لئے گوشت کا ایک تودہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن چند گھنٹے پہلے وہ زندہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ محبت کے بحرِ بے کراں کا شناور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے بعد اُس نے اپنے ہاتھ میں سیب دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ لہُو کا ہے اور یہ "جنگ" ہے ؎

(۵)

گرد و غبار کے پردے سے آہستہ آہستہ فلینڈرز کے میدانوں میں جو خاک خون میں غلطاں اور لاشوں سے پٹے پڑے تھے ۔ خورشیدِ عالم تاب طلوع ہوا ۔ اور اُس کی سنہری کانپتی ہوئی کرنیں "عشاق کے باغ" میں بھی جو شب گزشتہ باد و باراں کے تھپیڑے کھا چکا تھا ۔ درخشاں ہوئیں ۔ گریچن نے کھڑکی میں سے جھانکا ۔ اور بارش میں بھیگے ہوئے اور ہوا میں تھرتھراتے ہوئے زرد پتوں کو دیکھ کر محسوس کیا ۔ کہ موسمِ گرما اس دُنیا کو خیرباد کہہ چکا ہے ۔ اور اب خزاں کی آمد آمد ہے ؎

"اب اُس کے آنے کی توقع موہوم ہے ۔ اگر وہ آئے بھی تو باغ میں وہ رونق نہ ہوگی ۔ بہار کے لئے اگلے سال کا انتظار ہی کرنا ہوگا چشم زدن میں سال گزر جاتا ہے ۔ شاید اُس وقت تک جنگ ختم ہو جائے"؎

حقیقت میں گریچن کے نقطۂ نظر سے جنگ ختم ہو چکی تھی ۔ لیکن خزاں کے بعد بہار کی اُمید نہ تھی ؎

رُوس

(۱)

نوشتۂ تقدیر:۔ مصنّفہ چیخوف ، مترجمہ راجہ عبدالعزیز

(۲)

انتقام :۔ مصنّفہ پشکن ۔ مترجمہ ملک عطاءاللہ کلیم

نوشتۂ تقدیر

جج اینڈریے کی حسین بیوی صوفیا پیٹرو وینا جس کی عمر پچیس سال کی ہوگی۔ اپنے دوست وکیل الین کے ساتھ جو اس کی ہمسائیگی میں موسم گرما بسر کر رہا تھا جنگل کے ایک راستے پر درختوں کی دو رویہ قطاروں کے درمیان ٹہل رہی تھی۔ شام کے پانچ بج چکے تھے۔ روئی کے گالے کی طرح سفید بادلوں پر ایسا سکون طاری تھا۔ گویا وہ چیڑ کے فلک بوس درختوں کی چوٹیوں میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ ہوا بند تھی اور سخت حبس ہو رہا تھا۔

سامنے کچھ فاصلے پر ریل کی پٹڑی جنگل کے راستے کو قطع کرتی ہوئی دائیں اور بائیں طرف نکل گئی تھی۔ اور وہاں ایک سپاہی اپنی بندوق کندھے پر اٹھا کر خبر نہیں کیوں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اس سے پرے ایک عظیم الشان سفید گرجا تھا جس کی پرانی چھت اور چھ بڑے بڑے گنبد نظر آ رہے تھے۔

صوفیا نے زمین کی طرف دیکھتے اور خزاں رسیدہ پتوں کو اپنی چھتری کی نوک سے کچلتے ہوئے کہا "مجھے تم سے یہاں ملنے کی بالکل توقع

نہ تھی۔ اور اب میں خوش ہوں کہ ہم یہاں اکٹھے ہو گئے ہیں۔ میں تم سے ایک نہایت اہم بات کہنا چاہتی ہوں۔ اور سنو! قطعی طور پہ کہنا چاہتی ہوں۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ آئی ون مہیلو وچ۔ کہ اگر تم فی الحقیقت میرے ساتھ محبت کرتے ہو تو میرا اس طرح پیچھا کرنا چھوڑ دو۔ تم سائے کی طرح ہر وقت میرے تعاقب میں رہتے ہو۔ ہر وقت میری طرف دیکھتے رہتے ہو۔ اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہارے دیکھنے کا انداز اچھا نہیں ہوتا۔ تم طرح طرح سے اظہارِ محبت کرتے ہو۔ اور عجیب عجیب مضمون کے خط لکھتے ہو، اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اور میں نہیں جانتی۔ یہ سلسلہ کہاں اور کیسے ختم ہوگا! آخر اس سے کیا حاصل ہے؟"

الیتن خاموش رہا۔ صوفیا نے چند قدم چلنے کے بعد سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اور یہ تمہاری پانچ سال کی دیرینہ دوستی دو یا تین ہفتوں کے مختصر سے عرصے میں کس طرح پوری تکمیل کے ساتھ محبت کی صورت اختیار کر گئی ہے؟ میں تمہاری اس ذہنیت کو سمجھنے سے قاصر ہوں آئی ون مہیلو وچ"۔

صوفیا نے کنکھیوں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ الیتن سر اُٹھا کر سفید بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس شخص کی طرح خشمناک برہم اور مصروفِ تخیل معلوم ہوتا تھا۔ جو کوئی غیر معقول مہمل اور بیہودہ بات سننے پہ مجبور ہو رہا ہو۔

صوفیا نے اپنے کندھوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا: "میں حیران ہوں کہ تم خود کیوں اس بات کو محسوس نہیں کرتے۔ تمہیں ضرور محسوس کرنا چاہیئے۔ کہ یہ کھیل جو تم کھیل رہے ہو، قطعاً درست نہیں ہے۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ اور میں اپنے خاوند سے محبت کرتی ہوں اور اس کی ہر طرح سے عزت کرتی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری ایک بیٹی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سب بے معنی ہے؟ اس کے علاوہ میرے قدیم دوست ہونے کی وجہ سے تم بخوبی جانتے ہو۔ کہ مَیں اپنے خاندان کی زندگی کو کس نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادی ہوں اور نکاح کی عزت اور حُرمت میرے نزدیک کس قدر ہے۔"

الیمن نے غصّہ میں آکر گلا صاف کیا۔ اور ایک آہ بھری، اور بولا۔ "نکاح کی عزت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ! اے خدا!"

"ہاں ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ میں اپنے خاوند سے محبت کرتی ہوں۔ اور اپنے گھر کی پُر امن زندگی کو ہر حال میں اہم سمجھتی ہوں۔ میں اپنی جان دے دُوں گی لیکن اینڈریے اور اُس کی بیٹی کے لیے کسی ناخوشی کا باعث نہ بنوں گی۔ ۔ ۔ ۔ میں تم سے درخواست کرتی ہوں۔ آئی ون میہلو وچ کہ خدا کے لئے میرے امن و سکون میں خلل مت ڈالو۔ ہم ایک دوسرے کے پھر اسی طرح مخلص دوست بن جاتے ہیں۔ جیسے ابتدا میں ہوا کرتے تھے۔ یہ آہیں اور گرم گرم سانس لینا چھوڑ دو۔ یقین کرو دوست کہ یہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔ اب فیصلہ ہو گیا ہے۔ بس اسے ختم کر دو۔ اس

کے متعلق اب ایک لفظ تک نہ کہو۔ آؤ اب کسی اور موضوع پر گفتگو کریں"۔

صوفیا نے ایک دفعہ پھر نظر چرا کر ایلین کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور نگاہیں اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ وہ غصے میں اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ صوفیا کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آئی۔ کہ ایلین کیوں برہم اور غضبناک ہو رہا ہے۔ لیکن اُس کے چہرے کی زردی اور افسردگی نے اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگائی۔

صوفیا نے شفقت آمیز اور پر خلوص انداز میں کہا "خفا کیوں ہوتے ہو؟ آؤ دوستی کی تجدید کریں۔ تم افرار کرتے ہو؟ یہ لو، یہ ہے میرا ہاتھ"۔

ایلین نے اس کا چھوٹا سا نرم ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا دبایا اور آہستہ آہستہ اپنے ہونٹوں کی طرف لے گیا۔

اُس نے کہا "میں نادان نہیں ہوں۔ مگر میں اُس عورت کی دوستی سے ہرگز باز نہیں رہ سکتا جس سے میں محبت کرتا ہوں"۔

"بس بس اس کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہم بیٹھنے کی جگہ پر پہنچ چکے ہیں۔ آؤ یہاں بیٹھ جائیں" صوفیا کی روح پر سے ایک بوجھ اُتر گیا۔ اور آزادی کا ایک سرور انگیز اور شیریں احساس اس پر طاری ہو گیا۔ نہایت مشکل اور نازک بات کہی جا چکی تھی۔ دردناک سوال حل کر کے

ختم کر دیا گیا تھا۔ اب وہ آزادی سے سانس لے سکتی تھی اور ایلین کی طرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتی تھی۔ اس نے ایلین کی طرف دیکھا۔ وہ اس مرد پر جو اس کے دامِ محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ یوں فتح حاصل کر لینے کے احساس سے دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی اور اپنی تعریف کر رہی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر بہت مسرور تھی کہ ایلین جیسا عظیم الجثہ، تناور، مضبوط، تیز فہم، تہذیب یافتہ اور روایتی مالدار اور ہوشمند آدمی جس کا چہرہ ابھی ابھی خشم آلودہ ہو رہا تھا اب کس طرح افسردگی میں سر جھکا کر نہایت اطاعت کے ساتھ اس کے قریب بیٹھ گیا ہے۔ تھوڑی دیر تک دونوں بالکل خاموش رہے۔

آخر ایلین نے چلا کر کہا۔ "نہیں ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ تم ایسے کرتی ہو۔ جیسے میں کوئی نادان بچہ ہوں۔ اگر تمہیں اپنے شوہر سے محبت ہے۔ اور تم نکاح کی حرمت کا لحاظ کرتی ہو۔ تو یہ سب باتیں تمہارے بتانے کے بغیر ہی مجھے معلوم ہیں۔ بلکہ شاید میں اس سے بھی زیادہ تمہیں بتا سکوں۔ میں صدقِ دل اور خلوصِ قلب کے ساتھ تمہارے سامنے یہ اقرار کرتا ہوں۔ کہ تمہارے متعلق میرا یہ طرزِ عمل میرے نزدیک بھی مجرمانہ ہے۔ اس سے زیادہ اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ لیکن وہ باتیں کہنے سے کیا حاصل جنہیں ہر شخص نہایت اچھی طرح جانتا ہو۔ مجھے ایسے عام اور مہمل الفاظ سے بہکانے کی بہ نسبت تمہارے لئے یہ کہیں زیادہ بہتر ہوتا کہ تم مجھے صرف یہ بتا دیتیں۔ کہ اس کے سوا مجھے اور کیا کرنا چاہیے۔"

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے"

تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ میں نے پانچ مرتبہ یہاں سے جانے کی کوشش کی ہے۔ اور ہر مرتبہ نصف راہ سے لوٹ آتا رہا ہوں۔ میں تمہیں راستے کے ٹکٹ دکھا سکتا ہوں۔ میں نے وہ سب سنبھال کر رکھے ہیں میں اپنے آپ کو تم سے علیحدہ کر دوں، یہ بات قطعاً میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں اس کے خلاف جدوجہد کر رہا ہوں۔ اور نہایت خوفناک جدوجہد کر رہا ہوں۔ لیکن میری تمام کوششیں کس کام کی ہیں۔ جب مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں ہے۔ جب کہ میں اتنا کمزور ہوں۔ اتنا بزدل! میں فطرت کے خلاف جنگ نہیں کر سکتا۔ تم سمجھ رہی ہو؟ فطرت کے خلاف میری تمام مساعی بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ مجھے پکڑے رکھتی ہے۔ اور روکے رکھتی ہے۔ آہ! یہ ذلیل اور حقیر کمزوری!

ایلین کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ کھڑا ہوا اور جائے نشست کے نزدیک ٹہلنے لگا۔

اس نے اپنے ہاتھوں کو بھینچتے ہوئے کہا "میں ایک کتے کی سی ذلت محسوس کرتا ہوں۔ میں اپنے آپ سے نفرت کرتا ہوں۔ اور اپنے وجود کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں! میرے خدا! میں کیوں ایک نادان آوارہ لڑکے کی طرح ایک دوسرے شخص کی بیوی سے اظہارِ محبت کرتا ہوں! احمقانہ خط لکھتا ہوں۔ اور یوں اپنے آپ کو رسوا ذلیل کرتا

ہوں"۔ ایلین نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ کچھ بڑبڑایا اور بیٹھ گیا
"اور پھر تمہارا یہ فریب اور یہ ریاکاری!" وہ شدّتِ اضطراب میں برابر یہ کہتا
تھا" اگر تم میرے اس قابلِ نفرت طرزِ عمل کو فی الحقیقت ناپسند کرتی
نہیں۔ تو یہاں کیوں آ گئیں؟ کونسی چیز تمہیں کھینچ کر یہاں تک لے
آئی؟ اپنے خطوں میں میں نے تم سے ایک سیدھے، صحیح اور بے
تکلف جواب کی درخواست کی تھی . . . . . . ہاں، یا نہیں۔ مگر بجائے
صاف اور سیدھے جواب کے تم ہر روز اس قسم کی اتفاقی ملاقاتوں کی تدبیریں
نکالتی رہتی ہو۔ اور ناداموں کے بے سروپا مقولے سُنا سُنا کر مجھے مطمئن
کرنے کی عبث کوشش کرتی رہتی ہو!"

صوفیا ڈر گئی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور اس نے معاً اپنے آپ
کو ایسی حالت میں پایا۔ جیسے کوئی سنجیدہ اور شائستہ عورت یکلخت
اپنے آپ کو عریاں پا کر محسوس کرتی ہے۔ اُس نے کہا . . . . . .

"مجھے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمہیں میرے متعلق یہ شک ہے۔ کہ میں
تمہارے ساتھ کھیل رہی ہوں۔ میں نے تم کو ہمیشہ سیدھا، صحیح اور
بے تکلف جواب دیا ہے۔ اور . . . . . . صرف آج میں نے تم سے
درخواست کی ہے۔ کہ . . . . . . "

"آہ!! ایسے معاملات میں کوئی کسی سے درخواست بھی کرتا ہے؟ اگر
تم صرف ایک بار یہ کہہ دیتیں کہ بس اب یہاں سے چلے جاؤ۔ تو میں
مدّت سے جا چکا ہوتا۔ لیکن تم نے یہ بھی کبھی نہیں کہا۔ تم نے ایک دفعہ

بھی مجھے صاف و صریح جواب نہیں دیا۔ یہ تمہاری عجیب مذبذب حالت ہے، ہاں، یقیناً یا تو تم مجھ سے کھیل رہی ہو یا . . . . "

الین نے جملہ ختم کئے بغیر سر اپنے ہاتھوں پر جھکا دیا۔ صوفیا اپنے دماغ میں اس طرزِ عمل پر تبصرہ کرتی رہی۔ جو اُس نے الین کے ساتھ شروع سے لے کر آخر تک روا رکھا تھا۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا۔ کہ اپنے قول و فعل ہی میں نہیں . . . . . .

بلکہ اپنے پوشیدہ ترین خیالات میں بھی اُس نے الین کے اظہارِ محبت کی مخالفت کی تھی۔ مگر پھر بھی وہ محسوس کرتی تھی کہ اس دکالت پیشہ نوجوان کی باتوں میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور موجود ہے اپنے ذہن پر توجہ ڈالنے کے باوجود بھی وہ نہ سمجھ سکی۔ کہ وہ حقیقت کیا ہے۔ اور الین کے شکووں اور شکایتوں کا جواب اُس سے کسی طرح بن نہ آتا تھا۔ خاموشی کو خلافِ تہذیب سمجھ کر اُس نے اپنے کندھوں کو جھٹکا دیا اور کہا

تو اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ قابلِ الزام مَیں ہوں"۔

الین نے آہ بھر کر کہا :"تمہاری بے وفائی کے لئے مَیں تمہیں الزام نہیں دیتا۔ جب میں نے یہ کہا تھا تو میرا مطلب یہ نہ تھا۔ تمہاری بیوفائی بالکل قدرتی ہے۔ اور برمحل۔ اگر سب لوگ آپس میں اتفاق کر لیں اور فوراً ایک دوسرے کے سچے اور مخلص دوست بن جائیں تو دنیا کا یہ سارا نظام درہم برہم نہ ہو جائے۔

اس وقت صوفیا فلسفیانہ خیالات پر دماغ سوزی کرنے کیلئے کسی

طرح بھی تیار نہ تھی۔ لیکن وہ اندازِ گفتگو کی تبدیلی سے خوش ضرور تھی۔ اُس نے پوچھا "لیکن کیوں؟"

"کیونکہ صرف جاہل عورتیں اور وحشی جانور ہی وفادار اور مخلص ہو سکتے ہیں۔ جہاں تہذیب آئی۔ اور اُس نے عصمت و عفت جیسی سہولتوں کا تقاضا کیا اخلاص رخصت ہو گیا"۔

الین نے طیش میں آکر اپنی چھڑی ریت میں گھونپ دی۔ صوفیا اس کی باتیں سنتی رہی۔ اگرچہ اُن کا بیشتر حصّہ اس کے فہم و ادراک سے بالاتر تھا۔ لیکن وہ اس کی گفتگو کو پسند کرتی تھی۔ سب سے بڑھ کر جو خیال اس کے لئے فرحت بخش تھا۔ اور جس سے وہ بیحد محظوظ تھی یہ تھا کہ وہ۔ ایک معمولی ذہن و فکر کی عورت۔ ایک نہایت عقلمند آدمی کے ساتھ۔ دانش و حکمت کے موضوع پر گفتگو کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ الین کے منقش اور نوجوان چہرے کی حرکات و سکنات سے بھی بہت لُطف اُٹھا رہی تھی۔ جو ابھی تک زندہ دلِ اور غضبناک تھا۔ وہ اس کی گفتگو کا معتدبہ حصّہ سمجھنے سے قاصر رہی۔ اگر اس میں سے وہ کچھ سمجھ سکی۔ تو وہ صرف اُس کی وہ دلکش و جاذب مردانگی اور دلیری تھی جس سے دورِ جدید کے نوجوان بلا تکلّف و تامّل بڑے بڑے سوالوں کا ایک لمحہ میں فیصلہ کر کے فوراً قطعی نتیجہ وضع کر لیتے ہیں۔ اُسے یکایک محسوس ہوا۔ کہ اُس کا دل الین کی تعریف و سفارش کر رہا ہے۔ اور اس احساس سے وہ کانپ اُٹھی اور بولی:-

نے مجھے معاف کر دو۔ مگر میں سمجھ نہیں سکی کہ کون سی بات تمہیں بیوفائی کا ذکر کرنے پر مجبور کر رہی ہے؟ میں ایک بار پھر اپنی درخواست کو دُہراتی ہوں میرے اچھے اور سچے دوست بن جاؤ۔ اور مجھے تنہا چھوڑ دو! میں نہایت بے تابی کے ساتھ یہ استدعا کرتی ہوں۔"

لینن نے آہ بھر کر کہا "بہت اچھا میں ایک مرتبہ پھر کوشش کروں گا میں اس کے لئے انتہائی کوشش کرنے پر آمادہ ہوں ...

لیکن مجھے صرف یہ شک ہے۔ کہ میری کوششیں بارآور بھی ہوں گی یا نہیں؟ یا میں ایک گولی اپنے دماغ کے پار کر دوں گا یا کسی چیز کے چند گھونٹ پی لوں گا۔ یقیناً میں کسی نہایت خطرناک انجام کو پہنچوں گا دُنیا میں ہر چیز کی کوئی انتہا ضرور ہے ——— فطرت کے خلاف جنگ کرنے کا انجام بھی کچھ ضرور ہے۔ مجھے بتاؤ کہ انسان دیوانگی کے خلاف کیسے جنگ کر سکتا ہے؟ اگر تم شراب کے چند گھونٹ حلق سے نیچے اُتار لو۔ تو اُس کے نشہ آور اثرات کے خلاف کیسے جنگ کر سکتی ہو؟ اب میں کیا کروں۔ جب تمہارے تصور کا ایک پیکر میری رُوح میں پیدا ہو چکا ہے؟ رات اور دن لگاتار میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے آہ! اُس دلکش سرو کے مانند جو اس وقت میرے سامنے کھڑا ہے؟ آؤ! اور مجھے بتاؤ کہ دُنیا میں وہ کونسا مشکل ترین اور دشوار ترین مرحلہ ہے۔ جو مجھے اس ذلت اور شکستہ حالی سے نجات دلا سکتا ہے جس کے لئے میرے تمام خواب، میری خواہشیں اور میرے تمام خیالات

میرے اپنے نہیں رہے۔ بلکہ کسی ایسی ہستی کے ہو چکے ہیں۔ جس نے مکمل طور پر مجھ پر قبضہ حاصل کر لیا ہے؟ میں تم سے محبت کرتا ہوں، آہ! محبت کے وفور نے مجھے بالکل بے اختیار کر دیا ہے۔ میں نے اپنا کام کاج ترک کر دیا ہے۔ اور ان تمام لوگوں کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ جو مجھے عزیز ہیں۔ میں نے اپنے خدا کو بھی بھلا دیا ہے۔ یقین کرو کہ میں نے زندگی بھر میں اتنی شدّت کے ساتھ کبھی محبت نہیں کی۔"

صوفیا جس کو بالکل اُمید نہ تھی کہ ان کی گفتگو اس طرح پہلو بدل لے گی جھٹ ایلین سے علیحدہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اور خوف زدہ ہو کر ایلین کی طرف دیکھنے لگی۔ ایلین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور اُس کی صورت التجا، منت اور تشنگی کا اظہار کر رہی تھی۔

اُس نے اپنی آنکھوں کو صوفیا کی بڑی بڑی اور سہمی ہوئی آنکھوں کے قریب لاتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم کس قدر حسین ہو! میری رُوح کے اس وقت پرخچے اُڑے جا رہے ہیں۔ لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اپنی رُوح کو اس غیر متناہی عذاب میں ڈال کر اپنی ساری بقیہ زندگی یہیں بیٹھے بیٹھے گزار سکتا ہوں۔ تا کہ تمہاری آنکھوں میں جھانکتا رہوں۔"

"لیکن . . . . . . آہ! چُپ رہو۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں۔"

صوفیا اپنی گھبراہٹ کو محسوس کر کے ایلین کو خاموش کرنے کے لئے

کوئی فوری بات کہنے کی کوشش کرنے لگی۔ آخر فیصلہ کُن انداز سے بولی "میں یہاں سے چلی جاؤں گی"۔ لیکن اس سے پہلے کہ اُسے اُٹھنے کے لئے حرکت کرنے کا موقع ملتا۔ اُس نے دیکھا کہ ایلن اُس کے سامنے گھٹنوں کے بل جُھکا ہوا تھا۔ . . . . . . اور اُس کے گھٹنوں کو اپنی آغوش میں لے رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لگاتار دیکھ رہا تھا۔ اور نہایت دل سوزی، جوش اور فصاحت کے ساتھ شیریں لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ وحشت اور خوف میں وہ اُس کے الفاظ نہ سُن سکی۔ اب اس خطرناک لمحے میں، جبکہ اُس کے گھٹنے نہایت پُر لُطف طریقہ سے دبائے جانے پر کسی گرم گرم اور آسام دِہ غسل کی یاد تازہ کر رہے تھے . . . . . .

وہ ایک تکلیف وہ خلش کے ساتھ کسی خاص خیال سے مرعُوب ہو کر اپنے تمام پوشیدہ احساسات کو کھول کر بیان کر دینے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اُسے بے حد طیش آ رہا تھا۔ کہ اس کا دل بجلئے شریفانہ جذبات کے اظہار پر قادر ہونے کے ایک بے خبر شرابی کی طرح مرعُوب ہو رہا ہے پیچھے، ضرور اس کی رُوح کی گہرائیوں میں اس کی اپنی خودار شخصیت کی ایک رمق نہایت خوفناک اور مہلک انداز میں اسی کی تضحیک کر رہی تھی۔ تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتیں۔ کیا تمہیں یہیں رہنا چاہتے ہو؟

اچھا؟

ذہن میں کوئی بات تلاش کرتے ہوئے صوفیا بالکل نہ سمجھ سکی کہ وہ اپنا ہاتھ جس کے ساتھ الین کے ہاتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ کھینچ کر کیوں علیحدہ نہیں کر سکتی۔ اور کیوں وہ خود بھی اپنے ارد گرد مجرمانہ طور پہ نظر دوڑا کر یہ دیکھ رہی ہے کہ ان کی اس حالت پہ کسی کی نظریں تو نہیں پڑ رہیں۔ بادل کے ٹکڑے اور صنوبر کے درخت بالکل بے حس و حرکت کھڑے ان کی حرکات اس طرح غور سے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بوڑھا اور تجربہ کار ملازم مدرسے کے لڑکوں کی شرارتیں دیکھتا رہتا ہے۔ لیکن جیسے راز کو پوشیدہ رکھنے کے لئے رشوت دے دی جاتی ہے۔ سنتری ریل کی پٹڑی کے قریب بدستور کھڑا تھا۔ اور بظاہر انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

صوفیا نے دل میں کہا "چلو۔ اُسے دیکھنے دو۔"

پھر مایوسانہ انداز میں الین کی طرف دیکھ کر بولی "لیکن . . . . لیکن سُنو۔ اس سے کیا حاصل ہو گا؟ اس کا انجام کیا ہو گا؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں نہیں جانتا" الین نے یہ کہتے ہوئے صوفیا کا ناگوار سوال ہوا میں بکھیر دیا۔ انہوں نے ریل گاڑی کے انجن کی تیز سیٹی سُنی۔ روزمرّہ کی آزاد دُنیا کی اس ظالم اور بے موقع آواز نے صوفیا کو بیدار کر دیا۔ اُس نے جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا "میں اب نہیں ٹھہر سکتی . . . . . اس وقت مجھے گھر میں موجود ہونا چاہئے تھا۔ گاڑی آ رہی ہے . . . . . اینڈریے اِسس

گاڑی پہ آ رہا ہے!! اب اسے کھانا کھانا ہے"۔

جب صوفیا ریل کی پٹڑی کی طرف مڑی، تو اُس کا مُنہ آگ کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ انجن آہستہ آہستہ رینگتا ہوا گزر گیا۔ پھر گاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ مسافر گاڑی نہ تھی۔ جیساکہ اس نے خیال کیا تھا۔ بلکہ مال گاڑی تھی۔ سفید گرد کے عقب میں چھکڑے ایک تار میں انسان کی زندگی کے دنوں کی طرح پروتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اور یُوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

مگر آخر کار گاڑی نکل گئی۔ اور آخری ڈبہ گارڈ اور روشنی سمیت درختوں کے پیچھے غائب ہوگیا۔ صوفیا تیزی کے ساتھ مُڑی اور الین کی طرف دیکھے بغیر جلدی جلدی قدم اُٹھاتی ہوئی راستہ پہ چلی گئی۔ اب اُسے اپنی ذات پہ اختیار حاصل ہو چکا تھا۔ شرم سے اُس کے چہرے کا رنگ قرمزی ہو رہا تھا۔

خفت کا احساس جو اس پہ غالب آ رہا تھا الین کی وجہ سے نہ تھا ——— نہیں، بلکہ خود اپنی کمزوری کی وجہ سے، اُس بے حیائی کی وجہ سے جس سے اُس نے، ایک پاکدامن، باعصمت اور بلند خیال عورت نے، ایک مرد کو جو اس کا خاوند نہ تھا۔ اپنے گھٹنوں سے چمٹ جانے کی اجازت دے دی تھی۔

اب اُس کے سر میں صرف ایک خیال تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے وہ اپنے گھر میں اور اپنے گھر کے لوگوں میں، پہنچ جائے۔ الین اُس کے

ساتھ قدم بقدم نہیں چل رہا تھا۔ صاف اور کھلے راستے سے گزر کر ایک تنگ راستے میں داخل ہوتے وقت اُس نے جلدی سے ایلین کی طرف پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر سوائے اُس ریت کے جو ایلین کے گھٹنوں پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ اور کچھ نہ دیکھ سکی۔ اور ہاتھ کے اشارے سے اُس نے اُسے تعاقب کرنے سے منع کر دیا۔

گھر پہنچ کر صوفیا متواتر پانچ منٹ تک اپنے کمرے کے درمیان بالکل بے حس و حرکت اور خاموش کھڑی رہی۔ پھر اُس نے پہلے کھڑکی کی طرف دیکھا اور اس کے بعد لکھنے کی میز کی طرف . . . .

اس نے اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے کہا "اے رذیل عورت! اے رذیل عورت! " اپنی تحقیر اور نمایاں کرنے کے لئے اس نے سب واقعہ پوری اور صحیح تفصیل کے ساتھ یاد کیا۔ اگرچہ وہ شروع سے لے کر آخر تک ایلین کے اظہارِ محبت کی منّی لغت کرتی رہی تھی۔ لیکن اُس نے یہ سب واقعہ بغیر کسی تعصّب کے دوبارہ اپنی چشمِ تصوّر کے سامنے لانا چاہا۔ کوئی پوشیدہ جذبہ اُسے ایلین کی ملاقات کے لئے مجبور و بیقرار کرتا رہا تھا۔ اور ۔ اور کیا ؟ جب ایلین اُس کے قدموں پر گرا ہوا تھا تو اس نے بے حد لطف اُٹھایا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ بلا تکلف اپنے ذہن میں جمع کیا اور شرم کے مارے اس کا سانس پھول گیا۔ اور وہ اپنے گال پر ایک چپت مارنا چاہتی تھی۔

"بیچارا اینڈریے!" اس نے اپنے خاوند کا خیال آنے پر اپنے

چہرے پر حتی المقدور رحم آمیز اثرات ظاہر کرتے ہوئے کہا "واریا! میری بیکس چھوٹی بچی نہیں جانتی کہ اس کی ماں کس قسم کی عورت ہے۔ مجھے معاف کردو میرے عزیزو! میں تم سے بے حد محبت کرتی ہوں...

... بے اندازہ محبت!"

اور اپنے تئیں یقین دلانے کے لئے کہ وہ ابھی تک "بہترین بیوی اور بہترین ماں" کہلانے کی مستحق ہے۔ اور حرمتِ نکاح، جس کا ذکر اس نے ایلین کے رُو برو، نہایت پُرزور لفظوں میں کیا تھا۔ اسی طرح قائم ہے۔ صوفیا لپک کر باورچی خانہ میں گئی۔ اور باورچی کو سخت سُست کہنے لگی۔ کہ اس نے اینڈرے کے لئے ابھی تک کھانے کی میز کیوں آراستہ نہیں کی۔ اس نے اپنے بھوک سے بے تاب اور تھکے ماندے خاوند کا تصور کیا۔ بلند آواز میں اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور کھانے کی میز اپنے ہاتھوں سے آراستہ کی۔ جو اُس نے کبھی نہ کی تھی۔ پھر اُس نے اپنی بیٹی واریا کو بلایا۔ اور اسے گود میں اُٹھا کر نہایت پُر آرزو انداز میں سینے سے لگا لیا۔ اُسے بچی بوجھل اور سرد محسوس ہوئی۔ مگر اُس نے دل کو یہ یقین کرنے سے باز رکھا۔ اور بچی سے باتوں میں مشغول ہوگئی۔

"تمہارا باپ کیسا اچھا مہربان اور باعزت آدمی ہے۔"

مگر جب تھوڑی دیر بعد اینڈرے آیا تو صوفیا نے اپنی مرضی کے خلاف بڑی مشکل سے اُسے خوش آمدید کہا۔

جھوٹے اور باطل احساسات کا ایک طوفان اُمڈ کر اُس پر سے گزر چکا تھا۔ لیکن صوفیا کے لئے کوئی نتیجہ کلیۃً پیچھے نہ چھوڑ گیا تھا۔ بلکہ اپنے دروغ وکذب سے اُس کے دل میں ہیجان اور اس کے جذبات میں اشتعال پیدا کر گیا تھا۔ وہ اپنے رُوحانی آلام و مصائب میں گھری ہوئی کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی۔ انسان صرف مصیبت میں پھنس کر یہ معلوم کرتا ہے کہ اپنے جذبات پر قدرت قائم رکھنا کس قدر دشوار ہے۔ صوفیا نے محسوس کیا کہ وہ اوہام کی ایک ایسی گتھی میں پھنسی ہوئی ہے۔ جسے سلجھانا اسی قدر دشوار ہے۔ جتنا چڑیوں کو تیزی کے ساتھ اُڑتے ہوئے ایک جھنڈ میں سے گِننا مشکل ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے آگاہ ہوکر کہ وہ اپنے خاوند کو دیکھ کر مسرور نہیں ہوئی۔ اور وہ اُس کے کھانے کا طریقہ بھی ناپسند کیا کرتی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اُس کے دل کی گہرائی میں خاوند کی نفرت کا جذبہ آہستہ آہستہ اُٹھ رہا ہے۔

اینڈرے بھوک اور تکان سے بے تاب ہوکر بھُنے ہوئے گوشت کی طرف گرا۔ اور شوربے کے انتظار میں پلکیں گھماتا رہا اور نہایت شوق سے کھاتا ہوا چاپ چاپ کرتا رہا۔

صوفیا نے خیال کیا "میرے خدا! مَیں اس سے محبت کرتی ہوں اور اس کی عزت کرتی ہوں۔ لیکن کھانا کھاتے ہوئے اس کا مُنہ اس قدر قابلِ نفرت آواز پیدا کیوں کرتا ہے؟" اس کے خیالات کی بے ربطی اس کے جذبات کی بے ترتیبی سے کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ اُن ناتجربہ کار لوگوں

کی طرح جوناخوشگوار خیالات کے خلاف جد وجہد نہیں کر سکتے ۔صوفیا اپنے دُکھ کو محسوس کرنے سے جس قدر گریز کرتی تھی ۔ اسی قدر صفائی کے ساتھ الین اُس کے گھٹنوں پہ ریت ، گاڑی اور سفید بادل اس کی چشمِ تصوّر کے سامنے آجاتے تھے ۔

اُس نے اپنے آپ کو زجر و توبیخ کرتے ہوئے کہا " اور آج دوپہر کو میں ایک احمق کی طرح وہاں کیوں چلی گئی تھی ؟"

اور کیا میں واقعی اس قدر کمزور ہوں کہ مجھے اپنے آپ پر قطعاً اختیار نہیں ہے " ۔

خوفزدہ ہونا خطرے کے احساس کو بڑھا دیتا ہے ۔ اینڈرے کھانا ختم کرنے کے قریب تھا ۔ اور اس اثنا میں صوفیا نے مصمّم ارادہ کر لیا تھا ۔ کہ وہ سب معاملہ اپنے خاوند کے سامنے بے کم وکاست بیان کر دے گی ۔ اور اس خطرے سے آزاد ہو جائے گی ۔

صوفیا نے کھانا کھانے کے بعد جب اُس کا خاوند سونے کے لئے کوٹ اور بوٹ اُتار رہا تھا ، کہا " مجھے تم سے ایک نہایت ضروری بات کہنی ہے اینڈرے ! "

" اچھا ؟ "

" آؤ ۔ یہ جگہ چھوڑ دیں ! "

" ہوں ! . . . . . . اور جائیں کہاں ؟ اتنی جلدی واپس شہر میں جانے کی کیا پڑی ہے ! "

"سیر کے لئے ......" اینڈرے نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "مَیں بھی سَیر کے خواب دیکھتا رہتا ہوں۔ لیکن روپے کا انتظام کیسے ہو گا۔ اور مَیں دفتر کا کام کس کے سپرد کروں؟" پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا:۔

"بے شک تم اُکتا گئی ہو گی۔ اگر پسند کرو تو فی الحال تم اکیلی ہو آؤ"۔
صوفیا نے اس سے اتفاق کر لیا۔ اور معاً اسے خیال گزرا کہ الین یہ خبر سُن کر بہت خوش ہو گا۔ اور اسی گاڑی میں، اُسی ڈبے میں اُس کے ساتھ بیٹھ کر سفر کرے گا .... اُس نے سوچا اور اپنے خاوند کی طرف دیکھا جو مطمئن تھا۔ اور ابھی تک کسی قدر افسردہ معلوم ہوتا تھا کسی وجہ سے صوفیا کی آنکھیں اینڈرے کے پاؤں پر جم گئیں ـــــــــ

چھوٹے چھوٹے حسین پاؤں لکیردار خوبصورت جرابوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ لیکن ہر جراب کے سرے پر ایک بدنما دھاگا لٹک رہا تھا۔

پردے کے اس پار ایک مکھی بھنبھنا رہی تھی۔ اور بار بار کھڑکی کے پٹ کے ساتھ ٹکراتی تھی، صوفیا نے جرابوں کے دھاگے کی طرف دیکھا مکھی کی ناخوشگوار بھنبھناہٹ سُنی۔ اور اپنے سفر کے تصور میں کھو گئی .... کس طرح وہ رات دن الین کے رُوبرُو بیٹھی رہا کرے گی۔ اور وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اُس کے چہرے سے آنکھیں

نہ ہٹلئے گا۔ کس طرح وہ اپنی کمزوری کو محسوس کر کے طیش کھائے گا۔ اپنے روحانی آلام سے متاثر ہو کر زرد ہو جائے گا۔ کبھی اپنے آپ کو نادان اور احمق کہے گا۔ کبھی اُسے سخت الفاظ سے مخاطب کرے گا۔ اور کبھی اپنے بال نوچے گا۔ اور جب تاریکی چھا جائے گی۔ اور تمام مسافر سو چکے ہوں گے۔ یا کسی سٹیشن پہ تھوڑی دیر کے لئے اُترے ہوں گے۔ تو وہ موقع پا کر اُس کے سامنے دوزانو ہو کر جھک جائے گا۔ اور اُس کے گھٹنوں سے ہم آغوش ہو جلئے گا۔ جیسے وہ اُس روز جنگل میں ہو گیا تھا۔ . . . .

صوفیا نے اپنے آپ کو جھٹک کر اس خواب سے بیدار کر دیا۔

اُس نے کہا" سنو۔ میں تنہا نہ جاؤں گی۔ تمہیں میرے ساتھ ضرور چلنا ہوگا۔"

اینڈرے نے آہ بھر کر کہا" نادان صوفی چکا۔ انسان کو تنلبے سمجھ نہیں ہونا چاہئے۔ اور ناممکن باتوں کے لئے ضد نہیں کرنی چاہئے"۔

صوفیا نے دل میں کہا" جب تم حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ گے۔ تو تم میرے ساتھ ضرور چلو گے" بہر کیف اُس نے جانے کا عہد کر لیا اور محسوس کیا کہ اب وہ تمام خطرات سے آزاد ہو چکی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے خیالات صاف اور روشن ہو گئے۔ اس کی طبیعت میں مستعدی پیدا ہو گئی۔ اور اس نے اپنے آپ کو اس سارے واقعہ کے متعلق

آزادی کے ساتھ سوچنے کی اجازت دے دی۔ اور محسوس کیا کہ اُس کے افکار خواہ کتنے ہی کیوں نہ بڑھ جائیں۔ اور اُس کے اوہام کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہو جائیں چلی وہ ضرور جئے گی۔ جب اس کا خاوند سو رہا تھا۔ شام کی تاریکی رفتہ رفتہ ساری کائنات پر چھا گئی۔ صوفیا دیوان خانے میں بیٹھی پیانو بجانے لگی۔ اس کے گھر کے باہر چہل پہل، پیانو کی موسیقی اور سب سے بڑھ کر اس خیال نے کہ وہ ایک دانا اور روشن دماغ عورت ہے۔ اور اپنی تمام تکلیفات پر غالب آ گئی ہے۔ اس کی تمام کھوئی ہوئی اور زائل شدہ قوتوں کو بحال کر دیا۔ اس کا ضمیر اُسے اطمینان دلا رہا تھا۔ کہ اگر کوئی اور عورت اس کی حالت میں ہوتی تو وہ اپنا توازن و استقلال کھو کر کب کی بھاگ چکی ہوتی۔ مگر اس کے برعکس وہ خود مارے شرم کے مری جاتی تھی۔ انتہائی دُکھ سے بیقرار ہو رہی تھی۔ اور اب اس خطرے سے جس کی حقیقت شاید کچھ بھی نہ تھی قطعاً آزاد ہو رہی تھی۔

جب رات کی تاریکی پھیل گئی تو ملاقاتی جمع ہونے شروع ہوئے۔ مرد کھانے کے کمرے میں تاش کھیلنے میں مشغول ہو گئے۔ اور عورتیں برآمدے اور دیوان خانے میں بیٹھی رہیں۔ سب سے آخر میں الین آیا۔ وہ اُداس، غمزدہ اور بیمار معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک کوچ پر کونے میں دبک کر بیٹھ گیا اور وہاں سے بالکل حرکت نہ کی۔ الین جو بالعموم نہایت زندہ دل اور باتونی ہوا کرتا تھا۔ آج بالکل خاموش اور افسردہ بیٹھا آنکھیں

ملتا رہا جب اُسے کسی بات کا جواب دینا ہوتا۔ تو بہت کوشش کے ساتھ اپنے اُوپر والے ہونٹ کو جنبش دے کر چہرے پر مسکراہٹ کے آثار پیدا کرتا اور بڑی کوشش اور مشکل کے ساتھ جواب دیتا تھا۔ تین یا چار مرتبہ اس نے ہنسی مذاق کی کوئی بات کرنی چاہی لیکن ہر مرتبہ اس کی کوشش رائیگاں گئی۔ صوفیا نے محسوس کیا کہ وہ تقریباً مخبوط الحواس ہو چکا ہے۔ صرف اب کہ وہ بیٹھی پیانو بجا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ حرماں نصیب آدمی بُری طرح اس کی محبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی روح علیل تھی۔ اور اُسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ صرف اس کی خاطر وہ اپنی جوانی کے بہترین دن ضائع کر رہا تھا۔ اپنی جائداد کا آخری حصہ موسم گرما کی اس تفریح گاہ میں اپنی ماں اور بہنوں کو چھوڑ چھاڑ کر بیٹھا صرف کر رہا تھا۔ اور بدترین بات یہ تھی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ایک تباہ کن جنگ کر کے اپنے آپ کو تباہ و برباد کر رہا تھا۔ اگر کوئی نہایت سرسری نظر سے بھی دیکھتا تو اس کی اس حالتِ زار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ صوفیا نے یہ سب کچھ نہایت وضاحت کے ساتھ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔ یہاں تک کہ اُس کے دل میں درد کی ایک ٹیس اُٹھی۔ لیکن اگر اس وقت بھی وہ اُٹھ کر الین کے پاس چلی جاتی اور "نہیں" کہہ دیتی تو اس وقت اس کی آواز میں ایک ایسی سختی اور درشتی ہوتی کہ الین کو مایوس کر دینے کے لئے کافی ہوتی۔

لیکن وہ اُس کے پاس نہ گئی اور اُس نے کچھ نہ کہا ——————

بے شک اُسے اس کا خیال تک نہ آیا۔ آج شام سے پہلے اُس میں خود ستائی اور خود پرستی کا جذبہ اس قدر شدت کے ساتھ کبھی پیدا نہ ہُوا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ الین ناخوش ہے۔ اور وہ کوچ پہ اس قدر مضطرب و بیقرار ہو کر بیٹھا ہے۔ جیسے وہ جلتے ہوئے کوئلوں پر بیٹھا ہو . . . . .

صوفیا کا دل اُس کے لئے افسوس اور ہمدردی سے بھر گیا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے شوریدہ سر چاہنے والے کی موجودگی سے اُس کی رُوح حُسن کی فتح اور اپنے بے پناہ سحر کے احساس سے سرشار ہو گئی۔ اُس نے اپنے حُسن کو شباب کو اور اپنے غیر مغلوب اور ناقابلِ عبُور اوصاف کو محسوس کیا۔ اور چونکہ اُس نے وہاں سے چلے جانے کا عہد کر لیا تھا اس لئے اُس نے اس شام کی صحبت سے پُوری آزادی کے ساتھ لُطف اندوز ہونا چاہا۔ وہ انداز و ناز سے کھیلتی رہی پیہم قہقہے مارتی رہی۔ اور عجب جذبات انگیز اور دلکش الحان میں گاتی رہی۔ اور ہر جنبش سے مسرت حاصل کرتی رہی۔ وہ جنگل کے تمام واقعے کو اور سنتری کو جو اُن کی نقل و حرکت کو بڑے غور سے دیکھتا رہا تھا۔ یاد کر کے بہت مسرور ہوئی۔ اپنے مہمانوں اور الین کی ہنسی مذاق کی باتوں میں بہت دلچسپی لیتی رہی۔ وہ الین کے گلوبند کا پن دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ جسے اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ سُرخ

سانپ کی آنکھیں ہیرے کو تراش کر بنائی گئی تھیں۔ اُس کا دل یہ دیکھ کر اس قدر خوش ہوا۔ کہ اُس نے اسی وقت بے اختیار ہو کر پن کے سانپ کو چوم لینا چاہا ۔

صوفیا نہایت بے پروائی اور بے ترتیبی سے گاتی رہی جیسے کوئی نیم مخموری کی حالت میں ہو۔ اُس نے نہایت اُداس اور غم انگیز گانے چنے۔ جو پامال امیدوں، شباب رفتہ اور آمد پیری کے متعلق تھے اور جو دوسروں کے غمزدہ دلوں پہ برق بن کر گرتے تھے۔ "شباب ڈھل رہا ہے اور پیری آ رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " اُس نے گایا۔ بڑھاپے سے اس کا واسطہ؟

وہ وقتاً فوقتاً اپنے گانے اور قہقہوں کے درمیان خیال کرتی رہی "یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میری حالت کچھ خراب سی ہو رہی ہے"۔

لوگ بارہ بجے کے قریب منتشر ہو گئے۔ سب سے آخر میں ایلین اُٹھا۔ صوفیا نے اُسے رُخصت کرنے کے لئے برآمدے تک اُس کے ساتھ جانا چاہا۔ وہ اُسے بتانا چاہتی تھی۔ کہ میں عنقریب اپنے خاوند کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اور اس خبر کے اثرات اس کے چہرے پہ سے دیکھنا چاہتی تھی۔

چاند بادلوں کے پیچھے چھپ گیا۔ لیکن پھر بھی روشنی کافی تھی۔ جس میں صوفیا ایلین کے بڑے کوٹ کے دامن کو اور برآمدے کے شامیانے کو ہوا میں اُڑتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔ اُس نے ایلین کے زرد چہرے

کہا اور اُس کے اُوپر والے ہونٹ کو مُسکرانے کی کوشش میں ہلتے ہوئے دیکھا۔

"صوفیا، صوفچکا...... میری پیاری خاتون!" اس نے صوفیا کو بولنے سے باز رکھتے ہوئے کہا۔ "میری پیاری! میری محبوب!"

وفورِ محبت سے اُس کی آواز بھرا گئی۔ اور اُس نے محبت آمیز الفاظ اس پر بارش کی طرح برسانے شروع کر دئے۔ جو رفتہ رفتہ نازک اور نازک تر ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ اُس نے اسے "تم" کے لفظ سے مخاطب کیا۔ جیسے اینڈرے کرتا تھا۔

بالکل غیر متوقع طور پر اور بے خبری میں الین نے اپنا بازو صوفیا کی کمر کے گرد حمائل کر دیا۔ اور دوسرے ہاتھ میں اس کی کہنی پکڑ لی۔

"میری راحت! میری مسرت!" اس نے اس کی گردن... پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "مجھ پر رحم کرو۔ اور میرے پاس جلدی آجاؤ"۔

صوفیا اُچک کر اُس کے آغوش سے علیحدہ ہو گئی۔ اور سر اُونچا کر کے اُس نے اپنے غصہ اور طیش کا اظہار کرنا چاہا۔ لیکن اُس کا غصہ ظاہر نہ ہوا۔ اور اپنی پاکدامنی، اوصافِ حمیدہ، عفت اور پاکیزگی کے باوجود جن پر اسے فخر تھا۔ وہ بمشکل یہ چند الفاظ کہہ سکی۔ جو ہر معمولی اور ادنے عورت ایسے موقعوں پر کہہ دیتی ہے۔

"تم ضرور دیوانے ہو گئے ہو"

ایلین نے کہا "آؤ اب چلیں۔ مَیں نے اب بھی اور جنگل میں بیٹھے ہوئے بھی یہ محسوس کیا تھا کہ تم بھی میری طرح مجبور ہو۔ صوفیا۔۔۔۔۔۔
تم بھی اسی عذاب میں مبتلا ہو۔ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اور بے فائدہ اپنے ضمیر کو تسکین دینے کی کوشش کرتی ہو۔"

صوفیا کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھ کر اُس نے اسے آستین سے پکڑ لیا اور تیزی سے کہا:۔

اگر آج نہیں تو کل تمہیں آنا ہوگا۔ کیوں پھر ناحق وقت ضائع کر رہی ہو؟ میری مسرت! میری پیاری صوفیا! جب حکم صادر ہو جائے تو اُس کی تعمیل معرض التوا میں نہیں ڈال رکھنی چاہئے۔ تم کیوں اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو؟"

صوفیا اپنے آپ کو چھڑا کر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف لپکی۔ دلیوان خانے میں اس نے نہایت احتیاط سے پیانو بند کر دیا۔ کچھ دیر تک کھڑی پیانو کی طرف دیکھتی رہی اور پھر بیٹھ گئی۔ وہ کھڑی نہ رہ سکتی تھی۔ اور نہ کچھ سوچ سکتی تھی۔ دماغی ہیجان اور روحانی آلام کی کثرت نے اُسے ہولناک طریقہ پر کمزور، بے حس اور اُداس کر دیا تھا۔ اس کا ضمیر اسے رہ رہ کر ملامت کر رہا تھا۔ کہ اُس نے اِس شام کو ایک بے وقوف لڑکی کی طرح نہایت بُرا اور احمقانہ کام کیا تھا۔ بھاً مدے میں سے گزرتے ہوئے وہ کسی کی آغوش میں پہنچ گئی تھی اور ابھی تک اُس کے سینے اور کہنی میں اس ہم آغوشی کا تکلیف دہ احساس

موجود تھا۔

دیوان خانے میں کوئی شخص نہ تھا۔ صرف ایک ٹمٹماتی ہوئی شمع اپنی مدھم سی روشنی چاروں طرف پھیلا رہی تھی۔ صوفیا پیانو کے سامنے ایک تپائی پر بالکل خاموش بیٹھ گئی۔ جیسے وہ کسی بات کی متوقع تھی اور تاریکی سے مکمل فائدہ اُٹھا رہی تھی۔ اور جیسے انتہائی ناتوانی اور بیتابی کا سیلاب اُسے اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا تھا۔ ایک غالب آجانے والا تکلیف دہ احساس ایک عظیم اژدہے کی طرح خاموشی کے ساتھ اس کے جسم و رُوح کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ اور لمحہ بہ لمحہ اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جاتی تھی۔ اور یہ احساس اپنی پُوری شدت کے ساتھ اسے چاروں طرف سے محیط کئے ہوئے تھا۔

اپنے آپ کو الین کا تصور کرنے سے باز رکھنے کے بغیر وہ نصف گھنٹہ تک خاموش بیٹھی رہی۔ پھر لڑکھڑاتی ہوئی اُٹھی۔ اور اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی بمشکل خواب گاہ تک لے گئی۔ اینڈرے سو رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب بیٹھ گئی۔ اور اپنے آپ کو خواہشاتِ عشق کے سپرد کر دیا۔ اب اس کے سر میں کوئی اُلجھن نہ تھی۔ محسوسات اور خیالات ایک مناسبت اور مطابقت کے ساتھ صرف ایک مرکز پہ مجتمع ہو گئے تھے۔ اُس نے اِس کیفیّت کے خلاف جدوجہد کرنی چاہی۔ لیکن فوراً اس خیال کو ترک کر دیا۔ . . . . .

اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا مقابل دشمن، جس کے خلاف جدوجہد کرنا چاہتی تھی۔ کس قدر مضبوط، سنگ دل اور بے رحم تھا۔ اس خوفناک غنیم کا مقابلہ کرنے اور اُسے شکست دینے کے لیئے ہمّت اور جرأت درکار تھی۔ لیکن اس کی تربیت اور تعلیم میں یہ سبق کہیں نہ آیا تھا۔ اور اس کے نصاب زندگی میں اس کا کوئی باب نہ تھا۔

اس نے اپنی کمزوری پر اپنی تحقیر کرتے ہوئے کہا" بدکردار رذیل عورت! بداخلاق، پست ہمت!"

اُس کی خودداری کا تند اور بے پناہ احساس اس کمزوری کی وجہ سے اس قدر غصّہ میں تبدیل ہو گیا۔ کہ اس نے اپنے آپ کو ہر اُس بُرے لفظ سے یاد کیا۔ جو اس کے ذہن میں موجود تھا۔ مثلاً اس نے کہا کہ میں ہرگز نیک خلاق اور پاکدامن نہیں ہوں۔ اس قسم کے مصائب کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے میں اُن کے مقابلے کی بالکل اہلیت نہیں رکھتی۔ اور اُس روز میرا اعتراض محض ایک جھوٹ اور سوانگ تھا۔" اس نے خیال کیا۔" اگر میں نے اس کے خلاف کوئی جدوجہد کی بھی ہے۔ تو وہ کس قسم کی جدوجہد تھی؟ وہ عورت جو اپنے آپ کو فروخت کرتی ہے۔ اسے بھی اس کام کو سرانجام دینے سے پہلے بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ حالانکہ وہ اپنے آپ کو فروخت ضرور کر دیتی ہے۔ کیا یہی جنگ ہے! دودھ کی طرح میں ایک دن میں بدل گئی ہوں۔ صرف ایک دن میں!"

اُس نے اپنے آپ کو شکست کی طرف مائل پایا۔ کسی دردمندانہ احساس سے مرعوب ہو کر نہیں۔ اور نہ ایلین کی شخصیت ہی سے متاثر ہو کر، بلکہ اُن تاثرات اور حسیات سے مغلوب ہو کر جو باہر اُس کے لئے منتظر تھے۔ اِس کاہل عورت کے لئے! جس نے اور کئی سُست اور کاہل عورتوں کی طرح اپنے تئیں موسم گرما کی تعطیلات کے سپرد کر رکھا تھا۔

کھڑکی سے باہر کسی نے بھاری آواز میں گایا:۔

"طائرِ بے بال و پر ہے آشیانے میں اسیر"

"اگر مجھے جانا ہے تو یہ وقت نہایت موزوں ہے" صوفیا نے دل میں سوچا۔ اور اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔

وہ تقریباً چلا اُٹھی "اینڈرے! سنو ہم.......... ہم جا رہے ہیں! ہاں"۔

"ہاں۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ کہ تم فی الفور اکیلی چلی جاؤ"۔

صوفیا نے پھر کہا۔ "لیکن سنو! اگر تم میرے ساتھ نہ چلو گے تو اندیشہ ہے کہ تم مجھے کھو بیٹھو گے۔ میرا خیال ہے...... میں محبت کرتی ہوں"۔

"کس سے؟"

"میں تمہیں نہیں بتا سکتی کہ وہ کون ہے!"

اینڈرے بستر میں سے پاؤں نکال کر بیٹھ گیا۔ اور حیران ہو کر اپنی

بیوی کی تاریک شبیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "کیا لغو اور بیہودہ خیال ہے"۔

اُس نے اپنی بیوی کی بات پر یقین نہ کیا۔ لیکن وہ ڈر ضرور گیا تھا۔ کچھ دیر سوچنے اور صوفیا سے کئی غیر ضروری سوال کرنے کے بعد اُس نے خاندان کی عزت اور بے وفائی کے متعلق چند باتیں کیں —— تقریباً دس منٹ تک وہ بے پروائی کے ساتھ تقریر کرتا رہا۔ اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اُس کی اخلاق آموز تقریر نے کچھ اثر نہ کیا۔ دُنیا میں ایک موضوع پر بہت سی آراء ہیں۔ لیکن ان میں نصف سے کہیں زیادہ تمہارے سامنے ایسے لوگ پیش کریں گے۔ جو خود کبھی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوئے!

اگرچہ رات بہت جا چکی تھی۔ لیکن موسم گرما کے سیلانی ابھی تک باہر سیر کر رہے تھے۔ صوفیا نے ایک ہلکا سا کوٹ پہنا۔ کچھ دیر کھڑی رہی، کچھ دیر سوچتی رہی۔ . . . . . . ابھی تک اس کا کافی ارادہ تھا۔ کہ وہ اپنے سوئے ہوئے خاوند سے کہدے "تم سو رہے ہو؟ میں سیر کے لئے جا رہی ہوں . . . . . . تم میرے ساتھ آؤ گے؟" یہ اُس کے رہ جانے کی آخری اُمید تھی۔

آخر اُس نے یہ الفاظ کہہ دئے۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ باہر نکل گئی . . . . موسم نہایت خوشگوار تھا۔ اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ نہ تو اُسے ہوا کا کچھ خیال پیدا ہوا۔ اور نہ رات کی ہولناک

تاریکی کا بلکہ وہ چلتی رہی۔ چلتی رہی۔ ایک بااختیار اور آزاد طاقت دھکیلتی ہوئی اُسے آگے ہی آگے لے گئی۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ اگر راستے میں وہ کہیں رُک جائے گی۔ تو یہ بے پناہ طاقت اُسے پھر گھسیٹ کر آگے لے جائے گی۔ اس نے چلتے ہوئے حقارت آمیز انداز میں کہا۔

"بدکردار۔ ذلیل عورت! بداخلاق، پست ہمت!"

"اُس کا سانس پھول گیا۔ شرم سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا جسم کے نیچے سے اپنی ٹانگیں محسوس نہ ہوتی تھیں۔ لیکن وہ طاقت جو اُسے دھکیلتے ہوئے آگے کی طرف لئے جاتی تھی شرم، ذلیل یا خطرے سے کہیں زیادہ طاقتور تھی۔

انتقام

مَیں اپنی رجمنٹ کے ساتھ ایک چھوٹے سے قصبے میں مقیم تھا۔ قصبے کا نام "ن" فرض کر لیجئے۔ فوجی افسر کی زندگی ہی کیا ہوتی ہے۔ صبح پریڈ اور گھوڑے کی سواری، شام کو کرنیل صاحب کے ساتھ طعام یا کسی یہودی ہوٹل کی سرپرستی۔ اور فرصت کے وقت شراب اور تاش "بدقسمتی سے "ن" میں نہ کسی شخص کو مہمان نوازی کی عادت تھی۔ اور نہ کوئی حسین چہرہ نظر آتا تھا۔ اس لئے ہم ایک دوسرے کے کمرے میں جاکر وقت ضائع کرنے پہ مجبور تھے۔ تمام دن ہمیں فوجی وردیوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

صرف ایک شہری سے ہماری راہ ورسم تھی۔ اُس کی عمر تقریباً پینتیس برس ہوگی۔ اس لئے ہم اُسے "بزرگ" سمجھ کر اس کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ ہم نوجوان اُس کے تجربے، متانت اور صاف گوئی کے بہت مدّاح تھے۔ اُس کی شخصیت ہمیں پُراسرار معلوم ہوتی تھی۔ وہ شکل و صورت سے رُوسی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اُس کا نام روسی نہ تھا۔ وہ رسالہ

میں بھی ایک مُدت تک رہ چکا تھا۔ لیکن یہ کوئی نہ جانتا تھا۔ کہ اس نے فوجی ملازمت ترک کر کے ایک چھوٹے سے قصبے میں سکونت اختیار کرنا کیوں قبول کر لیا۔ اب وہ غربت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی عادت سے مجبُور ہو کر خُوب دل کھول کر روپیہ خرچ کیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ پیادہ پا اور ایک پُرانے سیاہ کوٹ میں ملبُوس ہوتا تھا۔ لیکن رجمنٹ کے افسروں سے ہمیشہ تواضع سے پیش آتا تھا۔ اگرچہ اس کی میز پر دو تین ہی قسم کے کھانے ہوتے تھے لیکن شراب پانی کی طرح بہتی تھی۔ ہم میں سے کوئی نہ جانتا تھا۔ کہ اس کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ اور نہ کوئی پوچھنے کی جرأت کرتا تھا۔

اس کے پاس چند فوجی امور کی کتابیں تھیں۔ اور معدودے چند ناول جو وہ ہمیشہ بخوشی عاریتہً دے دیا کرتا تھا۔ اور پھر کبھی ان کی واپسی کے لئے تقاضا نہ کرتا تھا۔ لیکن اگر خود کسی سے کتاب عاریتہً لیتا تھا۔ تو بہت کم واپس کیا کرتا تھا۔ پستول چلانے کی مشق اُس کا محبوب شغل تھا۔ اس کے کمرے کی دیواریں گولیوں سے چھلنی ہو گئی تھیں۔ قسم قسم کے پستول جمع کرنے سے اُسے بہت دلچسپی تھی۔ اور اُس نے اس فن میں حیرت انگیز مہارت حاصل کر لی۔ اگر وہ کسی سے کہتا کہ میں تمہارے سر پر اخروٹ رکھ کر اُس کا نشانہ بناؤں گا۔ تو ممکن نہیں کہ رجمنٹ میں سے ایک شخص کو بھی اخروٹ اپنے سر پر رکھنے میں کوئی عذر ہوتا +

مبارزہ کے واقعات اکثر ہماری گفتگو کا موضوع ہوا کرتے تھے۔

لیکن سلوکو (یہ تھا ہمارے دوست کا نام) اس بحث میں کبھی دلچسپی کا اظہار نہ کرتا تھا جب اس سے پوچھا گیا کہ تمہیں کبھی مبارزہ کا اتفاق ہوا ہے۔ تو اُس نے ترش روئی سے جواب دیا "ہاں" لیکن ہمیں اس سے کوئی تفاصیل حاصل نہ ہو سکیں۔ یہ ظاہر تھا کہ وہ اس موضوع کو پسند نہیں کرتا۔ ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس نے کسی کو مبارزے میں قتل کر دیا ہے۔ اور اس کا ضمیر اس کی اس حرکت پر ملامت کر رہا ہے۔ ہم میں سے کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کہ ایسا شخص بُزدلی کا اظہار کر سکتا ہے۔ اور اسے دیکھ کر کسی کو یہ شک ہو ہی نہ سکتا تھا۔ لیکن ایک غیر متوقع واقعہ نے ہم سب کو انگشت بدنداں کر دیا۔

ایک دن تقریباً دس افسر سلوکو کے ہاں مدعو تھے۔ کھانے کے بعد سب نے حسبِ معمول شراب پی ——— یعنی حدِ اعتدال سے زیادہ پھر سلوکو سے تاش کی فرمائش ہوئی۔ پہلے تو اُس نے بہت کچھ عذر خواہی کی۔ کیونکہ اُسے تاش کی فرمائش سے نفرت تھی۔ لیکن بعد میں کہنے سُننے سے شامل ہو گیا۔ اور تاش تقسیم کرنے لگا۔ وہ کبھی کھیل میں ردّ و قدح نہیں کرتا تھا۔ اگر کسی کو اعتراض ہوتا تھا۔ تو خاموشی سے اپنی غلطی کی تلافی کر دیا کرتا تھا۔ اور اگر کسی دوسرے سے غلطی ہو جاتی تھی۔ تو فوراً درست کر دیا کرتا تھا۔ اور کوئی عذر نہیں سنتا تھا۔ لیکن اس موقع پر ہمارے ساتھ اپنی رجمنٹ کا ایک ایسا افسر تھا۔ جس کا تقرر حال ہی میں ہوا تھا۔ وہ سلوکو کی عادات سے ناواقف تھا۔ کھیل کے دوران میں کسی معمولی

بات پر سلوکو سے اُس کی تکرار ہو گئی جس نے بڑھتے بڑھتے یہ صورت اختیار کی کہ اُس نے پیتل کا شمعدان اُٹھا کر سلوکو کے مُنہ پر دے مارا۔ ہم سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ سلوکو غصے میں بھرا ہوا اُٹھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اُس نے نئے افسر سے مخاطب ہو کر کہا "براہ کرم یہاں سے چلے جایئے۔ اور خدا کا شکر کیجئے کہ یہ واقعہ میرے گھر میں پیش آیا ہے"۔

ہم سب اپنے نئے رفیق کی زندگی کی گھڑیاں گننے لگے۔ وہ فوراً باہر نکل گیا۔ لیکن یہ کہتا گیا کہ میں ہر صورت میں اپنی حرکت کا جوابدہ ہوں گا۔ اس کے بعد کھیل دوبارہ شروع ہوا۔ لیکن چونکہ ہمارے میزبان کے خیالات برہم ہو گئے تھے۔ اس لئے ہم سب ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ اور واپس اپنے کمروں میں آ گئے۔ راہ میں یہی گفتگو ہوتی رہی۔ کہ جلد ہی رجمنٹ میں ایک افسر کی مدخالی ہونے کا امکان ہے۔

اگلے دن سواری کے میدان میں ہم اپنے نئے رفیق کی خیر و عافیت کے متعلق دریافت کرنے لگے۔ لیکن وہ خود ہی آ پہنچا۔ پھر ہم نے اس سے یہ سوال کیا۔ اس نے جواب دیا کہ ابھی مجھے سلوکو نے مبارزے کی دعوت نہیں دی۔ ہم سب یہ سُن کر حیران ہوئے۔ اور سلوکو کے مکان پر پہنچے۔ وہ صحن میں کھڑا تاش کے ایک پتے پر پے در پے فائر کر رہا تھا۔ وہ حسب معمول ہم سے ملا۔ لیکن پچھلی رات کے واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی اُس کے مُنہ سے نہ نکلا۔ اس کے بعد تین دن گزر گئے۔

اور لفٹنٹ ابھی زندہ تھا۔ ہم سب حیران ہو گئے۔ کیا سلویو لڑنے سے گھبراتا تھا؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سلویو نہیں لڑا۔ وہ ایک عُذر لنگ سے مطمئن ہو گیا۔

اس واقعہ سے سلویو کا وقار ہمارے دلوں میں کم ہو گیا۔ نوجوان ہر خامی پر درگزر کر سکتے ہیں۔ لیکن بزدلی سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ اُن کے نزدیک سب سے بڑا وصف اور بدترین عیب کا کفارہ بہادری ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ہم سب کچھ بھول گئے۔ اور سلویو نے کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا۔

صرف میں ہی ایسا شخص تھا جس کے تعلقات پہلے کی طرح خوشگوار نہ ہوئے۔ قدرتاً میری فطرت میں اکابر پرستی کا عنصر غالب تھا۔ اس لئے میں پہلے سلویو کی پُر اسرار زندگی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ میرے لئے وہ ایک پُر اسرار ڈرامے کا ہیرو تھا۔ اور میں ہی ایک ایسا شخص تھا جس سے وہ کھل کر بات کیا کرتا تھا۔ لیکن اس ناخوشگوار واقعہ کے بعد یہ خیال کہ اس شخص کے وقار پر ایک بدنما داغ ہے۔ اور وہ اسے دھونے کی کوشش نہیں کرتا۔ مجھے اس امر سے مانع تھا۔ کہ میں پہلے کی طرح اس کی عزت کروں۔ اب مجھے اس سے ملتے ہوئے شرم آتی تھی۔ سلویو ایسا احمق نہ تھا۔ جو میرے اس رویّے کو بھانپ نہ جاتا۔ اور اس کا سبب نہ جانتا۔ اُسے میرے ان اطوار سے دُکھ ہوتا تھا۔ دو تین مرتبہ مجھے ایسا محسوس بھی ہُوا کہ وہ اپنی معنی خیز خاموشی کے راز کا جسے بُزدلی سے تعبیر

کیا گیا تھا انکشاف کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں ایسے موقعوں پر گفتگو کا رُخ بدل دیا کرتا تھا۔ اور سلویو بھی وضاحت کرنے کی کوشش ترک کر دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد میں صرف دوسرے فوجی افسروں کی مجالس میں اُس سے ملتا تھا۔ اس لئے پھر اس تکلیف دہ موضوع پہ گفتگو کی نوبت نہ آئی۔

شہر کے لوگ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باعث ان خوشیوں کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جو دیہات کے لوگ زندگی کی معمولی باتوں سے حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً ڈاک کی تقسیم ہی کو لیجئے۔ منگل اور جمعہ کو ہماری رجمنٹ کا دفتر افسروں سے کھچا کھچ بھر جاتا تھا۔ کوئی خط کا انتظار کرتا تھا۔ کوئی اخبار کا اور کوئی منی آرڈر کا۔ خطوط، پارسل اور اخبار وہیں کھول کر پڑھے جاتے تھے۔ اور دفتر میں اچھا خاصہ میلہ رہتا تھا۔ سلویو اپنے خطوط ہمارے دفتر کے پتے پر منگواتا تھا۔ اور ان کے انتظار میں اکثر وہاں آیا کرتا تھا۔

ایک دن اُسے ایک ایسا خط ملا جس سے اُس کی حالت متغیر ہو گئی۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے خط کو کھولا۔ خط پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ افسر اپنے اپنے خط پڑھنے میں مشغول تھے۔ اس لئے کسی کو اُس کے اضطراب کی خبر نہ ہوئی۔

سلویو نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا "دوستو! بعض ایسے حالات پیش آ گئے ہیں کہ میں یہاں زیادہ عرصہ تک ٹھہر نہیں سکوں گا۔ میں

آج ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ آج شام میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو کر مجھے ممنون فرمائیں گے"۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہا:" اور آپ بھی ضرور آئیے۔ میں چشم براہ رہوں گا"۔

وہ تو یہ کہکر جلد جلد قدم اُٹھاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ہم بھی دعوت میں شرکت کا فیصلہ کرنے کے بعد اپنے اپنے کمروں کو چل دیئے۔

مَیں وقتِ مقررہ پر سلویو کے مکان پر پہنچا اور دیکھا کہ رجمنٹ کے افسر پہلے سے وہاں جمع ہیں۔ سلویو کا تمام سامان بندھ چکا تھا۔ فرش فروش سب لپیٹا جاچکا تھا۔ دیواروں پہ کوئی تصویر، کوئی تحریر نہ رہی تھی۔ گولیوں کے سوراخ پہلے سے زیادہ اور نمایاں تر تھے۔ سلویو معمول سے زیادہ خوش نظر آتا تھا۔ اُسے دیکھ کر مہمانوں پر بھی اثر ہونا لازمی تھا۔ پھر کیا تھا۔ بوتلوں کے کاک اُڑنے اور شراب کے ساغر چھلکنے لگے۔ اس طرح ہم نے کمال گرمجوشی سے اپنے دوست کو خیرباد کہی۔ یہ صحبت بہت رات گئے تک رہی۔ سب کو الوداع کہہ کر سلویو نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھا لیا۔ اور دھیمی آواز سے کہا:" میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔ میں ٹھہر گیا اور باقی سب افسر چلے گئے۔ سلویو اور میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔ اور ہم نے خوشی سے پائپ سُلگا لئے۔ سلویو بہت رنجیدہ خاطر نظر آتا تھا۔ اُس کی پہلی ہنگامہ خیز مسرت کا کوئی اثر باقی نہ تھا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اور منہ سے

دھوئیں کے بھپکے نکل رہے تھے۔ وہ صورت سے عفریت معلوم ہوتا تھا۔

اسی حالت میں چند منٹ گزر گئے۔ پھر سلویو نے اس طرح سکوت کو توڑا۔ "اب کے بعد شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں تم سے رخصت ہوں میں ایک معاملہ صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن مجھے تم سے اُنس ہو گیا ہے۔ اس لئے میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہیں دیر تک ایک غلط فہمی میں مبتلا رکھوں"۔

وہ ایک لمحہ کے لئے رُک گیا۔ اُس نے پائپ کی راکھ زمین پر گرا دی۔ اور میں سامنے نظریں گاڑے بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے سلسلۂ تقریر کو جاری کیا۔ "تمہیں حیرت ہوتی ہو گی۔ کہ میں نے اس بدمست لفٹنٹ کو قتل کیوں نہ کر دیا۔ اُس کی زندگی میرے ہاتھوں میں تھی۔ لیکن میں نے اُسے مبارزے پر مجبور نہ کیا۔ میں سب سے کہہ سکتا تھا کہ میں نے رحم کھا کر اُسے معاف کر دیا۔ لیکن تم سے حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتا۔ اگر مجھے اپنی جان کا کوئی خطرہ نہ ہوتا تو میں اُسے کبھی معاف نہ کرتا"۔

میں متعجب نظروں سے سلویو کی طرف دیکھنے لگا۔ اس انکشاف سے میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سلویو نے سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ مجھے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آج سے چھ برس پہلے ایک شخص نے مجھے طمانچہ مارا تھا۔ اور وہ شخص اب تک زندہ ہے"۔

"اور تم اُس سے لڑے نہیں! ممکن ہے حالات نے تمہیں اس کا موقع

نہ دیا ہو"۔

"میں اُس سے لڑا تو تھا اور یہ ہے اُس مبارزے کی نشانی"۔

سلوؔیو نے یہ کہہ کر الماری سے ایک ٹوپی نکالی، اور سر پر رکھی۔ ایک گولی اس کی پیشانی سے ایک انچ اوپر سے گزر کر ٹوپی سے پار ہو گئی تھی۔

سلوؔیو نے اس کے بعد مجھے اپنی داستانِ حیات سُنائی اور مجھے اپنی زندگی کے اہم ترین راز سے آگاہ کیا۔

جن دنوں میں رسالہ میں تھا۔ میں نے شراب نوشی اور جنگ جوئی میں خاص شہرت حاصل کر لی تھی۔ اُس زمانے کے مشہور شرابی میرے سامنے بیٹھ نہ سکتے تھے۔ اور دلیر سے دلیر جنگجو بھی میدانِ مبارزہ میں میرے سامنے سے ہٹ جاتے تھے۔ میرے رفقاء میری بے انتہا قدر کرتے تھے۔ اور میری رجمنٹ کے کمانڈر میری بے راہ روی کے باوجود مجھے عزیز رکھتے تھے۔

"یہ حالت ایک عرصے تک رہی۔ اس کے بعد ایک نوجوان جس کا تعلق ایک ممتاز اور دولت مند خاندان سے تھا ہماری رجمنٹ میں شامل ہوا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس جیسا خوش قسمت شخص نہیں دیکھا۔ تمہیں اس کے حُسن، دولت، شجاعت اور اقتدار کا اندازہ تک نہیں ہو سکتا۔ اس کے آتے ہی میری شہرت اور اقتدار کا زوال شروع ہو گیا۔ ابتدا میں اُس نے مجھ سے دوستی کا رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اُسے دھتکار دیا۔ پھر اُس نے میری کوئی پروا نہ کی۔ اس پر مجھے اُس سے

اور زیادہ نفرت ہو گئی۔ عوام میں اُس کی مقبولیت اور خصوصاً خواتین کے حلقے میں اُس کی عزت مجھے انگاروں پر لوٹاتی تھی۔ میں اُس سے اُلجھنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگا۔ اُس کی پھبتیاں میری پھبتیوں سے زیادہ لطیف ہوتی تھیں۔ اور مجھے اکثر خفیف ہونا پڑتا تھا۔

ایک دن رقص کی محفل میں وہ تمام خواتین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور میزبان کی بیوی بھی اُس کی طرف التفات ظاہر کر رہی تھی۔ مجھ سے یہ دیکھ کر نہ رہا گیا۔ میں نے اپنے رقیب کے کان میں سخت ذلّت آمیز الفاظ کہے۔ وہ اُنہیں سُن کر آگ بگولا ہو گیا۔ اور مجھے ایک طمانچہ رسید کیا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے تلواریں کھینچ لیں۔ خواتین کو غش آ گیا۔ اور ہمیں علیحدہ کیا گیا۔ اسی رات ہم لڑنے کو شہر سے نکل گئے۔

پَو پھٹنے کو تھی۔ میں تین معاونین کو ساتھ لے کر مقررہ جگہ پہنچا۔ جب سورج نکلنے کو تھا میرا مدِ مقابل صرف ایک معاون کے ساتھ ہماری طرف بڑھا۔ معاونین نے ہمیں ایک دوسرے سے بارہ قدم کے فاصلہ پر کھڑے ہونے کو کہا۔ پہلا فائر مجھے کرنا تھا۔ لیکن میری بے تابی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس لئے میں نے اُسے فائر کرنے کو کہا۔ لیکن میرا رقیب اس پر رضامند نہ ہوا۔ پھر ہم نے قرعہ اندازی کی اور قرعہ اس کے نام پڑا۔ اُس نے فائر کیا۔ اور گولی میری ٹوپی کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اب میری باری تھی۔ اُس کی زندگی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اُس کے چہرے پر اضطراب کے آثار ڈھونڈنے کے لئے نظر دوڑائی۔

لیکن وہ اپنی ٹوپی سے جامنیں نکال کر کھاتا رہا۔ اور گٹھلیاں میری طرف تھوکتا رہا۔ مجھے اُس کے لااُبالیانہ انداز پر بہت غصہ آیا۔ مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہونے لگا۔ ایسے شخص کی جان لینے سے کیا فائدہ جو اپنی زندگی کی ذرہ بھر پرواہ نہیں کرتا۔ مجھے ایک شرارت سوجھی اور میں نے اپنا پستول نیچے کر لیا۔ اور اُس سے کہا "تم ابھی مبارزے کے لئے تیار نظر نہیں آتے شوق سے اپنا ناشتہ ختم کر لو۔ میں مزاحم ہونا نہیں چاہتا"۔

تم کسی طرح مخل نہیں ہو رہے۔ ازراہِ مہربانی فائر کرو۔ اور اس مذاق کو طول نہ دو۔ اور اگر اب فائر کرنا نہیں چاہتے۔ تو جب چاہو میں حاضر ہوں۔

میں نے معاونین سے کہا کہ میں آج فائر کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے مبارزہ ملتوی کر دینا چاہئے۔

اس کے بعد میں اپنی اسامی سے مستعفی ہو گیا۔ اور یہاں آکر عزلت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اُس دن سے آج تک میں انتقام کا موقع ڈھونڈتا رہا ہوں۔ اور آج وہ ساعت آپہنچی ہے جس کا میں مدت سے منتظر تھا۔"

اس کے بعد اُس نے مجھے جیب سے خط نکال کر دیا۔ کسی نے اُسے ماسکو سے لکھ بھیجا تھا کہ "شخص مذکور کی شادی ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی سے ہونے والی ہے"۔

سلویو نے کہا "اب تم نے سمجھ لیا ہوگا۔ کہ شخص مذکور کون ہے۔ اور میں ماسکو کس لئے جا رہا ہوں۔ اب میں دیکھوں گا کہ وہ شادی کے بعد

کس طرح موت سے بے پروائی کا اظہار کرتا اور جاسوں کو زندگی سے زیادہ وقعت دیتا ہے"۔

سلو ایک بھوکے اور مقید شیر کی طرح کمرے میں چکر کاٹنے لگا میں حیرت و استعجاب سے اسے دیکھتا رہا۔ اور میرا دماغ مختلف قسم کے خیالات کی کشمکش کا مرکز بن گیا۔ اتنے میں ملازم نے آ کر کہا کہ گاڑی تیار ہے۔ سلو نے میرے ہاتھوں کو دبایا۔ اور مجھ سے معانقہ کیا۔ پھر گاڑی میں دو ٹرنک رکھے۔ ایک میں اس کا کل سامان تھا۔ اور دوسرے میں اس کے پستول۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے ایک بار پھر مجھے الوداع کہا۔ اور آدھ گھنٹے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

(۲)

اس واقعہ کے بعد کئی سال گزر گئے۔ میں معاش کے دھندوں میں پھنس کر اپنے گاؤں میں مقیم ہو گیا اور کھیتی باڑی کا شغل اختیار کر لیا۔ لیکن گذشتہ زندگی کی یاد اکثر ستایا کرتی تھی خصوصاً بہار اور سرما کی راتوں کی تنہائی میں دیرینہ رفقاء کی جدائی بری طرح محسوس ہوتی تھی۔ دن تو میں جوں توں بسر کر لیا کرتا تھا۔ کبھی پٹواری سے باتیں کیں کبھی مزدوروں کی نگرانی کی۔ مگر اندھیرا ہوتے ہی زندگی دوبھر معلوم ہونے لگتی تھی۔ دو چار کتب میں جو میرے پاس تھیں انہیں میں سینکڑوں مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ اور مجھے ان کے صفحوں کے صفحے ازبر تھے۔ میرے ملازم کو جتنی کہانیاں یاد تھیں میں انہیں ایک دفعہ نہیں، بیس دفعہ نہیں، پچاس دفعہ سن چکا تھا

اور اب ان کا سننا بہت صبر آزما ہو گیا تھا۔ دیہاتی لڑکیوں کے گیت بھی اپنا اثر کھو چکے تھے۔ اور اب طبیعت پر گراں گزرتے تھے۔ میں نے جام و مینا کی صحبت میں تفکرات کو بھول جانے کی کوشش کی لیکن یہ شغل بھی دردِ سر ثابت ہوا۔ میری طبیعت شراب نوشی سے متنفر ہو گئی۔ میں جلد ہی اس کی تباہ کاریوں سے آگاہ ہو گیا۔ اور اپنے چند رفقا کے انجام سے متاثر ہو کر میں نے یہ شغل ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا۔

میرے پڑوس میں دو تین شرابیوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ان کی گفتگو ہچکیوں اور آہوں پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ اور اُن کا اکثر وقت کھانسنے میں گزرتا تھا۔ ایسی صحبت سے تنہائی بہتر تھی۔ آخر کار میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ شام کا کھانا بہت دیر سے کھاتا تھا۔ اور کھانا کھاتے ہی سو جاتا تھا۔ اس طرح میری شام بہت مختصر ہو جاتی تھی۔

میرے مکان سے چار فرلانگ کے فاصلہ پر ایک دولت مند خاتون کی جاگیر تھی۔ لیکن وہاں اُس کے منیجر کے سوا اور کوئی نہ رہتا تھا۔ شادی کے بعد وہ صرف ایک مہینے کے لئے اپنے خاوند کے ساتھ اپنی جاگیر میں آ کر رہی تھی۔ لیکن میری آمد کے دوسرے سال ہی یہ افواہ پھیلی کہ وہ پھر اپنی جاگیر کو دیکھنے آ رہی ہے۔ اور اب کی بار اُس کا قیام زیادہ دیر تک رہیگا۔ یہ افواہ درست ثابت ہوئی۔ اور جُون کے آغاز ہی میں وہ اپنے کاؤنٹ کے ساتھ آ پہنچی۔

گاؤں والوں کے لئے کسی امیر کی آمد ایک خاص اہمیت رکھتی ہے

زمیندارہ دو مہینے پہلے ہی اس اہم واقعہ پر تبصرہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ اس واقعہ کے بعد تین تین سال تک جاری رہتا ہے۔ مجھے بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ میں بھی اس واقعہ سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ اور پہلی فرصت میں کاؤنٹ اور اس کی میم کی تعظیم بجالانے کو ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

کاؤنٹ کے چوبدار نے مجھے دیوان خانے میں بٹھایا اور خود اطلاع کرنے گیا۔ کمرہ پُر تکلف سامان سے سجا ہوا تھا۔ چاروں طرف کتابوں کی الماریاں اور الماریوں پر پیتل کے خوبصورت بُت تھے۔ وسطی دیوار میں ایک خوبصورت قدآدم آئینہ نصب تھا۔ فرش پر ایک گراں قیمت سبز رنگ کی دری بچھی ہوئی تھی جس کا بیشتر حصہ قالینوں نے چھپا رکھا تھا۔ میں کاؤنٹ کی دولت سے مرعوب ہو کر ایک سائل کی طرح سمٹا بیٹھا تھا۔ کہ اتنے میں دروازہ کھلا۔ اور ایک وجیہہ شخص جس کی عمر تیس بتیس برس ہو گی اندر داخل ہوا۔ میں نے اپنی سراسیمگی کو چھپانے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہوا۔ کاؤنٹ اس بات کو تاڑ گیا۔ اُس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے مصافحہ کیا۔ پھر کیا تھا۔ چند منٹ میں ہم بے تکلف دوستوں کی طرح باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں میم صاحبہ بھی آ گئیں۔ اور کاؤنٹ نے میرا تعارف کرایا۔ مجھ پر پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اور زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ اُنہوں نے مجھے حواس درست کرنے کا موقع دیا۔ اور کمرے میں

پھر کر تصویریں دیکھنے کو کہا۔ اور خود بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ میں تصویروں کا شوقین نہیں۔ لیکن ایک تصویر ایسی تھی کہ میں اُس سے نظر نہ اُٹھا سکتا تھا۔ اس کا کپڑا دو گولیوں سے چھدا ہُوا تھا۔ اور ایک گولی کا نشان بالکل دوسری کے اُوپر تھا۔ مَیں نے کاؤنٹ سے نشانے کی تعریف کی۔ اور کاؤنٹ نے بھی اعتراف کیا۔ پھر مجھ سے پُوچھا "تمہارا نشانہ کیسا ہے؟" میں نے کہا "خدا کے فضل سے بُرا نہیں تیئیس قدم کے فاصلہ پہ تاش کا پتہ رکھا ہو تو کبھی نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ پستول پہلے میرے ہاتھ میں رہ چکا ہو"۔

میم صاحبہ کو بھی ہماری باتوں سے دلچسپی ہو گئی۔ خاوند سے پوچھنے لگیں "۔ اور آپ بھی تیئیس قدم پر تاش کے پتے کا نشانہ بنا سکتے ہیں؟"

کاؤنٹ نے جواب دیا "کسی دن دیکھیں گے۔ کسی زمانے میں میرا نشانہ بہت اچھا تھا۔ لیکن اب چار سال سے میں نے پستول کو ہاتھ نہیں لگایا"۔

میں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو میں شرط بد سکتا ہوں کہ آپ بیس قدم کے فاصلہ پہ بھی نشانہ نہیں بنا سکیں گے۔ میرا تجربہ تو یہ ہے۔ کہ پستول سے جب تک باقاعدہ مشق جاری نہ رکھی جائے۔ نشانہ ضرور خطا ہو جائیگا۔ اپنی رجمنٹ میں میرا نشانہ بہترین سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ایک موقع پر ایسا ہوا کہ میرا پستول مرمت کے لئے گیا ہُوا تھا۔ اور میں پُورا مہینہ مشق نہ کر سکا۔ اس کے بعد میں نے بیس قدم کے فاصلہ پہ چار مرتبہ ایک بوتل کا نشانہ

بنانے کی کوشش کی اور چاروں بار ناکام رہا۔ اس پر ہمارے کپتان صاحب نے یہ فقرہ کسا کہ تمہارا ہاتھ بوتل پر اُٹھ ہی نہیں سکتا۔ عالی جاہ! سچ تو یہ ہے کہ اِدھر آپ نے مشق چھوڑی اُدھر ہاتھ سب کچھ بھول گئے۔ بہترین نشانچی جو ہیں نے دیکھا تھا۔ اُس کا قاعدہ تو یہ تھا کہ ہر روز کھانے سے پہلے تین فائر ضرور کرتا تھا۔ نہ اُسے شراب کا گلاس بھولتا تھا اور نہ نشانہ بازی۔"

کاؤنٹ نے پوچھا "اس کا نشانہ کیسا تھا؟"

"عالی جاہ! اُس کا یہ حال تھا کہ اگر دیوار پر مکھی بیٹھتی تھی تو وہ پکارتا تھا "لانا، کوزکا، میرا پستول" کوزکا پستول بھر کر لاتا تھا۔ اور دو سیکنڈ میں مکھی کی لاش دیوار پر چپکی ہوتی تھی"۔

کاؤنٹ عش عش کرنے لگا اور اس کا نام پوچھنے لگا۔

"عالی جاہ! سلویو"۔

کاؤنٹ نے حیران ہو کر پوچھا "تم سلویو کو جانتے ہو؟"

"عالی جاہ! جانتا ہی نہیں بلکہ ہم بہترین دوست ہوتے تھے۔ ہماری رجمنٹ کے افسر اس سے برادرانہ سلوک کیا کرتے تھے۔ لیکن اب پانچ سال سے میں نے اُس کی کوئی خبر نہیں سُنی۔ آپ بھی تو اُسے جانتے ہوں گے؟"

"ہاں میں اُسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اُس نے کبھی تمہیں اپنی زندگی کا ایک عجیب واقعہ بھی سُنایا تھا؟"

"شاید اس سے آپ کا اشارہ اُس دعوتِ رقص کی طرف ہے جہاں اُسے کسی لفنگے نے طمانچہ رسید کیا تھا"۔

"کیا اُس نے کبھی اُس لفنگے کا نام بھی بتایا تھا؟"

میں معاملہ بھانپ گیا اور معذرت کرنے لگا" مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ فریقِ ثانی آپ ہی تھے"۔

"ہاں! میں ہی تھا" کاؤنٹ کے چہرے سے اضطراب کے آثار ظاہر ہونے لگے" اور وہ تصویر ہماری آخری ملاقات کی نشانی ہے"۔

میم صاحبہ بھی مضطرب ہو گئیں "خدا کے لئے اس واقعہ کا ذکر نہ کرنا مجھ میں اُس کے سُننے کی تاب نہیں"۔

کاؤنٹ نے اصرار کیا "نہیں! میں اس واقعہ کو شروع سے آخر تک سُنا کر چھوڑوں گا۔ ہمارے معزز مہمان کو یہ معلوم ہے کہ میں نے اُس کے عزیز دوست کی توہین کی تھی۔ اسے یہ بھی جاننا چاہیئے۔ کہ اس کے دوست نے کس طرح مجھ سے انتقام لیا"۔

کاؤنٹ نے کرسی میرے نزدیک کھینچ لی۔ اور واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا۔

"ہماری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں۔ پہلا مہینہ ہم نے اس گاؤں میں گزارا تھا۔ اس مکان میں میری زندگی کی بہترین مسرتیں مجھے حاصل ہوئی ہیں۔ اور میری زندگی کی سب سے رنج دہ ساعت بھی اسی مکان میں گذری۔

ایک شام ہم دونوں باہر سواری کے لئے گئے۔ میم صاحبہ کا گھوڑا مُنہ زور تھا۔ وہ ڈر گئیں اور پیادہ واپس آئیں۔ میں دونوں گھوڑوں کو لے کر پہلے گھر پہنچ گیا۔ گھر کے سامنے ایک گھوڑی کھڑی تھی۔ اور مجھے اطلاع کی گئی کہ ایک شخص جسے اپنا نام اور کام بتانے میں عذر ہے دیوان خانے میں میرا منتظر ہے۔ مَیں کمرے میں داخل ہوا۔ تو ایک شخص جس کے کپڑوں پر گرد جمی تھی۔ اور جس کی ڈاڑھی پانچ سات دن سے نہیں مُنڈی تھی آتش دان کے پاس کھڑا نظر آیا۔ میں نے نزدیک جا کر اُسے پہچاننے کی کوشش کی۔

اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ "کاؤنٹ! کیا اب مجھے نہیں پہچانتے؟"

میں نے فوراً کہا "سلویو" اور میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اُس نے کہا "ہاں! پہچان لیا! تمہیں میرا حساب بے باق کرنا ہے مَیں یہاں اپنا پستول خالی کرنے آیا ہوں کہو، تیار ہو؟"

اُس کی جیب سے اس کا پستول نکل رہا تھا۔ مَیں بارہ قدم گن کر اس کونے میں کھڑا ہو گیا۔ اور اس سے درخواست کی کہ برلئے خدا جلدی کرو۔ اور میری بیوی کی واپسی سے پہلے جھگڑا چکا دو۔ اس نے عذر کیا۔ اور روشنی کے لئے کہا۔ میں نے شمعیں منگائیں۔ دروازے بند کئے اور حکم دیا کہ کوئی بھی داخل نہ ہونے پائے۔ مَیں نے اسے دوبارہ جلدی کام ختم کرنے کو کہا۔ اُس نے پستول نکال کر نشانے پر رکھا۔ مَیں ایک ایک

لحہ گن گن کر گزارنے لگا۔ مجھے اپنی بیوی کا خیال آیا۔ ایک منٹ گزر گیا سلویو نے پستول نیچے کر لیا۔

اُس نے کہا "سوچ لو! پستول میں جان نہیں۔ وزنی گولی ہے یہ مبارزہ نہیں، صریح قتل ہے۔ نہتے آدمیوں پر گولی چلانا میرا شیوہ نہیں آؤ قرعہ ڈال لیں کہ پہلے کون گولی چلائے"۔

میرا سر چکرانے لگا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے عذر کیا ہوگا۔ پھر ہم نے ایک اور پستول بھرا۔ اور کاغذ کے دو پرزوں پر اپنے نام لکھے۔ اُس نے انہیں لپیٹ کر اپنی ٹوپی میں ڈالا۔ اسی ٹوپی میں جس میں میری گولی کا نشان تھا۔ اب کی بار بھی میرا نام پہلے نکلا۔

سلویو مسکرا کر کہنے لگا "کاؤنٹ! اس میں شک نہیں کہ تم بہت خوش قسمت ہو"۔

میں یہ نہیں جانتا کہ میرے تئیں کو کچھ ہو گیا تھا۔ یا سلویو کا رعب تھا لیکن ہوا یہ کہ میری گولی اس تصویر پر جا لگی"۔ کاؤنٹ نے چھدی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ اُس کا چہرہ آگ کی طرح دہکنے لگا۔ اور میم کا چہرہ اُس کے رومال سے زیادہ سفید ہو گیا۔

کاؤنٹ نے سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا "خدا کا شکر ہے۔ کہ میرا نشانہ خطا ہو گیا۔ پھر سلویو نے جو اُس وقت ہیبت کا مجسمہ دکھائی دیتا تھا۔ نشانے کے لئے ہاتھ اُٹھایا۔ اُسی وقت دروازہ کھلا اور ماشا چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے جرأت کر کے کہا "ماشا! گھبرا کیوں گئیں۔ یہ تو محض

مذاق ہو رہا ہے۔ جاؤ! ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پی کر آؤ۔ یہ میرے دیرینہ دوست ہیں۔ میں ان کا تعارف پھر کراؤں گا۔ پہلے تم پانی پی آؤ۔"

ماشا نے یقین نہ کیا۔ اُس نے ہیبت کے مجسمے سلویو سے مخاطب ہو کر کہا "سچ سچ بتاؤ! کیا میرا شوہر سچ کہہ رہا ہے۔ کیا یہ مذاق ہے۔ سلویو نے جواب دیا "تمہارے شوہر کو ہمیشہ سے مذاق کی عادت ہے اس نے ایک موقع پر مجھے مذاق میں طمانچہ رسید کیا تھا۔ ایک اور موقع پر مذاق میں میری ٹوپی کو گولی کا نشانہ بنایا تھا اور اب بھی جب اُس نے مجھ پر فائر کیا۔ اور نشانہ خطا گیا۔ تو یہ سب معاملہ مذاق ہو گیا۔ اب میرا جی بھی مذاق کرنے کو چاہتا ہے"۔

یہ کہکر اُس نے پستول کی نالی میری طرف کی اور لبلبی کو دبانا چاہتا تھا کہ ماشا اُس کے قدموں پہ گر پڑی۔ میں نے غصے میں ماشا سے اُٹھنے کو کہا اور اُسے شرم دلائی۔ اور سلویو سے کہا "تم کیسے مرد ہو کہ ایک عورت سے مذاق کر رہے ہو جلدی فائر کرو"۔

سلویو نے کہا "نہیں! اب میرا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ میں نے تمہارا اضطراب، تمہاری پریشانی، تمہارا خوف دیکھ لیا ہے۔ میں نے تمہیں گولی چلانے پہ مجبور کیا ہے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ اب تم مجھے مشکل سے بھولو گے اب تم جانو اور تمہارا ضمیر"۔

یہ کہکر وہ دروازے کی طرف گیا۔ لیکن تصویر کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔ اور نشانہ کیے بغیر فائر کیا اور غائب ہو گیا۔ ماشا کو غش آ گیا تھا۔ اور ملازموں

کو اُسے روکنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ سب دہشت زدہ ہو رہے تھے۔ سلویو نے سیڑھیوں پر سے کوچوان کو آواز دی۔ گاڑی میں بیٹھا اور پیشتر اس کے کہ میں اپنے حواس مجتمع کروں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کاؤنٹ نے افسانہ ختم کیا . . . . . . اس طرح مجھے اُس فسانے کا انجام معلوم ہوا جس کے آغاز سے میں اس قدر متاثر ہوا تھا۔ اس کے اہم ترین کردار سے میں پھر کبھی نہ مل سکا۔ لیکن یہ سُنا ہے کہ سلویو نے ایک معرکہ میں اپنے وطن کی آزادی اور ناموس کے لئے اپنی جان قربان کر دی۔ اور اس کی شجاعانہ موت اس کی شجاعانہ زندگی کے شایاں تھی۔

اِٹلی

(۱)

چھوٹی بہن: مصنفہ ماتیلدے سیراؤ۔ مترجمہ ابُومحمد امام الدین رام نگری۔

(۲)

آخری دن: مصنف گیووانی پاپینی۔ مترجمہ طاہر قریشی

چھوٹی بہن

صوفیہ نے نگاہ اُوپر نہیں اُٹھائی۔ اُس کی نازک اُنگلیاں بدستور لیس کے کام میں لگی رہیں۔ اور لولو تھی کہ سارے کمرے میں چکر لگا رہی تھی۔ وہ کبھی طاق میں رکھے ہوئے کھلونوں کو اُلٹتی پلٹتی اور کبھی دروازے کھول کر اندر دیکھتی۔ اس کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن بہن کی سنجیدگی کے باعث اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو رہی وہ کچھ دیر تک ایک گیت کا ایک بند بھی گنگناتی رہی۔ اور ایک نظم بھی پڑھ ڈالی۔ لیکن صوفیہ نے جیسے کچھ سُنا ہی نہیں۔ لولو کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ سیدھے سادے پیرائے میں بہن سے اپنی بات کہے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ وہ صوفیہ کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ اور بولی "صوفیہ! تمہیں معلوم ہے مس جانیٹ نے مجھ سے کیا کہا ہے؟"

"کوئی دلچسپ بات تو نہیں بتائی ہو گی؟"

اُف تمہارے اس سرد جواب سے تو گرمیوں میں بھی نزلہ ہو جائے بڑی فیلی بی بی! تم اپنی باتوں میں ٹھنڈک پیدا کرنے کے لیے اتنے اولے

کہاں سے لائی ہو؟"

"لو لو۔ تو ہے تو ذرا سی چھوکری۔ لیکن کتنی شریر ہے!"

"میری بہن! میرے دل کی ملکہ! یہ تمہاری کتنی بڑی غلطی ہے۔ جو تم مجھے اب تک چھوکری ہی سمجھے جا رہی ہو۔ میں اب چھوکری نہیں رہی اس لئے کہ اب میری شادی ہونے والی ہے"۔

"کیا"؟

"جانیت نے مجھ سے یہی تو کہا ہے"۔

"یہ تو کیا بکے جا رہی ہے؟ تیرا تو ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا"۔

"بہت بہتر جناب۔ اب میں ڈرامے کی طرح تمام حالات تفصیل کے ساتھ آپ کو سناتی ہوں۔ لیکن داستان ذرا طویل ہے۔ کیا سنجیدگی کی ملکہ بغور سماعت فرمائیں گی؟"

"کچھ کہو گی بھی"۔

"مارس کے میدان میں گھوڑدوڑ تھی۔ تم تو وہاں گئی نہیں تھیں۔ اس لئے کہ تمہیں تو کتابوں کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی ہی نہیں ہے"۔

"پھر وہی فضول بکواس۔ اصل بات کہنا ہو تو کہو۔ ورنہ مجھے سننے کی ضرورت نہیں"۔

"تمہیں سننا تو بہر حال پڑے گا۔ اس لئے کہ یہ پُر اسرار داستان سنائے بغیر میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ جان پہ بن رہی ہے"۔

"تو آخر کہو گی بھی وہ بات؟"

"اچھا لو سنو۔ ہم لوگ گھوڑ دوڑ میں گرینڈ اسٹینڈ کی پہلی صف میں بیٹھے تھے۔ کہ "پولو آلو بو دا تو" نے آکر ایک حسین و خوش رُو نوجوان "مونتے فرانکو روبرتو" سے ہمارا تعارف کرایا۔ رسم ملاقات کی ادائیگی کے بعد وہ دونوں ٹھیک ہمارے پیچھے بیٹھ گئے۔ گھوڑوں کے اسٹارٹ ہونے تک ہم لوگوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے گارگن گھوڑے پر بازی لگائی تھی۔ مجھے اُمید نہ تھی کہ میں دھوکا کھا جاؤں گی۔ تمام گھوڑے گرد و غبار میں چھپ گئے تھے۔ میں نے چلا کر کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گارگن جیتے گا۔ روبرتو نے مسکرا کر کہا "جی نہیں لارڈ لا ڈیلو جیت رہا ہے"۔ میں اپنی بات کٹتے دیکھ کر غصے سے بیتاب ہو گئی۔ لیکن وہ اسی طرح مسکراتا اور میری بات کاٹتا رہا۔ آخر میں ہم دونوں نے آپس میں بازی لگا لی۔ بارہ منٹ کے اضطراب انگیز انتظار کے بعد وہ دوڑ ختم ہوئی۔ اور معلوم ہوا کہ گارگن نے مجھے دھوکا دیا۔ روبرتو نے بازی جیت لی۔ ذرا اس سین کا تصور کرو۔ میں نے کہا میں ابھی روپے دئے دیتی ہوں۔ تو اُس نے جھک کر ادب سے مسکراتے ہوئے کہا "ابھی جلدی کیا ہے۔ دے دیجئے گا"۔ اس کے بعد ساحل پر میری اُس سے ملاقات ہوئی میں نے اس پر ایک مستفسرانہ نگاہ ڈالی۔ وہ پھر معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ اور جھک کر آداب بجا لایا۔ تھیئٹر میں اور ہر جگہ یہی صورت پیش آتی ہے۔ میرا تو فوراً اضطراب سے دم نکلا جا رہا ہے۔ روبرتو چھبیس برس کا خوبصورت نوجوان ہے۔ اور آج صبح اُس کا باپ دو گھنٹے تک امّی جان سے باتیں بھی کرتا رہا"۔

"اچھا!"

"تم میری باتوں کو توجہ سے سُن رہی ہو نا؟ امّی کے پاس اُس کے آنے کا حال مجھے جانیٹ سے معلوم ہوا۔ مختصر یہ کہ شادی کے تمام مراحل طے ہو چکے ہیں۔ صرف یہ طے کرنا باقی ہے۔ کہ میں میئر کے دفتر میں کب جاؤں۔ اور گاؤن کیسا پہنوں۔ بھورے رنگ کا یا بادامی اور ٹوپی سائے دار ہو یا بے سائے کی؟"

"واہ کیسی قینچی کی طرح زبان چلا رہی ہے۔"

"کیوں نہ چلے گی۔ اب تو کوئی مرحلہ باقی رہا نہیں۔ مجھ میں اور روبرتو میں کامل محبت ہو گئی ہے۔ میرے "رشتہ دار بھی" اس نسبت سے رضامند ہیں ....."

"تو تم اس طرح شادی کرنے پر تیار ہو؟"

"اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ اس کے تو بیسیوں معنے ہو سکتے ہیں۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ تم اسے اچھی طرح سے جانے اور محبت کئے بغیر اُس سے شادی کر رہی ہو۔"

"نہیں بغیر جانے تو نہیں۔ میں اُسے بخوبی جان چکی ہوں۔ میں نے اُسے گھوڑدوڑ میں اور اس کے علاوہ سیر و تفریح میں اکثر دیکھا ہے۔ میں تو اس کی پرستش کرتی ہوں۔ پرسوں میں نے اُسے نہیں دیکھا۔ تو مجھ سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ اور میں خودکشی کی نیت سے تین پیالے "کافی" بھی پی گئی۔"

"اور اس کا کیا حال ہے؟"

"وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے مجھ سے محبت کرتا ہے"۔

لولو نے جوشِ مسرت میں یہ جواب دے تو دیا۔ لیکن صوفیہ کے چہرے پر افسردگی دیکھ کر اسے ان بیباکانہ الفاظ پر بہت افسوس ہوا۔ اُس نے بہن کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔ "بہن کیا میں غلط کہتی ہوں؟"

صوفیہ نے ایک لمبی سانس لے کر کہا "نہیں دیوانی غلط کیوں کہنے لگی۔ جب کوئی محبت کرتا ہے تو شادی تو کرتا ہی ہے۔ لیکن محبت کا بیدار کرنا مشکل ہے"۔

لولو کچھ جھنجھلا کر بولی۔ "محبت کا بیدار کرنا مشکل ہے۔ صوفیہ یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ لیکن تمہاری طرح جس کی بھنویں کھنچی رہیں آنکھوں میں اُداسی چھائی ہوئی ہو۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کا نام نہ ہو۔ جو اس وقت بھی اپنے خیال میں گم ایک گوشے میں پڑا رہے جب دوسرے ناچ گا تے اور ہنسی مذاق سے دل بہلا رہے ہوں۔ اور ہنسنے کھیلنے کی بجائے کتابوں میں اُلجھا رہے۔ جو جوان ہو کر بھی غمزدہ صورت بنائے رہے۔ اُس کے لئے محبت کا بیدار کرنا البتہ مشکل ہے"۔

صوفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔ اُس کے ہونٹ اس طرح کانپ رہے تھے۔ گویا وہ اپنے آنسو بڑی مشکل سے روک رہی ہو۔

لولو بولی۔ "میری باتوں سے تمہیں کچھ رنج تو نہیں پہنچا؟ میں تو تمہیں

بھی محبت سے شرابور ایک دُلہن کی صورت میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ کتنا اچھا ہو۔ اگر ہم دونوں کی شادی ایک ہی روز ہو"۔

"نہیں میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں کنواری ہی رہ کر زندگی گزار دوں گی"۔

"بس بس مس صاحبہ مجھ سے زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔ روبہ تو ایک حسین نوجوان ہے۔ اور اس کا ایک نہ ایک بھائی ضرور ہوگا۔ اس لئے میری دلی کوشش ہوگی کہ اس سے تمہاری شادی ہو جائے"۔

اتنے میں اُن کی ماں کپڑے پہن کر باہر جانے کے لئے کمرے میں آئی۔

لولو نے پوچھا "کہیں باہر جا رہی ہو امی؟"

"ہاں بیٹی۔ ذرا وکیل کے ہاں جانا ہے"۔

اچھا" وکیل کے ہاں جا رہی ہو۔ تب تو ضرور کوئی خاص بات ہوگی"۔

"ہاں۔ بتّو! خاص ہی بات ہے۔ جو تمہیں بھی جلد ہی معلوم ہو جائے گی۔ صوفیہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔" "اچھا تو کیا صوفیہ کو بھی قانونی رائے لینی ہے؟"

"لولو! تو زبان کو قابو میں رکھنا کب سیکھے گی۔ اور تیری یہ طفلانہ حرکتیں کب چھوٹیں گی؟" ..... "جلد ہی چھوٹ جائیں گی امی"۔ پھر وہ ماں اور بہن کے لئے دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑی ہو گئی اور ازراہِ شرارت سنجیدہ صورت بنا کر دوبارہ جھک کر سلام کر کے بولی "بیگم صاحبہ اور مس صاحبہ اِدھر سے"۔ اور جب وہ دونوں کچھ دُور نکل گئیں تو لولو نے

ایک قہقہے کے ساتھ پکار کر کہا: "امی خوب اطمینان سے باتیں کر لینا۔ میں بھی ایسی بنوں گی گویا کچھ بھی نہیں جانتی۔"

(۳)

روبرتو کچھ زیادہ غور و فکر کرنے والا آدمی نہ تھا۔ اُس کے پاس غور و فکر کے لئے وقت بھی نہ تھا۔ اس کے اوقات دعوتوں، اسپ سواریوں ملاقاتوں اور سیر تماشوں میں لطف سے گزر رہے تھے۔ وہ اپنا شام کا وقت اپنی محبوبہ لولو کے ساتھ بسر کرتا۔ باقی اوقات میں اُسے کبھی وکیل کے پاس کوئی قانونی مشورہ لینے جانا پڑتا۔ کبھی کسی قرضدار سے قرض کی وصولی کا بندوبست کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ اسے مکان اور شادی کے بعد ہنی مون منانے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ اسے گھنٹہ آدھ گھنٹہ مطالعہ کے لئے بھی وقت نہ ملتا تھا قہوہ خانے کے سامنے پندرہ منٹ چہل قدمی کرنا اس کا معمول تھا۔ آج کل وہ بھی ترک ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ کبھی کسی گہرے خیال میں غرق نہیں دیکھا گیا۔ نہ وہ کبھی کسی معاشرتی مسئلہ میں سر کھپاتے پایا گیا۔ روبرتو میں خوش انجام یا حزنیہ ڈرامے کے ہیرو بننے کا بھی کوئی جذبہ نہ تھا۔ وہ نہایت ہی سکون پسند انسان تھا۔ اور کچھ لوگ تو اس کی اس فطرت کے باعث اس پر رشک بھی کیا کرتے تھے۔

لیکن آج روبرتو خلافِ معمول دن کو سہ پہر کے وقت آرام کرسی پر بیٹھا ٹانگ پر ٹانگ دھرے کتاب ہاتھ میں لئے مطالعے کی کوشش کر رہا تھا۔ کتاب کافی دلچسپ تھی۔ لیکن پھر بھی اُس کا دل کسی اور خیال میں اُلجھا

ہوا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُس کے چہرے سے فکر و تردد کے آثار بھی نمایاں تھے۔ وہ ایک صفحہ بھی پورا نہ پڑھ سکا۔ دو ہی چار سطروں کے مطالعہ کے بعد اُسے ایسا معلوم ہوا گویا چھپے ہوئے حروف کاغذ پر رقص کر رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ غیر ارادی طور پر خیالات کی وادیوں میں سرگرداں پھرنے لگا۔

"پاپا مطمئن ہیں۔ چچی اور پھوپھیوں نے دعائیں بھیجی ہیں۔ اور چچازاد بہنیں ناخوش ہیں۔ قہوہ خانے میں میرے احباب از راہِ طنز مبارکباد دیتے ہیں۔ اور میرے مخلص دوست ہاتھ دبا دیتے ہیں۔ ان قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں شادی کرنے میں کوئی غلطی نہیں کر رہا۔ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ لولو حسین نہیں ہے۔ جب وہ اپنی شوخ آنکھیں اوپر اُٹھا کر مجھے دیکھتی ہے۔ اور ہنستے وقت اس کے موتیوں کی لڑی ایسے دانت نظر آتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے اس کے حسین و ملیح چہرے کو پکڑ کر اُس پہ بوسوں کی بھرمار کر دُوں۔ وہ طبیعت کی شریف اور اخلاق کے اعتبار سے کھرا سونا ہے۔ ہمیشہ خوش اور بشاش رہتی ہے۔ اور ہر وقت مذاق کرتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ شوخ و طرار اور حاضر جواب بھی ہے۔ کبھی اُداس نہیں رہتی۔ ہم دونوں میں نبھے گی خوب۔ مجھے لٹکا ہوا لمبا چہرہ ایک آنکھ نہیں بھاتا خصوصاً اس کا جس سے مجھے محبت ہو۔ میرا تو پختہ خیال ہے۔ کہ جس شخص کے چہرے پر افسردگی طاری رہتی ہے۔ اس کے دل میں ضرور کسی نہ کسی طرح کا غم پوشیدہ ہوتا ہے۔

میری ہونے والی سالی صوفیہ میں نہ جانے ایسی کیا بات ہے کہ اُس کے افسردہ چہرے کو دیکھتے ہی مجھے ایک وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ اور وہ جیسے ہی میرے سامنے آتی ہے میرا دل اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ اور ساری مسرت زائل ہو جاتی ہے۔ اس وقت خواہ کتنی ہی سہانی دھوپ نکلی ہو۔ مجھے ایسی اُلجھن ہونے لگتی ہے۔ گویا برسات کی گہری گھٹا چھائی ہو۔ مجھ میں لولو سے ہنسی مذاق تک کرنے کا جذبہ باقی نہیں رہتا۔ میری ساری خوشی کافور ہو جاتی ہے۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر باتیں کرتی ہے۔ مجھ سے ہاتھ تک نہیں ملاتی۔ مختصر سے مختصر لفظوں میں جواب دیتی ہے۔ شاید صوفیہ نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا ہے۔ کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ مجھ سے الگ الگ رہتی ہے۔

"لولو ہمیشہ ہنستی رہتی ہے۔ وہ ہے بھی تو بالکل چھوکری۔ اُس نے کبھی سنجیدہ صورت بنا کر مجھ سے بات نہیں کی۔ اگر کبھی سنجیدہ بن کر بات کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے مذاق کر رہی ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ مگر دیوانہ وار نہیں۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ میں بھی اس سے دیوانہ وار محبت نہیں کرتا . . . . . .

اور یہی بہتر بھی ہے۔ مَیں ازدواجی معاملے میں دو باتوں کو ازلیس ضروری خیال کرتا ہوں۔ اوّل یہ کہ میاں بیوی کو ہم مزاج اور ہم مذاق ہونا چاہیئے۔ دوم یہ کہ اُن کو اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز حد سے زیادہ محبت کے ساتھ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہماری حالت ان اصولوں کے بالکل مطابق

ہے ۔ اور مجھے یقین ہے ۔ کہ میری اور لولو کی بیاہتا زندگی ہر طرح خوشگوار اور کامیاب ہو گی ۔ شادی کے بعد ہم دونوں اطالیہ بھر کی سیر کریں گے ۔ کسی طرح کی عجلت سے کام نہ لیں گے ۔ چھوٹے چھوٹے سفر کریں گے ۔ جہاں دل چاہے گا ٹھہر جائیں گے ۔ اور اطمینان سے ہر چیز دیکھیں گے ۔ اسی طرح تین مہینے گزریں گے ۔ نہیں تین مہینے کافی نہ ہوں گے ۔ بلکہ چار مہینے ، صوفیہ کی افسردہ صحبت سے لولو کا کچھ دنوں علیحدہ رہنا ہی بہتر ہے ۔

لیکن بہر حال یہ بات قابلِ غور ہے کہ کیا اس عمر کی دوشیزہ کے لئے ایسی متانت اور سنجیدگی مناسب ہے ۔ زیادہ سے زیادہ اُس کی عمر تیئس سال کی ہو گی ۔ اُس کا حُسن و جمال بھی معمولی نہیں ہے ۔ وہ حسین ہے اور بلا انتہا حسین ۔ بڑی بڑی سحر آگیں آنکھیں ۔ چلتی ہے تو کبک دری کی طرح ۔ اگر اُس میں کوئی عیب ہے تو یہی کہ وہ اپنی صورت کو ہر وقت افسردہ اور مضمحل بنائے رہتی ہے ۔ ورنہ وہ مرد بے حد خوش نصیب ہے جسے صوفیہ جیسی رفیقۂ حیات ملتی ۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ کنواری ہی بوڑھی ہو جائے گی ۔ اور شاید اسی اندیشے سے وہ اس قدر افسردہ اور مضمحل رہتی ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کی اِس افسردگی کے پردے میں کوئی غمناک داستانِ محبت پوشیدہ ہو ۔ بہر حال اس کی افسردگی کا راز معلوم کرنا ضروری ہے ۔ لولو سے تنہائی میں اس کے متعلق دریافت کرنا چاہئے ۔

"میں اُس دن شام کو لولو کے ہاں گیا۔ تو اُس نے مجھے بتایا تھا اُسے چاکلیٹ بہت پسند ہے۔ وہ اکثر اسے کتر کتر کر کھاتی ہے۔ کھا چکنے کے بعد وہ کس طرح منہ بنا کر کہتی ہے کہ ہائے سارے چاکلیٹ ختم ہو گئے۔ لولو کتنی حسین اور دلفریب ہے۔ ایک روز اُس نے میرے کان میں آہستہ سے کہا کہ جب بادل گرجتے ہیں۔ تو وہ ڈر جاتی ہے۔ اور تکیے میں منہ چھپا کر پڑ رہتی ہے۔ وہ اکثر خواب دیکھتی ہے کہ وہ لمبا سیاہ گاؤن پہنے ہے جس کا دامن بیگموں کے لمبے دامن کی طرح زمین پر گھسٹتا جاتا ہے۔ اس کے گلے اور آستین میں سفید لیس کا کالر اور کف ہے۔ اُس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا۔ کہ وہ کسی قسم کی رقابت برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ایک سنہرے دستے کی ایک چھوٹی سی کٹار خرید کر اپنے پاس رکھے گی، تاکہ اپنے دشمن سے بدلہ لے سکے۔ وہ اس قسم کی بے سروپا باتیں کرتے وقت کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ اور بچوں کی طرح اپنے تمام خیالات پر زبردست یقین رکھتی ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی باتوں پر صوفیہ بھی مسکرا پڑتی ہے۔ اور اس وقت اس کا مضمحل چہرہ دمک اُٹھتا ہے۔ صوفیہ بھی ایک عجیب پُر اسرار دوشیزہ ہے۔ اس کا سمجھنا کس قدر مشکل ہے!"

خیالات کے استغراق میں کتاب رد برتو کے سینے سے کھسک کر نیچے گر پڑی جس کی آواز سُن کر وہ چونک پڑا۔ اور اس طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا گویا وہ اپنے آپ کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہے۔ اسے

اپنے آپ پر تعجب ہو رہا تھا کہ اسے آج کیا ہو گیا ہے۔ کہ وہ خیالات کے ہجوم میں اس طرح کھو گیا ہے۔

(۳۷)

شام کا جھٹپٹا فضا پر چھایا ہوا تھا۔ صوفیہ ایک کھڑکی کے پاس جو چھجے کی جانب کھلتی تھی کھڑی ہجوم اور شور و غل سے معمور سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ صوفیہ کی نگاہوں سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا۔ گویا وہ آدمیوں کے اس ہجوم میں کسی کو تلاش کر رہی ہے۔ یکایک اس کے چہرے کی شگفتگی پژمردگی سے تبدیل ہو گئی۔ وہ کمرے میں واپس چلی آئی۔ اس کے ایک منٹ بعد دروازے کو زور سے کھول کر کرسیوں کو ادھر اُدھر کرتی طوفان کی طرح لولو کمرے داخل ہوئی۔

"محترمہ مس صوفیہ سانتا جلو! کچھ مطالعہ کر رہی ہیں کیا؟"

"ہاں مطالعہ ہی کر رہی تھی"۔

"تم نے باہر چھجے پر کھڑے ہونے کی کبھی ضرورت نہیں سمجھی؟"

"کیا ضرورت تھی؟"

"اچھا تمہیں ضرورت نہ ہو۔ لیکن مجھے تو ہے۔ اس لئے کہ آج شام کے پہننے کے لئے آبینا درزن میرا نیا گاؤن لانے والی تھی۔ اس کے انتظار میں میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ میں کب کی تیار ہو کر یہاں آ جانا چاہتی تھی کیونکہ میں نے کل شام روبرتو سے کہا تھا کہ وہ آج اپنا کبوترا اوورکوٹ پہن کر اور سلیم کو گاڑی میں جوت کر ساڑھے چھ بجے اِدھر

سے گزرے ہ معلوم نہیں ، میرے کہنے کے مطابق وہ اس طرف آیا تھا۔ یا نہیں؟"

روبرتو اِدھر سے گیا تو ہے۔ بھُورا کوٹ پہنے اپنی ٹم ٹم میں بیٹھا تھا۔"

"کیا واقعی ؟ نہیں کیسے معلوم ہوُا۔ تم تو یہاں بیٹھی کتاب دیکھ رہی تھیں؟"

"مَیں کھڑکی میں کھڑی تھی۔"

"خوب! تو تم نے روبرتو کو پہچان لیا۔ تم تو کبھی اُس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھتیں بھی نہیں۔ وہ جھک کر آداب تو بجا لایا ہوگا؟"

"ہاں!"

"اس نے اپنی ٹوپی بھی اُٹھائی تھی؟"

"ہاں، کیونکہ وہ تو ہمیشہ ٹوپی اُٹھاتا ہے۔"

"تم نے جُھک کر جواب دیا تھا؟"

"کیا تمہارا خیال ہے کہ مَیں تہذیب و اخلاق کے قاعدے سے بے بہرہ ہوں؟"

"تو کم از کم تم اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی تو ضرور ہوگی؟"

"نہیں مجھے یاد نہیں۔"

"صوفیہ! روبرتو کل شام مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم اچھی عورت نہیں ہو۔"

"اس طرح کہہ رہا تھا؟"

"نہیں وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ تم اس قدر الگ الگ کیوں رہتی ہو؟ اور تمہاری طبیعت میری طبیعت سے اس قدر مختلف کیوں ہے۔ میں نے جواب میں تمہاری تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ میں نے اُسے بتایا کہ تم مجھ سے کہیں ملنسار اور خوش اخلاق ہو۔ مجھ سے زیادہ محبت کرنے والی ہو۔ اگر تم میں کوئی عیب ہے تو یہی کہ اپنی ان خوبیوں کو ظاہر نہیں ہونے دیتیں۔ وہ میری بات کو بغور سُن رہا تھا۔ آخر میں اُس نے مجھ سے دریافت کیا۔ کہ تم اس سے نفرت کیوں کرتی ہو؟"

"نفرت!"

"ہاں۔ وہ تو یہی کہہ رہا تھا۔ اور تم خود سمجھتی ہو کہ اُس کا کہنا غلط نہیں ہے۔ تم تو اُس سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتیں لیکن میں نے تمہاری وکالت کرتے ہوئے اس کی تردید کر دی اور کہہ دیا۔ کہ تم اُسے نہایت پسند کرتی ہو۔ اور اس کے متعلق تمہارا خیال . . . ."

"لولو!"

"میں جانتی ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا سرتا پا بے اصل تھا۔ پھر بھی میں اتنا ضرور کہوں گی کہ روبرٹو تمہیں اس قدر پسند کرتا ہے۔ کہ اس کے ساتھ تمہارا اجنبیوں کا سا برتاؤ سراسر خلافِ اخلاق ہے"۔

صوفیہ نے اپنی چھوٹی بہن کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس کا منہ چوم لیا۔

لولو کچھ دیر تک خاموش رہ کر محبت بھری آواز میں بولی۔ "تم اپنی محبت کا کچھ حصہ روبرٹو کو کیوں نہیں دے ڈالتیں؟" صوفیہ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ چونک کر اُس کی گردن سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

لولو نے گفتگو کا پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو خیر اس بات کو چھوڑ دو۔ یہ تو بتاؤ کہ واقعی تم شام کو ہم لوگوں کے ساتھ نہیں چل رہی ہو؟"

"نہیں میرے سر میں درد ہے۔ تم امّی کے ساتھ چلی جانا۔"

"پھر وہی بات۔ میں تو ضرور ہی جاؤں گی۔ کیونکہ مجھے تو زندگی کا لُطف اُٹھانا ہے۔"

"روبرٹو بھی تمہارے ساتھ جائے گا؟"

"نہیں ڈائرکٹروں کی میٹنگ ہے۔ اس لئے وہ کلب میں جائے گا۔ میں اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ویکٹو کے رقص خانے میں چلی جاؤں گی۔ اور رات بھر ناچتی رہوں گی۔"

"اگر روبرٹو کو پتہ چل گیا تو؟"

"یہ تو اور بھی اچھا ہوگا۔ اِس طرح اُس پر میری آزادہ روی ظاہر ہو جائے گی۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ وہ مجھ پر پابندیاں عائد کرے۔ اور میری آزادی میں مخل ہو۔"

"میرا تو خیال ہے تمہیں اُس سے دلی محبت نہیں ہے۔"

"ہے کیوں نہیں۔ ذرا اپنے خاص ڈھنگ سے ہے۔ اچھا اب میں چل کر کپڑے بدل ڈالوں۔ کم سے کم دو گھنٹے اس میں بھی صرف ہوں گے۔"

(۴)

صوفیہ کھڑی ماں اور بہن کی گاڑی کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنتی رہی۔ وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اور وہ تنہائی کو ہی پسند کرتی تھی۔ بچپن میں جب کوئی اُسے ڈانٹتا یا مارتا تو وہ بھاگ کر بستر کے اندر گھس جاتی اور تنہا پڑی رویا کرتی۔ اُس کی وہ عادت اب تک باقی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے طویل وعریض ڈرائنگ روم میں موم بتی سے روشن شمعدان کے پاس گدے دار کرسی پر سر ٹیکے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی تھی چہرے پر عمیق حزن و ملال چھایا ہوا تھا۔ جو اس بات کا پتہ دے رہا تھا۔ کہ اس کے دل میں جذبات کا طوفان برپا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تنہائی میں اس کے قلبی تاثرات پوری شدت اختیار کر چکے تھے۔

وہ پیروں کی آہٹ سن کر چونک پڑی۔ یہ روبرٹو کے پاؤں کی آہٹ تھی۔ وہ صوفیہ کو تنہا دیکھ کر ایک بار آگے بڑھنے سے جھجکا۔ لیکن پھر یہ سمجھ کر کہ گھر کے اور لوگ کسی دوسرے کمرے میں موجود ہوں گے۔ اس نے پھر آگے قدم بڑھایا۔ صوفیہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"شام بخیر صوفیہ!"

"شام بخیر!"

دونوں بت کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ روبرٹو دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ کہ کیسی بد اخلاق لڑکی ہے۔ اتنی دیر میں صوفیہ نے سنبھل کر اپنی عادت کے مطابق متین صورت بنالی۔ اور دونوں ایک دوسرے سے

کسی قدر ہٹ کر بیٹھ گئے ۔

" تمہاری اماں جان تو بخیریت ہیں ؟"

" جی ہاں بخیریت ہیں ۔ آپ کا شکریہ !"

" اور لولو ؟"

" وہ بھی اچھی ہے "۔

پھر سکوت طاری ہو گیا ۔ روبہ تو رنج اور خوشی کی ایک ملی جلی کیفیت محسوس کر رہا تھا ۔

" کیا لولو کسی کام میں مصروف ہے ؟"

صوفیہ نے اپنے اضطراب کو دباتے ہوئے کہا ۔" وہ ماں کے ساتھ ویلونو کے رقص خانے میں گئی ہے "۔ اُس نے اس طرح جلدی سے جواب دیا گویا وہ اسکے سوالوں کا اندازہ کرکے ایک ہی بار تمام باتوں کے جواب سے فارغ ہونا چاہتی ہے ۔

چونکہ صوفیہ اکیلی تھی ۔ اور روبر تو خود کو بدتمیز کہلانا پسند نہیں کرتا تھا ۔ اس لئے اسے اپنا وہاں ٹھہرنا اور بات چیت کرنا نامناسب معلوم ہوا ۔ یہ خیال آتے ہی وہاں سے نکل بھاگنے کے منصوبے سوچنے لگا پھر بھی اُس سے اُٹھا نہ گیا ۔

" میں اس لئے چلا آیا کہ کلب کے ممبر کافی تعداد میں نہیں آئے تھے "۔ اُس نے یہ بات اس طرح کہی گویا اپنے آنے کی صفائی پیش کر رہا ہو ۔

" مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لولو کو تمہارے آنے کا انتظار نہ تھا ۔

"اس کا کچھ مضائقہ نہیں" روبرتو نے قطع کلام کرتے بولا۔ ایک دوشیزہ کی غیر موجودگی میں روبرتو کا ایسا جواب کسی طرح موزوں نہیں تھا۔

روبرتو نے پھر کہا "اور تم نہیں گئیں؟"

"نہیں مجھے رقص و سرود سے دلچسپی نہیں ہے"

"کیا تمہیں مطالعہ زیادہ پسند ہے؟"

"ہاں بہت زیادہ"

"تو تمہیں کثرت مطالعہ سے نقصان کا خطرہ محسوس نہیں ہوتا؟"

"نہیں میری نگاہ بہت اچھی ہے" صوفیہ نے آنکھیں اوپر اٹھا کر روبرتو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

روبرتو کو اس کی آنکھیں نہایت حسین معلوم ہوئیں۔ اس نے سوچا، کاش یہ آنکھیں ہر وقت اداس رہنے کی بجائے مسرور رہا کرتیں۔

روبرتو بولا "میرا مطلب بینائی کے نقصان سے نہیں، قلبی اور دماغی نقصان سے تھا"

"اس طرح کے نقصان کا بھی اندیشہ نہیں۔ میں جن کتابوں کا مطالعہ کرتی ہوں۔ وہ میرے لئے بہت ہی سکون بخش ثابت ہوتی ہیں"

"کیا تمہیں بھی حصولِ سکون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟"

"کون ایسا انسان ہے جسے سکون و اطمینان کی ضرورت نہیں"

صوفیہ کی آواز متین اور ترنم آمیز تھی۔ اس لئے روبرتو کو اس کی گفتگو سے ایک کیف حاصل ہو رہا تھا۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے وہ

ایک ایسی عورت کے پاس بیٹھا ہے جس سے وہ قبل ازیں بالکل ناآشنا ہے۔ اور اب جس کی ایک ایک ادا کی خوبیاں اس پر منکشف ہوتی جا رہی ہیں۔

صوفیہ کی خشک مزاجی بھی یک لخت زائل ہو چکی تھی۔ اب وہ رد برڈ کی طرف دیکھتی بھی تھی مسکراتی بھی تھی۔ اور دوستانہ لب و لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔

ان دونوں کی پہلی حالت میں ایک انقلاب آ گیا تھا۔

رد برڈ تو بولا "جب میں کوئی اچھی کتاب دیکھتا ہوں۔ تو مجھے یہ معلوم کرنے کی زبردست خواہش ہوتی ہے۔ کہ خود کتاب کے مصنف یا مصنفہ پر کیا گذری ہے۔ کیا اس نے بھی کسی سے محبت کی ہے۔ کیا اس کو بھی محبت کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے؟"

صوفیہ نے کہا۔ "کچھ دنوں بعد تمہارے اس خیال کی اصلاح ہو جائیگی اور تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ افسانہ نگار خواہ مرد ہوں یا عورتیں اپنی داستانِ محبت کبھی سپردِ قلم نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ دوسروں ہی کی عشقیہ داستانیں لکھا کرتے ہیں۔"

"وہ خودداری کے خیال سے اپنی سرگذشت منظرِ عام پر لانا پسند نہیں کرتے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ رشک و رقابت کے جذبات سے اثر پذیر ہو کر اپنے خیالات لکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے دل بھی ہیں جن کے

لئے دنیا کی گرانبہا اور عزیز ترین شے محبت ہے"۔

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے بھی صوفیہ کے لب و لہجے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کے چہرے کا بھی وہی سیدھا سادہ انداز قائم رہا اس کی آواز اور اس کے لہجے میں اتنی سادگی، پاکیزگی اور خلوص و اعتماد تھا کہ اس کے مسئلہ محبت پر اس صحت و یقین کے ساتھ گفتگو کرنے پر روبرتو کو مطلق تعجب نہیں ہوا۔ اسے صوفیہ کی تمام باتیں تصنع سے پاک اور فطری معلوم ہو رہی تھیں۔ روبرتو کی اس روز کی شام جو صوفیہ کے ساتھ گزر رہی تھی۔ اُسے ایسی معلوم ہو رہی تھی۔ گویا وہ اس کا مدتوں سے منتظر تھا۔ اور جو گویا روز اوّل ہی سے اس کی قسمت میں لکھی جا چکی تھی۔

جب وہ ایک دوسرے سے جُدا ہونے لگے تو دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے گویا وہ ایک دوسرے کو اس طرح پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہ دوبارہ ملاقات ہونے پر ایک دوسرے کے پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ صوفیہ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جسے روبرتو اپنے ہاتھ میں لے کر ازراہ احترام اس پر جھک گیا۔ ساتھ ہی دروازے کے بھاری پردے نے درمیان میں آ کر دونوں کو ایک دوسرے جدا کر دیا۔

(۵)

صوفیہ کی ہم نشینی اور بات چیت کا گہرا اثر روبرتو کے دل سے کچھ کم ہوا۔ تو بہت گھبرایا۔ اس کا دماغ ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ کبھی انبساط و

مسرت محسوس کرتا تھا۔ اور کبھی رنج والم۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے اور لولو کے متعلق کیا فیصلہ کرے۔

صوفیہ بے حد خوش تھی۔ اور اسی لئے وہ تکیے میں منہ چھپائے سسک سسک کر خوشی کے آنسو بہا رہی تھی۔

تین مہینے گزر گئے۔ اور لولو کی شادی برابر ٹلتی چلی گئی۔ ماں اس تاخیر کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ بار بار لولو کو علیحدہ بلا کر اس سے وجہ دریافت کرتی۔

لولو جواب دیتی "میں ابھی روبرتو کو زیادہ سمجھنا چاہتی ہوں"۔

واقعی لولو اب بہت سنجیدہ اور دور اندیش ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی ناچتی گاتی اور ہنستی مذاق کرتی۔ مگر درمیان میں وہ روبرتو اور صوفیہ کا مطالعہ کرنے اور صوفیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی۔ صوفیہ بھی اپنی دونوں بھنویں ملائے اور ہونٹ دبائے بڑے غور سے لولو کی بات سنتی۔

لولو کے غور و فکر اور مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اُسے صوفیہ اور روبرتو میں روز افزوں تغیرات نظر آنے لگے۔

روبرتو میں پہلے کی سی بے تکلفی اور شوخی و شگفتگی باقی نہیں رہی اب وہ ہر وقت مضطرب اور بے چین نظر آتا تھا۔ اور اُس کے چہرے پر زردی اور افسردگی سی چھائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ وہ اب بولتا بھی بہت کم تھا۔ اور جب باتیں کرتا تو معلوم ہوتا کہ وہ کہیں اور ہے۔ اور اس کا دل کہیں اور۔ اُسے پہلے جن چیزوں سے دلچسپی تھی۔ انہیں چیزوں

سے اب وہ نفرت کرنے لگا تھا۔ وہ کبھی کبھی پہلے کی طرح خوش رہنے کی کوشش کرتا اور کامیاب بھی ہو جاتا۔ لیکن یہ حالت محض عارضی ہوتی۔

رَدَبَرٹو تصنع اور تکلف سے واقف نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنی اندرونی حالت کو چھپانے کی کوشش کرتا تو وہ اور بھی عُریاں ہو جاتی۔ اُس کا قلبی اضطرار و اضطراب اُس کی آنکھوں سے ٹپکا پڑتا تھا۔

صوفیہ میں بھی زبردست تبدیلی ہو گئی تھی۔ اب اس کا پہلا سکون و اطمینان یک لخت معدوم ہو گیا تھا۔ وہ ہر وقت مضطرب اور پریشان رہتی تھی۔ وہ کبھی وفورِ محبت میں چھوٹی بہن کو گلے سے لگا لیتی۔ کبھی اس سے الگ گھنٹوں تنہا بیٹھی رہتی۔ اس کی آنکھوں سے ہر وقت چنگاریاں نکلتی رہتی تھیں۔ اس کے رخساروں پر اس طرح سرخی آتی اور جاتی رہتی تھی جس طرح ہوا کی رَو کے ساتھ بادل گھرتے اور چھٹتے رہتے ہیں۔ اس کا بدن بھی گرم رہتا تھا۔ اور سانس بھی۔ ہجومِ جذبات سے کبھی اُس کی آواز بھاری ہو جاتی، کبھی سخت اور کرخت، کبھی نرم اور دھیمی۔ اُس کے ہاتھ کانپا کرتے رات کو نیند نہ آتی تھی۔ لولو اکثر رات کو ننگے پاؤں اُس کے کمرے کے دروازے پر جا کر آہٹ لیتی۔ صوفیہ تمام رات کروٹیں بدلتی۔ اور سسکتی رہتی۔ لولو وجہ دریافت کرتی تو صوفیہ جواب دیتی "نہیں، کوئی بات نہیں ہے"۔

(۶)

اب روبہ تو اور صوفیہ میں روزانہ ملاقات ہونے لگی تھی۔ وہ آپس میں ملتے تو اپنی تبدیل شدہ حالت کو اور بھی شدت سے محسوس کرتے۔ ان میں باتیں بہت کم ہوتیں۔ وہ ایک دوسرے کی بات کا سرسری جواب ہی دیتے۔ دونوں ایک دوسرے کو ایک عجیب انداز سے دیکھتے۔ کبھی کبھی وہ ملاقات کے پورے وقت کو خاموشی ہی میں گزار دیتے۔ لیکن روبہ تو کسی نہ کسی حیلے سے اس کی مس کی ہوئی کتاب یا اس کے کاڑھنے کی کوئی چیز اٹھا لیتا۔ جب کبھی صوفیہ کمرے میں نہ آتی۔ تو وہ اور بھی بے چینی کے ساتھ بار بار بند دروازے کی طرف دیکھتا۔ کبھی اس سے کچھ پوچھا جاتا۔ تو بڑی بے دلی سے کوئی بے سروپا جواب دے دیتا۔ کبھی صوفیہ کے آنے کے چند منٹ بعد ٹوپ اٹھا کر چلنے لگتا۔

صوفیہ روز بروز زرد ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ بالآخر اس نے یہ طے کر لیا۔ کہ اب وہ باہر نکلنا چھوڑ دے گی چنانچہ وہ ایک ہفتے تک نہایت درد و کرب اور اندوہ و غم کی حالت میں اپنے ہی کمرے کے اندر پڑی رہی۔

اسی حالت میں ایک روز لولا اس کے کمرے میں جا کر کہنے لگی "صوفیہ میرا ایک کام کرو گی؟"

"کون کام ہے۔ کہو؟"

"مجھے ایک مختصر سا خط لکھنا ہے۔ روبہ تو چھت پہ تنہا بیٹھا ہے۔ تم

تھوڑی دیر تک اس کے پاس بیٹھ کر اُس سے بات چیت کرو۔"

"لیکن میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تو کیا تمہیں یہاں بند پڑا رہنا اتنا اچھا لگتا ہے۔ کہ تم میرا اتنا معمولی سا کہنا بھی نہیں کر سکتیں؟"

"تو جلدی آجاؤ گی نا؟"

"اور کیا۔ مجھے چند ہی سطریں تو لکھنی ہیں۔"

صوفیہ اس نازک حالت کا مقابلہ کرنے کے لئے چھت کی طرف چلی گئی۔ روبرٹو چھت پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ صوفیہ ایک بار تو دروازے پر پہنچ کر ٹھٹکی۔ پھر ہمت کر کے اس کے قریب چلی گئی۔

"مجھے لوئی نے بھیجا ہے۔" صوفیہ دھیمی آواز سے بولی۔

"تم مجبوراً یہاں آئی ہو؟"

"مجبوراً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

روبرٹو اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ ہجوم جذبات سے صوفیہ کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

"تمہارا یہ کیا حال ہے صوفیہ!"

"کچھ نہیں۔ لیکن تم میری طرف اس طرح نہ دیکھو۔" وہ سہمی ہوئی بولی۔

"تمہیں بخوبی معلوم ہے۔ صوفیہ کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔"

"روبرٹو۔ مجھ پر مہربانی کرو۔ اس طرح نہ کہو۔ لوئی نے سن لیا تو کیا ہوگا؟"

"صوفیہ! مجھے لولو سے محبت نہیں ہے تم سے محبت ہے"۔

"یہ لولو کے ساتھ بے وفائی ہے"۔

"میں جانتا ہوں۔ لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں چلا جاؤنگا۔"

لولو دوسرے دروازے پر کھڑی تھی۔ اُس نے وہاں سے پکارا۔

"کیوں جی! تم دونوں میں صلح ہو گئی یا نہیں؟"

کسی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ صوفیہ دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا کر بھاگ گئی۔ اور روبرتو اس طرح بت بنا بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ گویا اُسے بجلی چھو گئی ہو۔

لولو چلائی۔ "روبرتو!"

"لولو!" روبرتو اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

لولو پھر چلائی۔ "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں میں جا رہا ہوں"۔

روبرتو لولو سے رخصت ہوئے بغیر چلا گیا۔ لولو اس کی جانب دیکھتی اپنے خیال میں گُم وہیں کھڑی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ایک کی وہ حالت اور دوسرے کی یہ۔ معاملہ طول پکڑ رہا ہے۔ اب مجھے کچھ کرنا چاہئے"۔

(۷)

لولو نے ان تمام باتوں کو ماں سے بیان کر کے کہا۔ "اب میں روبرتو سے شادی نہیں کر سکتی"۔

"تو نے بھی شادی نہ کرنے کا کیا سبب گھڑا ہے۔" ماں نے سر ہلاتے

ہوسے کہا:۔

"تو کیا میں سچی بات کہہ دوں۔ کہ روبرٹو مجھے خوش نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں اُس سے شادی نہیں کر سکتی؟"

"تو نے اپنے دل کی بات ضرور کہہ دی۔ لیکن یہ محض تیرا وہم ہے۔ روبرٹو کو تجھ سے دلی محبت ہے۔"

"جو کچھ بھی ہو وہ اپنے دل کو سمجھائے گا۔"

"تم نے تو ایک دوسرے کو زبان بھی دے دی ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ زبان جس طرح دی جا سکتی ہے اُسی طرح واپس بھی لی جا سکتی ہے۔ وہ زمانہ تو اب ہے نہیں جب جبری شادیاں ہوا کرتی تھیں۔"

"دُنیا کیا کہے گی؟"

"دُنیا کے کیا معنی امی؟"

"لوگ کیا کہیں گے؟"

"یہ لوگ کون ہوتے ہیں؟ میں انہیں نہیں جانتی۔ میں لوگوں کی خوشی کے لئے اپنی زندگی تباہ کرنے پر مجبور نہیں ہوں۔"

"تو عجب لڑکی ہے۔ میں بھلا روبرٹو کو کیا جواب دوں گی؟"

"تم جو جی چاہے جواب دینا۔ آخر تم ماں کس لئے ہو؟"

"واہ کیا خوب، تم خود رائیاں کرتی پھرو۔ اور اس کا خمیازہ بھگتوں میں، پھر تمام دُنیا میں جو بدنامی و رسوائی ہوگی۔"

اس میں رسوائی اور بدنامی کی بات نہیں ہے۔ تم اُسے نرمی کے ساتھ سمجھا سکتی ہو۔ اور ڈھنگ کے ساتھ میری برائی بھی کر سکتی ہو۔ تم کہہ دینا کہ لولو بڑی ضدی، غیر مستقل مزاج اور چھچھوری لڑکی ہے۔ وہ بات بات میں بچپنے سے کام لیتی ہے۔ وہ اچھی بیوی نہیں بن سکتی۔ یہ بھی کہنا کہ اس میں نہ متانت ہے نہ سنجیدگی، نہ حمیت ہے۔ نہ خودداری اور لولو کی بڑی بہن . . . . . "

"تیری بڑی بہن! دیوانی ہو گئی ہے کیا لولو؟"

"اُونہہ۔ اتنا کہنے میں کیا حرج ہے۔ ابھی تو روبرٹو اور صوفیہ ایک دوسرے سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے بخوبی واقف ہونے کے بعد باہمی عیب وہنر کو پسند کرنے لگیں گے۔ اس میں تمہاری بھی نیک نامی ہے۔ لوگ کہیں گے۔ بڑی لڑکی کی شادی پہلے کر دی کتنی اچھی ماں ہے"

"اصل بات یہ ہے لولو . . . . . "

"بات کیا ہے؟ میں کنواری ہی تھوڑی رہ جاؤں گی۔ ابھی صرف اٹھارہ سال کی تو میری عمر ہے۔ پھر میں ابھی نادرہ کر نوجوانی کا لُطف بھی۔ تو اُٹھانا چاہتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اپنے لڑکپن کے ایام اپنی شریف اور سلیقہ مند ماں کے ساتھ گزار دوں"۔

"تو بڑی شریر ہے" ماں نے پیار سے بیٹی کو آغوش میں کھینچ کر کہا۔

"اچھا تو تم ساری باتیں سمجھ گئیں نا؟ اب جا کر روبر تو کو اِن باتوں کی اطلاع دے دو۔ ذرا سمجھا کر کہنا کہ ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے دوست رہیں گے۔ اور ہم میں اکثر ملاقات ہوتی رہے گی۔ اگر اُن دونوں کے دلوں میں باہمی محبت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ تو دونوں خوشی خوشی باہمی محبت کے رشتے میں منسلک ہو جائیں گے۔"

"کیا تجھے یقین ہے کہ تمام معاملات بآسانی طے ہو جائیں گے؟ تو جانتی ہے کہ مجھے کشمکش اور نزاع پسند نہیں۔"

"اماں تم بھی عجیب شکی مزاج ہو۔ میں پورے یقین سے کہتی ہوں کہ کسی طرح کی کوئی بے عزتی اور بدنامی نہ ہوگی۔ روبرتو ایک شریف آدمی ہے۔ وہ اُسے گوارا نہیں کرے گا۔ کہ میں اپنی پسند کے خلاف اس سے شادی کرنے پر مجبور کی جاؤں۔"

"یہ صوفیہ والی بات تو مجھے ناممکن معلوم ہوتی ہے۔"

"ناممکن سے زیادہ ممکن کوئی چیز نہیں ہوا کرتی اماں!" لولو نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اچھا اب تو اپنی فقرے بازی رہنے دے۔ کافی باتیں ہو چکیں۔ اب ہمیں تمام معاملات کو وقت کے سپرد کر دینا چاہئے۔ وقت خود ہی تمام معاملات کو درست کر دے گا۔ لیکن میں جانتی ہوں۔ کہ تو کبھی درست نہ ہوگی۔ تو ہمیشہ نٹ کھٹ ہی رہے گی۔"

"ہاں ضدی اور شریر چھوکری۔"

"ہاں ہاں میں پھر کہتی ہوں تو نہایت نافہم اور متلوّن مزاج چھوکری ہے۔"

"بلکہ پاگل اور سِڑی بھی، جو جی میں آئے کہہ لو۔ میں سب کچھ ہوں۔ کچھ اور کہنا چاہتی ہو تو وہ بھی کہہ ڈالو۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔"

"اچھا میری پیاری لولو جیسی تمہاری مرضی۔ جاؤ اب جاکے سو رہو۔"

"شب بخیر۔ امّی۔"

ماں نے سوچا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ لولو ہے بھی بہت کم سن۔ کم سنی کی شادیوں کے بُرے نتائج روز ہی پیش آتے رہتے ہیں۔ خدا نے اس سے بچا لیا۔ بہت اچھا ہوا۔

لولو ایک لمبی سانس لے کر دل ہی دل میں کہنے لگی "اُف امی کو رضامند کرنے کے لئے کیا کیا چالیں چلنی پڑیں۔ اور کیسی کیسی باتوں سے کام لینا پڑا۔ اگر مجھ کو شاہی سفارت کے کام پر مقرر کیا جائے۔ تو اسے کیسی خوبی سے انجام دے سکتی ہوں۔ کیسی زبردست فتح ہوئی ہے۔ محبت کی فتح نہیں بلکہ میری فتح ہے۔"

وہ اپنی بہن کے کمرے کے دروازے کے باہر جا کر کھڑی ہوئی۔ اندر سے رہ رہ کر دبی ہوئی آہوں کی آواز آ رہی تھی۔ غریب صوفیہ کو سکون و قرار نہ تھا۔ لولو نے اس طرح دروازے کو چُوما۔ گویا بہن کی پیشانی کا بوسہ لے رہی ہو۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔ "صوفیہ اب تم آرام و اطمینان کی نیند سوؤ۔ میں نے آج تمہارے آلام و مصائب کا خاتمہ کر دیا۔"

اس کے بعد وہ فراخدل اور ایثار پسند لڑکی اپنے کمرے میں آئی۔ اور اپنی بہن کے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو کر خود بھی میٹھی نیند سو گئی۔

(۸)

صوفیہ اور روبرتو کی شادی کا مبارک اور مسرت آگیں وقت آگیا۔ لولو کبھی سوچتی کہ اسے بہن کی شادی کے موقع پر سالی کی حیثیت سے کس رنگ کا گاؤن زیب تن کرنا چاہیے۔ نیلا۔ ریشمی یا بادامی رنگ کی لیس کے کام کا۔ کبھی روبرتو سے کہتی کہ شادی کے وقت اسے چاکلیٹ کا بڑا سا ڈھیر ملنا چاہیے۔ صوفیہ سے اس کا وہ رومال مانگتی جس پر اس کے ہاتھ کی کڑھی ہوئی بادلوں کی تصویریں تھیں۔ روبرتو اور صوفیہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ لولو کتنی ایثار پسند اور بلند حوصلہ لڑکی ہے۔ اس لئے وہ اس کی محبت اور امنگ بھری باتوں کو سُن سُن کر مسکرا دیتے تھے۔ اس طرح ان تینوں کا باہمی رشتۂ محبت مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

روبرتو نے اپنی شادی کے متعلق ایک دوست سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ "میرا تو ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ بیوی اور شوہر کو مختلف مزاج اور مختلف مذاق کا ہونا چاہیے۔ اسی صورت میں دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اور ایک دوسرے میں جذب ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی مزاج اور مذاق کے دو انسان اگرچہ دو مساوی خطوط کی طرح ہوتے ہیں۔ جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مگر آپس میں کبھی ملتے نہیں!"

آخری دن

مَیں اس وقت بائیس برس کی تھی۔ اور شہر وائنا کی ہر مجلس میں میرے حُسن و جمال کا چرچا تھا۔

سرما کے اواخر کا ذکر ہے۔ کہ ایک دن مجھے ایک خوش پوش شریف زادے نے بلا بھیجا اور کہا "کیا آپ تھوڑی دیر کے لئے تنہائی میں میرے ساتھ بات کر سکتی ہیں؟" مَیں نے اُس کی درخواست قبول کر لی۔ اس نے کہا:۔

"میری ایک لڑکی ہے جس سے مجھے بے حد محبت ہے۔ وہ بُری طرح بیمار ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ اس کی زندگی اور طاقت کو دوبارہ کارِ فرما کروں۔ اس مقصد کے لئے مَیں ہر طرف کا چکر کاٹ رہا ہوں تاکہ کوئی شخص مجھے اپنی جوانی کے چند سال مول یا عاریتہً دے دے۔ اگر تم مجھے ایک سال قرض کے طور پر دے دو۔ تو مَیں ایک ایک دن کر کے اسے موت سے پہلے واپس کر دوں گا۔ جب تم عمر کی بائیسویں منزل طے کر لوگی۔ تو بجائے تئیسویں سال کے تم چوبیسویں سال میں قدم رکھو گی۔

تم اپنی جوانی کی تروتازگی کی وجہ سے اس ایک سال کے خلا کو مشکل محسوس کر سکو گی۔ یقین جانو میں تمہارے تین سو پینسٹھ دن دو دو تین تین کر کے آخری دن تک تمہیں واپس کر دوں گا۔ اس طرح بڑھاپے میں بھی تم چوبیسویں سال کی سی جوانی کا لطف اُٹھاتی رہو گی۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے مذاق کر رہا ہوں۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ اور میں نے خدا سے باخلاص دعا کی تھی۔ کہ مجھے وہ نعمت ملے جو آج تک کسی کے قبضے میں نہ آئی ہو۔ اس سے پہلے میں تین سال کا عرصہ جمع کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ مگر ابھی مجھے بہت سے سالوں کی ضرورت ہے۔ ایک سال تم دیدو۔ اور اطمینان رکھو کہ تمہیں اس فراخدلی سے کوئی کوفت نہیں ہوگی۔"

میں ہمیشہ ایسے عجیب وغریب واقعات سے دوچار ہوتی رہی ہوں۔ اس لئے میں یہ حیرت انگیز قرضہ دینے پہ تیار ہوگئی۔ اور چند دنوں میں بقدر ایک سال کے میری موجودہ عمر میں اضافہ ہوگیا۔ شاید ہی کسی نے اس اضافے کو محسوس کیا ہوگا۔ چالیس سال تک مجھے وہ اپنا سال واپس لینے کی ضرورت نہ پڑی جو میں نے بطور قرض دے رکھا تھا۔ اور جا بھی تمام کا تمام مجھے واجب الوصول تھا۔

بوڑھے شریف نادے نے اپنا پتہ تمسک نامے کے ساتھ ہی منسلک کر دیا۔ اُس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر تمہیں ایک دو دنوں یا ایک ہفتہ کی ضرورت پڑے تو ایک مہینہ پہلے مجھے اطلاع دے دینا۔ تاکہ مقررہ وقت پر تم کو مطلوبہ ایام مل سکیں۔

چالیس سال کے بعد میری جوانی ڈھلنے لگی۔ مَیں ایک قلعے میں جو میرے خاندان کی ملکیت تھا۔ اقامت گزین ہو گئی۔ اور وائنا میں صرف ایک یا دو بار سال میں جایا کرتی تھی۔ مَیں بوڑھے قرضدار کو ایک مہینہ قبل استفادہ لکھ دیا کرتی تھی۔ اور بائیسویں سال کی سی جوانی کی بہار لے کر شہر کے بڑے بڑے گھرانوں میں چلی جایا کرتی تھی۔ اور جن لوگوں نے میری جوانی کا انحطاط دیکھا تھا۔ ان کے لئے میں ایک معما بن جاتی تھی۔ فی الحقیقت وہ لمحے بڑے مسرت انگیز تھے۔ جبکہ شام کے وقت میں بڑھاپے کے باعث کسلمند نظر آتی تھی۔ اور صبح اُٹھ کر سبک رفتار ہرن کی طرح کلانچیں بھرتی پھرتی تھی۔ اس وقت میرے چہرے کے تمام شکن دُور ہو جاتے۔ میرا جسم سڈول نِکل آتا۔ بال سُنہری ہو جاتے۔ اور ہونٹ سرخ ——— اتنے سرخ کہ خود میرا انہیں چومنے کو جی چاہتا! اس وقت وائنا کے لوگ جو میرے حُسن کے جال میں گرفتار ہو چکے تھے۔ میرے گرد جمع ہو جاتے اور میرے اچانک تبدیل ہو جانے کو جادو اور سحر پر محمول کرتے۔ لیکن انہیں اصلی واقعہ کی قطعاً خبر نہ تھی۔

جب میرا ٹھیکہ ختم ہونے کو آیا۔ تو مَیں نے اپنے آپ کو اسی قلعے میں بند کر دیا۔ وہاں کسی کو ملاقات کی اجازت نہ تھی۔ مگر ایک دن ایک جرمن افسر، جو وائنا میں میرے دامِ حُسن میں پھنس چکا تھا۔ کسی پُر اسرار طریق سے میرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں یہ کیسے ہوا۔ مجھے صورت بدلی ہوئی دیکھ کر اس کے حواس بجا نہ رہے۔ اس کے بعد کسی نے

میری مجلس میں آنے کی جرأت نہ کی۔ میں کبھی کبھی اپنے واجب الوصول دنوں کے ذریعے سے جوانی کی بہار دیکھ لیتی تھی جس سے میرے روبہ انحطاط شباب کا تسلسل منقطع ہو جاتا تھا۔ تم میری اس عجیب و غریب زندگی کا تصور نہیں کر سکتے۔ جو میں نے اس طرح گزاری ——— پژمردگی اور افسردگی کا طویل زمانہ جس میں ایک دو دنوں کے لئے جوانی عود کر آتی تھی ؛

غرضکہ یہ تین سو پینسٹھ دن مجھے لاانتہا معلوم ہوتے تھے۔ اکثر میں دنوں کی بقیہ تعداد سے بے نیاز ہو کر بوڑھے قرضدار سے مطالبہ کیا کرتی تھی۔ مگر وہ حساب کا پکا تھا!

ایک دن میں اس کے گھر گئی۔ حساب کی کاپی دیکھنے پر مجھے معلوم ہوا۔ کہ صرف میں ہی ایسی عورت نہیں جس کے ساتھ اُس نے ایسا ٹھیکہ کر رکھا ہے۔ بلکہ اور بھی ہیں۔ وہاں میں نے اس کی لڑکی بھی دیکھی۔ اس کا رنگ زرد اور چہرہ موت آفریں تھا۔ اس کے گرد پھول ہی پھول جمع تھے ؛

میں نے کبھی اس امر کا اندازہ نہیں لگایا تھا۔ کہ وہ کہاں سے زندگی مانگ کر مقررہ دن پر ادا کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ نئے آدمیوں سے اُدھار لے کر پرانے قرضخواہوں کو دے دیتا ہوگا۔ میں حیران ہوا کرتی تھی کہ وہ کون عورتیں ہیں۔ جو اسے زندگی کے محدود ایام میں سے قرض دے دیتی ہیں۔ . . . . . میں ان میں سے کسی ایک سے ملنا چاہتی

تھی، مگر اس میں مَیں کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ بہت ہی عجیب و غریب انسان تھا۔ اور اس کام کو نہایت حُسن و خوبی سے انجام دیتا تھا۔

تم اس کوفت کا تصور نہیں کر سکتے جو مجھے اس وقت پہنچی جب اس نے نہایت متانت کے ساتھ مجھے بتایا کہ اب صرف گیارہ دن اس کے ذمہ باقی رہ گئے ہیں۔ سال بھر میں نے اس سے مطالبہ نہ کیا تھا۔ ایک دن میرے دل میں خیال آیا کہ اسے باقی ماندہ دنوں کے لئے ایک ہی دفعہ لکھ دوں تاکہ بار بار لکھنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔ تمہیں معلوم ہے۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ دوستو! جوں جوں میری موجودہ عمر اور بائیسویں سال کے درمیان کا عرصہ زیادہ ہوتا گیا۔ میری جوانی عود کر آنے کا امکان بھی جاتا رہا۔ اس لئے مَیں چاہتی تھی کہ جلد از جلد ان گیارہ دنوں کو طلب کر کے پھر ایک بار جوانی کی بہار سے لُطف اندوز ہو سکیں۔

اب میرے تمام ایام ختم ہونے والے تھے۔ اور میرا حساب بے باق ہوا چاہتا تھا۔ ذرا سوچو تو! ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ اس کے بعد مستقل طور پہ میں بڑھاپے کی زد میں آ چکی تھی ——— صرف ایک دن نوجوانیت کا اور پھر سرمدی اور ابدی تاریکی! مجھے معلوم نہ تھا کہ اس ایک دن میں کیا کیا ظہور پذیر ہوگا؟ مگر مَیں اپنا آخری دن کب طلب کروں؟ کیا میں اسے چھوڑ دوں؟ یہ خیال تھا جو ہر وقت میرے دل میں سمایا رہتا تھا۔ تین سال سے میں نے جوانی کا عارضی لُطف نہیں اُٹھایا تھا۔ مجھے شاید ہی اب کوئی دانا میں جانتا ہوگا۔

اب میں ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس کرتی تھی۔ جو میری والہانہ محبت کا دعویدار ہو۔ آہ میرا شکن آلود چہرہ آخری بار شگفتہ ہوگا اور سوکھے ہوئے نفرت آفریں ہونٹ آخری بار گلاب کی طرح سرخ ہوں گے۔
——— آخری بار، آخری بوسے کے لئے!

یہ کہکر غریب شہزادی کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ یہ رقت انگیز منظر دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ میں اس پیکر یاس و حرماں کو تسلی دوں۔ میں اس قابل پرستش عورت کے پاؤں پر گر پڑا۔ اور اسے یقین دلایا کہ میں ایسا انسان ہوں۔ جو تہ دل سے تمہارا طالب ہوں اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے حسن کا "آخری دن" میرے لئے وقف کردے ٭

ان اطمینان بخش الفاظ سے اُس کی ڈھارس بندھ گئی۔ اور اس نے کہا "ایک ماہ کے بعد تم میرے حسن سے لطف اندوز ہو سکتے ہو ——— صرف ایک دن کے لئے!" ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اسی پُرانے گھر میں ملیں گے اس کے بعد میں اُسے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا ٭

میں نے اپنی محبوبہ سے وعدہ کر رکھا تھا۔ کہ مقررہ دن سے پہلے اُسے نہ دیکھوں گا۔ اور میں نے اپنا وعدہ تمام و کمال پُورا کیا۔ بالآخر وہ دن آپہنچا۔ شام ہوگئی۔ میں نے اس کے گھر کا راستہ لیا۔ دُور ہی سے گھر کی کھڑکیاں نظر آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں پہنچ گیا گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور گیلری پھولوں سے لدی پڑی تھی۔ میں

اندر داخل ہو گیا۔ وہاں بے شمار کافوری شمعیں، خیرہ کُن روشنی سے کمرے کو منور کر رہی تھیں۔

مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں تاحکمِ ثانی منتظر کھڑا رہوں۔ میں نے بہت انتظار کیا۔ مگر کوئی فردِ بشر نمودار نہ ہوا۔ ایک گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد میں کھانے کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ وہاں انواع و اقسام کے پھلوں اور پھولوں کی طشتریاں مزین تھیں۔ آخرکار بڑی جرأت کر کے میں شہزادی کے کمرے تک جا پہنچا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اس پر میں نے حوصلہ سے کام لے کر اور عاشقوں کی طرح آدابِ محفل سے بے نیاز ہو کر دہلیز پہ قدم رکھا۔ اور اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں خوبصورت کپڑے پریشان حالت میں پڑے تھے۔ چند دھیمی دھیمی شمعیں فرش پہ بکھری پڑی تھیں۔ شہزادی آئینے کے سامنے بازوؤں والی کرسی پہ جلوہ افروز تھی۔ وہ اس وقت خوبصورت ترین لباس زیب تن کیے ہوئے تھی۔ میں نے آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ میں اُس کے پاس گیا۔ مگر وہ نہ ہلی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ زرد پڑ چکا ہے میں نے اپنا ہاتھ اس کے مُنہ پہ رکھا۔ مگر سانس کی آمد و رفت بند تھی اور دل ساکن و جامد تھا۔

آہ شہزادی مر چکی تھی۔

اس کے پاس ایک خط پڑا تھا۔ جو شکستہ الفاظ میں لکھا ہوا تھا:۔

میری پیاری شہزادی!

مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں تمہارا آخری واجب الادا دن مقررہ وقت پر واپس نہیں دے سکا۔ کسی عورت نے بھی میری حیرت انگیز کہانی پر اعتبار کرتے ہوئے مجھے زندگی کا قلیل ترین حصہ عاریتہً نہیں دیا۔ اس وجہ سے میری لڑکی کی زندگی خطرے میں ہے۔ میں ہر ممکن ذریعے سے کوشش کروں گا کہ تمہیں اپنی کامیابی اور ناکامی سے اطلاع دوں۔ میں آخری وقت تک تمہاری خوشنودی کا طالب ہوں!

(تمہارا احسان مند)

ڈنمارک

(۱)

خواب و خیال :۔ مصنفہ گسٹاف وائیڈ - مترجمہ منصور احمد

خواب و خیال

وہ ایک کرٹاڑے کے نیچے بیٹھ گیا۔ شام نہایت خوشگوار تھی اور اُن کے سروں کے اوپر پھل اور پھولوں سے لدی ہوئی بیلوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ اُن کی پشت پر ایک صاف اور ہموار پتھر زرد زرد مٹی سے نکل کر ایک قدِ آدم تک بلند ہو گیا تھا۔ اور لکڑی کا ایک موسم زدہ تختہ، غالباً کسی پرانی گاڑی کی نشست جس کا رنگ دھوپ سے اُڑ چکا تھا۔ انہیں بنچ کا کام دے رہا تھا۔ بیلوں کی جھلملیوں میں سے نیچے سمندر تک پھیلتا ہوا سبزہ اور سمندر، وسیع نیلا سمندر، لہریں مارتا ہوا، اور لہریں ساحل کے سنگریزوں میں سرسراتی ہوئی سب کچھ انہیں دکھائی دے رہا تھا۔

دن کے شور اور ہنگامے سے دور، خاموشی اور تنہائی میں، وہ بیٹھے تھے۔ ساحل پر سیر کرتے ہوئے وہ یہاں آ پہنچے تھے۔ اور کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئے تھے۔ مرد بولا :-

"ہاں۔ یہ جگہ ہے۔ جہاں ہمارا مکان بننا چاہیئے، مکان کی دیواریں

آسمانی برف کی طرح سفید ہونی چاہئیں۔ اور چھت چھپر کی بنی ہوئی ہو۔ اور گلاب اور عشق پیچاں کی بیلیں دروازوں اور کھڑکیوں سے لپٹی ہوئی ہوں۔"

عورت نے کہا "ہاں، اور کھڑکیوں میں پرانی وضع کے سبز شیشے لگے ہوئے ہوں۔ اور دروازے کے اوپر دیوار کے ساتھ ہم جنگل کے سب سے بڑے ہرن کے سینگ لگا دیں گے۔ اور ابابیلیں ہماری چھتوں میں گھونسلے بنائیں گی۔ اور سارس بھی گرمیوں میں چھت کے اوپر پیال میں رہا کریں گے۔"

مرد نے کہا "لیکن سارس یہاں کیسے رہیں گے۔ اُن کی غذا کا تو یہاں کچھ سامان ہی نہیں۔ نہ یہاں میدان ہیں نہ دلدلیں۔"

عورت فیصلہ کن انداز میں بولی "کچھ بھی ہو سارس یہاں ضرور ہونے چاہئیں۔ میں انہیں ہر روز شام کے وقت اُڑتے ہوئے اپنے گھونسلے میں آتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور اُن کے بچوں کی طرف دیکھ دیکھ کر جب وہ اپنی لمبی لمبی پتلی پتلی ٹانگوں پر ناچیں گے۔ اور اپنے پَر پھڑپھڑائیں گے۔ اور جب یوں معلوم ہو گا۔ کہ وہ صحن میں منہ کے بل اب گرے کہ گرے، خوب خوب ہنسنا چاہتی ہوں۔"

مرد نے عورت کے ننھے سے سفید ہاتھ کو چومتے ہوئے کہا "اچھا تو ہم ایک سارس ہی رکھ لیں گے۔ لیکن بچے نہیں۔ ان پر بہت زیادہ خرچ آئے گا۔ ہم ایک بڑا سا سبز طوطا بھی پالیں گے۔ اور اُس کا پنجرہ

کھانے کے کمرے میں رکھ دیں گے ۔ اور جب ہم چلائے پہیئے کے لئے کمرے میں جایا کریں گے ۔ تو وہ تمہیں کہا کرے گا " امّاں جان! آداب"
عورت نے اپنے سر کو ہلاتے ہوئے کہا ۔" ہاں طوطا ضرور ۔ لیکن ایک ننھا سا بچہ بھی ہونا چاہیئے "
مرد نے مسکراتے ہوئے اور اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے کہا ۔
" لیکن ہو نا ضرور چھوٹا سا چاہیئے "
عورت نے کہا " ہا ۔ ا ۔ ں ! بالکل ننھا سا ۔ بس اتنا سا " اور اُس نے اپنی انگلی سے اُس کا قد بتایا ۔
مرد نے عورت کا مُنہ چوم کر کہا ۔" کھانے کے کمرے میں دیواروں کا رنگ سبز ہونا چاہیئے ۔ اور الماری میں عجیب عجیب قسم کے برتن اور طشتریاں اور کرسیاں بھی سبز رنگ کی ۔ لکڑی کی پُشتوں والی جن پر پھول پتے بنے ہوں ۔ اور ایک کونے میں ایک سبز رنگ کی میز پر قدیم وضع کی چاندی کی چلئے دانی اور پیالیاں رکھی ہوئی ہوں "
عورت بولی ۔" اور ایک سبز رنگ کا بڑا سا کلاک جس پر نقش و نگار بنے ہوں "
مرد نے کہا ۔" ہاں کلاک " اور آدم اور حوّا کے ہبوط کی ایک تصویر اور فرعون کی دریائے نیل میں غرق ہونے کی "
عورت نے پوچھا ۔" مگر نشست کا کمرہ کیسا ہوگا ؟"
" نشست کا کمرہ ؟ اُس کی تین کھڑکیاں ہونی چاہئیں جہاں سے

نظر درختوں کی چوٹیوں کو عبور کرتی ہوئی سمندر تک جا پہنچے۔"

"لیکن اس طرح تو صبح سے دوپہر تک کمرہ دھوپ سے بھرا رہے گا۔"

"نہیں، کھڑکیوں کے آگے چھجے لگے ہوں گے۔ اور ان پر خوشبودار پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں چڑھی ہوں گی۔ اس لئے دھوپ اندر نہیں آسکے گی۔ بلکہ چند لمبی سنہری کرنیں فرش اور کمرے کے سازو سامان پہ آکر پڑا کریں گی۔ کمرے کے درمیان ایک بیضوی شکل کی آبنوسی میز ہوگی جس کے پائے شیر کے پنجوں کی طرح بھاری بھاری ہوں گے اور نیچی نیچی نرم نرم کرسیاں، اور کونے میں گول کمرے کے قریب ایک شاندار پیانو رکھا ہوگا۔ درمیانی میز پہ ایک بہت بڑے تھال میں چوڑے چوڑے پتوں والی پام کا گملا بہار دے رہا ہوگا۔"

"مگر میرے سینے کی میز کہاں رکھی جائے گی؟"

"تمہارے سینے کی میز؟ درمیانی کھڑکی میں جس کے شیشوں پہ خوبصورت نقوش اور زریں اقوال گہرے نیلے، ہلکے سرخ اور پیلے انگوری رنگ میں لکھے جائیں گے رکھی ہوگی۔ کھڑکی میں سنبل اور عشق پیچاں کی بیلیں ہوں گی اور کانچ کے لمبے لمبے گلدانوں میں سے نرگس کے سفید سفید پھول تمہیں دیکھ دیکھ کر مسکرائیں۔ اور شیشے کے ایک بڑے سے برتن میں سنہری مچھلیاں تمہارے ہاتھ سے روٹی کے ریزے لے لے کر کھائیں گی۔ اور ہاں، کبوتر بھی ہونے چاہئیں! ——— برف کی طرح سفید اور سمندر کی طرح نیلے اور زنگار کی طرح بھورے کبوتر جب تم برآمدے

کی سیڑھیوں پر گلاب اور عشق پیچاں کی بیلوں کے پیچھے کھڑی ہو گی۔ تو وہ تمہارے سر کے گرد چکر کاٹیں گے۔ وہ تمہارے سر اور کبھی کندھوں پر اور کبھی ہاتھوں پر آ کر بیٹھ جائیں گے۔ اور تمہارے ہاتھ میں سے یا تمہارے لبوں میں سے دانے لے لے کر کھائیں گے۔ اور تم سفید براق لباس میں ملبوس۔ آدھی باہوں والی قمیص اور زردی مائل نیلی جمپر میں اور لال مونگے کا ایک نازک سا ہار پہنے ان کا تماشا دیکھ رہی ہو گی۔"

عورت نے اپنی باہیں مرد کے گلے میں ڈال دیں۔ اور خوشی سے مسکراتے ہوئے اپنا سر اُس کے سینے پر رکھ دیا۔ پھر کہنے لگی" اور خلوت کا کمرہ کیسا ہو؟ اور تمہارے مطالعے کا کمرہ کیسا؟"

مرد نے جواب دیا" خلوت کے کمرے کا رخ مشرق کی طرف ہونا چاہیئے۔ اور اس کی کھڑکی کے باہر اخروٹ کا ایک بہت بڑا درخت ہونا چاہیئے۔ اتنا بڑا جتنے لبنان کے ہزار ہزار سال کے بلوط ہیں۔ اور اس درخت کے نیچے نرم نرم سبز سبز گھاس ہو۔ اور اس پر بید مجنوں کی شاخوں کو خم دے کر بنائی ہوئی کرسیاں اور میزیں اور پاس ہی ہمارے مہمانوں کے لیئے ٹینس کا انتظام ہو۔ اور ایک تپائی پر ایک دو فٹ لمبی دُوربین ہو تاکہ ہم سمندر میں سے جہازوں کو آتے جاتے دیکھ سکیں۔"

"لیکن خلوت کے کمرے کا فرنیچر کیسا ہو گا؟"

مرد نے کہا" یہ تم خود ہی فیصلہ کر لو۔ کیونکہ یہ تمہارا کمرہ ہو گا۔"

عورت نے کہا "نہیں، یہ تمہیں تجویز کرو۔"

وہ سر کی جنبش سے اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے بولا "سفید ہال سفید میز کرسیاں، جن کی نازک ٹانگوں پہ نفیس سنہری کام بنا ہوا ہو۔ اور اُن کے بازو اور نشستیں ریشم کی ہوں۔ ایسا ریشم جس کی زردی مائل نیلی زمین پہ بڑے بڑے پھول کڑھے ہوئے ہوں۔ اور چھوٹے سونے کی گول سروں والی کیلوں سے اُس کو جڑا گیا ہو۔ دیواریں سب منقش چرمی کاغذ سے ڈھنپی ہوئی ہوں گی۔ سنہری کاغذ سے اور پردے وغیرہ بھی ریشمی اور اسی رنگ کے ہونگے جس رنگ کا فرنیچر ہو گا۔ درمیانی میز بیضوی شکل کی ہوگی۔ اور اس کی سطح پہ بیل بوٹے کندہ کئے ہوں گے۔ کناروں پہ ملمع ہو گا۔ اور میز کے اوپر ایک عظیم الشان جھاڑ لٹک رہا ہو گا۔ جس پہ بلور اور موتی لگے ہوں گے۔ اور وہ ستاروں کی طرح چمکیں گے۔"

"اور آتش دان؟"

"نہیں آتش دان کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہم صرف بہار اور گرمیوں کا موسم یہاں گزاریں گے۔ اور خزاں اور جاڑے میں ہم کسی اور صحت افزا مقام پہ چلے جایا کریں گے۔"

عورت بولی: "تو بس صرف تمہارے مطالعہ کا کمرہ رہ گیا۔ اور سونے کا کمرہ۔"

"میرا کمرہ مکان کے مغربی کونے میں ہو گا۔ جہاں سے میلوں تک پہاڑیوں، وادیوں، جنگلوں اور جھیلوں کو شفق شام کی سرخی میں نہاتے

ہوئے میں دیکھا کروں گا۔ اس میں ایک ہی بہت بڑی سی گوتھک طرز کی کھڑکی ہوگی جس کے سامنے ایک بھاری پردہ لٹک رہا ہوگا۔ کمرے میں بھیڑیوں اور ریچھوں کی کھالیں بچھی ہوئی ہوں گی۔ اور یہ بلوط کی لکڑی کے متین اور باوقار سازوسامان سے آراستہ ہوگا۔ پردوں پہ چمکتے ہوئے زرہ بکتر میں ملبوس بہادرانِ قوم کی تصویریں ہوں گی۔ اور دیواروں کے ساتھ تلواریں، بندوقیں اور ڈھالیں لٹک رہی ہوں گی۔ ان چیزوں کے علاوہ اس کمرے میں ایک چور دروازہ بھی ہونا چاہئے۔ کہ جب چاہو ایک بٹن دباؤ اور کتابوں کی الماری آگے سے ہٹ جائے"۔

عورت نے کانپتے ہوئے کہا " اوہ ——— مگر یہ دروازہ کس طرف کھلے گا؟"

" نیچے ایک سرنگ کی طرف، جو تمہارے کمرے کو جاتی ہے۔ جہاں تم لیٹی ہوگی۔ تم بیٹھی ہوئی انتظار کر رہی ہوگی۔ اور صرف ایک چھوٹا سا لیمپ تمہارے سرہانے کی طرف سنگِ مرمر کی میز پہ جل رہا ہوگا۔ اور تم باہر اندھیرے میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہوگی۔ تم دیر تک کوئی کتاب پڑھتی رہی ہوگی۔ لیکن اب وہ کتاب تمہارے سامنے بستر کی سفید چادر پہ پڑی ہوگی۔ اور تم نے اپنی دونوں باہوں سے اپنا سر تکیے سے ذرا بلند کر رکھا ہوگا۔ تم میرے پاؤں کی آہٹ پہ کان دھرے اپنی بڑی بڑی خوابگیں آنکھوں سے باہر کی طرف دیکھ رہی ہوگی۔ پھر تم چور دروازے کے کھلنے کی آواز سُنوگی۔ اور مسکراتی ہوئی اپنی کہنی کا سہارا لئے ذرا اُٹھ کر پھر اس کھٹکے

پر کان لگا دُگی۔ تمہیں میرے دبے پاؤں چلنے کی آواز قریب سے قریب تر آتی ہوئی سنائی دے گی۔ جلدی سے تم کتاب میز پہ رکھ دوگی۔ اور تکیے پر سر رکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لوگی۔ آہستہ سے ایک دروازہ کھلے گا۔ تمہارے چہرے پر کوئی اپنا چہرہ جھکا دے گا۔ اور ایک چیخ سنائی دے گی۔ مسرت آمیز چیخ، اور تم اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دوگی۔ اور مجھے اپنی طرف کھینچ کر پیار کروگی ......"

سو کچھ اس طرح بیٹھے وہ خیال آرائیاں کر رہے تھے۔ بہار کی ایک خوشگوار شام تھی۔ اور پھل اور پھولوں سے لدی ہوئی بیلوں نے ان پر سایہ کر رکھا تھا۔ اور ان کی نگاہیں جھومتے ہوئے سر سبز درختوں اور سمندر کی ان موجوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ جو ایک سرسراہٹ کے ساتھ آ آ کر ساحل سے ٹکراتی تھیں۔

جب سورج مغربی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ اور اوس پڑنی شروع ہوئی تو مرد اپنی جگہ سے اٹھا اور کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے کہ اب گھر چلنا چاہئیے تمہاری اماں چائے کے لئے ہمارا انتظار کر رہی ہوگی۔"

وہ خاموش تھے۔ اور ایک عجیب سی تکان ان کے دلوں پر طاری تھی آہستہ آہستہ وہ جنگل میں چلنے لگے، ریلوے سٹیشن کی طرف۔

یکایک عورت بولی۔ "میرا تو جی چاہتا ہے۔ کہ ہم یہیں کھانا کھائیں۔"

مرد نے ذرا مضطربانہ اس کی طرف اپنا سر گھما کر کہا۔ "لیکن پیاری تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ ......"

عورت نے جلدی سے جواب دیا "ہاں ہاں، میں نے تو یونہی بے سوچے سمجھے کہہ دیا تھا۔ ہم پہلے ہی آج بہت خرچ کر چکے ہیں"۔

اب پھر وہ پہلے کی طرح خاموش ہو گئے۔

جب وہ اسٹیشن کی اُس کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا جہاں ٹکٹ بٹتے ہیں تو وہ ذرا گھبرا سا گیا۔ پھر عورت کی طرف منہ پھیر کر اس نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم تیسرے درجے میں بیٹھ جائیں"۔

عورت نے پُرجوش لہجے میں کہا "ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ اس وقت تو گاڑی میں کچھ زیادہ بھیڑ نہیں ہوتی۔ اور اس طرح ایک روپیہ بھی بچ جائے گا"۔

سپین

(۱)

اُبو حامد - مُصنّفہ شاتو بریاںؔ[1] - مترجمہ احمد دین مارہروی ایم اے

---

[1] وطن اور قومیّت کے لحاظ سے یہ مصنّف فرانسیسی ہے۔ لیکن افسانہ سپین کے اُس دردانگیز دَور کی یاد تازہ کرتا ہے جب سینکڑوں برس حکومت کرنے بعد "موروں" کو اس ملک سے نکال دیا گیا تھا +

ابُو حامد

(۱)

جب غرناطہ کا آفتاب غروب ہو گیا۔ اور وہاں کے آخری تاجدار ابُو عبداللہ کو غریب الوطن ہونا پڑا۔ تو اُس نے اپنی روانگی سے قبل پادل کی چوٹی پر کھڑے ہو کر پہلے توسمندر کی طرف نظر کی۔ جدھر سے اُس کے اسلاف اسپین میں آئے تھے۔ اور پھر دریائے وادانگا پر ایک نگاہِ واپسیں ڈالی جس کے کنارے شاہ فرڈی نینڈ اور ازابیلا کے خیمے ایستادہ تھے۔ اہلِ اسلام کے چند مقابر کا پیش نظر ہونا تھا۔ کہ اُس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ اور اُس وقت سلطانہ عائشہ نے (جو اس جلاوطنی میں اُس کے ہمراہ تھی) ان مردانہ صفت الفاظ کا اعادہ کیا۔ جو مغربی یورپ میں ضرب المثل بن گئے ہیں:۔

"جس سلطنت کی تو مردوں کی طرح حفاظت نہ کر سکا۔ اب اس پر عورتوں کی طرح رو۔"

ہسپانوی موروں کے مختلف قبیلے افریقہ کی اسلامی ریاستوں میں آباد

ہو گئے۔ رنگیزی اور گومل جو فیض سے آئے تھے پھر اُسی جگہ واپس آ گئے۔ وینگا اور الآب الجیریک کے ساحل پر مقیم ہوئے۔ اور بنو سراج نے طرابلس کے قرب و جوار میں سکونت اختیار کر کے کارتھیج کے منہدم شدہ شہر کے سامنے ایک نوآبادی قائم کی جو آج تک مشہور رہے۔ ان نوآبادیوں میں جنت الغرناطہ کے افسانے رائج تھے۔ اور جب مائیں بچوں کو سلاتی تھیں۔ تو رنگیزی اور بنو سراج کے گیت ان کی لوریاں ہوتے تھے۔ یہ لوگ ہر جمعہ کو غرناطہ کی واپسی کے متعلق دُعائیں مانگتے تھے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے۔ کہ ان کی یہ گریہ و زاری اثر سے ہمیشہ عاری رہی غرناطہ کے محلات سے نکلنے کے بعد ان لوگوں کو نہ تو پھل شیریں معلوم ہوتے تھے۔ اور نہ فطری مناظر ہی میں کوئی دلکشی نظر آتی تھی۔ گویا جلا وطن ہوتے وقت اُن کا دل وہیں رہ گیا تھا۔

بنو سراج کو تمام قبائل سے زیادہ صدمہ تھا۔ یہ لوگ غرناطہ کی فوج کے مسلم جنگجو تھے۔ لیکن چونکہ اس آبادی میں جنگ کا ذکر بھی نہ تھا۔ اس لئے اُنہوں نے شمشیر زنی کو ترک کر کے جڑی بوٹی کی شناخت کو اپنا مشغلہ اور طب کو اپنا پیشہ قرار دے لیا تھا۔ گویا وہ قوم جو کبھی زخم لگانے میں مشہور تھی۔ اب ان کا اندمال کرنے لگی۔

اسی قبیلہ میں وہ خاندان بھی تھا۔ جو محلات میں رہا کرتا تھا۔ اُنہوں نے عین اس مقام پر ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا لیا تھا۔ جہاں سینٹ لوئی نے شہادت پائی تھی۔ اس مکان کی دیواروں پر ان کی گذشتہ عظمت کی یادگار ڈھالیں، تلواریں اور دیگر آلات حرب آویزاں تھے۔ جن کے مقابلہ

میں سبزوں پر گھاس اور جڑی بوٹیاں رکھی تھیں۔ جو نہ صرف جسمانی بلکہ روحانی زخموں کو بھی مندمل کر دیتی تھیں۔ لیکن ایک زخم کے واسطے کوئی دوا نہ تھی اور اب تک اسی طرح ہرا تھا۔

غرناطہ کی فتح کو چوبیس سال ہو گئے تھے۔ اس دوران میں بنو سراج کے چودہ نفر موسم کی سختیوں اور آب و ہوا کی ناموافقت سے چل بسے اور اب اس خاندان کا لے دے کر ایک سہارا۔ ایک رہنما اور ایک سربراہ ابوحامد تھا۔ جس میں اپنے اجداد کی تمام صفات موجود تھیں۔ وہ جری ہونے کے علاوہ نیک دل، خوش خلق اور سخی بھی تھا۔ لیکن ساتھ ہی غریب الوطنی نے اس کے چہرے پر اداسی کا پھیکا پن پیدا کر دیا تھا۔ باپ کے انتقال کرتے ہی اس نے غرناطہ جانے اور اپنی دیرینہ آرزو پوری کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ ماں کی ممتا مانع نہ ہو۔ اس نے اپنے منصوبوں کا کسی سے ذکر نہ کیا اور ایک دن بلا کسی کو اطلاع دئے جہاز پر سوار ہو کر یورپ کی طرف روانہ ہو گیا جبل الطارق پہنچ کر اس نے یہی ظاہر کیا۔ کہ وہ ایک طبیب ہے۔ اور سیرا نویدا کی وادیوں میں چند بوٹیاں تلاش کرنے آیا ہے لیکن اس کا دل مرتعش تھا۔ اور جب اس کی نظر ایک اسلامی عمارت پر پڑی۔ جو دست بردِ زمانہ کے ہاتھوں کھنڈر ہو گئی تھی۔ تو اس کو معاً اپنے خاندان کا خیال آیا۔ اور اس مشابہت نے بنو سراج کے آخری چشم و چراغ کو اندوہگین کر دیا۔ سڑک پر تلوار بند مسافر جا رہے تھے۔ اور ہر گزرنے والا ابوحامد کو سلام کرتا تھا۔ لیکن وہ اپنی دھن میں مست تھا۔ اور نہ کچھ سنتا

تھا اور نہ سمجھتا۔

غرناطہ کا پہلا نظارہ بہت صبر آزما تھا۔ یہ شہر دو پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ اور اس کی شکل نیم وا انار کی طرح ہے۔ اسی وجہ سے اس کو غرناطہ کہتے ہیں۔ اس کے ہر دو جانب دریا ہیں۔ اور قریب ہی ویگا کی وادی ہے جس میں پھل وغیرہ بکثرت ہوتے ہیں۔ ابوحامد نے اس جنت ارضی کو دیکھ کر اپنا خچر روک لیا۔ اور راہبر سے مختلف عمارتوں کے متعلق سوال کرنے لگا۔ ہسپانوی اگوا کا ایک ایک لفظ اس کے حق میں تیر و نشتر سے کم نہ تھا۔ تقدیر کا تمسخر ہی کہنا چاہیئے۔ کہ بنوسراج کا ایک فرد اپنے اجداد کی عمارات کے متعلق اجنبیوں سے سوال کر رہا تھا۔ اور خود محض لاعلم تھا۔

اس نے ایک مسلمان سردار کے مکان پہ قیام کیا۔ جو غرناطہ میں ریشمی پارچہ کی تجارت کیا کرتا تھا۔ لیکن روئیدادِ قلب نے اس کو اطمینان سے نہ سونے دیا۔ اور وہ آدھی رات کے وقت گھر سے نکل پڑا۔ نوجوان شہزادے نے غرناطہ کے چپہ چپہ کا حال سنا تھا۔ اور اب تاریک رات میں وہ اپنے اجداد کے محلوں اور کتب خانوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ان سڑکوں پہ کسی زمانہ میں بنوسراج کے جلوس نکلا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت شور و شغب کی جگہ موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ شہر کے باشندے تبدیل ہو گئے تھے۔ اور فاتح سردار مفتوحوں کے محلات میں مست خواب تھے۔ انہیں خیالات کو لئے ہوئے ابوحامد شہر کے کوچہ و بازار میں گشت کر رہا تھا۔ لیکن جب اس نے واپسی کا ارادہ کیا۔ تو قوتِ حافظہ جواب دینے لگی۔ اصل یہ

ہے۔ کہ وہ سڑکوں پر بلا کسی اصول کے چل رہا تھا۔ اور راستہ بھول گیا تھا اُس نے دو مرتبہ واپسی کی کوشش کی۔ لیکن بیکار، راہ نہ ملنی تھی نہ ملی۔

ٹھیک اُس وقت قریب سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اور اُس نے دیکھا کہ ایک دوشیزہ جو ملکہ گوتھ کا سا لباس پہنے ہے۔ اس کی طرف آ رہی ہے اس کے ہمراہ ایک دوسری عورت ہے۔ اور دو خادم جن میں سے ایک "دعاؤں کی کتاب" لئے ہوئے تھا۔ اس لڑکی کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اُس کا حُسن ابو حامد کے نزدیک نہ صرف کامل بلکہ مافوق البشر تھا اور ایک مرتبہ تو اس کو گمان ہوا کہ آسمان سے حُور اُتر آئی ہے یہ اجنبی لڑکی بھی جو صبح کی نماز ادا کرنے جا رہی تھی۔ اُس نو وارد کو استعجاب کی نظر سے دیکھا۔ مگر پھر بلا کسی قسم کا جوش ظاہر کئے اشارہ سے ابُو حامد کو اپنے پاس بلایا اور کہا "مُور صاحب! آپ غالباً آج ہی کل تشریف لائے ہیں؟ کیا آپ کو راستہ نہیں ملتا؟"

ابُو حامد نے کہا "اے ملکہ حُسن، اے کنیز نصرانی تمہارا خیال درست ہے میں مُور سردار کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اور راستہ بھول کر نہ معلوم کہاں آ گیا ہوں۔ تم کو ہمارے پیغمبر اس ذرہ نوازی کا اجر دیں"۔

دوشیزہ مسکرائی اور جواب دیا "مُوروں کا طرزِ کلام مشہور ہے۔ مگر میں نہ حُسن کی ملکہ ہوں نہ کنیز۔ اور نہ مجھ کو تمہارے پیغمبر کی عنایت درکار ہے۔ البتہ میں تم کو منزلِ مقصود تک پہنچائے

دیتی ہوں" ؂

چنانچہ اُس نے جلد جلد چند سڑکیں طے کیں۔ اور مورتاجر کے دروازہ کی طرف اشارہ کرکے ایک گلی میں غائب ہوگئی ؂

اس ذرا سے واقعہ نے ابو حامد کی دُنیا تبدیل کردی۔ اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ سب خواہشات ملیامیٹ ہوگئیں۔ اور ان سب کی جگہ اُس برق صفت معشوقہ کا خیال اس کے دل میں جاگزین رہنے لگا۔ اس میں کلام نہیں کہ اُس نے اپنے آبا و اجداد کی یادگاروں پر آنسو بہائے۔ اور اپنے خاندانی حظیرے کی بھی زیارت کی۔ لیکن اب اُس کے دل میں وہ خلوص باقی نہ تھا جس کو وہ افریقہ سے لے کر چلا تھا۔ یہ نامعلوم دوشیزہ کون تھی؟ ابو حامد نے اس سے دوبارہ ملنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر بے سُود۔ کوئی بازار، کوئی محل۔ کوئی گرجا ایسا نہ تھا جہاں وہ اُس کی تلاش میں نہ گیا ہو عشق نے اُس کے جذبات حمیّت کو اس قدر پامال کر دیا تھا۔ کہ وہ فرڈی نینڈ اور ازابیلا کے مقابر پر بھی ہو آیا۔ لیکن فضول۔ گوہرِ مقصود کہیں ہاتھ نہ آیا ؂

(۳)

ایک روز شہر سے دُور جنگل اور پہاڑوں میں ابو حامد چند بوٹیاں تلاش کر رہا تھا۔ یکایک اُس کی نظر درختوں کے ایک کُنج پر پڑی۔ جس کے درمیان دیہاتی وضع کا ایک مکان بنا تھا۔ اور وہ ابھی محوِ تحیّر ہی تھا۔ کہ اس کی کھڑکیوں سے کسی خوش گلو نازنین کے نغموں کی آواز

نکلنے لگی۔ موسیٰ کا دل مرتعش ہونے لگا۔ اور اُس نے زیرِ لب کہا "بے شک یہ اسی کی آواز ہے"۔ نامعلوم حسینہ ایک نسطلی راگ نکال رہی تھی جس میں بنو سراج اور زنگیریوں کے کارنامے بیان کئے گئے تھے۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ بنو سراج کا نام سُن کر ابو حامد کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور مکان میں داخل ہو گیا۔ اس دخل در معقولات سے محفل درہم برہم ہو گئی۔ اور لڑکیاں موسیٰ کی صورت سے دہشت کھا کر وحشی ہرنیوں کی طرح بھاگنے لگیں۔ دوشیزہ ہچکچائی۔ لیکن ابو حامد کو دیکھ کر بول اُٹھی "ارے یہ تو وہی موسیٰ ہیں"۔

ابو حامد نے کہا "پری وش خاتون! میں نے آخر تم کو ڈھونڈ نکالا۔ میں نے آواز ہی سے تم کو پہچان لیا تھا۔ اور اب میں اُس احسان کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں"۔

لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا "مجھ کو بھی تمہارا یہی خیال تھا۔ اور اسی وجہ سے میں بنو سراج کی بہادری کا گیت گا رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ موسیٰ سوار نہ بھی تمہاری ہی طرح ہوں گے"۔

اس فقرے کا اعادہ کرتے وقت بلا نکالا لڑکی کا نام ہے کے چہرے پر ایک رنگ دوڑ گیا جس کو موسیٰ نے بھی دیکھ لیا۔ اس کو اپنی قوم پر بیجا تفاخر نہ تھا۔ اور ابو حامد کا دل بے اختیار چاہتا تھا۔ کہ دوشیزہ پر اس حقیقت کا اظہار کر دے۔ کہ وہ خود بنی سراج کا آخری چشم و چراغ ہے۔ لیکن اس امر کا اعادہ اس کو ہمیشہ کے لئے اپنی محبوبہ سے جدا کر

دیتا۔ اِس لئے اُس نے خاموشی ہی کو مناسب سمجھا ⁂

بلانکا کا خاندان شرافت و نجابت کے واسطے مشہور تھا۔ اور اس کے دادا کو شاہ فرڈی نینڈ نے حسنِ خدمات کے صلے میں موروں کی جاگیریں اور ڈیوک کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔ دوشیزہ کا ایک بھائی بھی تھا جو تاریخ میں ڈان کارلو کے نام سے مشہور ہے۔ یہ شخص ایک مشہور نبرد آزما تھا۔ اور اس نے اس وقت تک بہادری میں کافی نام پیدا کر لیا تھا۔ باپ کو بلانکا کے ساتھ ابتدا ہی سے بہت اُنس تھا۔ اور بیوی کے انتقال پر تو گویا اس کی تمام مسرت اس لڑکی کے دم سے وابستہ تھی۔ جو اس وقت اٹھارھویں سال میں قدم رکھ رہی تھی۔ آج کا جشن اس کی سالگرہ کی تقریب میں تھا ⁂

بلانکا نے ابوحامد کو باپ سے متعارف کراتے ہوئے کہا "یہی وہ مور صاحب ہیں جن کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا"

ابوحامد کو بھی جشن میں شرکت کی اجازت دے دی گئی۔ اور اُس نے مشرقی افسانے سنا کر نہ صرف بلانکا بلکہ اس کے والد اور تمام حاضرین کا دل موہ لیا۔ اور جب جلسہ برخاست ہوا۔ تو اس سے وعدہ لے لیا گیا کہ گاہے گاہے ڈیوک کے گھر آیا کرے گا۔ چنانچہ دوسرے دن آفتاب کی ابتدائی کرنوں کے ساتھ ہی وہ اپنی معشوقہ کے مکان پر پہنچ گیا۔ اس کا دل اب دوشیزہ کے عشق کا گنجینہ تھا۔ اور وہ تمام خیالات جو اس کے سفر سپین کے محرک تھے۔ فراموشی کے غیر متناہی عمق میں

دھکیل دیئے گئے تھے۔ کیونکہ بہت ممکن تھا کہ ان کا اظہار اس طلسم کو توڑ دے جو اس کی نظروں کے سامنے بندھا ہوا تھا۔ اُس نے مشرق و مغرب کے بُعد کا خیال نہ کیا۔ اور نہ اس امر کا کہ دوشیزہ اس قوم سے تعلق رکھتی ہے جس نے اس کے اجداد کو غریب الوطن بنا دیا۔ وہ کہتا تھا "بس بلانکا مسلمہ
میرے ساتھ محبت کرنے لگے۔ تو میں ہمیشہ کے لیے
ہو جاؤں گا۔"

ہسپانوی دوشیزہ کو بھی بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اُس کے دل پر ابوحامد کی محبت گہرے نقوش ڈال رہی ہے۔ اوّل اوّل تو اس کو یہ خیال ہی مضحکہ خیز معلوم ہوا کہ ڈیوک سناتانی کی لڑکی کسی مور کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے سکتی ہے۔ لیکن جب اس پر حقیقت کا اظہار ہوا تو سپینیوں کی طرح وہ بھی ناگزیر کے واسطے تیار ہو گئی اور کہنے لگی "بس ابو حامد عیسائی ہو جائے اور مجھ سے محبت کرنے لگے۔ تو میں اس کے ساتھ دُنیا کے ہر حصہ میں جانے کو تیار ہوں۔"

ابو حامد اور بلانکا دونوں اپنے ارادوں میں راسخ اور محبت میں مستقل تھے۔ لیکن ابھی ایک کو دوسرے کی حالت کا اندازہ نہ تھا۔ موسم بہار پوری رعنائی پر تھا۔ اور دونوں اکثر وبیشتر باغ میں بیٹھے بلبلوں کے نغمے سُنا کرتے تھے۔ ایک روز لڑکی نے کہا "تم نے ابھی تک الحمرا کی سیر نہیں کی۔ حالانکہ وہ تمہاری قوم کے بادشاہوں کی زندہ یادگار ہے۔ چلو میں آج تم کو وہاں لے چلوں۔"

مور سردار کو اس سے زیادہ خوشی کس بات میں ہو سکتی تھی۔ کہ وہ الحمرا کو بلانکا کی معیت میں دیکھے۔ چنانچہ اس نے پہلے تو ڈیوک کی لڑکی کو گھوڑے پر سوار کرایا۔ اور پھر خود ایک اندلسی خچر پر بیٹھ گیا۔ مور کا لباس اور وضع اس کی جرأت و شہامت اور شہسواری راہگیروں کے واسطے جاذب توجہ تھی۔ اور اس کو دیکھ کر ہر شخص پکار اُٹھتا تھا۔ کہ "بلانکا اس کافر شہزادے کو عیسائی بنانے لئے جاتی ہے"۔

الحمراء کی سیر بذاتِ خود ایک رومان تھی۔ یہ عمارت گویا غرناطہ کے عروج و زوال کی مجسم تاریخ ہے۔ اس کو دیکھ کر ابو حامد کو اپنی بے کسی کا احساس دوچند ہو گیا۔ اور وہ پکار اُٹھا "آہ بنو سراج کے بادشاہو! تم کس گوشے میں محوِ خواب ہو؟"

بلانکا اس کو یکے بعد دیگرے تمام محلات دکھا رہی تھی۔ آخر وہ ایک کمرے میں پہنچی۔ جس کی چھت سقفِ آسمان کی طرح نیلی فام اور دیواریں سورج کی کرنوں کے مانند سنہری تھیں۔ اُس کے وسط میں ایک فوارہ تھا جس کا پانی ایک مرمریں پیالہ میں گرتا تھا۔ ڈیوک کی لڑکی نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اسی پیالہ میں ابو عبداللہ نے بنو سراج کا خون بہایا تھا۔ ان کے خون کی رنگینی اب تک اس ظرف میں موجود ہے۔ دیکھو تمہارے ملک میں اُن مردوں کا یہ حشر ہوتا ہے۔ جو عورتوں کو جھوٹے وعدے کر کے بہکائے جاتے ہیں"۔

ابو حامد پر اس نظارے کا بہت زبردست اثر پڑا۔ اُس نے پہلے تو

دونا تو ہو کر اپنے اجداد کے خون کو بوسہ دیا۔ اور پھر دوشیزہ کے قدموں پر گر کر کہنے لگا "میں بنو سراج کے خون کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم کو ہمیشہ اپنی جان سے عزیز رکھوں گا۔"

بلانکا نے اپنے نازک ہاتھوں کو ایک دوسرے میں حمائل کرتے ہوئے دریافت کیا "ہاں تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ مگر کیا تم نے یہ بھی سوچ لیا ہے کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟ میں اسپینی عیسائی ہوں اور تم مسلمان مور۔ پھر تم کو اپنی محبت کے اظہار کی جرأت کیونکر ہوئی۔ بہرحال میں معاملات کو صاف کر لینا ضروری سمجھتی ہوں۔ سنو! مجھ کو بھی تم سے محبت ہے۔ اور اگر تم عیسائی ہو جاؤ تو ہمیشہ کے واسطے تمہاری ہو جاؤں گی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لو کہ اگر تم اس سے انکار کرتے ہو تو ڈیوک سنا تانی کی لڑکی کسی طرح تمہاری بیوی نہیں بن سکتی۔"

ابو حامد کو یہ بات معلوم کر کے کہ لڑکی کا دل اس کی محبت سے معمور ہے۔ اتنی خوشی ہوئی کہ وہ اس کی شرط کو مطلق بھول گیا۔ مگر پھر سنبھل کر بولا "اللہ اکبر اے خدا، تو ہی اس لڑکی کو سیدھا راستہ دکھا"

اب یہ دونوں "دوازدہ شیروں کے کمرے" میں پہنچے اور بلانکا نے اپنے ساتھی سے کہا "یہ النجیمہ کا کمرہ ہے۔ ابو حامد جب میں تمہارے عمامہ عبا اور ہتھیاروں کے ساتھ تمہاری محبت کا خیال کرتی ہوں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا بنو سراج کا سردار بد نصیب النجیمہ کے ساتھ اس کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ ہاں ذرا اس کتبہ کے معنی بتانا ــــ

فوارے کے اوپر ایک تحریر تھی جس کا کچھ حصہ دست بُردِ زمانہ سے کالعدم ہو چکا تھا۔ ابو حامد نے اس پر لکھا ہوا پڑھا: "حسین شہزادی جو اس جگہ محوِ خرام ہے۔ اپنے حسنِ عالمتاب سے گھر کی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ——————" اور کہنے لگا: "یہ تحریر دراصل تمہارے ہی واسطے لکھی گئی ہے۔ کاش میں بھی خوش نصیب بنو سراج ہوتا۔"

بلانکا نے ان الفاظ کو بہت غور سے سُنا پھر بولی: "لیکن اس وقت مجھ کو اور زیادہ اذیت ہوتی۔ اگر میرا کہنا مانو تو سرداری کے خیال کو چھوڑ دو۔ کیونکہ اکثر سردار شہرت کے پیچھے محبت کو فراموش کر دیتے ہیں۔"

ابو حامد نے کہا: "اس طرف سے تو مطمئن رہو۔ کیونکہ میں تم کو شہرت سے بہت زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔"

الحمرا کی سیر دونوں کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی۔ انہوں نے اپنا پورا دن اس میں صرف کر دیا۔ اور جب جدا ہونے لگے۔ تو بلانکا نے کہا: "میری قسمت اب ہمیشہ کے واسطے مُہر ہو گئی۔ ابو حامد یاد رکھو کہ جب تک تم مسلمان رہو گے میں تمہاری محروم القسمت کنیز ہوں لیکن عیسائی ہوتے ہی تمہاری خوش نصیب بیوی بن جاؤں گی۔"

ابو حامد کا جواب بھی ایسا ہی پُر اشتیاق و پُر حسرت تھا: "جب تک تم عیسائی ہو۔ میں تمہارا حسرت نصیب خدام ہوں۔ لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد تمہارا شوہر بننے پر فخر کروں گا۔"

وقت کے ساتھ دونوں کی محبت میں اضافہ ہوگیا۔ لیکن ساتھ ہی وہ خلیج جو اُن کے ازدواج میں حائل تھی وسیع تر ہونے لگی۔ ابو حامد نے کبھی اپنے نام و نسب کا راز بلانکا پر ظاہر نہ کیا اور اس کو اور بھی زیادہ خوشی ہوئی کہ اسپین کی امیرزادی اس کے باوجود بھی اس کو اپنی تمناؤں کا مرکز بنائے ہوئے تھی۔

(۳)

ایک روز ہورے کو خبر ملی کہ اس کی والدہ لبِ مرگ ہے۔ اور مرنے سے قبل اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھنا چاہتی ہے۔ اب وہ مجبور تھا کہ اس جنتِ ارضی کو چند دن کے لئے خیرباد کہے۔ اور افریقہ جائے۔ چنانچہ اس نے اپنی مشکلات کا اظہار کرکے کہا۔ "سلطانہ! مَیں اپنی ماں سے ملنے جارہا ہوں کیا تم اپنی محبت میں ثابت قدم رہوگی؟"

لڑکی اس ناگہانی واقعہ سے گھبرا گئی۔ اس نے سمجھا کہ ابوحامد ہمیشہ کے لئے اس کو خیرباد کہہ رہا ہے۔ لیکن ہورے سردانہ معاملات کو اس حالت میں نہ چھوڑ سکتا تھا۔ اُس نے بلانکا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اور اپنے اجداد کے قبرستان میں پہنچ کر کہنے لگا۔ "حسین نازنین! میرے باپ دادا اس قبرستان میں محوِ خواب ہیں۔ اور مَیں ان کی رُوح کو گواہ کرکے کہتا ہوں۔ کہ اپنی عمر میں بجز تمہارے کسی دوسری عورت سے محبت نہیں کروں گا۔ اور جس وقت تم کلمہ پڑھ لوگی تو مدت العمر کے واسطے تمہارا خادم بن جاؤں گا۔ میرا ارادہ ہے کہ ہر سال اسی موسم میں

غرناطہ آیا کروں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ تم اپنی محبت میں ثابت قدم ہو نیز یہ کہ تم نے اپنی ضد کو ترک کر دیا ہے یا نہیں؟"

بلانکا کا جواب بھی اسی قدر شریفانہ تھا "اور میں ہر سال تمہارا انتظار کیا کروں گی تمہاری طرح میں بھی اپنی محبت کو تمہارے لئے محض صرف تمہارے واسطے مخصوص کرتی ہوں۔ اور جس وقت خدا تمہارے کافر دل میں ایمان کی کرن ڈال دے گا میں نہایت خوشی سے تم کو اپنا شوہر بنالوں گی۔"

ابو حامد بیدا گیا اور بلانکا کی نظروں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ وہ اسی روز سے سال کے دن گننے لگی اور جب موسم بہار دوبارہ آیا تو اس نے باپ کو مجبور کیا کہ اس کو سمندر کے کنارے لے چلے۔ اس کا معمول تھا کہ روزانہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر افق کی طرف دیکھتی اور اگر افریقہ سے کوئی جہاز آنے والا ہوتا تو اس کا انتظار کرتی۔ ایک مرتبہ اس نے کسی مشرقی جہاز کو طوفانی لہروں میں گھرا ہوا دیکھا۔ اور اس خیال سے اس کا دل سرد ہو گیا کہ کہیں اس کا عاشق صادق اس ورطۂ ہلاکت میں نہ پھنسا ہو۔

بوڑھے سردار نے اپنی والدہ کو زندگی کے آخری لمحے گزارتے ہوئے پایا۔ اور چند روز کے بعد اس نے داعی اجل کو لبیک کہہ دی۔ گویا وہ کڑی جو اس کو افریقہ سے وابستہ کئے ہوئے تھی ٹوٹ گئی۔ اب اس کی نظروں میں دنیا تاریک تھی۔ اور وہ بلانکا کی طرح موسم بہار کا نہایت بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ آخر موعودہ دن آگیا۔ اور اس نے جہاز پر قدم رکھتے ہی اپنے خیالات کو بلانکا اور محض بلانکا کے واسطے وقف کر دیا۔

Ahmad Ali

"کیا وہ دوشیزہ اپنی محبت میں ثابت قدم ہوگی؟ کیا وہ بھی میری طرح اس روز کا انتظار کر رہی ہوگی؟ کیا اس نے ایک غریب عرب کو دل سے فراموش تو نہ کیا ہوگا؟" اس قسم کے سینکڑوں سوال اس کے دل میں آتے اور پریشان کرتے تھے۔ ابو حامد کو علم نہ تھا کہ باوفا معشوقہ اس کے انتظار میں چشم براہ ہے . . . . . .

اسپین کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی بلانکا نے اپنے عاشق کو پہچان لیا اس کا حرماں نصیب دل بے اختیار چاہتا تھا۔ کہ دوڑ کر ابو حامد کے پاس جائے۔ لیکن پاس وضع مانع تھا۔ آخر اس نے اپنے خادم کو بھیجا کہ مور کو مکان پر لے آئے۔ بنو سراج کا آخری چشم و چراغ بلانکا کیواسطے اپنے ملک کا ایک غزال لایا تھا جس کو اس نے معشوقہ کی خدمت میں پیش کیا اور سب لوگ خوشی خوشی غرناطہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

بہار کا موسم گزر گیا۔ اس دوران میں وہ ایک دوسرے کی خوبیوں سے بخوبی آگاہ ہوگئے۔ لیکن وہ خلیج جو دونوں کے درمیان حائل تھی۔ اب بھی اسی طرح موجود تھی۔ اور ان کو حسرت نصیب بنائے ہوئے تھی ایک کہتا تھا "مسلمان ہو جاؤ"۔ اور دوسری کی دھن تھی "عیسائی بن جاؤ" آخر فراق کا زمانہ آگیا۔ اور ابو حامد آئندہ سال ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگیا . . . . . .

(۴)

اس مرتبہ اس کا استقبال پُرجوش نہ تھا۔ سمندر کے کنارے نہ بلانکا تھی۔

اور نہ اُس کا خادم - لیکن گورنس نے اُس کو ایک خط دیا جس میں بلانکا نے اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ اس کا باپ دارالخلافہ چلا گیا ہے۔ اور بھائی ایک فرانسیسی کے ساتھ وہاں مقیم ہے - ان کو چھوڑ کر وہ کسی طرح نہیں آسکتی - اس سرد مہری نے مور کو متوحش کر دیا - اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ اور وہ ہم طرح طرح کی مہیب اشکال پیش کر رہا تھا۔

بلانکا کا عذر معقول تھا - ڈان کارلو سات برس کی مسلسل عدم موجودگی کے بعد گھر واپس آیا تھا - اور اس کے ساتھ ایک فرانسیسی امیرزادہ بھی تھا جس کی مہمان نوازی دونوں پر فرض تھی ڈان کارلو نے مذہبی جنگوں میں شریک ہونے کے بعد تہیہ کر لیا تھا۔ کہ وہ خود کو خدا کی راہ میں وقف کر دے گا - اور ازدواجی زندگی سے ہمیشہ کے واسطے کنارہ کش ہو جائیگا اس ارادہ کی باپ اور بہن دونوں نے سختی سے مخالفت کی - لیکن چونکہ مذہبی معاملہ تھا - اس لئے وہ جبر سے کام نہ لے سکے - اور ڈیوک اپنے عزم میں راسخ رہا - اب گویا خاندان کی تمام اُمیدیں بلانکا کی ذات سے وابستہ تھیں - اور یہی وجہ ہے کہ ڈیوک اور ڈان کارلو دونوں اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔

ابو حامد نے ڈیوک کے مکان میں داخل ہو کر دیکھا کہ اُس کی معشوقہ ایک اجنبی کے پاس بیٹھی ہوئی ہے - اور ایک دوسرا نوجوان جو قرینہ سے بلانکا کا بھائی معلوم ہوتا ہے - قریب کھڑا دوشیزہ سے باتیں کر رہا ہے۔

مور سردار کو دیکھ کر بلانکا کے منہ سے بے اختیاری میں "ابو حامد" نکلا۔ مگر پھر سنبھل کر کہنے لگی "مبارز! دیکھو یہی وہ کافر مور ہے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم پر غالب آجائے۔ بنو سراج کا بھی یہی حلیہ تھا۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بہادری، وفاداری اور عشق میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے:

ڈان کارلو نے آگے بڑھ کر کہا "والد صاحب اور بلانکا نے تمہارا ذکر مجھ سے کیا تھا۔ تم کسی اعلیٰ خاندان کے فرد معلوم ہوتے ہو۔ بادشاہ سلامت عنقریب ٹیولس پر فوج کشی کرنے والے ہیں۔ اس وقت ہم دونوں کا جنگ میں سامنا ہو گا"

ابو حامد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی نظر بلانکا اور فرانسیسی امیر زادے پر تھی جو پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے۔ امیر زادہ اسپینی دوشیزہ کو اُلفت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن بلانکا کے جذباتِ عشق اُس کی آنکھوں سے ہویدا تھے۔ جن کو نہ صرف لاٹریک بلکہ ڈان کارلو نے بھی دیکھ لیا۔ ابو حامد کچھ دیر کے بعد چلا گیا۔ . . . . . . اور جب بھائی بہن تنہا رہ گئے تو ڈان کارلو نے پوچھا "بلانکا یہ کیا بات ہے کہ تم مور کو دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں؟"

بلانکا نے اپنے جذباتِ عشق کو پوشیدہ رکھنے کی مطلق پروا نہ کی اور صاف صاف کہہ دیا کہ مجھ کو ابو حامد کے ساتھ محبت ہے۔ وہ اگر عیسائی ہو جائے تو میں بجز اس کے کسی کو اپنا شوہر بنانا پسند نہ کروں گی۔

ڈان کارلو۔ "کیا خاندانِ سنا تافی کی لڑکی ایک مور سے محبت کرے جس کو ہم نے اس ملک سے باہر نکال دیا ہے" بلانکا بھی آخراسی بھائی کی بہن تھی۔ اُس نے سختی سے کہا "ہاں میں اس سے محبت کرتی ہوں اور اس کو تین سال ہو گئے۔ ہم دونوں اپنے اپنے مذہب پر قائم ہیں۔ اور یہی امر ہمارے ملاپ میں مزاحم ہے۔ یہ شخص شرافت مجسم ہے۔ اور میں تا دمِ مرگ اس کی محبت میں ثابت قدم رہوں گی۔۔۔۔"

ڈان کارلو نے دیکھ لیا۔ اور اچھی طرح سمجھ لیا کہ دونوں شرافت کے پُتلے اور اپنے مذہب پر پکے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس نے بلانکا کو اس ورطۂ ہلاکت سے نکالنے کی کوشش کی اور کہا "مگر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ میرا خیال تھا کہ لارنیک میرا بھائی بن جائے گا۔۔۔۔"

بلانکا۔ "تمہارا خیال غلط تھا۔ مَیں اس اجنبی سے محبت نہیں کر سکتی۔ تم اپنے ارادوں میں راسخ رہو۔ اور مَیں اپنے عزم میں۔ ہاں اس کا اطمینان رکھو کہ میں ایک کافر کی بیوی کبھی بننا پسند نہ کروں گی"

کارلو۔ "مگر اس کے تو یہ معنی ہیں کہ ہماری نسل برباد ہو جائے گی"

بلانکا۔ "نسل لڑکے سے چلتی ہے یا لڑکی سے؟ مگر اس کا افسوس ہی کیا ہے"

یہ دیکھ کر کہ بہن سے پیش جانا مشکل ہے۔ ڈان کارلو احمد کے پاس گیا۔ اور نہایت جوشیلے الفاظ میں کہا "بہتر یہ ہے کہ میری بہن سے دست بردار ہو جاؤ۔ ورنہ ہم میں جنگ چھڑ جائے گی"

ابُوحامد:۔ "کیا تم بلانکا کا پیغام لئے ہو؟"

کارلو:"نہیں وہ تم سے اسی طرح محبت کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ بلانکا میرے فرانسیسی دوست کی زوجیت میں آئے۔ اور اگر تم راہ میں حائل نہ ہوتے تو اس امر میں کوئی شخص میرا مزاحم نہ ہوسکتا تھا۔"

یہ الفاظ سُن کر ابوحامد نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اور لڑنے کے واسطے تیار ہو گیا۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ بلانکا اپنے وعدوں سے منحرف ہو کر فرانسیسی امیرزادے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس بات کا علم کہ اس کی معشوقہ باوفا ہے۔ تقویتِ قلب کے واسطے کافی تھا۔ اور وہ اس کے لئے کیا کچھ نہ کرسکتا تھا۔ اس نے پہلے تو بلطائف الحیل اس جنگ کو ٹالنا چاہا جس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ جرأت یا شہامت میں اپنے آپ کو ڈان کارلو سے کم سمجھتا تھا۔ بلکہ اپنی معشوقہ کے عزیز بھائی سے اُسی کے واسطے لڑنا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن بدرجۂ مجبوری اس ناگزیر "ڈوئل" پر تیار ہو گیا۔ اور دونوں شہر سے باہر جا کر مصروفِ پیکار ہو گئے۔

ڈان کارلو پُورا مردِ میدان تھا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ابُوحامد کسی جنگ میں شریک نہ ہُوا تھا۔ تاہم اس کی شجاعت اور نسبی شہامت کافی حد تک ناتجربہ کاری کی بدل ہو گئی۔ ایک طرف اگر احساسِ نسب باعثِ مجادلہ تھا۔ تو دوسری جانب جذباتِ عشق۔ بہر حال دونوں اپنے ارادوں میں پختہ اور دھن کے پکے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ ڈان کارلو کو اپنے حریف کے مار ڈالنے میں باک نہ تھا۔ لیکن ابوحامد اس کی جان نہ لینا

چاہتا تھا۔ مجادلہ کافی عرصہ تک رہا۔ اور اگر کوئی دیکھنے والا ہوتا تو ضرور کہہ اُٹھتا کہ مقابلہ کی چوٹ ہے۔ دونوں کے گھوڑے زخمی ہو گئے۔ تلوار چلاتے چلاتے ہاتھ رہ گئے۔ مگر غلبہ کسی کو حاصل نہ ہوا۔ پھر ڈان کارلو کا رہوار جواب دے گیا۔ اور سوار پیادہ لڑنے لگے۔ اب بھی کوئی ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن جب حریف کا آلہ حرب ابو حامد کی دمشقی تلوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا تو گویا اس جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ اور مغلوب شخص چلانے لگا۔ "میں اب بھی تمہاری قوم کو لامذہب اور بُرا سمجھتا ہوں۔ اس لئے تم مجھ کو جلد ہلاک کر دو۔"

مگر ابو حامد نے اپنی تلوار نیام میں کر لی اور کہا "میں صرف اس لئے جنگ کر رہا تھا کہ تم پر اپنی برتری کا اظہار کر کے ثابت کر سکوں کہ بلانکا میری بیوی بن سکتی ہے۔ ورنہ میرا ارادہ تم کو کاری زخم پہنچانے کا نہ تھا۔"

اس وقت شہر کی طرف سے گرد و غبار اُٹھتا نظر آیا۔ اور لاٹریک مع بلانکا کے موقع جنگ پر پہنچ گیا۔ بلانکا کو شبہ ہوا تھا کہ دونوں آپس میں لڑ نہ بیٹھیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ بھائی کو غیر حاضر پا کر سیدھی میدانِ مجادلہ کی طرف چلی آئی۔ ان دونوں کو دیکھ کر کارلو نے کہا "میں تو ہار گیا۔ مگر لاٹریک تم غالباً اس عرب سے پیش جا سکو گے" مگر فرانسیسی امیر زادے نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا اور اسپین کی دوشیزہ کا عزمِ راسخ دیکھنے کے بعد اس کو مورکے مقابلہ میں کامیابی کی بہت کم اُمید تھی۔

بلانکا نے ہر ممکن کوشش کی کہ تینوں میں اتفاق ہو جائے۔ لیکن کارلو بول اُٹھا" میں ابوحامد سے نفرت کرتا ہوں" لاٹریک نے کہا" اور مجھے اس پر رشک آتا ہے۔ لیکن ابوحامد کا خیال تھا کہ وہ باوجود اس کے کہ ڈان کارلو کی عزت کرتا اور لاٹریک پر رحم۔ ان سے دوستانہ تعلقات قائم نہیں کر سکتا۔

اس وقت سے بلانکا کی محبت سوگنی بڑھ گئی۔ بہادر اقوام کی عورتیں شوہر کی جرأت و شہامت پہ ہمیشہ ناز کرتی ہیں۔ اور بلانکا کو یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ کہ اس کا عاشق ڈان کارلو سے بھی زیادہ شجاع ہے، حالانکہ وہ تمام مغربی یورپ میں نام پیدا کر چکا ہے۔

(۵)

اس ماجری کو ایک عرصہ گزر گیا۔ ابوحامد ہر سال آتا اور ناکام واپس جاتا۔ آخر ایک روز اُس نے سوچا کہ لاؤ گرجا میں جا کر بلانکا کے مسلمان ہونے کی دُعا مانگوں۔ چنانچہ وہ ایک ایسی عمارت میں داخل ہوا۔ جو کسی زمانہ میں مسجد تھی۔ لیکن اب اہلِ مسیح کی عبادت گاہ کہلاتی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ قربان گاہ کے سامنے ایک نائٹ جھکا ہوا نہایت خلوص سے دعا مانگ رہا ہے۔ اس کی تلوار قریب ہی رکھی ہوئی ہے۔ اور وہ اپنی عبادت میں اس قدر منہمک ہے کہ کوئی کھٹکا، کوئی آواز اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کر سکتی۔ یہ نائٹ لاٹریک تھا۔ ابوحامد پہ اس کی محویت کا بے حد اثر ہوا۔ اور وہ بھی قربان گاہ کے سامنے جھکنا چاہتا

تھا کہ اُس کی نظر ایک عربی کتبہ پر پڑی۔ جو دراصل قرآن مجید کی ایک آیت تھی۔ اس کے دیکھتے ہی اس میں مذہبی جوش پیدا ہو گیا۔ اور وہ گرجا سے نکل بھاگا۔ لیکن آج کا دن اس کے واسطے مبارک نہ تھا۔ گرجا کے دروازہ پر اس کو ایک نقاب پوش عورت ملی۔ جو بجز بلانکا کے کوئی نہ تھی۔

ابو حامد نے اس کو روک کر پوچھا "کیا تم لاڈریک کو تلاش کرنے آئی ہو؟"

بلانکا نے جواب دیا "بھلا اس رشک و حسد سے فائدہ؟ اگر میری محبت سرد ہو جاتی تو میں بجائے دھوکا دینے کے صاف صاف تم سے کہہ دیتی۔ میں یہاں تمہارے واسطے دعا کرنے آئی ہوں۔ اوّل تو تمہیں مجھ سے محبت نہ کرنی چاہئے تھی۔ اور اگر تم نے اس کا دعوے کیا تھا تو عیسائی ہو جاتے۔ تمہاری وجہ سے ہمارا سارا خاندان رنج و الم میں مبتلا ہے۔ میرا بھائی تم سے متنفر ہے۔ والد اسی غم میں گھلے جاتے ہیں۔ کہ شادی نہیں کرتی اور خود میری تندرستی بھی خراب ہو گئی ہے۔ تم دیکھ لینا کہ یہ محبت اور صدمات مجھ کو زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہنے دیں گے۔ کیونکہ مشعل کی آگ اس کو روشن ہی نہیں کرتی بلکہ جلا بھی ڈالتی ہے۔"

یہ الفاظ نہ تھے تیر و نشتر تھے جو ابو حامد کے دل میں پیوست ہو گئے۔ عشق و مذہب میں جنگ شروع ہو گئی۔ اور بہت جلد عشق مذہب پر غالب آ گیا۔ ابو حامد اپنی معشوقہ کا اس غم میں مرجانا پسند

نہ کرتا تھا۔ اس لئے اُس نے تہیہ کر لیا۔ کہ وہ عیسائی ہو جائے گا۔"

(۶)

آج سب لوگ لاٹریک کے مہمان تھے۔ اور دعوت کا سامان موروں کے محل میں کیا گیا تھا۔ دیواروں پر مسیحی فاتحین کی تصویریں آویزاں تھیں۔ اور ان کے نیچے غرناطہ کے آخری فرمانروا کی تلوار لٹکی ہوئی تھی۔ ابو حامد کا دل اس نظارہ سے خون ہو گیا۔ لیکن عشق میں بجز ذلت و رسوائی کے رکھا ہی کیا ہے؟

دعوت شروع ہو گئی۔ پہلے ڈان کارلو نے اپنی بہادری کے افسانے سنائے اور پھر لاٹریک نے ایک نظم گائی۔ جس میں فرانس کے مناظر کی تعریف کی گئی تھی۔ اس کے بعد ابو حامد سے خواہش کی گئی۔ کہ وہ بھی کچھ سنائے۔ مگر بیچارے مور کو اس ماحول میں بجز اپنی قوم کی بربادی اور تباہی کے کیا نظر آ سکتا تھا چنانچہ اس نے غرناطہ کی تباہی کے متعلق ایک نوحہ گایا۔ جس کو سن کر سب کے دل بھر آئے۔ پھر ڈان کارلو نے ایک نظم شروع کی۔ جس میں اُس کے جدِ امجد سڈ (مشہور اسپینی ہیرو) کی تعریف کی گئی تھی۔"

ابو حامد بول اُٹھا۔" اس شخص کو تم لوگ مردِ میدان کہتے ہو۔ اور ہم اسے ظالم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ البتہ اگر اُس کی بہادری فیاضی کے قدم بقدم۔۔۔۔۔۔"

ڈان کارلو نے تلخ لہجہ میں جواب دیا۔" اس کی شجاعت اور فیاضی دونوں

ضرب المثل ہیں۔ میرے جدامجد کو صرف مور ہی برا کہہ سکتے ہیں۔"
اس فقرے کو سُن کر ابو حامد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا استعجاب انتہا کی حد کو پہنچ چکا تھا۔ اور الفاظ کی تلخی اس کی دلی کاوش کا ثبوت دیتی تھی۔ "تم سڈ کو اپنا جدامجد قرار دیتے ہو؟"
"ہاں۔ اس کا خون ہماری رگوں میں موجود ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مجھ کو کافر موروں سے سخت نفرت ہے۔"
ابوحامد نے اپنی معشوقہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم خاندان بیوار سے تعلق رکھتی ہو جس نے غرناطہ کی فتح کے بعد بنو سراج کے ایک معمر شخص کو اس کے باپ کی قبر کے پاس ہلاک کر دیا تھا۔ افسوس مجھے اس کا علم نہ تھا کہ اس خاندان نے سنا تانی کا نام اختیار کر لیا ہے۔ اللہ اس ناواقفیت نے مجھ کو ڈبو دیا۔"
کارلو نے فخریہ لہجہ میں کہا۔ "جی ہاں۔ ہمارے دادا ہی نے بنو سراج کو قتل کیا تھا۔ اور انہیں کو فرڈی نینڈ نے ڈیوک سنا تانی کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔"
ابوحامد کی گردن جھکی تھی۔ چہرہ کا رنگ کافور تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آخر اس نے اپنے دل کو قابو میں کیا۔ اور بولا۔ "معاف کیجیے میں جانتا ہوں کہ رونا کم ہمتی کی نشانی ہے۔ اور آئندہ آپ کبھی میری آنکھوں کو پُر نم نہ دیکھیں گے۔ (بلانکا کی طرف خطاب کر کے) بلانکا! میری محبت بادِ سموم کی طرح ہے۔ اس روز لاٹریک کو سربسجود دیکھ کر

اور تمہارے الفاظ سُن کر مَیں نے تہیہ کر لیا تھا کہ عیسائی ہو جاؤں۔"
ان الفاظ کو سُن کر غمزدہ دوشیزہ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ ڈان کارلو استعجاب سے چونک پڑا۔ اور فرانسیسی نائٹ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ کیونکہ اب اس کو دوشیزہ کے حصول کی مطلق اُمید نہ رہی۔
مور نے اس کے خیالات کو معلوم کر لیا۔ اور ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جو انتہائی کرب کا پتا دیتی تھی۔ بولا "نائٹ! اُمید کو ہاتھ سے نہ دو۔ اور بلانکا تم بنی سراج کے آخری چشم و چراغ کا ماتم کرو۔"
بنو سراج کا نام سُن کر ہر طرف خاموشی ہو گئی۔ اور دلوں میں خوف نفرت، اُلفت، استعجاب اور حسد کے جذبات متلاطم ہو گئے۔ آخر بلانکا نے اس سکوت کو توڑا۔ اور بولی "پاک مریم۔ تو نے میرے انتخاب کو لاجواب بنا دیا۔ واقعی میں صرف بہادروں کی اولاد سے محبت کر سکتی ہوں۔"
ابو حامد نے کہا "نازنین ملکہ مَیں تا دمِ مرگ تمہارا غلام رہوں گا۔ مگر تم کو میری اصلی حالت کا پتا نہیں۔ مَیں نے ابھی خاندان بیوار کا ذکر کیا ہے جس نے غرناطہ میں بنو سراج کے ایک معمر شخص کو بیدردی کے ساتھ قتل کر دیا تھا۔ یہ شخص میرا دادا تھا۔ اور میں پہلی مرتبہ غرناطہ صرف اس غرض سے آیا تھا۔ کہ بیوار کے کسی فرد سے اپنے دادا کا بدلہ لوں لیکن میں کس خیال میں تھا اور تقدیر کو کیا منظور تھا؟" اس انکشاف نے دونوں کے دلوں کو آلودہ کر دیا۔ اور بلانکا نے بالکل مُردہ آواز میں دریافت کیا "اور اب کیا ارادہ ہے؟"

ابوحامد: "یہی کہ میں تمہارے مواعید کو واپس کر دوں۔ خود ہمیشہ کے لئے بادیہ گردی اختیار کر لوں۔ اور آخر اپنی موت سے اس باہمی تنافر کی تلافی کروں۔ اگر امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں تمہارے دل سے میری تصویر مٹ جائے تو یہ فرانسیسی نائٹ ——"

مگر لاڈریک نے اُس کو آگے بڑھنے نہ دیا۔ اور زور سے بغل گیر ہو کر کہنے لگا۔ "نہیں نہیں! تم یہیں رہو۔ اور میں ڈان کارلو سے التجا کرتا ہوں۔ کہ وہ اپنی بہن کو تمہاری مناکحت میں دیدے۔ اگر تم چلے بھی جاؤ تو میرے منہ سے بلانکا کی محبت کا ایک کلمہ بھی نہ نکلے گا۔"

ڈان کارلو نے دونوں کے ایثار کی تعریف کی۔ لیکن اُس کو یقین نہ تھا۔ کہ ابوحامد دراصل بنو سراج کا آخری چشم و چراغ ہے۔ اور جب مور سردار نے اس کو اپنی انگوٹھی بطورِ نشانی کے دکھائی تو وہ بھی نرم ہو گیا اور کہنے لگا۔ "ابوحامد! بس عیسائی ہو جاؤ اور میں خود بلانکا کو تمہاری زوجیت میں دے دوں گا۔"

امتحان سخت تھا مگر نہ اس قدر کہ ابوحامد عزت کو محبت پر قربان کر دے۔ کیا مقتول کا پوتا قاتل کی پوتی سے شادی کر سکتا تھا؟ پھر بھی اُس نے اِس امر کا فیصلہ بلانکا کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔

ہمیں کہنا پڑتا ہے۔ کہ اس امتحان میں بلانکا باوجود عورت ہونے کے نہایت کامیاب رہی۔ اُس نے ایسی آواز میں جو مشکل سے سُنی جاتی تھی کہا۔ "جاؤ اپنے وطن کو چلے جاؤ۔" اور غش کھا کر گر پڑی۔ ابوحامد نے اِس فیصلہ کو

پھانسی پانے والے مجرم کی طرح سُنا اور اپنی تقدیر پر قانع ہو گیا۔

(۲۷)

دوسرے دن مور سردار جہاز میں سوار ہو کر افریقہ چلا گیا۔ لیکن چونکہ اب اس کی دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس لئے وہ اس کارواں میں شامل ہو گیا جو ہر تیسرے سال مصر کو جاتا اور یمن میں مکہ معظمہ کے قافلہ سے مل جاتا۔ بلانکا کچھ عرصہ تک صاحب فراش رہی مگر پھر تندرست ہو گئی۔ اُس کا معمول تھا کہ ہر سال موسم بہار کی آمد پر سمندر کے کنارے جاتی۔ کچھ روز افریقہ کی طرف انتظار کی نظریں ڈالتی۔ اور جب ابو حامد کے آنے کا زمانہ گزر جاتا تو غرناطہ واپس آجاتی۔ وہ نہ کسی بات کی شکایت کرتی تھی۔ نہ کبھی ابو حامد کا ذکر اُس کے لبوں تک آتا۔ لوگ خیال کرنے لگے تھے کہ بلانکا اپنے حال میں خوش ہے۔ اس کا باپ بیٹی کے غم میں مر گیا۔ اور ڈان کارلو لڑائی میں مارا گیا۔ لیکن ابو حامد کا انجام کسی کو معلوم نہ ہوا۔

ایک مرتبہ ٹیونس سے کارتھیج کے کھنڈروں کو جاتے ہوئے مجھ کو بنو سراج کے آخری چشم و چراغ کا مقبرہ دکھایا گیا جس پر کھجور کا ایک گھنا درخت سایہ کئے ہوئے تھا۔ قبر میں بجز اس کے کوئی خاص بات نہ تھی کہ بیچ میں ایک پیالہ بنا ہوا تھا جس میں برسات کا پانی جمع ہو جاتا۔ اور موسم گرما میں پرند اس سے پیاس بجھاتے ہیں +

امریکہ

(۱)

مورلّا :- مصنّفہ ایڈگرایلن پو - مترجمہ "شہید"

(۲)

گلاب کے چار پھول :- مصنّفہ او۔ ہنری، مترجمہ محمد نقی۔

مولّا

مولّا سے میں جس رشتے میں وابستہ تھا۔ اگر اُسے بیان کرنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس سے اتنی ہی گہری محبت تھی، جتنی کسی کو کسی سے ہو سکتی ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ تعلق ایسی عجیب وغریب کا تھا کہ جس کی تصریح کسی قسم کے رسمی الفاظ نہیں کر سکتے۔ جب سے حُسنِ اتفاق نے ہمیں ایک دوسرے کے مقابل کیا تھا۔ اسی لمحے سے میری روح میں ایک ایسی آگ کے شُعلے روشن ہو گئے تھے۔ جس سے میں پہلے مطلق آشنا نہ تھا لیکن ان شعلوں میں وہ التہاب نہ تھا جسے آنکھیں دیکھ سکیں یا جس کی تصویر الفاظ کے رنگ وروغن سے کھینچ سکے۔ وہ شعلے نہ تھے۔ ایک ایسی مبہم سوزش تھی۔ جسے میں محسوس تو کرتا تھا۔ لیکن یہ نہ بیان کر سکتا تھا کہ وہ کس قسم کی سوزش ہے۔ اور کہاں ہے؟ جتنی زیادہ میں اُس کے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُتنی ہی زیادہ وہ مبہم ہوتی جاتی تھی۔ اور اس طرح میں ایک ایسی رُوحانی خلش میں مبتلا تھا۔ جو روز بروز بڑھتی جاتی تھی بہر حال ہماری قسمت میں ایک دوسرے سے ملنا لکھا تھا۔ اور یہ بھی ہماری قسمت میں لکھا تھا کہ ہم نکاح کے رشتے میں مربوط ہوں۔ اور

ایک دوسرے کے ہو کر رہیں۔ اگرچہ میں نے کبھی اپنی زبان سے اپنی محبت کا راز نہیں کھولا۔ لیکن وہ میری ہوگئی اور اُس نے دوسروں سے قطع تعلق کر کے اپنے آپ کو میری خوشی کے لئے وقف کر دیا۔

مولانا کی علمیت غیر محدود تھی، یہ مبالغہ نہیں کہ اُس کی ذہنی قوتیں معمولی درجے کی نہ تھیں۔ وہ اپنی ذہانت و لیاقت کے اعتبار سے ایک خارق عادت ہستی تھی۔ اور میں کیونکر یہ محسوس کئے بغیر رہ سکتا تھا؟ چنانچہ میں نے اُسے اپنا استاد تسلیم کر لیا۔ تاہم مجھے بہت جلد یہ معلوم ہوا کہ اُس نے جو کتابیں مجھے پڑھنے کے لئے دی ہیں۔ وہ جرمن فلاسفہ کی متصوفانہ تحریریں ہیں جنہیں جرمنی کی ادبیات کی ادنےٰ درجے کی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کتابیں اُسے کیوں اتنی مرغوب تھیں۔ اور وہ کیوں ہر وقت اُن کے مطالعہ میں منہمک رہتی تھی۔ تاہم غیر محسوس طور پر مجھے بھی ان سے رغبت ہوتی چلی گئی۔ جس کی وجہ غالباً صحبت کے سریع اور غیر شعوری اثر کے سوا کچھ نہیں۔

اور اس اثر پذیری میں جہاں تک میرا خیال ہے۔ میری عقل کو کوئی دخل نہ تھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں میں اُس کے طبعی رُجحانات اور اس کی عادات سے جتنا بھی متاثر ہوا بالکل غیر محسوس طور پر ہوا۔ میرے خیالات اور اعتقادات نے مطلق اس کا رنگ نہیں قبول کیا۔ نہ میرے اقوال میں اور نہ میرے اعمال میں ان متصوفانہ کتابوں کے اثر کا کبھی کوئی شائبہ پایا گیا۔ مجھے پورے طور پر دلجمعی تھی کہ میں لاکھ ایسی کتابیں

پڑھوں اور لاکھ اپنی رفیقہ کی باتوں کو غور سے سنوں۔ میری ذہنی کیفیت کا متغیر ہونا محال ہے۔ اس لئے میں نے اپنے آپ کو پورے طور پر اُس کی تعلیم و تدریس کے سپرد کر دیا۔ اور بلا خوف و خدشہ اس کی بتائی ہوئی کتابوں کی پیچیدگیوں میں غرق ہو گیا۔ اور جب میں ایسی کتابوں کے مطالعہ میں ہمہ تن مصروف ہوتا جن کا پڑھنا مذہب اور اخلاق نے ممنوع قرار دیا ہے۔ اور میرے دل میں فاسد خیالات چکر لگانے لگتے۔ تو موریلا اپنا برف سا سرد ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیتی اور فلسفۂ قدیم کے خاکستر سے ایسی دبی ہوئی چنگاریاں نکال لاتی۔ جن کا نقش تپتے ہوئے لوہے کے داغ کی طرح میرے حافظے پر مرتسم ہو جاتا۔ اور میں گھنٹوں اُس کے قریب بیٹھا رہتا۔ اور اُس کی آواز کی موسیقی سے اپنی رُوح کی تشنگی بجھاتا رہتا تا آنکہ اُس کی آواز کی موسیقیت میں ایک ہولناک اور خوف انگیز عنصر مل جاتا۔ اور میرے دل و دماغ پر ایک تاریکی سی مسلط ہونے لگتی اور میرے چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ اور اس کی آواز کو سُن سُن کر جو کسی انسانی آواز سے مشابہ نہ ہوتی۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ طبقاتِ اسفل کی گہرائیوں سے گونج گونج کر آرہی ہے۔ میری ذہنی عشرت ایک پُراسرار خوف سے تبدیل ہو جاتی۔ اور اُس کا مافوق البشر حسن میری نظروں میں ایک مہیب شکل اختیار کر لیتا۔ میں مرعوب اور خوفزدہ ہو کر اُس کی طرف دیکھتا رہ جاتا۔

اُن مباحثوں کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ جو مذکورہ بالا

کتابوں کے مسائل کے متعلق میرے اور اُس کے درمیان ہوتے تھے اور ایک طویل عرصے تک ہماری گفتگو کا واحد موضوع رہتے تھے جن لوگوں کو دینیات اور اخلاقیات پر عبور ہے۔ کچھ وہی اُن کو سمجھ سکیں گے۔ اور جن لوگوں کو ان سے مس نہیں اُن کو بتانا نہ بتانا برابر ہے۔ اجمالی طور پر قسطنطے کا فلسفہ ہمہ اوست، فیختا غورث کا ترمیم شدہ مسئلہ تناسخ اور خاص طور پر شیلنگ کا نظریہ وحدانیت ——— یہ تھے وہ مباحث جن سے میری تخیل پرست رفیقہ کو طبعی لگاؤ تھا جس چیز کو لاک نے تشخصیت یا وحدتِ ذات سے تعبیر کیا ہے۔ وہ ایک ذی عقل فرد کے صحیح الدماغ اور کامل الحواس ہونے کی ایک دلیل ہے۔ اور چونکہ ہم ذات سے ایک ذی فہم اور ذی شعور ہستی مراد لیتے ہیں۔ نیز چونکہ تفکر و تعقل ہمیشہ شعور کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اپنے آپ کو "میں" یا "ہم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس طرح ہم اپنے آپ کو دوسرے ذی عقل افراد سے ممتاز اور قائم بالذات تصور کرتے ہیں۔ لیکن بقائے ذات کا مسئلہ یعنی یہ مسئلہ کہ آیا موت کے بعد شخصیت باقی رہتی ہے یا فنا ہو جاتی ہے۔ میرے لئے بڑی دلچسپی کا موضوع تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس کا حل مشکل اور ادق اور پیچیدہ ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ موریلا اس کا ذکر بار بار ایک ایسے عجیب انداز سے کیا کرتی تھی۔ جو مجھے اس پر غور کرنے پر مجبور کر دیتا تھا ؀

آخر کار ایک وقت آیا جب اپنی بیوی کا طور و طریق میرے

لئے ذہنی معمہ بن گیا۔ جیسے کوئی حیرت انگیز شعبدہ انسان کی عقل کو چکر میں ڈال دیتا ہے۔ اب میں اُس کی سرد اور نازک انگلیوں کے مس اس کی مترنم آواز کے دھیمے سُروں اور اُس کی غمگین آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ اور وہ یہ جانتی تھی۔ لیکن ظاہر نہ کرتی تھی۔ اور مجھ سے کچھ نہ کہتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری کمزوری اور حماقت سے واقف ہے۔ وہ ہمیشہ مسکرا دیتی اور اسے ایک قسمت کی بات کہہ کر ٹال دیتی۔

یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے دل کے آہستہ آہستہ ہٹ جانے کی وجہ جانتی ہے۔ حالانکہ میں خود اس سے ناواقف تھا۔ بہرحال وہ مجھ پر کبھی ظاہر نہ کرتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا۔ مگر وہ پھر عورت تھی۔ اور اس لئے زود اثر پذیر۔ چنانچہ وہ اسی فکر میں گھلتی جاتی تھی۔ رہتے ہوتے ایک وہ دن آیا۔ جب اس کے رخساروں پر وہ قرمزی داغ۔ جو خونِ جگر کا داغ اور ایک جان گسل بیماری کی نشانی ہوتا ہے۔ ہمیشہ نظر آنے لگا۔ اور اُس کے زرد پیلے ماتھے کی نیلی نیلی رگیں اُبھر آئیں۔ اُس کو اس حال میں دیکھ کر کبھی کبھی میرا دل نرم ہو جاتا۔ لیکن جب ہماری آنکھیں چار ہو جاتیں اور اُس کی آنکھوں کے پُرمعنی انداز نگاہ کو دیکھ کر مجھے وحشت ہونے لگتی۔ اور میری رُوح پر وہی حالت طاری ہو جاتی جو کسی شخص پر اُس وقت طاری ہوتی ہے۔ جب وہ کسی اتھاہ کھڈ کے کنارے کھڑا ہو کر اُس کی خوفناک گہرائیوں کو دیکھے۔

میں صاف طور پہ کیوں نہ کہہ دوں کہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو چلی تھی کہ کسی طرح موت کا پردہ میرے اور مورلا کے درمیان حائل ہو جائے۔ ہاں یہ زبردست خواہش ایک چنگاری کی طرح میرے سینے میں سُلگ رہی تھی۔ لیکن کئی دن گزر گئے۔ ہفتوں پر ہفتے اور مہینوں پر مہینے مجھے انتظار کرتے ہو گئے۔ پھر بھی روح کو اپنا قفس خاکی کچھ اتنا عزیز ہوتا ہے۔ کہ میں بات کی مجھے خواہش تھی۔ وہ نہ ہوئی۔ آخرکار مجھے اپنے دل پر ضبط نہ رہا۔ اور میں اس تاخیر کو دیکھ کر جھنجلانے اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگا۔ میں جل کر اُن تلخ و ناگوار لمحوں اور ساعتوں، اُن پہاڑ سے دنوں اور ہفتوں کو کوسنے لگا جو اس طرح طول پکڑتے اور اُس کی مدت حیات کو دراز تر کرتے جاتے تھے جس طرح دن ڈھلتے وقت شام کے سائے آہستہ آہستہ طویل ہوتے جاتے ہیں:

لیکن خزاں کی ایک شام کو جب ہوائیں فضائے آسمانی میں ساکن اور خاموش تھیں مورلا نے مجھے اپنے بستر کے قریب بلایا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی رُوئے زمین پر ایک مبہم اور تاریک دُھند چھائی ہوئی تھی۔ اور پانی کی سطح پر ایک ایسی عجیب و غریب چمک تھی جیسے آگ کے شعلوں کا عکس در و دیوار پر پڑتا ہے۔ اور جنگل کے پتوں کے درمیان سے آسمان پر قوس قزح کے رنگ جھلکتے ہوئے نظر آ رہے تھے"

جب میں اُس کے قریب پہنچا تو وہ بولی "آج کیسا اچھا دن ہے! یہ وہ دن ہے۔ کہ اس دن یا انسان صحیح معنوں میں زندہ رہے یا مر جائے

دُنیا کے بسنے والوں کے لئے یہ دن غنیمت ہے۔ لیکن فنا کی بستی کے رہنے والوں کے لئے یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے"۔

میں نے اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور وہ کہنے لگی "میری موت کا دن قریب ہے۔ بس میں کوئی دن کی مہمان ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں پھر بھی زندہ رہوں گی"۔

"وہ دن کبھی نہیں آیا جب تم نے مجھ سے محبت کی۔ لیکن جو جیتے جی تیری نظروں میں حقیر رہی مرنے کے بعد تُو اس کی پرستش کرے گا"۔

"خدارا ایسی باتیں مُنہ سے نہ نکالو"۔

"میں پھر کہتی ہوں کہ میں کوئی دم کی مہمان ہوں۔ لیکن میرے سینے کے اندر وہ امانت محفوظ ہے جو تیری محبت کی یادگار ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور جب میری رُوح تن سے جدا ہو جائے گی تو تیری بچی مورلا۔ میری نشانی بن کر تیرے پاس رہے گی۔ لیکن تیری زندگی غم اور افسوس کی زندگی ہوگی وہ غم و افسوس جو مٹائے سے نہیں مٹتا۔ تیری خوشی کے دن گذر چکے۔ اور خوشی ایک بار جا کر پھر نہیں آتی"۔

میں نے چلّا کر کہا " مورلا! تجھے یہ کس طرح معلوم ہے۔ تو یہ کس طرح کہہ سکتی ہے"؟

لیکن اُس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ بلکہ میری طرف سے مُنہ موڑ کر تکیے پر مُنہ رکھ لیا۔ اُس کے جسم پر ایک کپکپی سی نمودار ہوئی۔ اور ابھی اُس

کے آخری الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ کہ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔

لیکن اُس کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ اُسی وقت پوری ہوئی۔ گویا رُوح اُس کے جسم سے پرواز نہیں کر گئی۔ بلکہ اُس کے جسم ہی کے ایک حصے سے نکل کر دوسرے حصے میں داخل ہو گئی۔

اس کی لڑکی ایک عجیب سرعت کے ساتھ زندگی کے ابتدائی مراحل طے کرکے قدوقامت اور عقل وذہانت میں جوان ہوئی۔ اور وہ مرنے والی کی ایک ایسی شبیہہ تھی کہ سرِمُو فرق نہ تھا۔ مجھے اُس سے ایسی محبت ہوگئی جیسی مجھے سان گمان نہ تھا۔ کہ مجھے اس دُنیا کے کسی باشندے سے ہو سکتی ہے۔

لیکن بہت مُدّت نہ گذرنے پائی تھی کہ آسمانِ محبت کا مطلع تاریک ہونا شروع ہوا۔ اور تاریکی خوف اور غم کے بادل اُمڈ اُمڈ کر چھانے لگے۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں میری بیٹی قدوقامت اور عقل وذہانت میں ایک حیرت انگیز سرعت سے ترقی کر رہی تھی۔ بے شک اُس کی جسمانی ترقی عجیب وغریب تھی۔ لیکن اُف میں کیا بیان کروں۔ کہ اُس کی ذہنی نشوونما کو دیکھ کر کیسے کیسے ہیجان انگیز خیالات میرے دل میں پیدا ہوتے تھے۔

اور یہ خیالات میرے ذہن میں کیونکر نہ آتے۔ جب روز بروز مجھے اس کا زیادہ احساس ہوتا جارہا تھا۔ کہ اس سن وسال ہی میں میری بچی

عقل میں حیران ہو گئی ہے۔ میں اُس کی زبان سے اکثر ایسی باتیں سُنتا تھا۔ جیسی بڑی بوڑھی تجربہ کار عورتیں کیا کرتی ہیں۔

اور میں یہ دیکھتا تھا کہ اُس کی آنکھیں، جو ہر وقت کسی سوچ میں رہتی ہیں۔ عالم شباب کے جذبات سے مخمور ہو رہی ہیں۔ یہ سب کچھ مجھ پر ایک تلخ حقیقت کی طرح ثابت ہو گیا۔ اور جب کوئی توجیہ اُسے غلط ثابت کرنے اور میرے دل کو تسلی دینے کے لئے کافی نہ ہو سکتی تھی تو پھر یہ کونسی تعجب کی بات ہے کہ میرے دل میں طرح طرح کے خوفناک شبہات پیدا ہونے لگے جن سے میری رُوح پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔

اور اپنی بیوی ہولا کے دل ہلا دینے والے قصے کہانیوں اور اُس کے وحشت انگیز نظریوں کی یاد مجھے ستانے لگی مرنے والی کی بات پوری ہوئی جس طرح قضا کا حکم اٹل ہوتا ہے۔ میں نے اُس کی نہیں۔ تو اُس کی یادگار کی۔ دُنیا کی نظروں سے چھپ کر پرستش شروع کی۔ اور اپنے گھر کی تنہائی میں مقید رہ کر میں اپنے اوقات اپنی محبوبہ کی محبوب نشانی کی حفاظت میں بسر کرنے لگا۔ برس پر برس گذرتے چلے جاتے تھے اور میں جب اس کے حسین چہرے کو۔ جس کے خدوخال میں ایک مبہم سا سحر تھا جس میں ایک تقدس کا عنصر ملا ہوا تھا۔ اور اس کے بڑھتے ہوئے قد و قامت کو دیکھتا، تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روز بروز اُس کے انداز و اطوار اور اس کے چہرے کے نقوش میں اُس کی ماں کی شکل و شباہت نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ ساعت بساعت مشابہت

سکے یہ نقوش جو پہلے بیٹی سے نیچے ابھرتے آتے تھے۔ اور ساعت بساعت وہ زیادہ شوخ، زیادہ واضح اور زیادہ مہیب ہوتے چلے تھے یہ تو میں برداشت کر سکتا تھا کہ اُس کی مسکراہٹ عین بعین اُس کی ماں کی سی ہے۔ مگر جب اُس کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے مرنے والی کی صورت یاد آجاتی تو میں کانپ اُٹھتا۔ مَیں یہ بھی برداشت کر سکتا تھا۔ کہ اُس کی آنکھیں بالکل اپنی ماں کی آنکھوں سے مشابہ ہیں۔ لیکن جب وہ موریلا کی آنکھوں کی طرح میری رُوح کی گہرائیوں تک اُترنے لگیں تو میں خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیتا، پھر اُس کی بلندی اور چوڑی پیشانی ہیں۔ اُس کے ریشمیں بالوں کے پیچ وخم ہیں، اُس کی زرد نزار اُنگلیوں ہیں، اُس کی آواز کے غمگین، موسیقیت سے لبریز لہجے ہیں اور ان سے کہیں زیادہ اُس کے الفاظ اور جملوں میں مجھے اُس کی ماں کی مجسّم یادگار نظر آتی تھی۔ اور یہ امر میرے لیے جگر سوز اور جانکاہ خیالات کا ہمت نیا سامان بہم پہنچاتا رہتا تھا۔

اس طرح میری بیٹی کی زندگی کے دو دَور گزر گئے۔ لیکن وہ اب تک روئے زمین پر ایک بے نام ونشان ہستی تھی۔ پدرانہ محبت اُسے "میری بیٹی" اور "میری پیاری" کے عمومی کلمات ہی سے مخاطب کرتی تھی۔ اور اُس کا گھر کی خلوت سے باہر قدم نہ نکالنا اُس کے غیروں سے راہ ورسم رکھنے میں مانع تھا۔ موریلا کا نام اُسی کے ساتھ مٹ گیا۔ مَیں نے اپنی بیٹی کے سامنے کبھی اُس کی ماں کا ذکر نہیں کیا۔ اور یہ ممکن بھی کیونکر تھا؟

میری بیٹی کے دل و دماغ پر اس قلیل مدت عمر میں سوائے اپنے
محدود حلقہ معاشرت کے تاثرات کے خارجی دنیا سے کوئی تاثرات
وارد نہیں ہوتے تھے۔ اور اس لئے اُس کے ذہن میں یہ خیال کبھی نہ آیا
ہوگا کہ میرے سوا کسی اور کی ذات بھی اُس کے وجود کی کفیل ہے لیکن
آخرکار بپتسمہ کی رسم میرے دماغ کو، جو متواتر تفکرات کے باعث بالکل
مضمحل ہو رہا تھا۔ مہلک تقدیر سے نجات پانے کا واحد ذریعہ نظر آئی۔
اور جب میں یہ رسم ادا کرنے کے لئے تیار ہوا۔ تو مجھے نام کے انتخاب
کرنے میں تذبذب ہوا۔ قدیم اور جدید زمانے اور اپنے اور غیر ملکوں کی
عورتوں کے بے شمار نام جن میں سے کوئی حُسن میں ضرب المثل تھی۔ کوئی
دولت میں شہرۂ آفاق اور کوئی نیکی میں زبان زدِ خلائق، میری زبان پر
آآ کر رک جاتے تھے۔ لیکن نہ جانے وہ کیا چیز تھی جس نے مجھے مرنے
والی کی یاد تازہ کرنے پر مجبور کیا۔ نہ جانے میرے اندر وہ کونسی روح
خبیثہ تھی جس نے وہ لفظ میرے منہ سے نکلوایا جس کے خیال سے
میری رگوں میں خون خشک ہو جایا کرتا تھا۔ نہ جانے میری رُوح کے
عمق میں وہ کونسی فاسد قوت پوشیدہ تھی جس کے اثر سے میں نے
گرجا گھر کی تاریکی اور رات کی خاموشی میں ڈرتے ڈرتے آہستہ سے
مورلا کا لفظ زبان سے نکالا۔ اور نہ جانے وہ کیا پُر اسرار شعبدہ تھا جس
نے یکایک میری بیٹی کی صورت مسخ کر دی۔ وہ اس خفیف آواز کو سُن کر چونکی۔
اور اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا کر اور گرجا کے فرش پر دھم سے گر کر

جواب دیا "میں آگئی"۔

نہایت درجہ صراحت، آہستگی اور خاموشی سے یہ الفاظ میرے کان میں آئے۔ اور اس کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا گویا پگھلا ہوا سیسہ میرے کانوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ جو کانوں کے راستے دماغ میں اُتر گیا ہے۔ ماہ و سال ایک دوسرے کے بعد آئیں گے۔ اور گذر جائیں گے۔ لیکن کیا کبھی اُس منظر اور اُس وقت کی یاد میرے دل سے جائیگی؟ ناممکن! اس وقت کے بعد میں تھا۔ اور ایک عالم بے خبری۔ ایک کیفیت بیہوشی، میں دُنیا و مافیہا سے بالکل غافل ہوگیا۔ میری قسمت کا ستارہ غروب ہو گیا۔ اس لئے دُنیا میری نظروں میں تاریک ہو گئی۔ اور اس کی مختلف اللون شکلیں ایک مدھم فانوس کی سایہ نما شکلوں کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گذرنے لگیں۔ اور ان سب میں مجھے ایک مورلا ہی کی صورت نظر آتی تھی۔ فضائے آسمانی کی ہوائیں اور وسیع سمندر کی بیتاب لہریں میرے کانوں میں سرگوشیاں کرتی تھیں۔ اور وہ ایک ہی لفظ دہراتی تھیں۔ "مورلاّ! مورلاّ" لیکن مورلاّ کہاں؟ اُسے تو میں اپنے ہاتھوں سپرد خاک کر آیا تھا۔ اور جب میں پہلی مورلاّ کی طرح دوسری مورلاّ کو بھی لحد کے سیاہ پردے میں چھپا چکا۔ تو ایک طویل اور ناخوشگوار قہقہے کی آواز قبرستان میں گونجی:۔

گلاب کے چار پھول

ایونکل ——— سیاح، مصور اور شاعر ایونکل ——— نے
تیوری پر بل ڈالتے ہوئے رسالے کو فرش پر پھینک دیا۔
اُس کے دوست سامی براؤن نے جو کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا جلدی سے رسالے کو اُٹھا لیا۔ اور اُس کے اوراق پلٹتے ہوئے زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔" ایونل خیر تو ہے؟ آج رسالے کیوں پھینکے جا رہے ہیں؟ کیا کسی نقاد نے جناب کے ... کسی شہ پارے کو رگڑ دیا ہے؟"
ایونل نے آہستہ سے جواب دیا۔" رگڑا دگڑا تو کسی نے بھی نہیں، اور ہمیں رگڑے گا بھی کون! مگر افسوس تو یہ ہے کہ رومان کا خاتمہ ہوتا جا رہا ہے"
ایونل نہایت سنجیدگی کے ساتھ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اُس نے ایک رسالے کو اُٹھایا اور اُس کے ورق اُلٹ پلٹ کر کہنے لگا ———
"سامی! تم جیسے صاحبِ ذوق آدمی کو سمجھنا چاہیئے۔ کہ یہ وہ رسالہ ہے جس میں پہلے پیو۔ لونگ، ڈانٹے مین۔ رابرٹ اور ——— اور

خیر تمہیں اسی سے اندازہ ہو جائیگا کہ ان لوگوں کے مضامین کا معیار کیا ہوگا اور اب اس کا تازہ پرچہ تمہارے سامنے ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ اس میں کیا کیا جواہر پارے شامل ہیں۔

"کوئلوں کی کان کے متعلق ایک مقالہ، زہریلی گیس کے متعلق ایک انکشاف، گذشتہ سے پیوستہ ایک افسانہ جس میں بین الاقوامی بمباری کا تذکرہ ہے۔ ایک نوجوان عورت کی کہانی ہے جس نے چند دن بطور جاسوس کے مشرق میں گزارے تھے۔ ایک نظم ہے۔ ایک بحری حادثے کا ذکر ہے۔ نئی حکومت کی کشتیوں کا ذکر ہے۔ ایک اور افسانہ ہے۔ جو کسی سیاسی محمند کا قصہ ہے جس نے تخریبِ مجرمانہ کے ذریعے سے کامیابی حاصل کی تھی۔

"اس کے علاوہ اکٹھے اُنیس صفحوں پہ ایڈیٹر نے اشاعت کا رونا رویا ہے۔ کیا یہ تمام چیزیں رومان کی موت کی شہادت نہیں ہیں —؟"

سامنے کھڑکی کے پاس چمڑے کی آرام کرسی پہ نہایت اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ گول تھا اور ہنس مکھ۔ رنگ سُرخ و سفید تھا۔ اُس کی آنکھوں میں چنچل رومان کے لئے کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔

ایونل کے گھر کی پچھلی کھڑکی ایک پرانے باغ میں کھلتی تھی۔ جہاں بہت سے قدیم درخت اور بیلیں تھیں۔ اس باغ کے چاروں طرف اینٹوں کی ایک دیوار کھڑی تھی جس نے اس باغ کو بازار سے علیحدہ کر دیا تھا۔ باغ کے بیچوں بیچ اور ایونل کی کھڑکی کے سامنے ایک پُرانا مکان موسم

بہار کے پتوں اور ڈابیوں سے ڈھکا کھڑا تھا۔ یہ مکان ایک قلعے کی طرح محصور تھا۔ شہر کی ہاؤ ہُوا ور غل غپاڑے سے بھی محفوظ تھا۔

اس میں ایک بوڑھا آدمی رہا کرتا تھا جس کو اپنے اس مکان سے بے حد محبت تھی۔ اور وہ اس کو کسی قیمت پر بھی علیحدہ کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ ہفتے میں تین چار مرتبہ سامی براؤن ایونل کے گھر آتا اور اس کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا جو گوشہ نشین نواب کے گھر کے سامنے کھلا کرتی تھی۔

ایونل اور سامی کے تعلقات اُس وقت سے چلے آرہے تھے۔ جب وہ نئے نئے "بزم شعراء" کے رُکن بنے تھے۔ اگرچہ اب سامی کو کاروباری ... مصروفیتوں نے ادبی ذوق سے محروم کر دیا تھا۔ تاہم کسی زمانے میں اس کو شعروسخن سے بے انتہا شغف تھا۔ لیکن اب اُس گزرے ہوئے رُومان کے لیئے نہ اُس کے دل میں درد تھا اور نہ آنکھ میں آنسو۔ نہ موسم بہار کے سہانے گیت اُس کے دل کو گدگداتے اور نہ دردناک افسانے اُس کی طبیعت کو لبھاتے تھے۔ اب تو بس ایونل کی کھڑکی کے سامنے چمڑے کی آرام کرسی پر بیٹھنے میں اُس کو لطف آتا تھا۔

سامی ایونل کی باتوں سے حظ اٹھاتا تھا۔ مگر ایونل کی نگاہ میں اُس کی چنداں وقعت باقی نہیں رہی تھی۔ سامی براؤن ایک دلال کا کلرک تھا اور زمانے کی نیرنگیوں اور زندگی کے نامساعد حالات نے اُسے پختہ کار بنا دیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایونل اُسے تختۂ مشق بنانا چاہتا ہے۔ سامی نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا: "میرا تو خیال ہے کہ اس رسالے نے

آپ کی نظموں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لئے آپ اس سے اتنے برہم ہو رہے ہیں۔"

ایوِنل نے جواب دیا "آپ کا خیال وال سٹریٹ کے متعلق یا کسی زنانہ کلب کی صدارت کے بارے میں درست ہو تو ہو۔ لیکن یہاں تو آپ کے سامنے اسی رسالے کے اس سے پہلے پرچے میں ایک نظم ہے۔ اگر مجھے آپ اُس کو اپنی نظم کہنے کی اجازت دیں ———"

"اچھا خیر ذرا سنیئے تو سہی۔ کیا نظم ہے" سامی برادن نے دھوئیں کا بادل اُڑاتے ہوئے کہا:-

ایوِنل نے رسالہ کھول کر اپنی نظم بلند آواز سے پڑھنی شروع کی۔

چار گلاب

نظم

ایک گلاب جو میں نے تمہارے بالوں میں لگایا تھا

وہ سفید بیش بہا گلاب، محبت کا تحفہ

ایک گلاب جو تم نے اپنے سینے پر آویزاں کیا تھا

وہ سُرخ گلاب جو محبت کی تصدیق کرتا تھا

اور ایک وہ گلاب جو تم نے اپنی نازک انگلیوں سے توڑا تھا

جس کی عطریت عام خوشبوؤں سے نرالی اور دائمی تھی

اور ایک وہ گلاب جو تم نے مجھے دیا تھا جس کی یاد

اب تک میرے دل میں کانٹے کی طرح چُبھتی تھی

سامی نے تعریف کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا "بھئی واہ! یہ تو خوب چیز کہی ہے"

اسی رنگ میں مَیں نے پانچ چیزیں اور لکھی ہیں" ایولن نے جواب دیا اور وہ اپنی بیاض تلاش کرنے لگا۔

"اچھا اب تو رہنے دو۔ پھر کسی وقت سُنیں گے۔ اور تم جانتے ہو کہ مجھے نظموں سے ایسی زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ اور مَیں نظم کی باریکیوں سے واقف بھی نہیں ہوں۔ اور سچ پوچھو تو مجھے وہ نظمیں پسند آتی ہیں۔ جن کو سُن کر دل کے اندر کانٹا نہ چُبھے۔ بلکہ مسرّت اور فرحت کا احساس ہو۔ اچھا خیر پھر کسی وقت گفتگو ہوگی۔ اب تو مَیں اجازت چاہتا ہوں" اُس نے باغ کے ہرے بھرے درختوں پر ایک آخری نگاہ ڈالی۔ اور منہ سے ایک بے سُری سیٹی بجاتے ہوئے نکل گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو ——

ایولن کھڑکی کے پاس بیٹھا ہُوا اپنی ایک تازہ ترین نظم کا ایک غیر موزوں مصرع درست کر رہا تھا۔ اور اس کی نظریں اس نواب کے باغ پر پڑ رہی تھیں کہ وہ یکایک ایک مصرع گنگناتا ہُوا کھڑا ہو گیا۔ درختوں میں سے باغ والے محل کی ایک کھڑکی صاف نظر آتی تھی۔ اس کھڑکی پر ہمیشہ ایک

سفید پردہ لٹکا ہوا ہوا میں لہرایا کرتا تھا۔ مگر اس وقت تو اس کھڑکی پر اُس کے خوابوں اور شاعرانہ رومانوں کے فرشتے ایک حسین و جمیل دوشیزہ کے رُوپ میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔

وہ ایسی شگفتہ و شاداب تھی جیسے شبنم سے بھیگا ہوا گلاب کا پھول اور ایسی دلفریب و نازک اندام تھی جیسے انگور کی لہلہاتی بیل۔ اُس کا ملکوتی حسن باغِ جنّت کے پھول کی مانند تھا۔ جس کی مدح میں شاعر قصیدے لکھا کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کھڑکی میں کھڑی رہنے کے بعد وہ پھر پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

غیر فانی حُسن و شباب سے بے اعتنائی برتنے کے جُرم میں شاعر کے احساساتِ لطیف پر ایسی کاری ضرب لگائی گئی تھی کہ وہ سر سے پیر تک لرز گیا۔ اس ہوش ربا منظر کی جھلک نے ایک لمحہ میں اُس کے تصوّرات کی دُنیا کو درہم برہم کر دیا۔

سامان لادنے کے ٹھیلے جو اس کے گھر کے پاس سے گزر رہے تھے اُن کی بے ہنگم چرخ چُوں میں بھی اس کو محبت کے راگ سنائی دینے لگے۔ اخبار فروش لڑکوں کا شور بلبل کا شیریں نغمہ بن کر اُس کو مست کرنے لگا۔ اور وہ باغ اور محل جس میں وہ حسینہ رہتی تھی۔ اس کے لئے پریوں کا مسکن بن گیا۔ اور وہاں کے دربان تلواروں، نیزوں اور بھالوں سے آراستہ دیو معلوم ہونے لگے۔

شام کو چار بجے ایونل نے باغ پر جو نگاہ ڈالی تو وہ "جانِ تمنا" اُس کی

اُمیدوں کے مرکز یعنی دریچے پر چینی کے چار چھوٹے چھوٹے گلدان سجانے میں مصروف تھی جن میں سے ہر ایک میں سرخ یا سفید گلاب کا ایک نہایت شگفتہ پھول رکھا ہوا تھا۔ گلدان سجا کر وہ پھولوں پر جھکی۔ اور اُن کو اپنے حسن سے شرمسار کرنے لگی۔ ایونل کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ اُس کی طرف غور سے دیکھ رہی ہے۔

شاعر نے جواب میں اُس کا مؤدبانہ مگر پُر جوش استقبال کیا۔ پھر وہ کھڑکی میں اپنی خوشبو کا نقش چھوڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

ایونل نے اپنے آپ سے کہنا شروع کیا "کیسا خوبصورت اشارہ ہے۔ اگر میں اس کو نہ سمجھوں تو نرا گنوار ہوں۔ اس نے ضرور میری مشہور نظم چار گلاب پڑھی ہے۔ اور اس نظم نے یقیناً اُس کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ یہ اس کا رومانی جواب ہے۔ یقیناً اُسے معلوم ہے کہ ایونل ——— شاعر ایونل ——— اس کے گھر کے سامنے رہتا ہے۔ اس نے میری تصویریں بھی رسالوں میں دیکھی ہوں گی۔ . . . . . . یہ اچھوتی محبت سے لبریز پیغام کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا"۔

ایونل نے دیکھا کہ اُن گلدانوں کے پاس ایک گملا بھی رکھا ہے جس میں ایک پودا اُگ رہا ہے۔ وہ بے تکلف اپنی دُوربین اُٹھا لایا۔ اور اس پودے کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ نرگس کا پودا تھا۔

وہ شاعرانہ ٹھاٹھ کے ساتھ اُٹھا اور کتابوں کی الماری میں سے ایک گرد آلود کتاب اُٹھا لایا۔ اُس کے ورق پلٹنے شروع کئے۔ اور پھولوں

کی زبان" کا باب نکال کر دیکھنے لگا کہ نرگس کے پودے کے کیا معنی ہیں؟

اس میں لکھا تھا کہ نرگس کے پودے کے معنے ہیں" ملاقات کی متوقع ہوں"۔ ابونل مسکرایا۔ عاشقوں کی سی مسکراہٹ "اس نے خیال کیا کہ اب میں نے جیت لیا۔ وہ عورت جو محبت کرتی ہے۔ ایک مسکراہٹ سے مفتوح ہو جاتی ہے"

اس معرکے کو میں جلد سر کر لوں گا۔

کیسا خوبصورت خیال ہے ۔مجھے دکھانے کے لئے اپنی کھڑکی میں گلاب کے چار پھول رکھ دینا۔ کیسا خوبصورت خیال ہے ۔بلاشبہ اس نازنین کے پہلو میں ایک شاعرانہ دِل ہے"۔

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی ۔پھر سامی سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ ابونل مسکرا کر کہنے لگا۔" تشریف لایئے۔ اتنے روز سے کہاں تھے"۔

"کہیں نہیں"۔ کہتا ہوا سامی اپنی پرانی جگہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور باغ کے سبز سبز پتوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے یکایک اپنی گھڑی نکال کر دیکھی اور ایک دم کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا"۔ اوہو چار بجکر بیس منٹ ہو گئے۔ بھائی اب تو میں ٹھہر نہیں سکتا۔ مجھے ساڑھے چار بجے ایک آدمی سے ملنا ہے"۔

ایونل نے کہا صاحب جناب کا اس وقت کسی سے ملاقات کا وعدہ تھا تو یہاں آنے کی تکلیف ہی کیوں گوارا کی؟ میں تو سمجھتا تھا کہ تم کاروباری لوگ اپنے گھنٹوں اور منٹوں کا پورا پورا احتساب رکھتے ہو۔"

سامی ٹھٹھک گیا۔ اُس کا چہرہ قدرے گلابی ہو گیا۔ کہنے لگا۔ بالکل صحیح ہے۔ مگر دوست یہاں آنے سے پہلے معلوم ہی نہ تھا کہ مجھے ساڑھے چار بجے کسی سے ملنا ہے۔"

ایونل نے تعجب کے ساتھ پوچھا" پھر تمہیں یہیں آ کر کیسے معلوم ہُوا؟ یہ تو اور زیادہ عجیب بات ہے۔"

سامی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔" وہاں بھئی کچھ ایسی ہی بات ہے۔ مگر لو سنو اب میں تمہیں بتا ہی دیتا ہوں۔ تمہارے گھر کے سامنے باغ والا محل ہے نا۔ اُس میں ایک شوخ و شنگ حسینہ رہتی ہے۔ میں دل و جان سے اُس پر مرتا ہوں۔ پہلے تو وہ کچھ بے اعتنائی برتتی تھی۔ لیکن اب میری محبت نے اُس کے دل پر بھی اپنا اثر کیا ہے۔ ہمارے درمیان شادی کا وعدہ ہو گیا ہے۔ صرف اُس کا بڈھا باپ روڑے اٹکا رہا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اُس کی مخالفت بالکل بے کار ثابت ہو گی۔ میں اس نازنین کو تمہاری کھڑکی میں سے دیکھا کرتا ہوں۔ جب اُسے کہیں باہر جانا ہوتا ہے۔ تو وہ مجھے یہاں سے بتا دیتی ہے کہ فلاں وقت ملنا چنانچہ آج ساڑھے چار بجے کا وقت دیا ہے۔ اچھا اب اجازت دو۔ پھر کسی وقت تفصیل عرض کر دوں گا۔"

ایونل نے گھبرا کر پوچھا۔ "مگر تم وقت کس طرح سمجھ جاتے ہو؟"
"گلاب کے پھول سے"۔
"گلاب کے پھول سے؟ وہ کیونکر؟" ایونل نے حیران ہو کر پوچھا۔
"دیکھو، آج گلاب کے چار پھول ہیں۔ اس کے معنی ہیں چار بجے، سمجھے جناب؟"
ایونل نے جلدی سے کہا "اور نرگس کے پودے کا کیا مطلب ہوا؟"
سامی نے بھاگتے ہوئے کہا "آدھا گھنٹہ"۔
ایونل کہتا رہ گیا۔ "ٹھہرو تو سہی۔ ذرا ٹھہرو۔" مگر اس نے ایک نہ سنی۔
دروازے کے باہر سے آواز آئی "اب تو کل ملاقات ہو گی"۔

نیوزی لینڈ

چائے کی ایک پیالی

مصنّفہ کیتھرین مینسفیلڈ۔ مترجمہ "خسرو"

چائے کی ایک پیالی

روزمیری فیل بہت زیادہ حسین نہ تھی۔ ہاں اُس کے اعضا کو فرداً فرداً دیکھا جاتا تو وہ خوش وضع ضرور کہلا سکتی تھی۔ لیکن اس ظلم کی کیا ضرورت ہے کہ ناحق کسی کے جسم کے حصے بخرے کر دئے جائیں۔ وہ جوان تھی۔ ذہین تھی۔ تہذیب جدید سے پوری طرح بہرہ مند تھی۔ غیر معمولی طور پہ خوش پوشاک تھی اور نئی نئی کتابوں کا مطالعہ اُس کے حیرت انگیز ذوق ادب کا شاہد تھا۔

اُس کی شادی کو دو سال گزر رہے تھے۔ اور اُس کا شوہر سچے دل سے اُس کا پرستار تھا۔ اُن کا ایک ننھا بچہ بھی تھا جس کا نام مائیکل تھا وہ محض خوش حال ہی نہ تھے۔ بلکہ نہایت امیر تھے۔ روزمیری خرید وفروخت کیلئے پیرس جایا کرتی تھی جس طرح ہم لوگ ذرا بازار تک جاتے ہیں۔ اگر اُسے پھول درکار ہوتے تو اس کی موٹر ریجنٹ سٹریٹ میں پھولوں کی عظیم الشان دکان پہ جا ٹھہرتی۔ وہاں وہ سر اُٹھا کر نہایت مطمئن لہجے میں پکارتی جاتی "مجھے وہ پھول چاہئیں۔ اور وہ، اور وہ۔ وہاں چار مجھے ان پھولوں کے اور وہ گلدان اس گلدان میں جتنے گلاب کے پھول ہیں تمام میں لوں گی۔ بکائن نہیں

مجھے بکائن سے نفرت ہے۔ اس کی کوئی وضع ہی نہیں"۔ دکان کا پیشِ خدمت ادب سے سر جھکائے اُٹھتا۔ اور بکائن کے پھولوں کو نظروں سے اس طرح اوجھل کر دیتا گویا اس کے قول کی صحت میں کوئی کلام ہی نہیں۔ اور بکائن واقعی خوفناک طور پر بدوضع ہے"۔ "ہاں، وہ لالے کے چھوٹے چھوٹے پھول میں ضرور لوں گی۔ وہ سُرخ اور سفید"۔

اس کے بعد موٹر تک اُس کے پیچھے پیچھے دکان کی پتلی دُبلی خادمہ پھولوں کے بوجھ تلے ڈگمگاتی ہوئی آتی دکھائی دیتی۔

موسم سرما کی ایک شام کا ذکر ہے۔ کہ وہ قدیم نادر اشیا کی ایک دکان پر دیر تک خرید و فروخت میں مصروف رہی۔ یہ دکان اسے بہت پسند تھی دکان کا مالک بھی غیر معمولی طور پر اُس سے عقیدت رکھتا تھا۔ اور اس کی خدمت سے محفوظ ہوتا تھا۔ وہ جب کبھی آتی دکاندار کا چہرہ چمک اُٹھتا۔ وہ اپنے ہاتھ باندھ لیتا۔ اور تشکر آمیز جذبات کے غلبے سے اُس کی قوتِ گویائی سلب ہو جاتی۔ خوشامد۔ ہاں مگر اُس کے ساتھ ہی اُس کے دل میں کچھ نہ کچھ بات ضرور تھی۔

وہ فرطِ ادب سے آہستہ آہستہ بولتا اور کہتا۔ "خاتونِ محترم! آپ جانیے مجھے اپنی چیزوں سے محبت ہے۔ ناشناس ہاتھوں میں دینے پر میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں۔ کہ یہ چیزیں فروخت ہی نہ ہوں۔ آہ! دنیا میں لطیف الاحساس لوگوں کی کتنی کمی ہے"۔ اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے نیلی مخمل کا ایک رومال کھول کر اُس کے سامنے رکھا۔

آج اس میں ایک ڈبیہ تھی۔ وہ اُس نے خاص طور پہ روزمیری کے لئے رکھی تھی۔ اور اب تک کسی کو نہ دکھائی تھی۔ یہ چاندی کی تھی۔ اور اس قدر نفیس تھی گویا اسے بالائی میں گوندھا گیا ہے۔ اس کے ڈھکنے پر پھولوں کے ایک ننھے سے درخت کے نیچے ایک نہایت ننھا سا نوجوان کھڑا تھا۔ اور ایک اس سے بھی چھوٹی عورت اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے نظر آتی تھی۔ اُس کی ٹوپی جو مشکل پھول کے زیرہ کے برابر تھی۔ ایک ٹہنی پہ ٹنگی تھی۔ ٹوپی کے گرد سُرخ فیتہ لگا ہوا تھا۔ اُن کے سروں کے اُوپر گلابی بادل کا ایک ننھا سا ٹکڑا تیرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ روزمیری اس ڈبیہ پر فریفتہ ہو گئی۔ ایک نایاب تحفہ تھا۔ اُس نے حسبِ عادت اپنے دستانے اتار دیئے۔ اور متعدد بار ڈبیہ کو اپنے ہاتھوں سے کھولا اور بند کیا۔ اس اثنا میں وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اُس کے ہاتھ نیلی مخمل کے رومال کے اوپر بے انتہا پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے دکاندار نے بھی اپنے دل کے کسی عمیق اور پوشیدہ گوشے میں یہ خیال لانے کی جرأت کی ہو۔ کیونکہ اُس نے پنسل ہاتھ میں لی اور میز پہ جھکتے ہوئے اپنی زرد اور نحیف انگلیاں ڈرتے ڈرتے اُن نوائی انگلیوں کے قریب لا کر دھیمی آواز میں کہا "کیا میں آپ کو ننھی خاتون کے گون کے پھولوں کی طرف توجہ دلانے کی جرأت کر سکتا ہوں؟"

روزمیری نے پُرجوش آواز میں پھولوں کی تعریف کرتے ہوئے ڈبیہ کی قیمت دریافت کی۔ ایک لمحے تک دکاندار خاموش رہا۔ گویا اُس نے

کچھ سنا ہی نہیں۔ اس کے بعد روزمیری کے کانوں میں اُس کے گنگنانے کی آواز آئی "اٹھائیس اشرفیاں۔ خاتونِ محترم!"

"اٹھائیس اشرفیاں" روزمیری کچھ دیر ساکت کھڑی رہی۔ اُس نے ڈبیہ نیچے رکھ دی۔ اور دوبارہ اپنے دستانے پہن لئے۔ خواہ آدمی امیر ہو مگر پھر بھی اٹھائیس اشرفیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ متحیر سی نظر آتی تھی۔

لیکن دکاندار پہلے ہی سرِ تسلیم خم کر چکا تھا۔ گویا ڈبیہ کا اُس کے لئے رکھنا ہی انسانی آرزوؤں کی معراج تھا۔ بلاشبہ وہ یہ ڈبیہ ہمیشہ کے لئے اس کی خاطر رکھنے کو تیار تھا۔

دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ اب وہ دکان سے سیڑھیوں پر موسم سرما کی شام کا نظارہ کر رہی تھی۔ بارش ہو رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ بارش کے ساتھ ہی تاریکی بھی سیاہ راکھ کی طرح زمین پر گرتی اور چھاتی جا رہی ہے۔ ہوا میں تکلیف دہ خنکی پیدا ہو چکی تھی۔ اور شام کے چراغ افسردہ سے معلوم ہوتے تھے مقابل کے گھروں میں روشنی بھی افسردہ سی نظر آتی تھی۔ چراغوں کی لَو مدھم معلوم ہوتی تھی۔ گویا وہ کسی بات پر افسوس کر رہی ہے۔ لوگ اپنی چھتریوں کی اوٹ میں بھاگے جا رہے تھے۔ روزمیری کے دل میں اُس وقت درد سا پیدا ہوا۔ اُس نے اپنا گلوبند درست کیا۔ اور سوچا کاش وہ چھوٹی سی ڈبیہ مَیں نے خرید لی ہوتی۔ موٹر کار سامنے کھڑی تھی۔ چند قدم اُٹھا کر وہ اُس میں بیٹھ سکتی تھی۔ مگر وہ وہیں کھڑی رہی۔ انسان کی زندگی میں بعض لمحے ایسے بھی آتے ہیں۔

جب بلا وجہ وہ اپنی پُرامن جائے پناہ سے سر نکال کر باہر کے خوفناک حالات سے دوچار ہونا چاہتا ہے۔ حالانکہ چاہیئے تو یہ کہ انسان ان حالات کے تاثر سے بچے اور سیدھا گھر پہنچ کر نفیس چائے کے ایک پیالے سے لذت اندوز ہو لیکن اس خیال کے آنے کے ساتھ ہی اُس کی نظر ایک دُبلی پتلی سیاہ بالوں والی نوجوان لڑکی پر پڑی۔ معلوم نہیں وہ کہاں سے آئی تھی۔ لیکن وہ روزمیری کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ اُس نے کہا "محترم خاتون! کیا میں آپ سے ایک التجا کر سکتی ہوں؟"

روزمیری نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

لڑکی کا لباس پھٹا پرانا تھا۔ اُس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں۔ وہ بالکل نوجوان تھی۔ تقریباً روزمیری کی ہم عمر، وہ سردی سے اس طرح کانپ رہی تھی۔ گویا ابھی پانی سے نکل کر آئی ہے۔

آخر اُس نے رُکتے رُکتے کہا: "محترم خاتون! کیا آپ مجھے چائے کی ایک پیالی کی قیمت دے سکتی ہیں؟"

"چائے کی ایک پیالی" اُس کے الفاظ میں سادگی اور صداقت پائی جاتی تھی۔ یہ کسی گداگر کی آواز نہ تھی۔ روزمیری نے اس سے دریافت کیا "اچھا کیا تمہارے پاس بالکل کچھ بھی نہیں؟"

اُس نے نفی میں جواب دیا۔

"کتنا تعجب ہے" روزمیری نے دھند کی تاریکی میں اُس لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور لڑکی نے اُس پر نظر ڈالی۔ روزمیری کو اس لڑکی کی

ملاقات ایک دلچسپ اور غیر معمولی واقعہ معلوم ہونے لگی۔ دھند میں اس لڑکی کی مڈبھیڑ اُسے ڈاسٹاوسکی کے کسی ناول کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر میں اس کو گھر لے جاؤں اور اس قسم کا کوئی کام کروں جو اکثر ناولوں میں یا سٹیج پر دیکھنے میں آتا ہے۔ تو کیسا لطف ہو اور پھر تصور ہی تصور میں اُس نے اپنے آپ کو اپنے متحیر احباب سے یہ فقرہ کہتے ہوئے سُنا "میں اسے صرف اپنے ساتھ گھر تک لے آئی تھی"۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے قدم اٹھایا اور لڑکی سے کہا "چلو میرے ساتھ۔ میں تمہیں گھر لے جا کر چائے پلاؤں گی"۔

لڑکی نے درد بھری آواز سے کہا "محترم خاتون! آپ مجھ سے مذاق کر رہی ہیں"۔

روزمیری نے کہا "نہیں میں مذاق نہیں کرتی۔ آؤ تم میری خاطر میرے ساتھ چلو"۔

لڑکی نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ دیا۔ خوف سے اُس کی آنکھیں کھل کر بہت بڑی بڑی ہو گئیں۔ آخر اس نے ڈرتے ڈرتے روزمیری سے کہا "آپ مجھے پولیس کے حوالے کرنا چاہتی ہیں؟"

روزمیری نے ہنس کر کہا "نہیں میں ایسی ظالم نہیں ہوں۔ میں تمہیں آرام پہنچانا اور تم سے تمہاری داستان سننا چاہتی ہوں"۔

ایک لمحہ کے بعد وہ دونوں موٹر کار میں سوار ہو چکی تھیں۔ جو دھند کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

روز میری ایک فاتح کے انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دل میں رحم اور مروّت کے جذبات موجزن تھے۔ وہ اس غریب لڑکی پر یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ کہ روزانہ زندگی ہی میں عجیب سے عجیب واقعات پیش آ سکتے ہیں۔ بعض اوقات انسانی بھیس میں فرشتے مدد کو آموجود ہوتے ہیں —— اُمرائے کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔ اور تمام عورتیں آخر بہنیں بہنیں ہیں، چنانچہ اس نے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھ کر پُرجوش آواز میں کہا "تم بالکل نہ ڈرو۔ آخر اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ کیا ہم دونوں عورتیں نہیں ہیں؟ اگر میں زیادہ خوش قسمت ہوں تو تم کو توقع . . . . ."

اس وقت حُسنِ اتفاق سے موٹر کھڑی ہو گئی۔ کیونکہ روز میری کو اپنا فقرہ پُورا کرنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ گھنٹی بجا کر دروازہ کھلوایا گیا۔ اور روز میری لڑکی کو ایک نہایت دلاویز اور مربیانہ انداز سے تقریباً اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہال میں داخل ہوئی۔

گرمی، نرمی، روشنی، خوشبو جو روز میری کے لئے معمولی اور اس لئے ناقابلِ توجہ تھیں۔ لڑکی کے لئے بالکل غیر متوقع نعمتیں تھیں۔ چنانچہ روز میری نہایت اشتیاق کے ساتھ اُس کے چہرے کے اثرات کا مطالعہ کر رہی تھی۔ یہ منظر سحر آلود معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک امیر ننھی بچّی کی طرح تھی جو اپنی پرورش گاہ میں آزاد ہو۔ وہ اپنی مرضی سے ہر الماری کھول سکے اور ہر صندوق سے چیزیں نکال سکے۔

پھر روز میری نے لڑکی سے کہا، "چلو اوپر کی منزل میں میں تمہیں اپنے

کمرے میں لے جاتی ہوں۔ اس سے نہ صرف اُسے اپنی فراخ حوصلگی کا اظہار مقصود تھا۔ بلکہ وہ اس غریب لڑکی کو نوکروں کی متحیر نگاہوں کا ہدف بننے سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ اِسی مقصد سے اُس نے اپنا لباس تبدیل کرنے کے لئے خادمہ کو بھی نہ بُلایا۔

آخر روزمیری اپنی خوابگاہ کے وسیع کمرے میں داخل ہوئی۔ دروازوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ آتش دان میں آگ دہک رہی تھی۔ اور کمرے کا شاندار ساز و سامان جگمگا رہا تھا۔ لڑکی دروازے میں آ کر رُک گئی۔ اُس کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ لیکن روزمیری نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ اُس نے اپنی بڑی آرام کرسی کھینچ کر آگ کے نزدیک کی۔ اور لڑکی سے پکار کر کہا۔ "آؤ یہاں بیٹھو۔ تمہیں بہت سردی محسوس ہو رہی ہے"

لڑکی پیچھے ہٹ گئی اور بولی "محترم خاتون! میں یہ جرأت نہیں کر سکتی!"

روزمیری نے آگے بڑھ کر اُس کو بازو سے پکڑ لیا اور کہا۔ "تم ناحق جھجکتی ہو۔ اس میں بات ہی کیا ہے۔ ذرا دم لو۔ میں کپڑے اُتار لوں اور پھر دوسرے کمرے میں جا کر ہم آرام سے چائے پئیں گے۔ تم ڈرتی کیوں ہو؟ یہ کہکر اُس نے اُسے خود کرسی پر بٹھا دیا۔

لڑکی بالکل خاموش تھی۔ جس طرح روزمیری نے اُس کو کرسی پہ بٹھایا تھا۔ وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی۔ وہ کچھ حواس باختہ سی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن روزمیری نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ اور اُس سے کہا۔

"ٹوپی اتار دو۔ تمہارے خوبصورت بال بھیگ رہے ہیں۔ ٹوپی پہنے رہنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

ہلکی سی آواز آئی۔ "بہت خوب محترم خاتون!" اور پھٹی پرانی ٹوپی اتار دی گئی۔

پھر روزمیری نے کہا۔ "اٹھو میں تمہارا کوٹ اتروا دوں۔"

لڑکی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مگر ایک ہاتھ سے اُس نے کرسی کو پکڑے رکھا۔ روزمیری نے کھینچ کھینچ کر بمشکل اس کا کوٹ اتارا۔ اس کے بعد اُس نے آتشدان کے پیچھے پڑے سگرٹ کا ڈبہ اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ لڑکی کی آواز سنائی دی: "محترم خاتون! میں معافی چاہتی ہوں۔ مگر میں غش کھانے کے قریب ہوں۔ اگر مجھے کھانے کو کوئی چیز نہ ملی تو شاید میری جان نکل جائے گی۔"

روزمیری چونک کر بولی: "اُف میں کتنی بے پروا ہوں مجھے خیال ہی نہیں آیا۔" اِس کے بعد اُس نے جلدی سے گھنٹی بجائی: "چائے — فوراً۔ . . . . اور کچھ برانڈی — بھاگ کر لاؤ۔"

خادمہ چلی گئی۔ لڑکی نے چلا کر کہا "نہیں میں برانڈی نہیں پیوں گی۔ میں کبھی برانڈی نہیں پیتی۔ مجھے صرف چائے درکار ہے۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔"

یہ نہایت متاثر کرنے والا نظارہ تھا۔ روزمیری اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اُسے تسلّی دینے لگی: "بچّی مت روؤ۔ پھر اُس نے اپنا زرنگار

رومال اُسے دیا۔ اور اپنی باہیں اُس کے دُبلے، پرندہ نما کندھوں کے گرد حمائل کر دیں۔ اب لڑکی کو بھی کچھ لمحوں کے لئے اپنا شرمیلا پن بھول گیا۔ اور وہ سسکیاں لے کر رونے لگی "میں یہ مصیبت برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اپنا خاتمہ کر لوں گی۔ اب مجھ میں حوصلہ نہیں رہا"

روزمیری نے شفقت آمیز لہجے میں اُسے تسلی دی اور کہا "اب تمہاری مشکل کا زمانہ گزر گیا ہے۔ میں ہر طرح تمہارا خیال رکھوں گی۔ دیکھو کیسی اچھی بات ہوئی۔ کہ تم مجھے مل گئیں۔ ہم ابھی چائے پئیں گے۔ پھر تم مجھے اپنی سرگزشت سنانا۔ میں تمہارے لئے ضرور کچھ نہ کچھ انتظام کر دوں گی۔ تم رونا موقوف کرو۔ اس سے سخت کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا کے لئے چُپ رہو"

اُس نے رونا بند کیا اور روزمیری اُٹھی ہی تھی۔ کہ خادمہ چائے لیکر آگئی۔ روزمیری نہایت مدارات سے ہر چیز، مکھن، توس، کیک وغیرہ اُسے پیش کرتی رہی۔ اور جتنی دفعہ اس کی پیالی چائے سے خالی ہوئی اُسے چائے، شکر اور بالائی سے بھرتی رہی۔ خود اُس نے کچھ نہ کھایا۔ بلکہ دوسری طرف منہ کر کے سگرٹ کے کش لگاتی رہی۔ تاکہ لڑکی شرم کی وجہ سے اپنا ہاتھ نہ روکے۔

اس تھوڑی سی خوراک نے فی الواقع حیرت انگیز اثر ظاہر کیا جب چائے کے برتن اُٹھائے گئے۔ تو کرسی پہ ایک نئی ہستی، ایک ہلکی پھلکی کشیدہ قامت، گھونگریالے بالوں، سُرخ گلابی ہونٹوں اور بڑی بڑی روشن

آنکھوں والی لڑکی سیمری کے عشرت آفریں احساسات میں غرق بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ روزمیری نے ایک اور سگریٹ سُلگایا، اب گفتگو کا موقع تھا۔

اُس نے نرمی سے پوچھا "تم نے آخری دفعہ کب کھانا کھایا تھا؟"

اُس وقت دروازے کا ہینڈل گھوما اور آواز آئی "روزمیری! میں آسکتا ہوں؟" یہ فلپ تھا۔

"یقیناً"

وہ اندر داخل ہوتے ہوئے لڑکی کو دیکھ کر رُک گیا۔ اور بولا "اوہ مجھے افسوس ہے۔"

روزمیری نے مسکرا کر کہا "کچھ ہرج نہیں۔ یہ میری سہیلی مس——

"سمتھ، محترم خاتون" لڑکی نے بغیر جھجکے، غیر معمولی طور پہ مطمئن انداز سے اپنا نام بتا کر روزمیری کا فقرہ پُورا کیا۔

روزمیری نے کہا "ہم مختصر سی گفتگو کر رہے ہیں۔"

"ضرور" فلپ نے یہ کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی اُس کی نظر لڑکی کے کوٹ اور ٹوپی پر پڑی۔ یہ دونوں چیزیں فرش پہ پڑی تھیں۔ وہ آگ کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اور بولا "کس قدر تکلیف دہ سردی ہے۔" اس کے بعد اس نے لڑکی کے ہاتھوں اور جوتے پہ نظر ڈالی۔ اور پھر روزمیری کی طرف دیکھا۔

روزمیری نے کہا "ہاں، آج کی شام خوفناک ہے۔ کیوں ہے نا؟"

فلپ کے چہرے پہ ایک دلفریب مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر اُس

نے کہا: "بات یہ ہے کہ میں چند لمحوں کے لئے تم کو لائبریری تک آنے کی تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ کیا تم آ سکتی ہو؟ اُمید ہے کہ مس سمتھ ہمیں معاف فرمائیں گی"

لڑکی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے فلپ کی طرف دیکھا لیکن روزمیری نے اُس کے بجائے جواب دیا: "یقیناً وہ ہمیں معذور سمجھے گی"

تنہائی میں پہنچ کر فلپ نے کہا: "میں کہتا ہوں یہ ہے کون؟ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ کیا معاملہ ہے مجھے سمجھاؤ تو"

روزمیری نے ہنستے ہوئے دروازے کا سہارا لیا اور بولی "یہ مجھے کرزن سٹریٹ میں ملی تھی۔ دیکھو کیسی اچھی لڑکی ہے۔ اس نے مجھ سے چائے کی ایک پیالی کی قیمت مانگی تھی۔ مگر میں اُسے اپنے ساتھ لے آئی"

فلپ نے حیران ہو کر کہا "مگر تمہارا مقصد کیا ہے۔ تم اُسے کیا کرو گی"؟

روزمیری نے کہا "میں اس سے شفقت کروں گی۔ بے انتہا شفقت کروں گی۔ اس کی نگہبان بنوں گی۔ ابھی میں کہہ نہیں سکتی کس طرح، کیونکہ ابھی ہم نے اس کے متعلق گفتگو نہیں کی۔ مگر تم بھی اُس سے اس طرح سلوک کرو۔ اسی طرح پیش آؤ کہ اُسے محسوس ہو ۔ ۔ ۔ ۔"

فلپ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "پیاری لڑکی تم دیوانی ہو رہی ہو یہ ناممکن ہے"

روزمیری نے کہا "مجھے پہلے ہی معلوم تھا تم اس طرح کہو گے۔ آخر

کیوں ناممکن ہے۔ میری یہ خواہش ہے اور یہی اس کے لئے ایک محکم دلیل ہے۔ ہم اس قسم کے قصے کہانیاں پڑھتے رہتے ہیں۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

فلپ نے آہستہ سے کہا۔" لیکن"

پھر سگار کا سرا کاٹ کر بولا۔" وہ حیرت انگیز طور پر حسین ہے۔"

روز میری کے رخساروں پر سرخی آگئی۔ اور بولی" حسین؟ تمہارا یہ خیال ہے۔ میں نے تو یہ نہیں سوچا تھا۔"

فلپ نے دیا سلائی سلگاتے ہوئے کہا۔" سبحان اللہ۔ اس کی صورت بے انتہا پیاری ہے۔ میری بنّو! پھر ذرا غور سے اس کا چہرہ دیکھو۔ جب میں تمہارے کمرے میں داخل ہوا تو مجھ پر از خود رفتگی طاری ہو گئی تھی۔ خیر میرے خیال میں تو تم نے غلطی کی ہے۔ مگر ہاں یہ تو بتاؤ کیا مس سمتھ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گی۔ کیا اتنا وقت ہے کہ میں ذرا اخبار دیکھ لوں؟"

روز میری اُس کو پاگل کہہ کر لائبریری میں سے چلی گئی۔ مگر خوابگاہ کی طرف نہیں بلکہ اپنے لکھنے کے کمرے میں۔ وہاں وہ اپنے میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔" حسین! بے انتہا پیاری! از خود رفتگی طاری ہو گئی۔" اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔" حسین! بے انتہا پیاری!" پھر اُس نے اپنی چک بک نکالی۔ مگر آخر یہ سوچ کر کہ چک بیکار ہوں گے۔ اُس نے پانچ پونڈ کے نوٹ نکالے۔ پھر اُن پر ایک نظر ڈالی، اور دو نوٹ واپس دراز میں ڈال دئے۔ باقی تین ہاتھ میں لے کر وہ خوابگاہ کی طرف گئی۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ پھر لائبریری میں داخل ہوئی۔ فلپ ابھی وہیں تھا۔

اُس نے اپنے شوہر سے کہا:"میں تم کو صرف یہ بتانا چاہتی تھی، کہ مس سمتھ آج ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گی۔"

فلپ نے اخبار رکھ دیا اور کہا "اچھا! کیوں؟ کیا پہلے ہی وہ کہیں مدعُو تھیں؟"

روزمیری فلپ کے گھٹنے پہ بیٹھ کر بولی:" وہ جانے پر اصرار کرتی تھی اس لئے مَیں نے اُس کو کچھ نقد روپیہ دے دیا۔ میں اُنسے اُس کی خواہش کے خلاف نہ روکنا چاہتی تھی۔ تمہیں بتاؤ کیا یہ مناسب تھا؟"

روزمیری نے ابھی ابھی اپنے بالوں کو آراستہ اور اپنی آنکھوں کو سُرمے سے ذرا سیاہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے اپنا موتیوں کا مالا پہن لیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے فلپ کے چہرے کو چھوا۔ پھر اُس نے اپنی دھیمی اور شیریں آواز میں فلپ سے پُوچھا۔"کیا میں تمہیں پسند ہوں؟"

"میری پسند کی بھی کوئی حد ہے" یہ کہکر فلپ نے اُسے مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

"مجھے پیار کرو۔"

ایک لمحہ تک خاموشی طاری رہی۔

اس کے بعد روزمیری نے خواب آلود آواز میں کہا"آج مَیں نے ایک نہایت نفیس چھوٹی سی ڈبیہ دیکھی ہے۔ اُس کی قیمت اٹھائیس اشرفیاں

ہے۔ کیا مَیں وہ لے سکتی ہُوں؟"

فلپ اسے اپنے گھٹنے سے اُچھالتے ہوئے بولا "ہاں! فضول خرچ بچی! تم وہ ضرور لے سکتی ہو۔"

لیکن درحقیقت روزمیری یہ نہ پوچھنا چاہتی تھی۔ اُس نے اپنا سر فلپ کے سینے سے لگایا۔ اور آہستہ سے کہا "کیا مَیں خوبصورت ہُوں؟"

جاپان

(۱)

میری :۔ مصنّفہ ای۔ ای سپیٹ، مترجمہ حامد علی خاں

(۲)

رقاصہ :۔ مصنّفہ لیفکاڈیو ہرن ۔ مترجمہ راجہ عتیق اللہ خاں

میری

میں جو دردناک داستان ذیل میں سپردِ قلم کر رہا ہوں اُس کے ماخذ تک میری رسائی محض اتفاقی طور پر ہو گئی تھی۔ اس داستان کا تعلق میرے ایک جاپانی دوست اور سابق شاگرد سے ہے جو جدید تہذیب و تمدن سے بدرجۂ اتم بہرہ مند ہے۔ اُس کی وضع قطع امیرانہ ہے۔ اور اُس کے زرد چہرے سے فطری ذہانت کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ اپنے لباس اور آدابِ معاشرت سے وہ بالکل یورپین معلوم ہوتا ہے جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تو مجھے اُس کی انگریزی تحریریں دیکھ کر اُس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی خوش آیند سیرت نے رفتہ رفتہ مجھے اُس کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ اکثر شام کو ہم مل کر سیر کے لئے جایا کرتے تھے۔ اور اس کے ذریعہ سے مجھے جاپان کے قدیم آثار و مقامات کے متعلق نہایت دلچسپ اور اہم معلومات حاصل ہوا کرتی تھیں۔

وقتاً فوقتاً وہ اپنے مضامین میں اپنے دُور اُفتادہ کوہستانی گاؤں اور اُس کے مضافاتی علاقے کے مرقعے بھی پیش کیا کرتا تھا۔ ان مضامین کے

پڑھنے سے میرے دل میں اُن مقامات کو دیکھنے کی غیر معمولی خواہش پیدا ہو گئی۔ آخر ایک دفعہ موسم بہار کی تعطیل میں اس نے مجھے اپنے پہاڑی مسکن میں کچھ دن گزارنے کے لئے مدعو کیا۔ اور مَیں نے اس کی دعوت کو بخوشی قبول کر لیا۔ ہم نے اپنے شہر سے جو جزیرہ جاپان کے ساحل پر واقع ہے تین گھنٹے تک ریل کا سفر کیا۔ اس کے بعد ہم برقی گاڑی پر سوار ہوئے۔ اس قسم کی برقی گاڑیاں جدید جاپانی معاشرت کا ایک لازمہ ہیں۔ سر شام ہم ایک سٹیشن پر پہنچے۔ جو ایک پُرشور پہاڑی ندی کے کنارے واقع تھا۔ ندی کو ایک چھوٹے پُل کے ذریعے عبور کر کے ہم ایک گاؤں میں پہنچے۔ جس میں ایک لمبا بازار دُور تک چلا گیا تھا۔ ہماری نظروں کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک دراز سلسلۂ کوہستان پھیلا ہوا تھا جس کی بلند ترین چوٹی ہکوسان بارہ مہینے برف سے ڈھپی رہتی ہے۔ میرے شاگرد نے کسی دکان سے ایک قندیل جلا کر ساتھ لے لی۔ اس کے بعد اس نے اُس طویل سلسلۂ کوہستان کے دامن کا رُخ کیا۔ جس کے پیچھے ہکوسان کی فلک بوس چوٹی ثریا کو ثریا سے ملا رہی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد ہم ایک گھنے جنگل میں داخل ہوئے۔ اس وقت رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے نے چاروں کھونٹ چھاؤنی چھالی تھی۔ اور ہم اس تنگ پتھریلی سڑک پر چراغ کی مدد سے بمشکل اپنی راہ کا پتہ چلا رہے تھے۔ میرے شاگرد نے مجھے بتایا کہ یہ سڑک آٹھ سو سال قبل اُن کے مندر کے ساتھ تعمیر ہوئی تھی۔ سالہا سال سے برف و باراں کا طوفان پتھروں کو

اپنی جگہ سے ہٹ رہا ہے۔ اسی وجہ سے سڑک کے آثار قریب قریب مفقود ہو رہے ہیں۔

کچھ عرصے کے بعد ہم ایک گنبد کے پاس پہنچے یہاں اس نے بہ ادب اپنا سر جھکایا اور تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے لیے جب ہم اس کے گھر کے بالکل قریب پہنچ گئے تو اس نے ایک درخت پر اپنی کاغذی قندیل سے روشنی ڈال کر مجھے بتایا کہ اس کے نیچے شاکا سا مایعنی مہاتما بدھ روحانی ریاضت کے لیے بیٹھے تھے۔

آخر ہم اس کے گھر کی تاریک عمارت میں داخل ہوئے جہاں اس کے سن رسیدہ باپ نے جو مندر کا محافظ اور مذہبی پیشوا تھا۔ نہایت تعظیم و تکریم سے ہمارا استقبال کیا۔ اس کی ماں مختصر قد و قامت کی ایک غریب مزاج خاتون تھی کہ چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اس نے نہایت محنت اور مشقت کی زندگی بسر کی ہے۔ میرے دوست کے والدین فرط احترام سے میرے سامنے بات بھی نہ کرتے تھے۔ ان کے دل میں اپنے بیٹے کی غیر معمولی عزت اور وقعت تھی۔ اور میں نہ صرف اس کا استاد تھا۔ بلکہ وہ پہلا اجنبی شخص بھی تھا جس نے ان کی دہلیز پر قدم رکھا۔ اس دو گونہ اتفاق نے ان کے دل میں میری جگہ اس قدر بلند بنا دی تھی۔ کہ میں کئی مرتبہ کی کوشش کے باوجود کسی طرح اپنے مبسوط پر قادر نہ ہو سکا۔ انھوں نے میری آسائش کے لیے بہتر سے بہتر اہتمام کیا اور مجھے نہایت اعلیٰ درجے کی خوراک بہم پہنچائی سچ تو یہ ہے۔ کہ اس پہاڑی گاؤں میں مجھے ان تکلفات کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

صبح کے وقت مجھے معلوم ہوا کہ آس پاس کو ہسار کا منظر نہایت دل کُشا ہے۔ جا بجا پرانی عمارتوں کے کھنڈر بھی نظر آتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ کبھی ان عمارتوں میں چھ ہزار سے زیادہ بُدھ بھکشو آباد تھے۔ مگر اب انقلابِ روزگار نے بجز ایک مندر کے اور کچھ نہ چھوڑا تھا۔ پھر مجھے میرا شاگرد ایک مربع کمرے میں لے گیا۔ یہاں مندر کے تاریخی تحائف کا ایک حیرت انگیز خزانہ میری نظروں سے گزرا۔ میرے سوال پر اس نے مجھے بتایا کہ کوئی شخص اس بیش بہا خزانے کے سرقے کا خیال دل میں بھی نہیں لا سکتا۔ اور یہ اس ویرانے میں کامل طور پر محفوظ ہے۔

آفتاب ڈھل چکا تھا۔ اور میں اپنے جاپانی شاگرد کے قلبی احساسات سے بالکل بے خبر بیٹھا ہوا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔

اُن کے گھر پر بلکہ تمام جنگل پر اُداسی اور افسردگی سی چھا رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ابھی موسمِ سرما کو گذرے عرصہ نہ ہوا تھا۔ پالا بھی وہاں اس غضب کا پڑتا ہے۔ کہ چھتوں تک برف کی تہ پہنچ جاتی ہے۔ اور اس کے سفید فرش پر جنگلی ہرنوں، سوروں اور ریچھوں کے نقشِ رہگذار کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

شہر میں واپس آنے کے بعد کچھ عرصے تک کام کی کثرت اور اپنی مصروفیت کے باعث ہم دونوں کو کالج سے باہر ملاقات کا موقع نہ ملا۔ آخر ایک دن میں نے اپنے طلبہ سے خواب کے موضوع پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی معلوم نہیں نوجوان طلبہ کے دلوں میں صبح کے سہانے وقت اور سہانے منظر نے

کوئی خاص کیفیت پیدا کر دی یا وہ کسی افسوں کے زیرِ اثر اپنی دلی کیفیات کے اظہار پر مجبور ہو گئے۔ مگر جو کچھ انہوں نے لکھا وہ میرے لئے انتہائی حیرت اور دلچسپی کا موجب ہوا۔ بعض طلبہ نے اپنے بزرگوں کے خواب بیان کئے تھے۔ اور یہ خواب بھی جاپان کے عہدِ قدیم سے تعلق رکھتے تھے جس کو انہوں نے دوبارہ عالمِ خواب میں دیکھا تھا۔ انسانی جذبات کے ان مرقعوں میں سے بعض اس قدر پُر اثر بلکہ سحر آلود تھے کہ اُن کو پڑھ کر میری طبیعت میں ایک قسم کا ہیجان پیدا ہو گیا چنانچہ میں نے یوہارا کو، کہ میرے اس شاگرد کا نام یہی تھا۔ شام کا وقت اپنے پاس گذارنے کی دعوت دی۔ لیکن مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میری یہ دعوت کیا نتائج پیدا کرنے والی ہے۔

ہم دونوں دیر تک خواب کے موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ تو میرے تصور نے مجھے ایک دفعہ پھر جنگل میں اس مندر کے ایک بالائی کمرے میں تنہا پایا۔ کوہستانی ہواؤں کی وہی سائیں سائیں اور جنگلی درختوں کی ٹہنیوں کی وہی کڑکڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

اس کے بعد میرے حلقے میں دفعتہً ایک واقعہ تازہ ہو گیا جس کو میں اپنا ایک پریشان خواب سمجھ کر بالکل فراموش کر چکا تھا۔

جنگل کے قیام کی آخری شب کو میرے میزبانوں نے کھانے پینے کا غیر معمولی اہتمام کیا تھا۔ میں رات کے وقت سادہ غذا کھانے کا عادی ہوں لیکن اس کے بجائے انہوں نے مجھے ازراہِ تواضع بہ اصرار اس قدر مچھلی اور ہرن کا بھنا

ہؤا گوشت کھلا دیا۔ کہ میں رات کو دیر تک نہ سو سکا۔ بیداری کے اُن طویل لمحوں میں میرا تصوّر برابر کام کرتا رہا۔ اور میں اپنے جنگلی ماحول اور ارد گرد کی اُن ویران اور خوفناک گھاٹیوں سے ایک دم غافل نہ ہؤا۔ جو ہمارے اور اس بے برگ و گیاہ کوہستان کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ جس کی سفید برف پوش چوٹی تاروں بھری رات میں ہمارے مسکن سے نو ہزار فٹ کی بلندی پر جھلملا رہی تھی۔

تقریباً دو بجے میں سویا۔ اس کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں دفعتہً چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ مَیں نے ایک ہراس انگیز خواب دیکھا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ مَیں نے کسی خوفناک چیز کے غرّانے کی آواز سُنی ہے جس کی وجہ سے میرا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ اسی طرح مجھے کسی ایسی نہایت دہشت ناک چیز کے قُرب کا بھی احساس ہؤا۔ جس کے بیان سے الفاظ قاصر ہیں۔ لیکن مَیں نے اپنے دِل کو اس خیال سے تسلّی دی کہ یہ سب کچھ میرے جسم اور بستر کی غیر معمولی گرمی کا نتیجہ ہے۔ مَیں پسینے میں شرابور ہو رہا تھا لیکن احساسِ خوف کی شدّت کے باعث مَیں بستر سے نکل کر دیا سلائی سے چراغ جلانے کی ہمّت بھی نہ کر سکا۔

پھر مَیں نے صاف الفاظ میں ایک انسانی آواز سُنی۔ یہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔ یُوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتہائی دہشت کے درد و کرب میں بیدم ہو کر چلا رہی ہے۔ "انچن، ہیا کو کرو شیا بائی" بھائی جلدی کرو۔ مَیں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے بعد دوبارہ ویسی ہی غرّانے کی آواز

سنائی دی جس کو سن کر میں جاگ اُٹھا تھا۔ پھر ہیں نے رونے اور کراہنے کی دبی سی آواز سُنی جس کے بعد دوبارہ بالکل خاموشی چھاگئی۔

میں اُس وقت بالکل دم بخود لیٹا ہوا تھا۔ اب مجھے لمبے سانس کھینچنے کا خیال آیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے حواس پر قابو پالیا۔ پھر میں نے دل میں خیال کیا۔ کہ یہ غالباً میرے شاگرد کی بہن کے خواب میں رونے اور چلّانے کی آواز تھی۔ جو نیچے کی منزل میں سو رہی تھی

دوسرے دن صبح میں دیر سے اُٹھا۔ سورج کی کرنیں میرے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں جنگل کے پرندے گا رہے تھے اور کوہستانی ندیوں کا شور بہت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ رات کا واقعہ میرے ذہن سے بالکل اُتر گیا۔ اور آج معلوم نہیں میرے شاگرد کے قلبی حسیّات کے تصرف سے یا کس طرح، مجھے اُس رات کی ایک ایک بات پھر صاف یاد آگئی۔

مَیں نے محض برسبیلِ تذکرہ اس واقعہ کا ذکر کیا تھا۔ لیکن جب میری زبان پر وہ الفاظ آئے جو اُس رات میں نے سُنے تھے "انجن، ہیاگو گرد شیلی" تو میرے شاگرد کے چہرے پر جو تغیّر نمودار ہوا وہ مجھے عمر بھر نہ بھولے گا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ بے ہوش ہو کر کرسی سے نیچے گر پڑے گا۔ اُس کا چہرہ جو ہمیشہ زرد رہتا تھا۔ اب بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ اور اُس کی سانس رُک رُک کر چل رہی تھی۔ پھر اُس نے اپنا دایاں ہاتھ سہارا ڈھونڈھنے کے لئے پھیلایا۔ مَیں نے اُس کا ہاتھ جو متشنج معلوم ہوتا

تھا۔ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے بستر پر لٹانا چاہا۔ لیکن اُس نے لیٹنے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ یک لخت اُٹھ بیٹھا اور نگاہیں گاڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس کو میرے پیچھے کوئی نہایت ہی ہولناک چیز نظر آ رہی ہے۔

میں اُس کے اِس طرزِ عمل سے کچھ مضطرب سا ہو گیا چنانچہ مَیں نے مُڑ کر اپنے پیچھے کی کھڑکی کھول دی۔ باہر موسلادھار بارش ہو رہی تھی اس لئے مَیں نے اُس سے کہا کہ تم اب رات یہیں گزار لو۔ اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اپنے طرزِ عمل کے لئے معذرت کی۔ میں نے شرمندگی سے کہا کہ آپ لوگ جس قدر تواضع اور مدارات کے ساتھ مجھ سے پیش آتے رہے میرا دل ہی جانتا ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ مَیں نے اس واقعہ کو بیان کر کے تمہیں ناحق اذیت دی۔ حالانکہ یہ ایک پریشان خواب تھا جس کو میں خود بھول چکا تھا۔

اُس نے کہا، "یہ پریشان خواب نہ تھا۔ بلکہ سرے سے یہ خواب تھا ہی نہیں" پھر اُس نے جیب میں سے یادداشت کی ایک سیاہ کتاب نکالی اور اُس میں سے حنائی کاغذ کا ایک بوسیدہ سا ٹکڑا نکال کر مجھے دکھایا۔ اُس پر خون کے حروف میں کسی بچے کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہی فقرہ دیکھ کر میں تصویرِ حیرت بن گیا "انجن، ہبا کو، گردشیائی"۔

اس دردناک التجا کو اپنے سامنے دیکھ کر خود میرا جسم نامعلوم طور پر سرد ہو گیا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرا دل غم و اندوہ کے ایک بے پایاں

طوفان میں ڈوب گیا ہے۔

مَیں نے اُس سے پوچھا۔ "آخر یہ کیا بات ہے؟"

پھر اُس نے درد بھری آواز سے خلافِ معمول مجھے جاپانی زبان میں یہ واقعہ سُنانا شروع کیا اور اُس کے بیان کے ابتدائی الفاظ ہی کو سُن کر مَیں درد و غم کا پیکرِ مجسم بن گیا۔

اُس نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے میری ایک چھوٹی بہن ہے۔" اِن الفاظ کو سُن کر مجھے وہ تیرہ چودہ سال کی شرمیلی لڑکی یاد آگئی جس کی ایک آدھ جھلک مجھے اپنے دورانِ قیام میں اُس پہاڑی مکان کے دروازوں کے پیچھے سے وقتاً فوقتاً نظر آتی رہی تھی۔

اِس کے بعد اُس نے کہا۔ "وہ اب بالکل تنہا رہ گئی ہے۔" پھر کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔ اُس وقت اُس کی نظر زمین کی طرف جھکی ہوئی تھی اِس کے بعد اُس نے کہا۔ "گذشتہ سال اُس کی ایک سہیلی بھی تھی جو اُس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ اور وہ دونوں ایک دوسری کے ساتھ بہت خوش رہا کرتی تھیں۔ اُس کا نام میکی تھا۔ لیکن مَیں اُسے میری کہا کرتا تھا۔ کیونکہ مجھے اُس سے محبت تھی۔

اُس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور کچھ مدت سے وہ ہمارے گھر میں رہنے لگی تھی۔ کیونکہ وہ میری بہن فیومی کی نہایت عزیز سہیلی تھی۔ میرے والدین اگرچہ غریب ہیں۔ لیکن انہوں نے اِس کی پرورش اور نگہداشت اپنی بچی کی طرح کی۔ اور چونکہ وہ اُن کو بہت پسند تھی، اِس لئے وہ اُس کو

آیندہ اپنی بہو بنا لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔

"وہ میری بہن کے مقابلہ میں بہت زیادہ ذہین تھی۔ اور غیر ممالک کی ہر چیز سے گہری دلچسپی لیا کرتی تھی۔ مثلاً وہ انگریزی آداب معاشرت انگریزی گفتگو اور پیانو وغیرہ بجانا بخوشی سیکھ لیتی۔ حالانکہ اُس دُور دراز پہاڑی گاؤں میں ایسی باتیں خواب وخیال سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔

"پس آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب میں تعطیل کے دنوں میں اپنے گھر جاتا تھا تو ہم سب آپس میں مل کر کس قدر خوش ہوتے ہونگے۔ ان موقعوں پر وہ مجھ سے تمام نئی باتیں جو میں کالج سے سیکھ کر آیا کرتا تھا پوچھ لئے بغیر دم نہ لیتی تھی۔"

اس ذہین لڑکی کے حالات سُن کر میرا دل نہایت رنج محسوس کر رہا تھا مجھے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ اب اس دنیا سے وہ ہمیشہ کے لئے مفقود ہو چکی ہے۔

میرے شاگرد نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آخری مرتبہ میری سے میری ملاقات ستمبر کے مہینے میں ہوئی۔ میری، فیومی اور میں تینوں سیر و تفریح کے لئے صبح کے وقت گھر سے نکلے۔ ہم نے پہاڑ کے دامن کا راستہ لیا۔ اس زمانے میں یہ پہاڑی راستہ بالکل ویران ہو جاتا ہے ہم نے اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی لے لیا تھا۔ پھر بڑی پگڈنڈی کو چھوڑ کر ہم ندی کے کنارے ہو لئے۔ ہم ایک آبشار کو دیکھنے کے لئے جانا چاہتے تھے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ صبح کا تمام وقت

ہم نے وہاں دھوپ میں بیٹھ کر گذارا۔ کبھی کبھی لڑکیاں اُٹھ کر ریت پر چلنے کا لُطف اٹھاتی تھیں۔ اور ہم سب مل کر خوشی سے گیت گاتے تھے آخر جب سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپنے لگا۔ تو ہم نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا۔ ہم ندی کے کنارے کنارے واپس چلے آرہے تھے اور ابھی بمشکل چند سوگز کا فیصلہ طے کرنے پائے تھے۔ جب میری کو یاد آیا کہ وہ اپنے تصویر دار کارڈوں کا مجموعہ ایک چٹان کے پیچھے بھول آئی ہے۔ وہ اپنے کارڈ لانے کے لیے بھاگتی ہوئی گئی۔ اور ہم اس کے انتظار میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اُس وقت جنگل کا منظر نہایت سُہانا معلوم ہوتا تھا۔ درختوں کی ٹہنیوں میں چڑیاں خوشی سے چہچہا رہی تھیں۔ اور پھدک پھدک کر ایک دوسری کی طرف جا رہی تھیں۔

دفعتہً ہمیں ایک خوفزدہ چیخ سنائی دی۔ اور ہم خطرے کا احساس کر کے واپس بھاگے۔ ہمارا خیال تھا کہ میری کسی بندر وغیرہ سے ڈر گئی ہے۔ لیکن آبشار کے پاس پہنچنے پر وہ ہمیں کہیں نظر نہ آئی۔ تصویر دار کارڈ آس پاس اس طرح بکھرے ہوئے تھے، جیسے کسی نے انہیں زور سے زمین پر پٹک دیا ہو۔

اِس کے بعد اُس نے اپنی یادداشت کے ورق دوبارہ اُلٹے اور اُس میں سے دو کیچڑ سے بھرے ہوئے کارڈ نکال کر مجھے دکھائے جن پر بعض مشہور مغربی مصوروں کے ہاتھ کی تصویریں تھیں۔

پھر اُس نے کہا یہ وہاں ہمیں اور کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اِس مقام سے

باہر جانے کا دوسرا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ تینوں طرف بلند اور دشوار گذار چٹانوں کی سنگلاخ دیواریں کھڑی تھیں۔ ہم نے میری کو ہر طرف ڈھونڈا ہم بار بار بہ آوازِ بلند اُس کا نام لے کر اُسے پکارتے رہے لیکن گرتے ہوئے آبشار کے شور کے سوا جواب میں ہمیں کوئی دوسری آواز سنائی نہ دی۔ صرف ایک دفعہ ہم نے ایک عجیب و غریب آواز سُنی جو جنگل کی ہوا میں ریل کے انجن کی سیٹی کی طرح گونجی۔ میں نے ایسی آواز اس سے پہلے کبھی نہ سُنی تھی۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی ہرن کی آواز تھی یا کسی ریچھ کی۔

تاریکی دم بدم چھا رہی تھی۔ اور ہماری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کریں فیومی گھبرا کر رو رہی تھی۔ اور میں اُسے نہ تنہا چھوڑ سکتا تھا۔ اور نہ اکیلے گھر جانے کی اجازت دے سکتا تھا۔ اس ہولناک سانحے نے اُس کے ہوش و حواس بالکل گم کر دیے تھے۔

ناچار ہم گھر واپس آگئے۔ جہاں ہماری والدہ نہایت بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ میں فیومی کو گھر میں پہنچانے کے بعد فوراً گاؤں کی طرف بھاگا۔ اور لوگوں کو اطلاع دی۔ وہاں سے کئی لوگ میری مدد کیلئے چراغ ہاتھوں میں لے کر آئے۔ ہم وہ تمام رات اور پھر دوسرا تمام دن جنگلوں میں میری کو ڈھونڈتے رہے۔ لیکن ہمیں اُس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ میری کا اس طرح گم ہو جانا سب لوگوں کے لئے ایک ناقابل فہم راز تھا چند دنوں کے بعد مجھے کالج میں حاضر ہونا تھا۔ لیکن روانگی سے قبل میں

نے گرد و نواح کی تمام صحرائی آبادی میں پھر کر لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حتی المقدور میری کی تلاش جاری رکھیں۔

"میری بہن کے خط مجھے باقاعدہ ملتے رہتے تھے۔ لیکن اُن میں بجز حسرت و یاس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ آخر نومبر کے مہینے میں ایک دن مجھے ایک تار ملا کہ مجھے فوراً گھر کو روانہ ہو جانا چاہیئے۔ دن بھر میں سخت مضطرب الحال رہا۔ اور رات کو جب میں گھر پہنچا تو گھر والوں نے میرے ہاتھ میں کاغذ کا یہ بوسیدہ ٹکڑا دیا جو میں نے ابھی آپ کو دکھایا ہے۔ یہ کاغذ ایک شکاری کو پہاڑ کی بلندی پر اس مقام سے دس میل کے فاصلے پر جہاں ہم نے میری کو کھویا تھا۔ صنوبر کے کسی درخت کی شاخ میں اٹکا ہوا ملا تھا۔"

میرے شاگرد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ میرا خواب سن کر کیوں اس قدر سراسیمہ حال ہو گیا تھا۔

پھر اُس نے کہا "میری کے متعلق سب سے آخری اطلاع جو ہمیں موصول ہوئی ہے وہ یہی ہے بشرطیکہ وہ، بشرطیکہ وہ ——"

اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنا مافی الضمیر زبان سے ادا نہ کر سکا۔

اب مجھے اس ہولناک واقعے کا پوری طرح احساس ہو گیا۔ یہ لڑکی انسان سے کسی ادنٰے درجے کی ذی روح کی گرفت میں اب تک کہیں زندہ موجود تھی۔ اور اُس رات وہ کسی طرح بھاگ کر اپنی اُس تنہا جائے پناہ کی طرف آئی تھی لیکن اُس کے دروازے اُس کے لیے نہ کھل سکے اور وہ پھر اُسی

بلا کے پنجے میں گرفتار ہو گئی۔ ہمارے چہرے زرد پڑ گئے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف خوف بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اُس کا منگیتر اور بہن۔

اس واقعہ کو بھی ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ لیکن کسی نے اب تک اُس کی رہائی کے لئے کوئی کوشش نہ کی تھی۔

پھر مَیں نے کہا "کیا اس معاملہ میں پولیس یا فوج کا محکمہ کوئی مدد نہیں دے سکتا؟"

اُس نے جواب دیا "افسوس یہ ممکن نہیں۔ آپ ان پہاڑوں سے واقف نہیں ہیں۔ وہاں پولیس اور فوج کے دستوں کے دستے غائب ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو لوگ ان پہاڑوں سے بخوبی واقف ہیں وہ اپنی انتہائی کوشش صرف کر چکے ہیں۔ مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن اب آپ نے جو کچھ بتایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری ابھی تک زندہ ہے۔ میں علی الصبح گھر کو روانہ ہو جاؤں گا۔ اور تمام کوہستانی میں اس واقعہ کی خبر پہنچا دوں گا۔"

مَیں نے اُس کے ارادے کی تائید کی اور پھر اُس سے کہا کہ "اگر مَیں کالج کے لڑکوں سے اس بات کا تذکرہ کروں تو میرا خیال ہے کہ بہت سے طلبہ تلاش میں مدد دینے کے لئے بخوشی آمادہ ہو جائیں گے۔"

اُس نے کہا "مگر اُس سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ وہ خود پہاڑوں میں کھو جائیں گے۔ کیونکہ بارہا ایسے واقعات پیش آ چکے ہیں۔"

صبح پَو پھٹنے سے قبل میں اسٹیشن پر پہنچا آیا۔ ہم دونوں بھرے ہوئے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

ایک ہفتے کے بعد وہ واپس آیا۔ وہ بہت دُبلا پتلا معلوم ہوتا تھا اور اُس کا چہرہ تمازتِ آفتاب سے جلا ہُوا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ دو پہاڑی رہنماؤں کی مدد سے دن رات پھر کر اُس نے پہاڑوں کا ایک ایک گوشہ دیکھا ہے لیکن بجز مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہُوا۔ اِس پر میرے دل میں ایک نیا خیال جاگزیں ہُوا۔ میں نے ارادہ کیا کہ موسمِ گرما کی تعطیل کا تمام زمانہ اُن پہاڑوں میں گزاروں گا۔ اور یوبارا کے گھر سے دُور دُور کے علاقے میں جستجو جاری رکھوں گا۔ میں نے اپنے شاگردوں میں سے دو کو اپنا ہمراہی منتخب کیا۔ ایک کا نام کاموری تھا۔ جو نباتات سے گہرا شغف رکھنے کے باعث جاپان کے اُن عظیم الشان پہاڑوں کے چپے چپے پر پھر چکا تھا اور دوسرے شاگرد کا نام روکومتسو تھا۔ وہ ایک پہاڑی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اور اُن کا شمار اِس سلسلۂ کوہستان کے بہترین واقفوں میں کیا جا سکتا تھا۔

ہم نے اپنے ساتھ ایک خیمہ، بستر اور چند ضروری اشیاء رکھ لیں۔ اس کے علاوہ ہم نے تقریباً ایک درجن اشخاص کی خدمات حاصل کیں جو ہمیں آس پاس کی خبریں اور کھانے پینے کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ پہاڑ پر ہمیں آئے دن جو عجیب و غریب اور دلچسپ تجربے حاصل ہوتے رہے اُن کے بیان کے لیے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ کاموری پہاڑی

جڑی بوٹیوں سے بے انتہا دلچسپی لیتا رہا۔ اور رو کو مٹسو نے اپنے شوق کے مطابق پہاڑوں کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ جب کبھی وہ پہاڑوں میں غائب ہو جاتا اور ہم اُس کو ڈھونڈ نہ سکتے تھے۔ تو وہ اپنی بندوق کی آواز سے ہمیں اپنے متعلق اطلاع دیا کرتا تھا۔ اِدھر سے میں اپنی بندوق کے ساتھ جو ہمیں تازہ شکار بھی بہم پہنچایا کرتی تھی۔ اُس کے اشارے کا جواب دیا کرتا تھا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت کا موری پیچھے خیمے میں رہا۔ اور رو کو مٹسو اور مَیں دونوں ایک طرف دُور نکل گئے۔ دو میل کے فاصلہ پر جاپان کا سب سے بڑا آبشار تھا۔ جو دو ہزار فٹ بلند ہے ہم اس کو دیکھنے کے لئے آگے جا رہے تھے کہ راستے میں ہم ایک نہایت خوبصورت مقام پر پہنچے۔ جہاں مصفّا پانی کے چشمے کے کنارے ہم اپنا کھانا، جس میں چاول، بھُنے ہوئے تیتر، اور کچھ آلوچے شامل تھے۔ کھانے کے لئے بیٹھے۔ جس وقت مَیں توشہ دان کھول رہا تھا۔ رو کو مٹسو کچھ فاصلے پر زمین کو کھودنے لگا۔ دفعتہً اُس نے میری طرف متوجہ ہو کر دھیمی لیکن مضطرب آواز سے کہا "جناب ذرا یہ دیکھئے" اس کے بعد اُس نے معمولی سُرخ فلالین کا ایک ٹکڑا میرے ہاتھ میں دے کر کہا "یہ کسی عورت کے لہنگے کا حصّہ ہے"۔

میں نے حیرت سے اس ٹکڑے کو دیکھا اور پھر اُس سے پوچھا "کیا تمہیں پورا یقین ہے"؟

اُس نے اثبات میں جواب دیا۔ اور پھر چشمے کے کنارے انسانی پاؤں کے کچھ نشانات کی طرف اشارہ کیا۔ مَیں نے اُسی وقت دوبارہ توشہ دان

کو بند کر دیا۔ اور پھر ہم دونوں نہایت احتیاط سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ لیکن اور کہیں نہ تو ہمیں کوئی نقشِ قدم نظر پڑا۔ اور نہ کہیں کسی قسم کا دھواں وغیرہ دکھائی دیا۔ آخر ہم نے چلنا شروع کیا تا بہ مقدور ہم چٹانوں کی آڑ میں ہو کر چلتے تھے۔ قدم قدم پر ہمیں خطرے کا احساس تھا لیکن اس ویرانے میں پہاڑی چنڈالوں کی پھڑپھڑاہٹ کے سوا اور کسی قسم کی آواز یا آہٹ سنائی نہ دیتی تھی۔ آخر جب ہم ایک ذرا کھلے مقام پر پہنچے جس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی چٹانیں کھڑی تھیں اور جو بلندی میں قدِ آدم سے بھی کم ہونگی۔ تو یکایک ہوا میں ایک سیٹی کی آواز گونجی اور اس کے بعد ایک گرانڈیل پتھر ایک سخت چٹان پر اس زور سے آ کر گرا کہ اس میں سے آگ کے شرارے پیدا ہو گئے۔ میں اس قدر نزدیک تھا کہ اس طرح جس گیس کا اخراج ہوا۔ اُس کی بُو مجھے محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً اوپر نظر اٹھائی۔ ہم سے پچاس فٹ کی بلندی پر ایک جھکی ہوئی چٹان کے سائے میں ہمیں ایک جھونپڑا سا دکھائی دیا۔ جو کسی جنگلی جانور کے کھوٹ سے مشابہ تھا۔ اور جس پر درختوں کی سوکھی ٹہنیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے سامنے ہمیں انسانی صورت میں ایک ہولناک اور عظیم الجثہ ہیکل استادہ نظر آیا۔ وہ عام انسانوں سے کہیں زیادہ بلند قامت تھا اور اس کے بڑے بڑے اور گندے گندمی اعضا بغایت مکروہ اور بغایت گھناؤنے تھے۔ اُس کے ڈراؤنے چہرے کے گرد جو دیوانگی اور غضب ناکی کا مجسمہ تھا۔ اُس کے لمبے لمبے مٹیالے

بال لٹک رہے تھے۔ اُس کی کمر کے گرد ریچھ کی ایک کھال لپٹی ہوئی تھی۔ اور اُس کی بن مانس کی سی برہنہ چھاتی کے گھنے گھنے بال اُس کی اس پوشش سے بالکل ملے جُلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

وہ دانت پیس رہا تھا اور بھیڑیوں کی طرح غرا رہا تھا۔ یکایک مجھے یاد آیا کہ یہی وہ آواز ہے جس نے مجھے جنگل کی اُس خوفناک رات میں اُس مندر کے اندر نیند سے چونکا دیا تھا۔ اور وہاں بھی اُس وقت کھلی ہوا اور سورج کی روشنی میں میرا جسم کانپ اُٹھا۔

اُسی وقت جھونپڑے کے پست اور تاریک سے دروازے میں جو محض ایک موکھا سا تھا ہمیں ایک اور چہرہ دکھائی دیا۔ چہرے پر سورج کی روشنی پڑ رہی تھی۔ اور ایک زرد رُو اور مصیبت زدہ لڑکی صاف نظر آ رہی تھی۔ اُس کی نظر پہاڑوں پر ادھر اُدھر دوڑ رہی تھی۔ پھر دفعتہً اس کی متحیر نگاہ ہم پر جم گئی۔ اس وقت اُس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ لیکن وہ وحشی دندہ اُس کی طرف مڑ کر فرطِ غضب سے غرایا اور وہ ڈر کر اندر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ ایک لکڑ بگڑ کی طرح چیختا چلاتا اور شور مچاتا سیدھا ہماری طرف نیچے کو اُترنے لگا۔ وہ اپنی انسانی ہیئت کے باعث اور بھی زیادہ خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ اب ہمارے لئے بجز فائر کرنے کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ میں نے گولی مار کر دائیں کندھے میں اُسے زخم کیا۔

وہ چند قدم آگے بڑھا اور اُس کے بعد پیچ و تاب کھاتا ہوا زہریلے ناگ کی طرح پھنکارتا ہوا لڑھک کر نیچے پتھروں پر آ پڑا۔ میں نے رو کو مٹسو

سے چلّا کر کہا کہ اگر وہ ذرا بھی جنبش کرے تو وہ بڑا پتھر گرا کر اُسے کچل دو۔ اس کے بعد خود میں نے جھونپڑے کا رُخ کیا۔ اُوپر نظر اُٹھانے پر مجھے وہ خوفزدہ چہرہ بھٹ سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے پکار کر کہا "میری آڈ اب تم بالکل محفوظ ہو"۔ لیکن اُس نے دیوانوں کی طرح مجھ پر ایک ہراساں نگاہ ڈالی اور بھاگ کر چٹانوں میں چھپ گئی۔ اُس کے نحیف اور حسرت زدہ جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔

میں نے روکومٹسو سے چلّا کر کہا "اُس کے پیچھے بھاگو۔ وہ مجھ سے ڈر رہی ہے"۔

روکومٹسو چند جستوں میں اس ڈھلوان پہاڑی کو طے کر گیا۔ اور میں واپس وہاں پہنچا۔ جہاں وہ دیوقامت عفریت گرا ہوا تھا۔ وہ اب بھی غراتا اور دانت پیستا تھا۔ تناسبِ اعضاء کے لحاظ سے بلاشبہ وہ انسان تھا لیکن اعضاء کے فوق الانسانی نشوونما اور اُس کی سانڈ جیسی گردن کو دیکھ کر بے اختیار اتنی گھن آتی تھی۔ کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ کچھ دیر کے بعد لیٹے لیٹے اُس کا چہرہ اُوپر کی طرف اُٹھا تو اُس کی خوفناک آنکھوں، مہیب دانتوں اور اُس نفرت انگیز گڑھے کو دیکھ کر جہاں ناک ہونی چاہیے تھی۔ میں اپنے تحفظ کے لیے بالکل چوکس ہو کر کھڑا ہو گیا یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے ہوشی کی حالت سے بیدار ہو رہا ہے اور اب مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ گولی نے اُسے کچھ اتنا زیادہ نقصان نہیں پہنچایا بلکہ گرنے کے صدمے سے اُس کے حواس معطّل ہو گئے ہیں۔ اُس نے ہاتھوں

کے بل اُٹھنا چاہا۔ لیکن پھر درد سے کراہنے لگا۔ اس پر میں نے اپنی بندوق اُٹھائی۔ جس کو دیکھ کر وہ خاموشی سے پھر زمین پر لیٹ گیا۔ لیکن چند ہی لمحوں کے بعد وہ دفعۃً "کنگرو کی طرح اچھل کر اُٹھا اور رقندیں لگاتا اور چٹانوں کے بیابان کو پھاندتا ہوا نکل گیا۔ اور پھر دو چار وحشیانہ جستوں میں کوہستان کی دشوار گذار چوٹیوں پر پہنچ کر کہیں غائب ہو گیا۔ اب کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہا تھا۔

اِدھر وہ بلائے مہیب نظروں سے غائب ہوئی اور اُدھر مجھے روکو مٹسو ایک مُشتِ استخواں کو ہاتھوں میں لئے آتا دکھائی دیا۔ میں بھاگ کر اُس کی طرف گیا۔ وہ بے ہوش تھی۔ اور اُس کا سر پیچھے کو لٹک گیا تھا۔ پھٹے ہوئے کپڑوں میں اُس کے مُنحنی جسم پر جا بجا زخموں کے نشان نظر آرہے تھے۔ اُس کی حالت اِس قدر زار تھی کہ روکو مٹسو جیسا سنگین دل پہاڑی لڑکا بھی اُس کو دیکھ کر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اُس کھوہ میں نظر ڈالی۔ لیکن وہاں جانوروں کے پروں اور ہڈیوں کے انباروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انسانی ضروریات کی کوئی چیز مجھے وہاں نظر نہ آئی۔

میں نے میری کو روکو مٹسو کی پیٹھ پر باندھ دیا۔ اور چشمے پر پہنچ کر ہم نے اُس کے چہرے پر سرد پانی کے چھینٹے دیئے۔ جس کے بعد اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اب ہمیں اُس کے متعلق کوئی شبہ نہ رہا۔ کیونکہ اُس نے دوبارہ اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے دھیمی آواز میں یہ الفاظ گنگنائے

"آ! کروشی! آ! مَیں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔"
وہاں سے روانہ ہو کر ہم سہ پہر کے تین بجے واپس اپنے خیمے میں پہنچے کاموری کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ کئی لمحوں تک اُسے اپنی نگاہ کا فریب سمجھتا رہا۔ اس کے بعد وہ بھاگا ہوا گیا۔ اور دور پہنچ کر بندوق کے متواتر فائروں کے مقررشدہ اشارے سے اپنے اُن بارہ مددگاروں کو کامیابی کی اطلاع دی۔ چنانچہ اُن بارہ میں سے چار غروبِ آفتاب کے قریب ہم سے آملے۔ اس اثنا میں ہم نے میری کو گرم شوربے اور بعض محرکات کا استعمال کرایا۔ اور وہ گہری نیند سو گئی۔ رات بھر کاموری اور مَیں اُس کی خبر گیری کرتے رہے۔ خیمہ سے باہر ہمارے آدمی آگ کے الاؤ کے پاس بیٹھے اس دیو قامت حیوان کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ آخر کو متسو کے اس بیان پر سب نے اتفاق کیا کہ اس کا تعلق کشتی گروں کی اُس عجیب و غریب قدیم نسل سے ہے۔ جو پہاڑوں کے اُس پار بعض جنگلی علاقوں میں آباد ہے۔ وہاں کے باشندے بالعموم عظیم الجسامت اور عادات و اطوار میں بالکل وحشی ہوتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات اُن میں سے بھی کوئی فرد اپنی فوق العادت وحشیانہ زندگی میں اتنی سبقت لے جاتا ہے کہ دوسرے لوگ اُس کی تند خوئی کے باعث اُسے آبادی میں رہنے کے قابل نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگ جب قید یا موت سے بچنا چاہیں تو تنہا بھاگ کر پہاڑوں کی طرف نکل آتے ہیں۔ اُن کی خونخواری کے خوف سے کوئی شخص اُن کا ساتھ دینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

پو پھٹ رہی تھی جب مجھ پہ کچھ غنودگی طاری تھی۔ اور باقی سب لوگ سو رہے تھے۔ اُس وقت میری دفعتًہ اُٹھ بیٹھی اور میری طرف درد انگیز نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اُس کی نظروں میں وحشت اور اُس کی آنکھوں میں دیوانوں کی سی چمک نظر آتی تھی۔ پھر کچھ دیر تک وہ کھانستی رہی۔ اس کے بعد اُس کے مُنہ سے ذرا سا خون نکلا اور دوبارہ بستر پہ گر کر وہ ہمیشہ کی نیند سو گئی"۔

گجردم ہم نے اس کی ارتھی بنائی اور اُسے اُٹھا کر دو دن تک پتھریلے پہاڑی راستوں پر چلتے رہے۔ آخر یوہوٹو کے گرم چشموں کے پاس ٹھہر کر ہم نے ایک دن آرام کیا۔ اور پھر دوبارہ اُس کو اُٹھا کر جنگل میں اُسی مندر کی طرف اُس کے آخری مسکن کو روانہ ہوئے جہاں میں نے پہلے پہل اُس کی وہ یاس انگیز پکار سنی تھی جس کی طرف کوئی ملتفت نہ ہُوا تھا۔ اب وہیں مندر کے قریب ایک بڑے درخت کے نیچے اُس کی قبر نظر آتی ہے جس کی لوح پہ میری کا لفظ کندہ ہے"۔

رقاصہ

اندھیری رات تھی۔ بادل گرج رہے تھے جسم کو سُن کر دینے والی سرد ہوا چل رہی تھی۔ مینہ موسلا دھار برس رہا تھا پہاڑ کے دامن میں ایک گھنا اور مہیب جنگل تھا۔ اور اس میں ایک راستہ بھُولا ہوُا نوجوان مسافر۔ مصوری کا شوق اُسے کشاں کشاں جاپان کے دارالسلطنت ٹوکیو کی طرف لے جا رہا تھا۔

درماندہ مسافر نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی کہ اگر کوئی جھونپڑی وغیرہ نظر آئے تو اس طوفانِ باد و باراں سے بچنے کا کوئی سامان پیدا ہو لیکن چاروں طرف مایوسی مُنہ کھولے کھڑی تھی۔

مایوس مسافر نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ راستے میں کئی جگہ وہ پھسلا۔ کئی جگہ اُس نے نوکدار پتھروں سے ٹھوکریں کھائیں۔ کئی جگہ گرتے ہوئے درخت کے نیچے دب جانے سے بال بال بچا۔ کئی جگہ وہ خار دار جھاڑیوں میں اُلجھا۔ مگر اس نے دامنِ ہمت کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر پھر ایک دفعہ اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن ایک دفعہ پھر اُسے نا اُمیدی کا سامنا کرنا پڑا۔ مصیبت زدہ نوجوان کو ہر لمحے یقین ہونے لگا کہ آج کی رات آخری رات ہوگی۔ اس کے بعد موت ——— بیکسی کی موت۔

اُس نے دو زانو ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ دل میں ایک اطمینان سا پیدا ہو گیا۔ وہ خاموش تھا۔ یکایک تمام عالم پر سکوت چھا گیا۔ تیز ہوا رُک گئی۔ اور اُس کی جگہ ہلکی، عطر بیز اور نرم ہوا نے لے لی۔ بارش تھم گئی، بادل چھٹ گئے۔ اور آسمان پر خوبصورت چاند نمودار ہوا۔

مسافر کے دل میں پھر ایک دفعہ اُمید کی کرن پیدا ہوئی۔ اس نے سر اُٹھا کر نیچے وادی کی طرف دیکھا۔ دُور کسی جھونپڑی میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مدھم سی روشنی اُسے نظر پڑی۔ اُس کا دل بَلّیوں اچھلنے لگا۔ وہ اپنے آپ میں ایک نئی طاقت محسوس کرنے لگا۔ وہ اُٹھا اور چراغ کی سیدھ میں چل کھڑا ہوا۔

لڑکھڑاتا ہوا نوجوان جھونپڑی کے دروازے کے پاس پہنچا۔ اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک خوش آیند نسوانی آواز سنائی دی "کون ہے؟"

"میں ایک تھکا ماندہ مسافر ہوں۔ اگر مضائقہ نہ ہو تو کسی کونے میں رات بسر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں"۔

اسی وقت ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی۔ اور کسی نے مسافر کی شکل و شباہت، حالت اور اس کی سچائی کا جائزہ لینے کے لئے باہر جھانکا تھوڑی

دیر کے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔

"تشریف لے آیئے۔ خوش آمدید" وہی سریلی آواز آئی۔

مسافر نے قدم بڑھائے۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ اس کی میزبان ایک نہایت حسین پری وش لڑکی تھی۔

نوجوان آداب بجا لایا۔

"میں یہاں بالکل اکیلی ہوں۔ میرے پاس صرف ایک چارپائی اور بستر ہے۔ آپ اس پہ آرام فرمایئے۔ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ کیونکہ رات کا بیشتر حصہ میں آنکھوں میں کاٹتی ہوں۔ میں ابھی آپ کے لئے کھانا تیار کر کے لاتی ہوں۔"

یہ کہکر وہ چلی گئی۔ نوجوان حیران تھا کہ اتنی حسین لڑکی اور اس ہیبت جنگل میں یکہ و تنہا، یہ کیا راز تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اتنے میں لڑکی اُس کے لئے کھانا لے آئی۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے بھی یہی سوچتا رہا کہ اس لڑکی کے یہاں رہنے میں کیا راز ہے۔ کھانے کے بعد اپنی حسین میزبان کی درخواست پر وہ بستر پہ جا لیٹا۔ اتنی تکان کے بعد اُسے نیند آ جانی چاہیے تھی۔ لیکن نہ آئی۔ وہ اس عقدے کے حل کی فکر میں تھا۔ آخر بہت دیر کے بعد اُس پہ نیم مدہوشی کی سی حالت طاری ہونے لگی تھکان اپنا کام کرنے لگی۔ اور وہ سو گیا۔

کتنی دیر وہ سوتا رہا؟ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ایک عجیب سی آواز سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ اٹھ کر چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ اس

کے سو جانے کے بعد ایک پردہ اُس کے سرہانے کی طرف لٹکا دیا گیا تھا۔ آواز اُسی پردے کے پیچھے سے آتی تھی۔ اس خیال سے کہ شاید جھونپڑی میں کوئی چور گھس آیا ہو۔ اُس نے جھونپڑی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ پردے کی طرف بڑھا۔ اور جھونپڑی کے دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے ایک ایسا نظارہ دیکھا جس نے اُس کو حیرت سے نقش بہ دیوار بنا دیا۔

اس کے سامنے مہاتما بدھ کا ایک بُت تھا۔ بُت کے پاس ایک خوبصورت نوجوان کی تصویر تھی۔ ان دونوں پر رنگا رنگ کے جنگلی پھولوں کے ہار پڑے تھے۔ اور حسینہ وجد کے عالم میں ان دونوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔ وہ رقص کر رہی تھی اور مسافر اُس کا رقص دیکھنے میں محو ——— دونوں دُنیا جہان سے بے خبر نظر آتے تھے۔

بے خودی کے اس دوران میں حسین رقاصہ کی نظر مسافر کے مدہوش چہرے پر پڑی۔ اُس نے ناچنا بند کر دیا۔ پہلے تو اُس کی خوبصورت پیشانی پر غصے کے آثار پیدا ہوئے۔ لیکن فوراً ہی اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"میں اپنی اِس غلطی کے لئے آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ اور میں سخت نادم ہوں کہ آپ کی نیند میں مخل ہوئی۔"

نوجوان چونکا ——— جیسے ایک حسین خواب سے۔ اُس نے پشیمانی سے کہا۔ "میں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ کی تنہائی میں خلل انداز ہوا۔

لیکن گستاخی معاف۔ آپ ایک بے مثل رقاصہ ہیں۔ آپ کے رہنے کے لئے یہ جھونپڑی کس طرح موزوں معلوم نہیں ہوتی۔ آپ . . . ."

"ہاں میں ایک رقاصہ تھی۔ تمام ٹوکیو میں مشہور۔ شہنشاہ اور بڑے بڑے امیروں کی مجلسوں میں میں رقص کیا کرتی تھی۔ مگر . . . ."

وہ رُک گئی۔ اور اس کا سر کسی نامعلوم غم کے بار سے جھک گیا۔

نوجوان نے ذرا اضطراب سے پوچھا "مگر؟"

پری پیکر رقاصہ نے اشکوں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو اُوپر اُٹھایا۔

"آپ میری کہانی سننا چاہتے ہیں چلئے دوسرے کمرے میں۔ وہاں میں آپ کو سناؤں گی۔ اپنی کہانی"۔

دونوں چارپائی والے کمرے کی طرف بڑھے۔ نوجوان مسافر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ خوبصورت رقاصہ جھونپڑی کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ رقاصہ نے کہنا شروع کیا "یہ کوئی دو سال کا قصہ ہے۔ ٹوکیو میں میرے ناچنے کی دھوم مچی تھی۔ نواب اور امیر مجھے اپنی محفلوں میں بلاتے اور فخر کرتے تھے۔ اچانک میری اس دنیا میں ایک نوجوان نے قدم رکھا وہ میرے ناچ پر بے خود ہو جاتا تھا۔ اُس نے میرے مکان پر آنا شروع کیا۔ یہ ہماری دوستی کی ابتدا تھی۔ رفتہ رفتہ آشنائی نے محبت کا رنگ اختیار کیا۔ ہمیں ایک دوسرے سے ایک ایک لمحہ کی جدائی شاق گزرنے لگی۔ پھر —— ہم نے ماں باپ کی مخالفت پر بھی شادی کر لی۔ اور ایک سال ہم دونوں تمام دُنیا کو بھول کر خوش رہے۔ لیکن ایک سال

کے بعد.... "رنج سے اُس کی آواز بند ہو گئی۔

اِس کے بعد اُس نے غمناک آواز میں کہا "موت کے بے رحم ہاتھوں نے اُس کو مجھ سے چھین لیا۔ وہ میرے ناچ کا شیدا تھا۔ اس لئے میں اب بھی ہر شب اُس کی تصویر کے سامنے اچھی سے اچھی ناچنے کی پوشاک پہن کر رقص کرتی ہوں۔ تاکہ اُس کی رُوح کو خوشی حاصل ہو جس طرح وہ یہاں مجھے ناچتا دیکھ کر خوش ہؤا کرتا تھا۔ اُسی طرح وہاں بھی وہ خوش ہو"۔

نوجوان مبہوت بنا اُس کی دردناک کہانی سُن رہا تھا۔ انجام پر اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

رقّاصہ نے آنسوؤں کو دیکھ کر کہا۔ "مجھے معاف کیجئے کہ میں نے آپ کو رنج پہنچایا ہے"۔

نوجوان خاموش تھا۔ اور اُس کی نظر حسین رقاصہ کے حسرت زدہ چہرے پر جمی تھی۔

(۲)

اِس واقعہ کو چالیس سال کا عرصہ گزر گیا۔

مصوّر اپنے عالی شان قصر کے نگار خانے میں بیٹھا ہؤا کسی بلند پایہ رئیس کی تصویر بنانے میں محو تھا۔ جاپان میں ہر طرف اس کی مصوّری کا چرچا تھا۔ بڑے بڑے رئیس گراں بہا معاوضہ دے کر اُس سے اپنی تصویر کھنچوایا کرتے تھے۔ ٹوکیو کے تمام مشہور اخبار اُس کی مصوّری کے گُن گاتے تھے ——— ایک خادم نے آ کر اطلاع دی۔ "ایک بُڑھیا

کوئی تین چار روز سے یہاں آتی ہے۔ اور حضور سے ملاقات کی خواہاں ہے ہم ہر روز اُسے ٹالتے رہے۔ مگر آج یہی مناسب سمجھا کہ جناب کو اطلاع کر دی جائے۔ وہ پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ہے۔ اور بے حد غریب معلوم ہوتی ہے۔"

مصوّر نے غصّے میں کہا "میں تم لوگوں کو اس لئے اپنے دروازے پر کھڑا نہیں رکھتا کہ خونخوار کتوں کی طرح کسی غریب کو میرے پاس پھٹکنے ہی نہ دو۔ جاؤ فوراً اُس غریب بڑھیا کو میرے پاس لاؤ۔"

خدمتگار کچھ عرصے کے بعد بڑھیا کو ساتھ لے کر واپس آ گیا۔ مصوّر نے نہایت عزت کے ساتھ اُسے کوچ پر بٹھایا۔ اور اُس سے ملاقات کی غرض دریافت کی۔ بڑھیا نے اُس کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور کہا "میں اپنی تصویر بنوانا چاہتی ہوں۔ بڑھاپے کی نہیں بلکہ جوانی کی۔ اُس وقت میں حسین تھی"۔

مصوّر نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"اُس زمانے کی ایک پوشاک میرے پاس رہ گئی ہے جسے پہن کر ایک خاص طرز میں کھڑی ہو کر میں یہ تصویر کھنچوانا چاہتی ہوں۔ آپ کو معاوضہ دینے کے لئے میرے پاس سوائے اس پوشاک کے اور کچھ نہیں۔ تصویر کھنچوانے کے بعد یہی میں آپ کی نذر کر سکتی ہوں۔ یہ پرانی وضع کا لباس شاید ایک اعجوبے کے طور پر آپ رکھنا پسند کریں۔"

بڑھیا نے پوشاک نکالی۔

مصوّر نے حیرت سے پوچھا "ہیں آپ؟"

بڑھیا نے گھبرا کر جواب دیا "ہیں"

مصوّر نے سوال کیا "کیا آپ نے مجھے پہچان لیا ہے۔ کیا آپ اُس درماندہ مسافر کو بھول گئیں جس نے ایک دفعہ آپ کے ہاں رات بسر کی تھی"

بڑھیا نے کہا "قدرت نے میری رہنمائی کی ہے کہ میں آپ تک پہنچ گئی ہوں۔ آپ نے اُس رات مجھے ناچتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اُسی وقت کی اور ویسی ہی میری تصویر کھینچ دیجئے"

"ہاں ضرور! آپ کہاں رہتی ہیں؟"

"یہ میں نہیں بتانا چاہتی۔ میرے رہنے کی جگہ اس قابل نہیں کہ آپ سے اس کا ذکر کروں"

چند دن میں مصوّر نے اُس کی مرضی کے مطابق اُس کی تصویر بنا دی۔ یعنی اس وقت کی جب وہ حسین تھی۔ تصویر میں مصوّر نے اُس کو کچھ اس خوبی سے ناچنے کی حالت میں دکھایا کہ تصویر پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ یہ مصوّر کی بہترین تصویر تھی۔

بڑھیا نے تصویر لے کر مصوّر کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنی پوشاک اُس کے حوالے کر دی۔

"نہیں، میں یہ نہیں لونگا۔ اسے آپ اپنے پاس رکھئے"

"یہ اب میرے کسی کام کی نہیں۔ ایک پرانی یادگار کے طور پر میری

خاطر رکھ لیجئے"۔۔۔ رقاصہ چلی گئی۔

مصوّر نے ایک نوکر اُس کے پیچھے روانہ کیا کہ چُپ چاپ اُس کے رہنے کی جگہ معلوم کرے۔ نوکر نے آکر کہا کہ وہ شہر کے باہر فقیروں اور گداگروں کے محلّے میں ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں رہتی ہے۔ مصوّر نے دوسرے دن گھوڑا گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور اپنے ساتھ کپڑے تحائف اور روپے لے کر اُس کی جھونپڑی میں پہنچا تاکہ اُس کی بقیہ زندگی کے آرام سے گذرنے کا سامان کر دے۔

جھونپڑی پر بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آواز دینے پر جب کسی نے جواب نہ دیا تو وہ اندر داخل ہوا۔ بدھ کے بُت اور نوجوان کی تصویر کے سامنے مصوّر کی تازہ بنائی ہوئی تصویر آویزاں تھی۔ اور بڑھیا چارپائی پر ہمیشہ کی نیند سو چکی تھی۔ اب وہ خود اپنے محبوب کی رُوح کو اپنے رقص سے خوش کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ اور اپنے بجائے اپنی نوجوانی کی تصویر چھوڑ گئی تھی۔

چین!

(۱)

قربانی ۔ مصنفہ چنگ ۔ مترجمہ آفتاب شروانی بی اے

(۲)

مینارِ غزالال :۔ مترجمہ ظفر قریشی بی اے

قربانی

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تمہیں چینی جنرل شبانگ کے صدر مقام پر جا کر جاسوسی کے فرائض سرانجام دینا ہوں گے۔ ہماری فوجیں ترشانگ کو فتح کر کے ہشادی کا رُخ کریں گی۔ اور کرنل اسوگی تمہاری خفیہ اطلاعات پر اپنی فوجوں کو نقل و حرکت دے گا۔ تمہاری کامیابی پہ ان پچاس ہزار غریب الوطن جاپانی سورماؤں کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ جو مادرِ وطن کی نئی فتوحات کا وعدہ دے کر آئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جاپان تم سے قربانی چاہتا ہے۔ قیمتی قربانی۔ جاپانی افواج میں مایوسیوں اور ناکامیوں کے لئے جگہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ہاں سنو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہیں اس دفتر سے کسی قسم کی مدد کی توقع نہیں رکھنا چاہئے۔ جو کچھ کرو اپنی ہمت کے بل بوتے پر۔"

بڈھے جاپانی جنرل کا یہ حکم کپتان نگاگی نے نہایت خاموشی سے جذبات کی ایک عجیب کشمکش میں سُنا اور سلام کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر آ کر اُس نے پتھر کی اس عمارت کی طرف دیکھا جس پہ جاپان کا شاہی جھنڈا طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کے نشان کو لئے ہوئے چاندنی میں لہرا رہا تھا۔ نگاگی

اس جھنڈے کو دیکھ کر بے اختیار مسکرا دیا۔ اُس کے دماغ میں اُن دنوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ جب اُس نے اس جھنڈے تلے چین کے وسیع میدانوں میں کتنی بار موت کے کھیل کھیلے تھے۔

نگائی پیدائشی سپاہی تھا...... موت کی بازی لگانے والا سُورما سپاہی، پُرسکون زندگی سے اُسے نفرت تھی۔ وہ ہر وقت ایک ہنگامہ چاہتا تھا جس کا ہیرو وہ خود ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہت جلد ترقی کی منازل طے کر کے کپتان کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ اور اب جاسوسی جیسی اہم اور خطرناک خدمت اُس کے سپرد کی جا رہی تھی۔ اب وہ کتنا خوش تھا اس کی مُدت سے بے قرار رُوح کس قدر تسکین محسوس کر رہی تھی۔ تسکین رُوح کے علاوہ خدمتِ وطن اور اس سے زیادہ "پاؤلین" کی نظروں میں مزید وقعت پیدا کرنے کا سنہری موقع۔ نگائی دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اُسے جاسوسی کی خدمت نہیں ملی تھی۔ بادشاہت مل گئی تھی۔ ہنگامہ، وطن، پاؤلین...... نگائی جوشِ مسرت سے دیوانہ سا ہو کر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔۔

... پاؤلین سے ملاقات کے لئے ٹینٹسن کی ملکہ جمال، چین کی حسین ترین تحفہ پاؤلین کے آستانے پر جبہ سائی کے لئے۔

یہ حقیقت کہ اُس کی محبوبہ چینی تھی نگائی کے لئے لایعنی سی بات تھی۔ اگر اُس کا دل چیرا جا سکتا تو شاید اُس کے ہر گوشے پر پاؤلین ہی کندہ نظر آتا۔ کیا اجتماعِ ضدین ہے۔ جاپان کا ایک نڈر سپاہی، ماہر جاسوس، چینیوں کے خون سے ہولی کھیلنے والا بانکا سورما۔ کتنے کو چینی پر ترجیح دیتے والا انسان

ایک چینی رقاصہ کا اسیر زلف۔ نگائی ایک جھرجھری لے کر چونکا لیکن پھر کھو گیا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ تو دل کا معاملہ ہے چینیوں کو قتل کرنا خدمت وطن ہے۔ اور پاؤلین سے پیار خدمت دل۔ اور پھر چینیوں پر ظلم بھی کہاں ہو رہا ہے۔ وہ بیوقوف ہیں جو ایسا خیال کرتے ہیں۔ اُسے سرکاری طور پر جو پمفلٹ پڑھنے کے لئے ملا تھا اس میں تو یہ صاف طور پر لکھا ہوا تھا۔ کہ جاپان چین سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ . . . کیا عجیب فلسفہ ہے۔ خون بہا کر دوستی حاصل کرنا۔ نگائی پھر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ . . . مگر یہ باتیں اس کے سمجھنے کے لئے نہیں۔ یہ تو وزیروں اور کمانڈ والوں کا حصہ ہیں۔ اسکول میں بھی تو ماسٹر صاحب نے اُسے کسی بڑے آدمی کا یہ قول سمجھایا تھا کہ ہر ایک شخص کے لئے ایک مخصوص شاہراہ ہوتی ہے۔ اُسے اسی پر چلنا چاہئے خواہ مخواہ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے والا کچھ نہیں حاصل کر سکتا۔ بس اس کے لئے بھی ایک شاہراہ ہے۔ . . . جنگ، ہنگامہ، خون کی ہولی وطن اور پھر آخر میں پاؤلین، نگائی نے اطمینان کا سانس لیا۔ شاید ارسطو نے منطق کا پیچیدہ ترین مسئلہ حل کرنے پر بھی وہ مسرّت محسوس نہ کی ہوگی۔ جو نگائی کو من مانے دلائل سے جنگ کے متعلق اپنا نظریہ قائم کر کے اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کر لے پر محسوس ہوئی۔

سنیچر کی شب۔ دوسرے دن اتوار۔ کیسا طمانیت بخش تصور ہے۔ یہ تو اس کے دل سے پوچھنا چاہئے۔ جو ہفتہ بھر گدھوں کے بیل کی طرح کام کرتے

کرتے ادھ مُوا سا ہو گیا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ٹینسٹن کی ہاچا کلب میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہفتہ بھر کے کام سے تھکے ماندے اس میں اس طرح جمع ہو رہے تھے جس طرح شمع کے گرد پروانے، کہ اطمینان کی ان چند میسّر شدہ ساعتوں کو صراحی کی قلقل، جاموں کی کھنکھناہٹ اور موسیقی کی تانوں پہ قربان کر کے کچھ عرصے کے لیئے دُنیا وما فیہا سے بے نیاز ہو جائیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹینسٹن میں جنگ ہو رہی تھی۔ لیکن شہر کے دروازوں کے باہر ہاچا کلب تو جنگ کے ہول کا تریاق فراہم کر رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نگائی کلب میں داخل ہوا۔ پاؤلین نے اُسے اور اُس نے پاؤلین کو دیکھا۔ دونوں طرف سے ہلکی سی مسکراہٹ پھر شوق اور شوخی۔ نیازمندی اور بے نیازی۔ عشق اور حسن میں کشمکش اس کے بعد قہقہہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نگائی اور پاؤلین باتیں کرنے لگے:۔

"تو تم جا رہے ہو؟"

"ہاں"

"کب؟"

"کل"

"کب واپس ہوں گے؟

"چند دنوں میں"

"چند دنوں میں"۔ پاؤلین نے نگائی کے فقرے کو دُہراتے ہوئے کہا خون کی ہولی کھیلنے کے چند دنوں بعد۔ لیکن تم جاؤ ہی کیوں؟ کیا تمہاری

فوج میں کوئی اور نہیں جو تمہاری جگہ بھیجا جا سکے؟ ۔۔۔۔۔ آخر یہ ہولناک کشت و خون کب بند ہوگا؟"

"چھوڑو اس قصے کو پاؤلین ۔ تمہیں جنگ سے کیا واسطہ ۔ دیکھو اطمینان کی ان چند ساعتوں کو اِدھر اُدھر کے بکھیڑوں میں ضائع نہ کرو ۔ مَیں جلد ہی واپس آجاؤنگا ۔ کیا مَیں پہلے واپس نہیں آیا ۔ یہ جنگ تو کیا ایسی ہزاروں جنگیں مجھے تمہاری محبت سے دست بردار نہیں کرا سکتیں ۔۔۔۔۔ ۔۔۔ ارے یہ آنسو کیسے ؟

پاؤلین کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے ڈھلک کر اُس کے دامن پر گر پڑے ۔ اور اُس نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا: ایسی ہزاروں کیا لاکھوں جنگیں بیشک تمہیں میری محبت سے دست بردار نہیں کرا سکتیں ۔ لیکن کیا تمہیں معلوم ہے نگائی ۔ کہ ایک بُزدل سے بُزدل چینی کی گولی تمہیں قبرستان کا مہمان بنا سکتی ہے؟"

"گولی اور وہ بھی چینی بُزدل کی!" نگائی نے تحقیر آمیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا: "مَیں کسی چینی کے ہاتھ سے مرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا ۔ پاؤلین ، مجھے زندہ رہنا ہے اور زندہ رہوں گا ۔" پھر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے پاؤلین کی ایک چھوٹی سی تصویر نکال کر "دیکھو جب تک تمہاری یہ تصویر میری حرزِ جان ہے ۔ مَیں گولیوں کے طوفان سے بھی صحیح و سالم واپس آؤنگا ۔ اس میں طلسم ہے ۔"

"دوسرے الفاظ میں میرے وطن کی بے عزتی اور میرے دل کی بربادی

گے لئے"۔

نگاٹی کے تیور بدل گئے۔ اور اُس نے اپنے لہجے میں درشتی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "غداری وطن اور فرض کی کوتاہی کے علاوہ بے عزتی اور بربادی لایعنی باتیں ہیں"۔ پھر کچھ چونک کر "مجھے معاف کرنا پاؤلین میری درشتی سے تمہارے دل کو ضرور دُکھ ہُوا ہوگا۔ اگر سچ پوچھو تو اس وسیع سیاسی بساط پر میری حقیقت ہی کیا ہے؟ ایک بے بس پیادہ سی جس کی چال شاطر کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مجھ سے یہ پوچھنا کہ مجھے کہاں اور کیوں رکھا جائے گا۔ میرے نزدیک فضول سی بات ہے۔ اس کی ذمہ دار قدرت اور اس کے بعد سیاسی شاطر ہیں۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں بلا پس و پیش ان کے احکام بجا لاتا رہوں۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر کسی نے کچھ کیا ہوتا تو شاید میرے لئے بھی ممکن ہو سکتا"۔

پاؤلین وحشت زدہ ہرنی کی طرح نگاٹی کو دیکھ رہی تھی۔ نگاٹی کے یہ الفاظ آبشار کی سی تندی کے ساتھ اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ "غداری وطن اور فرض میں کوتاہی کے علاوہ بے عزتی اور بربادی لایعنی باتیں ہیں"۔

"پاؤلین! نگاٹی چلایا۔

پاؤلین "ہوں" کہہ کر پھر خاموش ہوگئی۔

طاقتوروں اور کمزوروں کی جنگ ...... گولیوں کی سنسناہٹ گولوں اور بموں کی گرج، دھوئیں کے اُٹھتے ہوئے بادل۔ آگ کی بارش خون کی ندیاں، مجروحین کی چیخ پکار، کمزوروں کا طاقتوروں کے خلاف

دانت پیس پیس کر لڑتا اور بے بسی کے عالم میں اُن کی پسپائی۔ طاقتوروں کی طرف سے تعاقب اور پھر فاتحانہ داخلہ، بیواؤں کی ہچکیاں، بچوں کے نالے اور ضعیفوں کی آہیں، مفتوحین کا اپنے گھروں پر فاتحین کو قابض ہوتے دیکھ کر اشک آلود آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھنا اور خون آلود آہیں کھینچ کر نگاہیں نیچی کر لینا۔ پاؤلین اپنے تصور میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی...... اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"تمہیں کیا ہو گیا پاؤلین؟" نگائی نے اُسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں" پاؤلین نے اپنے خواب سے بیدار ہوتے ہوئے جواب دیا

"تمہاری جدائی کا تصور بہت الم انگیز ہے۔ اچھا تو تم کہاں جا رہے ہو؟"

"کیوں؟"

"یونہی پوچھتی ہوں"۔

"یہ تو راز ہے"۔

"تو مت بتاؤ"۔

"اچھا تو میں اجازت چاہتا ہوں۔ اب تم آرام کرو۔ تمہاری طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے۔ اچھا رخصت"۔

کرنل اسوگی نے ترشانگ کے چھوٹے سے شہر کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ اسوگی کا اردلی خیمے میں ڈاک لئے ہوئے داخل ہوا۔ اسوگی نے پہلا، دوسرا، اور پھر تیسرا خط کھولا۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آ

رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ آخر غصّے سے مغلوب ہو کر اُس نے بقایا خطوط دیکھے بغیر ڈاک کا پلندہ اردلی کے مُنہ پر دے مارا۔ "نالائق، بُزدل، لینی میں یہ اُس کی دوسری شکست ہے۔ ہماری ہائی کمانڈ بھی کیا عجیب ہے۔ پورے کا پُورا ڈویژن ایک چھوکرے کے سپرد کر دیا۔"

آسوگی کے غصّے سے خوفزدہ ہو کر اُس کا اردلی آہستہ آہستہ دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔

"میجر سکائی کو بھیجو۔" آسوگی نے اپنے اردلی سے عین اُس وقت جب کہ وہ دروازے سے نکل ہی رہا تھا۔ کڑک کر کہا۔

چند منٹ کے بعد ایک بال بچا فوجی افسر سر کے گرد خون آلود پٹی باندھے خیمے میں داخل ہوا۔

"اٹگائی پھر ناکام ہوا۔" آسوگی آنے والے کی طرف دیکھے بغیر چلّایا۔ جانتے ہو کیوں؟"

"نہیں" میجر سکائی نے خون کی ایک باریک سی لکیر اپنی پیشانی سے پونچھتے ہوئے جواب دیا۔"

"عقلمند آدمی" آسوگی پھر چلّایا۔ "مجھ پر دُہری مصیبت پڑ گئی ہے۔ ترشانگ کے بعد مجھے ہشاؤ کی طرف ہی پیشقدمی نہ کرنا ہو گی۔ بلکہ اس چھوکرے کو کمک بھی پہنچانا ہو گی۔ لینی کو ہم یوں نہیں چھوڑ سکتے۔ تم ترشانگ پر حملہ کے لئے فوجوں کو تیاری کا حکم دے دو۔ میں سورج غروب ہونے سے قبل اس شہر کی بلند ترین عمارت پر جاپانی جھنڈا لہراتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں

میجر سکائی خاموش کھڑا اسوگی کو دیکھ رہا تھا۔

"تم کھڑے کیوں ہو؟ جاؤ۔"

"میں ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔" سکائی نے جواب دیا۔

"کیا"

"ہمارے لئے بہتر یہی ہو گا کہ ہم لینی پر قابض ہونے کے بعد ترشانگ اور پھر ہشاؤ پر حملے کی سوچیں۔"

"کیا خوب۔" اسوگی بولا۔ "تو تم چاہتے ہو کہ میں ان رکشا ڈرائیوروں کے سامنے سے ہٹ جاؤں؟ ...... چھ ...... یہ نہیں ہو سکتا۔ بس تم جاؤ اور فوراً ترشانگ پر حملہ کی تیاری کا حکم دے دو۔"

اردلی پھر ڈاک لئے ہوئے داخل ہوا۔ اسوگی ڈاک پر اس طرح جھپٹا جس طرح کبوتر پر شاہین ...... اس نے بے قراری کے عالم میں پہلا خط کھولا۔ اور پڑھنے کے بعد ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا "آخر کار وہ ہشاؤ پہنچ گیا۔"

"کون"

"کپتان نگائی۔ یہ اسی کا خط ہے وہ لکھتا ہے کہ ہمیں فوری کوچ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ شام تک وہ مزید اطلاعات بھیجے گا۔"

"تو کیا ہم نگائی کی طرف سے کوئی خبر آنے تک ترشانگ کا حملہ ملتوی کر دیں؟" میجر سکائی نے پوچھا۔

"نہیں۔ ترشانگ پر آج ہی جاپانی جھنڈا لہرائے گا۔" اسوگی نے زمین

پر پاؤں مارتے ہوئے جواب دیا۔

پشاؤ میں چینی جنرل کے صدر مقام کے ایک بند کمرے میں مشاورتی جلسہ ہو رہا تھا۔ باہر دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ .... سنگینوں کا پہرہ۔ ایک بے ضرر سا چینی پیلے رنگ کا ایک لفافہ لئے ہوئے نہ معلوم کہاں سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ...... محافظوں نے سنگینیں تان لیں۔

"تم کون ہو؟" آخر ایک نے سنبھل کر پوچھا۔

"میں چین چینی وائرلیس کے محکمے کا ایلچی"۔

"ہم نے تمہیں پہلے تو نہیں دیکھا۔ پوشانی کہاں ہے؟"

"مجھے اسی کی بجائے بھیجا گیا ہے۔ وہ بیمار ہے ...... تو کیا تم مجھے اس وقت تک روکے رکھو گے جب تک دوسرا چینی ہرکارہ ترشانگ پر دشمنوں کے قبضے کی خبر نہ لے آئے؟"

محافظ دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے۔

بوڑھا چینی جنرل شی یانگ اپنی باریک اور لمبی سی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے چپٹی ناک کے نتھنے پھیلائے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے اپنے ماتحتوں کی طرف مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا " لینی میں ہماری یہ دوسری فتح ہے جس سے جاپانی بھیڑیئے بھونچکے سے ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف جنرل چی ترشانگ کو مضبوطی سے سنبھالے ہوئے ہے۔ اور دشمن کے

شدید ترین ہوائی اور بری حملوں کے باوجود اُس نے ہمت نہیں ہاری۔ جہاں جنرل "وانگ" اور "کاہن" نے پیش قدمی کر کے اسوگی کو محصور کر لیا۔ ہماری فتح یقینی ہو جائے گی۔ کیا اچھا ہو کہ اسوگی اٹھگائی کو کمک بھیجکر اپنی قوت تقسیم کر دے۔ ورنہ ...."

دروازہ کھلا۔ بڈھا جنرل خاموش ہو گیا۔ چوچین نے آہستہ آہستہ قدم بڑھا کر وہ لفافہ بڈھے جنرل کے ہاتھ میں دے دیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ بڈھے جنرل نے جلدی جلدی لفافہ کھولا۔ اور مضطرب سا ہو کر اُسے پڑھنے لگا۔ اس دوران میں اُس کا سکونِ قلب رخصت ہو چکا تھا۔ اُس کی بھنوؤں میں کھچاوٹ، پیشانی پر بل، آنکھوں میں سُرخی، لبوں پر تحقیر آمیز ہنسی اور انگلیوں میں غیر معمولی حرکت پیدا ہو گئی تھی۔

"جنرل چی کی طرف سے ایک پیغام" بڈھے جنرل نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا "ترشانگ پر جاپانیوں نے زبردست محاذ قائم کر دیا ہے۔ چی ہمارے احکام کا منتظر ہے۔ پیچھے ہٹ جائے یا مقابلہ کرے"۔

کمرے میں بدستور خاموشی تھی۔ بڈھا جنرل سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ عرصہ سوچنے کے بعد دیوار پر لٹکے ہوئے نقشے کی طرف گیا۔ اُسے دیکھ کر واپس آیا۔ اور پرش سے کچھ لکھ کر چوچین کے حوالے کرنے کے بعد حاضرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "اگر ہمارے دونوں جنرل چی کی مدد کو پہنچ گئے تو جاپانی ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ کیا عجب کہ ہمارے یہ داؤ پیچ ترشانگ ہی میں چین کی قسمت کا پانسہ پلٹ دیں۔ میں نے چی کو ہدایت کر دی ہے۔

کہ وہ کمک پہنچنے کے انتظار میں پیچھے ہٹنے کی بجائے جاپانیوں کو اُلجھائے رکھے۔"

چوچین چینی جنرل کا خط لے کر پیچ در پیچ گلیوں میں سے ہوتا ہوا ایک چھوٹی سی تاریک جھونپڑی میں داخل ہوا۔ اور ایک پتلی سی موم بتی جلا کر اُس کی پیلی پیلی، بھیگی بھیگی، بے نور سی روشنی میں اس خط پر کچھ لکھنے بیٹھ گیا۔ جھونپڑی کا ساز و سامان ایک ٹوٹی ہوئی میز، ایک شکستہ سی کرسی اور اسی قسم کی ایک چارپائی پر مشتمل تھا ...... چارپائی پر ایک لاش پڑی تھی، ایک میلی چادر میں لپٹی ہوئی۔

ٹھنڈی ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے نے چوچین کو چونکا دیا۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا تو دروازے میں ایک سپاہی اُس کی طرف پستول تانے کھڑا تھا ایک آدھ منٹ تک تو چوچین پر سکتہ کا عالم طاری رہا۔ اور وہ اس سپاہی اور اُس کے پستول کی طرف تکتے رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکا ......

پھر اُس کے دائیں ہاتھ کو معمولی سی حرکت ہوئی۔

"خبردار ..... حرکت مت کرو۔ ورنہ بے گناہ یوشان کے قتل کے انتقام کے لئے میرا پستول دغ جائے گا۔" دروازے میں سے وہ سپاہی چلایا۔

چوچین کا ہاتھ رک گیا اور وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔

"کپتان نگائی! یہ پیغام مجھے دے دو۔ تماشا ختم ہو چکا۔ اس جنگ

میں چین کو فتح ہو گی۔"

"کون ...... پاؤلین .... تم .... اُف"

"ہاں میں"۔ پاؤلین نے جھونپڑی میں بڑھتے ہوئے کہا۔ "وعدہ کرو۔ میری واپسی تک یہاں سے حرکت نہیں کرو گے۔"

نگاتی مسکرا دیا۔ اپنی مخصوص ہنسی۔ خون کی ہولی کھیلنے کی ہنسی۔ "تمہیں یہ پیغام دے دوں۔ اور اضافہ کئے بغیر۔ کیا خوب۔ جاپانی افواج میں ناکام سپاہیوں کے لئے گنجائش نہیں۔ پاؤلین! یہ پیغام حاصل کرنے کے لئے تمہیں مجھے قتل کرنا ہو گا۔ بالکل اس طرح جس طرح میں نے پوشان کو قتل کیا۔"

"تمہیں تو مجھ سے محبت تھی نگاتی؟"

"محبت تو اب بھی ہے۔"

"تو پھر یہ پیغام مجھ کو دے دو۔"

"اس کا تعلق ہماری محبت سے نہیں۔"

"مگر جنگ سے تو ہے۔"

"جنگ اور محبت دو جدا جدا چیزیں ہیں۔ مَیں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مگر تمہاری محبت میرے فرض کی بجا آوری میں مخل نہیں ہو سکتی۔ اس پیغام پر پچاس ہزار غریب الوطن جاپانی سپاہیوں کی زندگی کا دارومدار ہے ..... جاپان کی قسمت کا روشن ستارہ میرے پاس ہو اور مَیں اُسے تمہیں دے دوں۔"

"میری درخواست کو مت ٹھکراؤ ننگائی۔ کہیں محبت کا دیوتا غصے کے بھوت کا جامہ نہ پہن لے۔"

"بچوں کی سی باتیں مت کرو پاؤلین۔ جاؤ۔"

"مَیں کچھ لے کر جاؤں گی۔"

"ناممکن ہے۔"

"غلط"

"میرا راستہ چھوڑ دو پاؤلین۔"

"تم نہیں جا سکتے ننگائی۔ اگر تم جاپان کی قسمت کا ستارہ منوّر دیکھنا چاہتے ہو، تو مَیں چین کا ستارہ کیوں ماند ہونے دُوں؟"

"ضد مت کرو پاؤلین۔"

"چند منٹ تک دونوں پر موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ دو پہلی ساکت وصامت کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ موت کا خوفناک ہتھیار دونوں میں حائل تھا۔ ایک مرد اور ایک عورت میں کشمکش تھی دونوں کے دلوں میں محبت اور خدمتِ وطن کے بادل اُٹھتے تھے۔ اور آپس میں ٹکرا ٹکرا کر غم وغصّہ کی بجلیاں پیدا کر رہے تھے۔ . . . .
اپنی ضد سے کوئی بھی باز نہ آتا تھا۔

پاؤلین کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اُسے ایک طرف ننگائی کے ساتھ عیش ومسرت کی زندگی کا خوبصورت قصر کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اور دوسری طرف تاریکی ہی تاریکی۔ اُس کے کانوں میں ننگائی کے یہ الفاظ بھی گونج رہے

تھے۔ کہ "غداری وطن اور فرض میں کوتاہی کے علاوہ بے عزتی اور تباہی لایعنی باتیں ہیں"۔

نگائی چٹان کی طرح کھڑا تھا۔ اُس کے سامنے اس وقت صرف ایک مقصد تھا۔ ترشانگ کی فتح ...... اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ کوٹ کی جیب کی طرف بڑھنے لگا "خدا کے لئے حرکت مت کرو۔ نگائی" پاؤلین چلائی۔

مگر نگائی نے کچھ نہ سُنا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا پستول باہر نکال لیا ...... اور اُسے تانے آگے بڑھنے لگا۔

"ٹھہرو۔" پاؤلین چلائی "تم دروازے سے باہر نہیں نکل سکتے"۔

"میرا راستہ چھوڑ دو پاؤلین، ترشانگ کی فتح میں تاخیر ہو رہی ہے"۔ نگائی نے تُرش روئی سے جواب دیا۔

ٹھہرو! ترشانگ فتح نہیں ہو سکتا"۔ پاؤلین پھر چلائی۔

نگائی نے اپنا پستول جھکا دیا۔ پھر دانت بھینچ کر اُسے تانا اور آنکھیں بند کر کے اُسے داغ دیا ...... دھمکا دیا ...... پستول کی گولی پاؤلین کے کان کے پاس سے ہوتی ہوئی اُس کے آہنی خود کو توڑ کر نکل گئی ..... نگائی کے چہرے پر ایک وحشیانہ مسکراہٹ آئی۔ مگر ایک ثانیے کے لئے۔ پاؤلین کا پستول جوابًا دغا۔ نگائی کا سینہ چھلنی ہو گیا اور وہ تیورا کر پاؤلین کے قدموں میں گر پڑا۔ "پاؤلین" وہ چلایا اور ٹھنڈا ہو گیا۔

چینی جنرل کا پیغام کسی قسم کے تغیر و تبدل کے بغیر ترشانگ میں جنرل چی تک پہنچ گیا۔ اور اُس نے جاپانی حملوں کو روکے رکھا۔ دونوں چینی جنرل اُس کی مدد کو پہنچ گئے ...... ترشانگ پر جاپانی افواج بُری طرح پسپا ہوئیں۔

چین کو جاپان پر یہ پہلی عظیم الشان فتح نصیب ہوئی تھی ؛۔

ترشانگ کی ایک چھوٹی سی خانقاہ میں ایک پاگل چینی عورت ہے۔ جو اپنی تصویر کو دیکھ کر روتی رہتی ہے ..... تصویر کے عین وسط میں ایک سوراخ ہے ؛۔

بینارِ غزالال

ہمارے قصبے کی ابتدا ۱۱۴۷ء میں ہوتی ہے۔

۱۱۴۷ء میں چین کیا ہو سکتا ہے۔ ذرا اس کا تصور کیجئے۔ الگ تھلگ ایک سنسان نگر بے حد آباد و عظیم الشان آبادی۔ آج کل جو تہذیب چین میں ہم دیکھ رہے ہیں، اُس وقت اس سے کچھ زیادہ ممیز حالت نہ تھی لباس میں، زرہ بکتر و آلاتِ حرب میں، تعمیرات میں، غرض جس چیز میں دیکھیں وہی حالت قائم ہے جو صدیوں پہلے تھی۔ عجائب خانوں میں ہم چین کی حیرت انگیز چیزیں دیکھ کر چین کا جو تصور اپنے دماغ میں پیدا کر سکتے ہیں، بس سمجھ لیجئے کہ ۱۱۴۷ء میں بھی چین ایسا ہی تھا۔

کچھ عرصہ سے ایک قزاق میورو چی نام مملکت میں لوٹ مار کر رہا تھا۔ اور اُس نے اپنی خوفناک ترک تازیوں کا سلسلہ دور و نزدیک پھیلا دیا تھا۔ اُسے پکڑنے کی سب کوششیں بے سود ثابت ہو چکی تھیں اُسے اگر چین کا رابن ہُڈ یا فرضی قصوں کے بہرام کا اوتار سمجھ لیا جائے تو شاید معاملہ پڑھنے والوں کے لئے زیادہ سریع الفہم ہو جائے گا

بس ایک ایسا ہی قزاق جیسے "بہرام" تھا۔

شہنشاہِ وقت اشبوش کو ایک رات محل خاص میں یہ اطلاع ملی کہ ایک نوجوان حسینہ باریابی کی کوشش کر رہی ہے۔ اور قاعدے کے مطابق اسے روکا جا رہا ہے۔ وہ بادشاہ سے کوئی نہایت پُر اسرار بات کہنا چاہتی ہے کوئی خفیہ پیغام ——! اس سے سوالات کئے گئے کہ وہ بادشاہ کے پاس کیوں جانا چاہتی ہے۔ کیا کام ہے۔ دوسرے لوگوں کو وہ کام کیوں نہیں بتاتی وغیرہ۔ مگر اُس نے سب سوالوں کا جواب یہی دیا کہ "میں صرف شہنشاہ کے حضور میں جا کر ہی کہنا چاہتی ہوں۔ مجھے روکو نہیں"۔ اس لڑکی نے اپنا نام طاکی بتایا۔

اس عورت کو آخر کار حاکمِ عدل کے سامنے پیش کیا گیا۔ جسے منترین کہتے تھے۔ منترین نے اس عورت سے بہت سے سوال کئے۔ اور یہ بتایا کہ شہنشاہِ چین سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی معمولی آدمی اُس کے دربار میں بھیجا جائے حاکم کا فرض ہے کہ وہ اس شخص کی اصلیت اور معاملہ کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ لے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا جانا شہنشاہ کے لئے غیر ضروری تھا۔ اور اس نے جا کر کوئی معقول بات نہیں کی۔ تو اس کیلئے عذاب الیم تیار رکھا جاتا ہے۔ اس سے پہلے اُسے تمام عذابوں اور اذیت ناک سزاؤں کا نقشہ آنکھ سے دکھایا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے ارادے سے باز آ جائے۔ ورنہ ان سزاؤں کیلئے تیار رہے۔ دو روز تک طاکی سے سوال جواب ہوتے رہے۔ مگر اس نے بلند ہمتی اور پختہ عزم کے ساتھ

حاکم کے تمام شبہات دُور کر دیئے۔ مگر قانون کے مطابق اُسے عذابوں سے آگاہی دینے کے لیے تیسرے روز ایک مکان میں لے جایا گیا۔ لڑکی نے دیکھا کہ صحن میں دو مرد نیم برہنہ پیٹ کے بل گرم ریت پر لیٹے ہوئے ہیں، اور دو جلاد ان کے سرینوں پر گینڈے کی کھال کے تازیانے لگا رہے ہیں۔ اُن کی آہ و بکا سے زمین و آسمان لرزتے تھے۔ مگر ظالم جلادوں کو اُن کی تکلیف تازیانہ بازی کے لئے اور مہمیز کا کام دیتی تھی۔

لڑکی کے چہرے پر اس عذاب سے مطلق خوف پیدا نہ ہوا جسے دیکھ کر مجسٹریٹ کسی قدر متعجب ہوا۔ مگر اُس نے سوچا کہ کوئی عذاب اس سے بھی سخت دکھایا جائے تاکہ لڑکی اپنے ارادے سے باز آجائے۔ اُسے ایک اور مکان میں لے جایا گیا۔ جو قید خانے کے قریب تھا۔ یہاں پہنچ کر اس کی نظر دو ڈولیوں پر پڑی جن پر دو آدمی پڑے ہوتے تھے۔ اور ملازم ان ڈولیوں کو لے جا رہے تھے۔ اُن پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔ ایک پیر کھلا رہ گیا تھا لڑکی نے دیکھا کہ پیر میں سے خون کی تللیاں بہ رہی ہیں۔ آخر کار اُسے اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں سے اُس نے یہ دو آدمی ڈولیوں میں لیٹے نکلتے دیکھے تھے۔ یہ کمرہ دوزخ کا نمونہ تھا۔ بانس ہر قد و قامت اور وضع قطع کے جا بجا رکھے تھے۔ جو اذیت دینے کے کام آتے تھے۔ قیدیوں اور عذاب پانے والوں کیلئے مختلف قسم کے قفل، زنجیریں اور بندشیں سیسے کے موٹے اور مڑے ہوئے پائپ تھے جنہیں قیدی کے جسم سے لپیٹ کر دبایا جاتا تھا۔

منتظرین نے بتایا کہ ایسے لوگوں کے لئے جو کسی وجہ سے مورد عذاب قرار

دیئے جائیں یہ سزائیں دی جاتی ہیں۔ منترین نے نہایت جوش اور دبدبے کے ساتھ ان اذیتوں اور آلات کا ذکر کیا جن سے وہ سزا دے گا۔ اگر اس کو دربار شاہی سے عذاب کی سزا منظور ہوئی۔ مگر لڑکی اب بھی خاموش اور مطمئن کھڑی تھی۔ اُس پر کسی آنے والے خوف کا اثر نہ تھا۔

آخر میں اُسے ایک بڑے ایوان میں لایا گیا۔ جہاں ایک میز کے گرد بہت سے حاکم بیٹھے تھے۔ اور سامنے ایک کرسی بچھی تھی۔ طا۔کی کو اس پر بیٹھنے کا ارشاد کیا گیا۔ سامنے نسوار کی ڈبیہ رکھ دی گئی جو فیشن میں داخل تھا۔ اُس کے جسم کی تنومندی اور توانائی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کچھ خادم تولیہ، اسفنج اور پانی کے چھینٹے دے کر ہوش و حواس قائم رکھے جائیں۔ مگر عورت نہایت مسرور و مطمئن اور تمام تیاریوں سے بے غرض بنی اپنی کرسی پر بیٹھی رہی۔

توانا و تنومند انسان ایک بدنصیب مجرم تھا۔ کسی شاہی جرم کا اس پر عتاب نازل ہونے والا تھا۔ ایک جلّاد بانسوں کی تیلیوں سے بنی ہوئی دو جالیاں لایا۔ دونوں جالیوں کو دونوں ہاتھوں میں پہنا دیا گیا۔ اس طرح کہ انگلیاں بانسوں کی تیلیوں کے درمیان گویا شکنجے میں آ گئیں۔ ان بانسوں کے شکنجوں میں ڈوریاں بندھی ہوئی تھیں۔ جلّاد نے حکم پاتے ہی انہیں کھینچا۔ جس کی وجہ سے بانسوں کی تیلیاں کھنچنی شروع ہوئیں۔ اور پہلوان صفت مجرم نے آہ و زاری شروع کر دی۔ بہت کم لوگ ہیں جو صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بانسوں

کی یہ چند تیلیاں کس درجہ ہولناک عذاب انسان کے لئے پیدا کر سکتی تھیں
دیو پیکر انسان کرب و تکلیف کے باعث پتہ کی طرح لرزنے لگا۔ اُس کے ننگے
پنڈے پر ذرا سی دیر میں پسینہ پھوٹ پڑا۔ اُس کی آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں
چیختے چیختے اُس کی آواز بھی ختم ہو گئی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے چکی
میں پیسا جا رہا ہے ظالم حاکم کے حکم سے شکنجہ اور کس دیا گیا۔ مجرم کا جبڑا
اس طرح کٹکٹا رہا تھا۔ جیسے سردی میں دانت بجتے ہیں۔ اُس کے جسم کا
ایک ایک ریشہ اس جہنمی اذیت سے لرز رہا تھا۔

یکایک طا۔کی نے بے چین ہو کر مجسٹریٹ سے کہا" بس اسے رہنے
دیجئے۔ میں آپ کو ابھی بتاتی ہوں کہ کون ہوں اور کیوں ——؟"

بہت سنجیدگی اور آہستگی کے ساتھ لڑکی نے منترین کو بتایا کہ اس
کو جو چیز یہاں کھینچ کر لائی ہے اُس کا اس شخص کے معاملہ سے کوئی تعلق
نہیں ہے۔ بلکہ براہِ راست شہنشاہ سے متعلق ہے۔ اور وہ یہ رُوح کو لرزانے
والا عذاب اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتی۔ اُس نے پھر اپنے الفاظ دہرائے
مہربانی کر کے اس آدمی ——"

منترین نے کچھ سوچ کر اپنا سر تسلیم کے لئے جھکایا۔ اور بانسوں کا شکنجہ
ڈھیلا کرنے کا حکم دیا۔ شکنجہ علیحدہ ہو گیا۔ مگر ابھی تک کرب و اذیت کی
وجہ سے وہ دیو پیکر زرد فام غلام کانپ رہا تھا جس سے سزا کی جہنمی نوعیت
کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"میں بوروشی کی لڑکی ہوں جس نے غدر مچایا ہے۔ اور میں سیدھی

شہنشاہ کے پاس جانا چاہتی ہوں"۔

منتریوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ یہ مہمان کس قدر اہمیت کا مالک ہے اور اسے روکنا کتنا مضر ہوگا۔ معمولی مگر بے حد پیچیدہ رسوم و تکلفات کے بعد عورت کو شہنشاہ کے حضور میں جانے کی اجازت دے دی گئی۔

اُسے محل میں لے جایا گیا۔ تختِ شاہی جس کمرے میں بچھا تھا۔ اُس کی دیواریں زر و جواہر سے مرصع اور نقش و نگار سے آراستہ، حریر و دیبا کے رنگین و مصور پردوں سے مستور تھیں۔ اُس کا چوکور دروازہ یشب سے بنا ہوا تھا۔ عورت ڈری سہمی اور آدابِ شاہی سے مرعوب، زر و جواہر کی چمک سے ششدر اندر داخل ہوئی۔ پیچھے سے کسی چوبدار نے اُس کے شانوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ اور وہ مقررہ آداب بجالانے کے لئے جھک گئی۔ جب اُس نے اُٹھ کر نظر ڈالی۔ تو دیکھا کہ زر و جواہر سے لدی ہوئی شکلیں حکام و افسران و اُمرائے سلطنت کی چاروں طرف بیٹھی ہیں۔ اور بیچ میں شہنشاہ زرق برق لباس اور درخشندہ جواہرات سے لدا ہوا ننگے سر بیٹھا ہے۔

بادشاہِ چین تختِ سلطنت پر جلوہ افروز تھا۔ یہ تخت زمین سے چار فٹ اُونچا تھا۔ لڑکی پر شہنشاہِ چین نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جما دیں۔ اور اُسے قریب آنے کے لئے کہا۔ لڑکی قریب پہنچ گئی۔ اور جھک کر چار مرتبہ آداب بجالائی۔ یہ آداب صرف رقاصہ کنیزوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس لئے لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ لڑکی نہایت وجاہت اور طراری کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ نسوانی جھجک یا رعبِ شاہانہ کا اُس پر کچھ اثر

نہ تھا۔

اُس نے بتایا کہ میرا نام طا۔کی ہے۔ میں باغی سپاہی یوروشی کی بیٹی ہوں اور زمین و آسمان کے مالک شہنشاہِ چین سے اپنے باپ کی بدکرداریوں کی معافی مانگنے آئی ہوں۔ اس کے بعد اُس نے بتایا کہ میرا باپ اِن اِن شرائط پر حکومتِ وقت کی اطاعت کرنے کے لیے تیار ہے۔ اور وہ یہ اطاعت گزاریاں پُوری طرح ادا کر دے گا۔

شہنشاہِ چین بُت کی طرح خاموش تھا۔ زندگی کے آثار صرف اس بات سے ظاہر ہوتے تھے۔ کہ اس کے نتھنے کبھی کبھی ہل جاتے تھے۔ آج تک کسی عورت نے اُس پر اتنا اثر نہیں کیا تھا جس قدر اس عورت نے آج کیا۔ یہ لڑکی نسوانی حُسن و جمال کا شاہکار تھی۔ صرف چینی شکل تھی۔ ورنہ جسم اور رعنائی جمال کے باب میں وہ یونانی دیوی زہرہ کے مثل تھی۔ عادت کے خلاف اپنے ہم نشینوں سے مشورہ کیے بغیر شہنشاہِ چین نے حکم دیا کہ لڑکی کو دربار سے واپس کیا جائے۔ اور آرام سے رکھا جائے۔ اور طلب کرنے پر دوبارہ پیش کیا جائے۔

دوسری بار باریابی ہوئی۔ اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اور رفتہ رفتہ طا۔کی نے بادشاہ پر قابو پا لیا۔ اب اُس نے سرکاری معاملات اور رموزِ مملکت میں دخیل ہونے کی کوشش کی۔ شہنشاہ اُس کے حُسن کی دمک سے اندھا ہو چکا تھا۔ اور سوائے طا۔کی کے کسی عورت کو پاس نہ آنے دیتا تھا۔ لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ کہ یہ عورت کیا کرنے والی ہے۔ اگرچہ شہنشاہ

چین ایک مطلق العنان بادشاہ ہوتا تھا۔ مگر اپنے ارکان سلطنت سے مشورہ کئے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اب طا۔کی جو چاہتی تھی کرتی تھی۔ بادشاہ اُس کے آگے لب کشائی کی ہمت نہ کرتا تھا۔ سلطنت کے اُمراء خوف سے کچھ نہ کہتے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ اس نجس عورت کو شہنشاہ کے قریب سے ہٹانے کی فکر میں تھے۔

طا۔کی نے اثر جمانے کے بعد شاہی خزانے پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ بڑے بڑے عہدے، القاب و خطابات، اعزازات نیلام ہونے لگے۔ اور اس نے خوب رقم جمع کر لی۔ شہنشاہ چین شو سین اُس کے حُسن کا دیوانہ ہو رہا تھا۔ اور احتجاج کے باوجود کچھ نہ کرتا تھا۔ جب طا۔کی سامنے آتی اُس کے حُسن کی جھلک، اُس کے جسم کی لچک اور عیش افروز حرکات سے اُس کا دل سلطنت کی حدود سے نکل کر گناہ کے بھیانک جنگل میں غائب ہو جاتا۔ قدیم زمانے کے وہ آہنی اصول و قواعد جنہیں حکیم چین کنفیوشس نے منضبط کیا تھا، طا۔کی نے توڑ دیئے۔ حالانکہ وہ احکام الٰہی کے برابر سمجھے جاتے تھے۔

طا۔کی اس آزادی پر اکتفا کرنا نہ چاہتی تھی۔ اُس نے محل شاہی کو بار گیٹ میں تبدیل کر دیا جہاں معمولی سے معمولی خدمت کے عوض روپیہ طلب کیا جاتا تھا۔ عیش و معصیت کے اڈے قائم ہو گئے تھے۔ اپنے عیش کو وسیع کرنے اور ساری سلطنت کو اپنے وسیع گناہ کے صحرا میں گم کر دینے کے لئے اُس نے ایک محل بنوایا جس کا نام لوطائی یعنی مینارہ غزالاں رکھا۔ یہ اُس کے اپنے جمع کئے ہوئے روپے اور اپنے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق بنایا گیا تھا۔ اُس کی سج دھج اور کرّ و فر شاہی محل سے بڑھا دینا چاہتی تھی۔ تاکہ بادشاہ صرف

Ahmad Kasim and N. N. Bosu

یہاں رہا کرے۔ اور قدیم محل میں رہنا بھی چھوڑ دے۔

یمنارِ غزالاں میں ایشیا کی چیدہ، خوبصورت عورتیں منگوا کر رکھی گئیں۔ اس کے دروازے خوبصورت یشب سے بنوائے گئے۔ اس کے کمروں میں ننگی اور حیا سوز تصویریں کندہ کرائی گئیں۔ اس محل عیش کے دروازے صرف نیک اور بے عیب آدمی کے لئے بند تھے۔ ورنہ ہر گنہگار مرد عورت کے لئے اس محل میں کامل مہمانداری اور عیش کوشی کا سامان مہیا رہتا تھا۔ ایسے موقع پر خواجہ سراؤں، آبرو باختہ عورتوں اور عصمت فروش حسینانِ چین نے اڈے جما لئے۔ دنیا کے تمام اقسامِ عیش جو انسان کو معلوم تھے۔ یہاں پورے شباب کے ساتھ بر سرِ عمل دکھائی دیتے تھے۔ اور بادشاہ کے لئے نت نئی دلہنیں مہیا کرنے کا اہتمام افسوں گر حسینہ طا۔کی نے خود اپنے ذمہ لے لیا تھا۔

جاوا، تبت، منگولیا وغیرہ سے رقاصائیں بلوائی جاتی تھیں۔ ان کے عریاں ناچ ہوتے تھے۔ اور شہنشاہ کی بدمستیاں اَلاَمان۔ اہلِ چین نے شاید اس سے پہلے خواب میں بھی وہ جنسی بداطواریاں نہ دیکھی ہوں گی۔ جو زہریلی حسینہ طا۔کی نے ایجاد کر کے مینارِ غزالاں میں رائج کی تھیں۔ اور جن سے شوسین اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔

(۲)

کینِ کیو نامی ایک سردارِ مملکت نے بادشاہ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں۔ اور اس سلسلے میں اس نے ایک لڑکی حضور میں گزرانی۔ جس کی

صورت شکل حوروں جیسی اور جس کی عفت و عصمت بالکل محفوظ تھی ۔ جونہی یہ لڑکی مینارِ غزالاں میں لائی گئی بادشاہِ چین کے دل پہ اثر ہوا۔ اور اس نے اُسے اپنے سامنے رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا ۔ کی اس نئے مہمان کے آنے سے ہر گز خائف نہ تھی ۔ اور نہ اُسے یہ خدشہ تھا کہ وہ رقیبہ بن جائے گی۔ وہ اس نئے شکار کو بادشاہ کے لئے ایک حربہ ہی سمجھتی تھی ۔

کین کیو کو کیا معلوم تھا کہ اس کا بادشاہ سنورنے کے بجائے ایک معصوم دوشیزہ کو بھی گناہگاری کی قربان گاہ پر اپنے ہاتھوں سے بھینٹ چڑھا دیگا۔ سردار کین کیو نے تو یہ مصلحت سوچی تھی ۔ مگر کارگر نہ ہوئی۔ لڑکی نے جب اپنی آنکھوں سے مینارِ غزالاں کی معصیت نواز زندگی دیکھی ۔ شرمناک اور حیا سوز اطوار و اشغال اُسے دکھائے گئے ۔ تو وہ لرز اٹھی ۔ اس نے احتجاج کیا کہ میں یہاں رہنا نہیں چاہتی مجھے ابھی اس محبس گناہ سے نکالو۔ مگر دھمکیوں، ترغیبوں اور دلاسوں سے کام لے کر تھا ۔ کی نے اُسے کچھ دنوں محل میں رکھا ۔ اور رفتہ رفتہ اُسے بھی ان گناہوں میں برابر کا شریک کر لیا ایک مرغ معصوم گرفتار ہو کر جب تھا ۔ کی جیسی شکاری عورت کے محبوس معصیت میں پھنس جائے تو اُس کا دوبارہ باہر نکلنا ناممکن تھا ۔

لڑکی ان شرمناک اور دل ہلا دینے والے گناہوں کی تاب نہ لا سکی۔ اور اُس نے دادِ عیش دینے سے انکار کر دیا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ اُسے نہایت سخت قسم کی اذیتیں دے کر قتل کر دیا گیا ۔ آدم خوری اس محل کے رہنے والے انسانی درندوں کے مخصوص اشغال میں داخل تھی ۔ چنانچہ

اس عورت کے جسمِ نزار کو بھی دانتوں سے چبایا گیا۔ اور مردہ جسم کو طرح طرح کی لرزہ پیدا کرنے والی حرکات سے آلودہ کیا گیا۔ اُس کی لاش اس کے باپ کے پاس بطور مظاہرۂ انتقام بھیجدی گئی۔

لڑکی کے باپ پر غم و غصّہ کی بجلیاں گریں۔ اور وہ ایک شیر کی طرح بپھر کر میدان میں نکل پڑا۔ اُس نے تمام چین کو اپنے شور سے متوجہ کر لیا۔ اور بغاوت کی آگ پھیلانی شروع کر دی۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ آخر اس جہنمی زندگی کو اہلِ چین کب تک برداشت کریں گے ——— اس شخص کو شاہِ والاشان کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

مگر قتل رنگ لایا۔ تمام صوبوں میں بغاوت کی آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی۔ اور شعلے بھڑکنے کے لئے مچل رہے تھے۔ صرف جبر و خوف کی وجہ سے عام غدر نہ ہونے پاتا تھا۔ ورنہ لوگ طا۔ کی سے انتقام لینے اور شہنشاہ کو اس کی بدکرداریوں کا مزہ چکھانے کے لئے بالکل بھرے بیٹھے تھے۔ غریب دنادار، گمنام و بے حقیقت لوگوں کو بھی سر اُٹھانے کا حوصلہ ہوا۔ بڑے بڑے باغیوں کے آتے اور مینارِ غزالاں کے گرد منڈلاتے اور اُسے اُکھیڑ پھینکنے کی ترکیبیں کرتے۔ مگر مینارِ غزالاں کے عیش کرنے والے اپنے مضبوط و مستحکم قلعہ میں باہر کی دُنیا سے بے خبر باجوں کی آوازوں، موسیقی کی تانوں اور حسینوں کی برق پاشیوں میں مسحور و محو تھے۔ انہیں مُطلق خیال نہ تھا۔ کہ رنج و الم بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ تکلیف و پریشانی بھی کسی شے کا نام ہے۔ اُنہیں یہ پختہ یقین تھا کہ موت کبھی نہیں آئے گی۔ اور تاابد

یہ رقصِ عیش میں محو رہیں گے مینارِ غزالاں کے لوگوں کو انسان کے جامِ انصاف اور خدا کے پیمانۂ صبر کے لبریز ہو جانے کا قطعاً اندیشہ نہ تھا۔

اہلِ چین بڑی مشکل سے ان توہین آمیز حرکاتِ عیش اور تباہ کُن اطوارِ شاہی کو پانچ سال سے برداشت کر رہے تھے۔ اب ان کے صبر کا پیمانہ چھلکنے والا تھا۔ ضرورت تھی ایک ایسے رہنما کی جو سُلگتی ہوئی چنگاریوں کو شعلوں میں تبدیل کر کے اس گناہ کے ہنگامے کو خاکستر کر دے۔

دو وانگ نامی ایک خاندانی شہزادے نے آخرکار علمِ جہاد بلند کیا۔ چین کی کروڑوں کی آبادی میں سے ایک فوج سرفروشوں کی بن جانی کوئی مشکل کام نہ تھا۔ چاروں طرف سے رضاکار اس فوج میں بھرتی ہونے کے لئے آنے لگے۔ اور آخرکار اُس نے عیش محل پر دھاوا بول دیا۔

یہی وہ غریب تھے جن کے بھائی بند منگولوں نے چنگیز خان کے زیرِ کمان چین کے اس سرے سے لے کر یورپ کی اُس سرحد بحرِ اسود تک اپنی تاخت کی حدود وسیع کر دی تھیں۔ جن کے زیرِ نگین ایک دنیا کانپتی تھی۔

جب حملہ کی خبر شو سین کو ہوئی۔ تو اس کو پہلے تو یقین نہ آیا۔ مگر پھر ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے اپنے محل کی حفاظت کے لئے احکام جاری کئے۔ مگر جب اُس نے یہ دیکھا کہ اُس کے احکام سُن کر کرنے والے لوگ اب نہایت سرد مہری سے کام لے رہے ہیں۔ اور اُس کا حکم چلنا بند ہو جائیگا۔ تو اُس نے سمجھ لیا کہ وقت اب آگیا ہے کہ چُپ چاپ جان بچا کر آدمی نکل جائے۔ اور زیادہ شور نہ کرے۔ اُسے پھر خیال آیا کہ مینارِ غزالاں میں

چلو۔ وہ ایک ایسی جلئے پناہ ہے جہاں اب تک اُس کے احکام چلتے ہیں ؛

(۴۲)

وہ ایک خفیہ سُرنگ کے ذریعہ سے جو اُس کے محل سے مینارِ غزالاں تک جاتی تھی، چپ چاپ پہنچ گیا۔ وہاں جاکر اُس نے دیکھا کہ نقشہ ہی پلٹا ہوا ہے۔ ہزاروں رفیق ساتھ چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ کچھ نوکر چاکر باقی رہ گئے تھے جو مدافعت نہیں کرسکتے۔ رہ گئیں کنیزیں، خواجہ سرا، خوبصورت لڑکے اور عنین، وہ بھلا کیا اس کی حفاظت کا کام کرسکتے تھے ؛

اُس نے ایک سرد آہ بھری اور غصّے میں آکر چیزیں توڑنے پھوڑنے لگا۔ قیمتی آلاتِ مے کشی، بیش بہا ظروف، آرائش کے سامان ایک ایک کرکے ٹوٹنے شروع ہوگئے۔ یکایک اُس کو کچھ خیال آیا۔ اُس نے حکم دیا۔ کہ سب فرنیچر اور کاغذ کی چیزیں صحن میں جمع کردی جائیں۔ تمام قیمتی اور نایاب لکڑی کا سامان، کاغذی چیزیں ڈھیر کی صورت میں رکھ دی گئیں۔ اُس نے ایک نہایت بیش قیمت لبادہ پہنا اور زیورات کے صندوقچے منگاکر مٹھیاں بھر بھر کر حالتِ طیش و دیوانگی میں اپنے سر پر نچھاور کیں۔ کپڑوں پر نثار کیں۔ اور کاغذ اور لکڑی کے سامان کی اِس قیمتی چتا پر بیٹھ گیا ؛

چلّا کر ——— اُس کی آواز ہی اب کہاں باقی رہی تھی ——— بولا "شہنشاہِ چین غداروں کے ہاتھ پڑکر مرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے اپنی

جان کو بے عزتی سے کھونے کی بجائے خود خاکستر ہو جائے گا۔ تمام نوکر اور کنیزیں چاروں طرف آ کھڑی ہوئیں۔ کسی کی مجال نہ ہوئی جو اسے روک سکتا۔ اُس نے کہا چتا میں آگ لگا دو۔ ابھی لوگ تذبذب ہی کر رہے تھے۔ کہ کسی طرف سے ایک جلتی ہوئی مشعل آ کر گری۔ سامنے سے ایک دریچہ بند ہو گیا۔ لوگوں نے دیکھا طا۔ کی مشعل پھینک کر جلدی سے بھاگ گئی۔ مشعل کا کاغذ اور چوبی سامان پر گرنا تھا کہ بھک سے ہوا اور آناً فاناً شہنشاہ چین بھسم ہو کر ایک تودہ خاکستر بن گیا۔ اور اپنے گناہوں کی آلودہ سرزمین پر ہی آ کر اس نے آخری سانس بھی پورے کئے۔ محل عیش ایک زرد جھابجھ کی آواز اور ایک پُر اسرار چینی گھڑیال کی ضربات کے شور سے گونج رہا تھا۔ مرتے مرتے شوسین نے نوکروں اور ساتھیوں کو پکارا کہ تم بھی اِس آتش کدہ معصیت میں کود کر میرے ساتھ چلو۔ زندگی کی رفاقت کو تا ابد قائم رکھو۔ اگر بے وفا دُنیا اس قدر سمجھدار نہیں ہے کہ آخر تک کام میں شریک رہے۔

(۵)

طا۔ کی کہاں تھی؟

ہر شخص کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ طا۔ کی کہاں ہے۔ کہاں ہے وہ خبیثہ، ملعونہ، مجسمۂ گناہ و معصیت، وہ آلودگی و شرارت کی نجس دیوی کہاں چلی گئی ہے۔ لوگ اُس سے انتقام لینا چاہتے تھے۔

شاہی محل کی حفاظتی فوج نے ذرا سی دیر میں ہتھیار ڈال دیئے۔ میں

سے پہلے کہ محل پر انقلابی فوج کا حملہ ہوتا لوگوں نے فتح کے جھنڈے بلند کر دیئے اور شہروں میں اژدھے کی مورتیں جلوس میں نکالی گئیں۔ جو فتح مندی و کامرانی کا نشان سمجھی جاتی تھیں۔ چاروں طرف خوشی کا غوغا تھا۔ ہر شخص نجاست و آلودگیٔ حیات کے تماشے کا حسرت ناک انجام دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

چاروں طرف دستے اور فوجیں دوڑی دوڑی پھر رہی تھیں۔ طا۔کی نہ ملنی تھی نہ ملی۔

یکایک فاتح نوجوان وُو دانگ کی اقامت گاہ کے سامنے ایک مرصّع و مذہّب پالکی آکر رُکی۔ اندر سے طا۔کی زرق برق لباس اور جواہرات و آرائشِ جمال کے جملہ اسلحہ سے لیس باہر نکلی۔ اُس نے حرم میں جا کر نوجوان فاتح کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ اپنی جہنمی مسکراہٹ میں پُرشباب فاتح کے تمام ارمانوں کو فنا کر دینا چاہتی تھی۔

طا۔کی نے بتایا کہ اُس نے شہنشاہ کو غلط روی سے بچانے اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ مگر اُس کی تمام طاقتیں شہوت رانِ مطلق العنان کے سامنے ہیچ ہو گئیں۔ طا۔کی نے تمام نسائی خوبیاں نوجوان جرنیل کو اپنانے کے لئے ختم کر دیں۔ اُس کا حربۂ حُسن کبھی بار اِس قدر تیز ہوا کہ شاید نوجوان جرنیل اپنے آپ کو اُس کے آغوش میں گرا ہوا پاتا۔ مگر حُسن و جمال اور الفاظ کے جادو نے اس سے زیادہ دیر تک آزمائش میں نہ ڈالا۔ وہ سوچتا تھا کہ رعنائی اور پاکیزگیٔ حُسن کا ایسا نادر مجسمہ کیونکر

گناہ اور سیاہ کاری کا ایسا ہولناک امین بنا رہا چین کی تاریخ میں سب سے زیادہ سیاہ ورق جس کے حال سے بھر پور ہے۔ وہ بھی جگمگاتی ہوئی ملکۂ عیش تھی۔ وُووانگ دیکھتا اور حیرت کرتا تھا۔ آخر کار اندرونی کشمکش حسن کی کشش پر غالب آئی۔ اور اُس نے جھنجھلا کر حکم دیا ——

"اپنا کام کرو"

طا کی مسکرا کر نوجوان جرنیل کی طرف حریصانہ انداز سے دیکھنے لگی۔ وہ ایک دفعہ پھر مسکرائی۔ اور کس قدر زہر تھا۔ اُس کی مسکراہٹ میں جب وُووانگ ٹکٹکی کے پاس سے گزرا۔ جلاّد نے اُس کے خوبصورت سیاہ بال رسم کے موافق اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے۔ اُس کو ٹکٹکی سے باندھ دیا گیا تھا۔ سر قلم کرنے کے لئے جلاّد اپنا آفتاب جیسا چمکیلا سیفہ ایک ناپاک و نجس سر کو اُس کے تن سے جدا کرنے کے لئے تول رہا تھا۔

ترکی

(۱)

زر علیہ السلام: مصنفہ رشاد نوری۔ مترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی

(۲)

جب عورت غیرت دلائے: مصنفہ خالدہ ادیب خانم۔ مترجمہ مہر محمد خاں شہاب

نذر علیہ السّلام

آمینہ نے چاروں طرف دیکھا تو جہاں تک نگاہ جا سکتی تھی اُس کے بہنوئی کی زمینیں پھیلی دکھائی دیں۔ اُس کا دل کسی طرح یقین نہیں کرتا تھا کہ اتنی بڑی جائداد کا مالک ایک اکیلا آدمی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اپنی بہن شریفہ سے پوچھا۔

"کیا واقعی یہ سب جائداد میرے بہنوئی کی ہے؟"

شریفہ نے اقرار کیا تو آمینہ نے تعجب سے کہا "میری عقل نہیں مانتی یہ تو ایک پوری بادشاہی ہے۔ اور بہن تم اس پوری بادشاہی کی ملکہ ہو!"

حبشن لیلیٰ نے باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے دونوں بہنوں کی باتیں سنیں تو نظر لگ جانے کے ڈر سے زمین پر تین دفعہ تھوکا اور چلّا کر کہنے لگی۔

"بی بی! ماشاء اللہ کہو!"

آمینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی بہن سے ایک نئی خبر کے بارے میں پوچھنے لگی۔ جو سن چکی تھی۔

شریفہ نے افسوس کے ساتھ جواب دیا "ہاں، میں بھی سنتی ہوں کہ

تمہارے بہنوئی ناپاکی کا کارخانہ کھولنے والے ہیں۔ اُن کا خیال ہے اس کارخانے سے دس گنے زیادہ مالدار ہو جائیں گے۔ آہ میری تو آرزو یہ ہے کہ ہم فقیر ہو جائیں مگر یہ کارخانہ کبھی نہ کھُلے؟"

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد شریفہ نے پھر کہا "ہم انگور کے مربّے اور شربت بنایا کرتے تھے۔ مگر اب تمہارے بہنوئی کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے کہ دو دفعہ حج کرنے اور شراب پینے سے توبہ کر چکنے کے بعد بھی شراب بنانے کا کارخانہ کھولنے پر اڑے ہوئے ہیں!"

امینہ کو بھی یہ سُن کر بہت رنج ہوا اور پوچھنے لگی۔

"آخر دُولھا بھائی کو ستّر برس کی عمر میں یہ خیال کیسے پیدا ہو گیا، جو اسلام کے بالکل خلاف ہے؟"

شریفہ نے ہزاروں گالیوں کے ساتھ جواب دیا "یہ تمام شرارت تمہارے بھانجے صلاح الدین کی ہے۔ کالجوں میں پڑھ کر بے ایمان ہو گیا اور کرسٹانوں جیسی باتیں کرنے لگا ہے!

لیکن سچ پوچھو تو صلاح الدین بھی بے قصور ہے۔ فساد کی اصلی جڑ اُس کی بیوی حکمت ہے۔ شیطان کی بچّی جب سے آئی ہے گھر میں بے دینی ہی بے دینی پھیل گئی ہے۔ اسی نے صلاح الدین کو شراب کا کارخانہ بنانے کی رائے دی اور صلاح الدین نے اپنے دیوانے باپ کو راضی کر لیا!"

(۲)

امینہ اناطولیہ کے ایک دور گاؤں میں رہتی تھی۔ دو دن ہوئے کہ اپنی بہن شریفہ سے ملنے آئی تھی۔ امینہ اپنے بھانجے، صلاح الدین کی بیوی سے بہت خار کھاتی تھی۔ اُسے امید تھی کہ صلاح الدین سے خود اپنی لڑکی نزہیہ کی شادی ہو گی۔ لیکن صلاح الدین کا دل، پایۂ تخت استنبول کی ایک دوشیزہ حکمت پر آگیا۔ اور اُس سے شادی کرلی۔ امینہ نے دیکھا کہ شریفہ کی بہو کو گالیاں دے رہی ہے تو اپنے دل کی بھی بھڑاس نکالنا چاہی کہنے لگی۔

"بہن ساری خطا تمہاری ہے۔ کیا یہاں درۂ دانیال کے پورے علاقے میں کوئی اچھی لڑکی تھی ہی نہیں کہ تم نے اِس بے دین عورت کو اپنے گھر میں بلا لیا"

شریفہ نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنی بھانجی، نزہیہ کی طرف اشارہ کیا، جو قریب ہی بیٹھی تھی اور سب باتیں سُن رہی تھی۔ اشارے کا یہ مطلب تھا کہ وہ صلاح الدین کی شادی نزہیہ سے ہی کرنا چاہتی تھی۔ مگر قسمت کو کیا کرے۔

حبشن لیلےٰ، باورچی خانہ سے چلائی۔

"یہاں بارہ بستی کے سب آدمی، صلاح الدین کے خط کی تعریف کیا کرتے تھے، مگر تم ہی نے اُسے استنبول بھیج دیا۔ سوچو تو، میں نے کتنا کتنا منع کیا تھا مگر تم نہ مانیں۔ اب نتیجہ سامنے ہے۔ استنبول میں اُس نے پڑھا یہ ہے۔ کہ مونچھیں منڈاتا ہے، عینک لگاتا ہے، اور کرسٹانوں کا گانا گاتا ہے۔ آہ،

اِس لگانے سے مجھے کتنی چڑ ہے! بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتے بھونک رہے ہیں!"

پھر شریفہ نے اپنی بہن کو بتایا کہ صلاح الدین جب وکالت پڑھتا تھا تو کس طرح ایک دوست کے گھر میں دعوت پر حکمت کو دیکھ کر عاشق ہو گیا تھا۔

امینہ نے بات کاٹ کر کہا:۔

"تو حکمت استنبول میں کسب کماتی ہو گی۔ ورنہ اُس کے دوست کیسے پیدا ہو گئے!"

شریفہ نے جلدی سے جواب دیا "اُف، تم کیا جانو! تم تو گاؤں میں رہتی ہو تمہیں خدا خبر نہیں کہ استنبول کا کیا حال ہے۔ استنبول کی عورتیں بالکل بے پردہ ہو کر مردوں سے ملتی اور ہنستی بولتی ہیں۔ بلکہ اُن کے ساتھ ناچتی گاتی بھی ہیں۔ اور اس بے حیائی کا نام 'تہذیب' رکھ دیا گیا ہے!"

امینہ نے آنکھیں پھاڑ کر کہا:۔

"خدا کی قسم، مَیں نے کبھی نہیں سُنا تھا کہ استنبول کے لوگ بالکل کافر ہو گئے ہیں۔ خدا ہر مسلمان کو اس شر سے محفوظ رکھے۔ لیکن یہ تو بتاؤ۔ دولہا بھائی نے یہ رشتہ کیسے پسند کر لیا۔ وہ تو بڑے غیرت دار آدمی ہیں؟"

شریفہ نے جواب دیا۔

"انھوں نے بڑی سختی سے منع کیا تھا۔ مگر صلاح الدین ایسا بیمار پڑا کہ جینے کی بھی اُمید نہ رہی۔ مانتی ہوں مَیں نے ہی اُس سے کہا کہ چھپ کر شادی کرے۔ مگر اُس نے انکار کر دیا اور کہا کہ باپ کی اجازت کے بغیر شادی نہیں

کرے گا۔ مگر تمہارے بہنوئی کہتے تھے مر جائے لیکن میں اس ننگی عورت سے شادی ہونے نہیں دوں گا۔ اسی زمانہ میں پیرس سے تار آیا کہ اُن کے بھتیجے، نجم الدین نے پستول مار کر اپنے آپ کو بُری طرح گھائل کر لیا ہے کیونکہ اپنے ساتھ پڑھنے والی ایک لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا۔

مگر لڑکی، دوسرے آدمی کے ساتھ چلی گئی۔ اس خبر نے میرے ہوش اُڑا دیئے۔ مَیں ڈری کہیں صلاح الدین بھی خودکشی نہ کر لے۔ مَیں نے گھر کے یہودی ڈاکٹر، ابراہیم کو بلا کر دس اشرفی دینے کا وعدہ کیا کہ وہ تمہارے بہنوئی کو صلاح الدین کی شادی پر راضی کر دے۔ جانتی ہی ہو یہودی بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر نے مجھے ایک تدبیر بتائی اور وہ کارگر ہو گئی۔ تدبیر یہ تھی۔ کہ جب تمہارے بہنوئی ڈاکٹر کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو مَیں ہاتھ میں چائے کی پیالی لئے چلّاتی ہوئی آئی۔ پیالی میں لال دیا سلائی کی تیلیاں تھیں۔ مَیں نے جھوٹ موٹ رو کر کہا۔

"ڈاکٹر، ڈاکٹر کیا لال دیا سلائی میں زہر ہوتا ہے؟ یہ پیالی مَیں صلاح الدین کے ہاتھ سے چھین کر لائی ہوں!"

ڈاکٹر بھی بناوٹ سے تھر تھر کانپنے لگا اور کہنے لگا۔

"بے شک، یہ سم قاتل ہے۔ اسے پی کر آدمی جی ہی نہیں سکتا۔ اپنے لڑکے کی جلدی کوئی تدبیر کر دو!"

"یہ فریب چل گیا۔ اور تمہارے بہنوئی نے صلاح الدین کو شادی کر لینے کی اجازت دے دی۔

یہ سن کر امینہ نے سوال کیا۔ "مگر اللہ رکھے۔ اس امیر گھر کی حکمت کو کچھ قدر بھی ہوئی۔
شریف نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "آہ میں تم سے کیا کہوں؟ حکمت بڑی اکھل کھری ہے۔ ہمارے مہمانوں تک سے نہیں ملتی۔ بلکہ اُن کا مذاق اڑاتی ہے۔ کہتی ہے۔ گنوار ہیں، تہذیب سے ناواقف ہیں۔ اور حکمت کی ماں یعنی میری سمدھن، تو بہن۔ بس تم سے کیا کہوں، کیسی عورت ہے۔ جب دیکھو آئینہ کے سامنے بیٹھی ہے۔ اور سنگھار کر رہی ہے۔ مجھے تو یقین ہے۔ تمہارے بہنوئی کو پرچا رہی ہے۔ ورنہ ہونٹوں پر روغن کیوں لگتا ہے چھاتیاں اُٹھا کر کیوں باندھی جاتی ہیں۔ ناخن کیوں رنگے جاتے ہیں؟"

امینہ نے سوال کیا۔
"حکمت کسی اونچے گھرانے کی لڑکی ہے؟"

شریف نے جواب دیا: "حکمت کا باپ پیرس میں ہماری حکومت کا سفیر تھا۔ وہیں اِس لڑکی کی تعلیم و تربیت ہوئی ہے۔ بالکل ویسی ہی جیسی کافروں کی ہوتی ہے۔ وہ ذرا نہیں شرماتی۔ مردوں سے اس طرح ملتی اور باتیں کرتی ہے۔ جیسے خود بھی مرد ہے! اس بے حیائی پر بھی بڑی مغرور ہے۔ بہن سوچو تو اُسے یہ بھی منظور نہیں کہ کبھی میرا بدن دبا دے یا مل دے۔ یہ تو بڑی بات ہے۔ سیدھے منہ مجھ سے بات تک نہیں کرتی پچھلے ہی ہفتہ کا واقعہ ہے کہ میں نہا رہی تھی۔ لیلیٰ بدن مل رہی تھی۔ اور خوشامد کر رہی تھی۔ مگر بہو دور بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ اور تیوری چڑھائے تھی۔ جیسے لیلیٰ کا یہ کام بھی خلاف تہذیب

ہے۔ خدا غارت کرے اس تہذیب کو! اسی وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر خدا نے یلی جیسی ہی کوئی مجلس بہو دی ہوتی، تو اس کُتیا سے کہیں اچھی ہوتی!۔ لیکن ہائے نصیب کو کیا کروں۔ میری پھوٹی قسمت میں تو استنبول کی یہ بے حیا لڑکی تھی!"

امینہ کو معلوم تھا کہ شادی کو چار سال ہو چکے ہیں۔ مگر اب تک حکمت کے اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ اس گھر کو اولاد کی بڑی ضرورت تھی کیوں کہ حاجی علی کے صرف ایک ہی لڑکا، صلاح الدین تھا۔ اب اگر صلاح الدین کے اولاد نہ ہو، تو پورے خاندان کا خاتمہ تھا۔ امینہ جانتی تھی۔ کہ اس کی بہن کے گھر میں شب و روز اولاد کی دعائیں کی جا رہی ہیں مگر اس نے نااتفاقی بڑھانے کے ارادے سے کہا۔

"شاید اب تک تمہاری بہو کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے۔ استنبول کی لڑکیاں، اولاد پیدا کرنا بھی پسند نہیں کرتیں شاید اس ڈر سے کہ کہیں جلد بوڑھی نہ ہو جائیں!"

شریفہ کو یہ خیال کر کے بے حد صدمہ ہوا کہ اب تک پوتے سے محروم ہے کہنے لگی۔

"چار برس ہونے ہیں کہ علاج ہو رہا ہے۔ کوئی حکیم ڈاکٹر نہیں جس کی دوا نہ ہو چکی ہو۔ ہزاروں لاکھوں خرچ ہو چکے ہیں۔ مگر وہ بانجھ بھلا لڑکا پیدا کر سکتی ہے! آہ۔ خدا کرے اُسے اپنی شرارت کا خیال ہو جائے۔ مگر توبہ کرو۔ وہ موئی تو لٹکے میرے صلاح الدین پر

پر تہمت تراشتی ہے۔ کہتی ہے۔ خود اُسی میں خرابی ہے ، نہ ہوتی تو بچہ ضرور ہوتا! دیکھا تم نے ، یہ ہیں آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں! یہ لڑکیاں بڑی ہی مکار اور جھوٹی ہوتی ہیں۔ شرمانا تو جانتی ہی نہیں۔ صلاح الدین پر الزام لگاتی ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر ابراہیم کہتا ہے کہ صلاح الدین بالکل ٹھیک ہے۔ خود حکمت ، بانجھ ہے۔ اب ہم نے استنبول سے ایک ڈاکٹر بلایا ہے جو بجلی سے علاج کر رہا ہے۔ دعا کرو کہ فائدہ ہو اور خدا مجھے پوتا دے دے۔"

حبشن لیلیٰ بیچ میں بول اُٹھی "اب تو خدا کے کارخانے میں دخل دیا جانے لگا ہے۔ اولاد خدا کی طرف سے ہوتی ہے ، نہ کہ بجلی سے پیدا ہوتی ہے۔ بھلا بجلی سے پیٹ میں بچہ کیسے آ جائے گا؟"

شریفہ نے کچھ جواب دیئے بغیر اپنی امینہ کے کان میں کہا۔

"بہن کسی سے کہنا نہیں۔ تمہارے بہنوئی کو بہو سے بڑی نفرت ہے۔ اکثر کہا کرتے ہیں۔ کہ اپنے گھر میں رہنے نہیں دوں گا۔ . . . . بلکہ میں دیکھتی ہوں کہ اب صلاح الدین کا دل بھی بیوی سے پھیکا پڑ گیا ہے۔ اور عجب نہیں طلاق دے دے۔"

(۳)

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً لیلیٰ کی لڑکی ، دلبر چلاتی ہوئی اندر آئی "یہ دیکھو! یہ دیکھو!"

سب عورتیں ڈر کر گھوم پڑیں اور اس شور کا سبب پوچھنے لگیں دلبر نے ایک چھوٹی سی تھیلی زمین پر ڈال دی۔ اُس کی ماں، لیلے نے تھیلی اس طرح چھوئی، جیسے سانپ ہے! جب تھیلی کھولی گئی تو تمام عورتیں ڈر سے کانپنے لگیں۔

تھیلی میں سانپ کا سر تھا۔ دو بچھو تھے۔ بہت سی سوئیاں بچھوؤں میں چبھی ہوئی تھیں۔

رنگ رنگ کی کوڑیاں تھیں۔ سوہر کی سوکھی چربی تھی۔ اور ایک کاغذ پر عجیب و غریب نام لکھے۔ اور نقش بنے تھے۔ لیلے نے چلا کر اپنی لڑکی سے پوچھا۔

"تھیلی تجھے کہاں ملی؟"

دلبر نے تھر تھر کانپتے ہوئے جواب دیا۔ "صلاح الدین میاں کے بچھونے کے نیچے۔"

صلاح الدین کی ماں، شریفہ یہ سن کر کھڑی ہو گئی۔ اپنے سر پہ دو ہتھڑ مارا اور چلائی۔

"جادو ہے! اب میں سمجھ گئی کہ صلاح الدین کی بیماری کا اصلی سبب کیا ہے؟ کیوں ڈراؤنے خواب دیکھا کرتا ہے؟ یہ کہہ کر وہ دھاڑ مار کر روئی۔ پھر اپنے خاوند کا نام لے کر چلائی۔

"حاجی علی، دوڑو، اپنے اکلوتے کی جان بچاؤ۔ حرافہ عورتوں کے شر سے اُس کی حفاظت کرو۔"

حاجی علی آواز سنتے ہی دوڑا آیا۔ بیوی نے تھیلی کی طرف اشارہ کیا۔

حاجی علی نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

لیلیٰ نے سب سے پہلے جواب دیا۔ "ہے کیا؟ میاں جادو ہے۔ صلاح الدین کے بچھونے کے نیچے یہ بلا رکھی تھی۔ یہیں گُن تمہاری چہیتی استنبولی بہو کے۔ اللہ میاں کی قسم جادوگرنی ہے۔ صلاح الدین کو عمر بھر کے لئے اپنے چنگل میں رکھنا چاہتی ہے۔"

حاجی علی نے لیلیٰ کو ڈانٹ بتائی "میں کہہ چکا ہوں، اُس آوارہ کا نام میرے سامنے نہ لیا جائے۔"

پھر اپنی بیوی سے کہنے لگا۔

"خدا کی مار بہو پر۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اُس کی شرارتیں اب تو حد کو پہنچ چکی ہیں۔ کیا تم نے بھی سُنا کہ آج وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کھیتوں اور باغوں کی سیر کرتی پھرتی تھی؟ اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا میں اس گھر کو چھوڑے دیتا ہوں۔ مدینہ منورہ میں ہجرت کر جاؤں گا۔ لڑکا تمہارا ہے۔ اپنی بہو کو لے کر بیٹھو۔ لیکن میں؟ تو خدا کی قسم اس گھر میں میرا گزر نہیں ہو سکتا!"

"پھر حاجی علی نے زور زور ٹہلنا شروع کیا۔ بہت خفا تھا۔ بار بار داڑھی میں انگلیوں سے خلال کرتا تھا۔ سر ہلاتا تھا۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لیتا تھا۔

پھر اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ "یہ ساری آفت تمہاری لائی ہوئی ہے۔ خدا

کی قسم عورتوں کے چلتّر سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے سرک جاتے ہیں۔ تم دھوکہ نہ دیتیں تو میں کبھی صلاح الدین کو اس بانجھ سے شادی نہ کرنے دیتا۔ اُف کیسی بے حیا عورت ہے۔ نامحرموں سے نہیں شرماتی، جادوگرنی ہے۔ شیطان کی بچّی ہے خدا کی اس پر پھٹکار۔ شیطانی گانے گاتی ہے۔ بھوکے بھیڑیے کی سی آوازیں نکالتی ہے۔ کافروں کی بولی بولتی ہے۔ بندوق اٹھائے گھوڑے پر بیٹھتی ہے۔ اور ابلیس کی طرح دوڑی پھرتی ہے۔ اُڑتی چڑیا پہ بندوق چلاتی ہے اور وہ گھائل ہو کر گر پڑتی ہے۔ واللہ یہ نہ عورتوں سے ہو سکتا ہے نہ مردوں سے۔ ضرور یہ کوئی جنّات ہے یا بھوتنی ہے جس دن سے آئی ہے۔ میرے گھر سے برکت ہی اٹھ گئی۔ ہر وقت پریشانی ہی پریشانی رہتی ہے جسے دیکھو مجھ پہ ہنستا اور اس بھو کی وجہ سے نام دھرتا ہے۔ باغ میں جال لگایا جاتا ہے اور صلاح الدین روز اس کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتا ہے۔ کُتیا کو اس کھیل پہ بڑا گھمنڈ ہے حالانکہ آج تک مجھے اِس کھیل کا نام بھی یاد نہ ہو سکا!“

حبشن لیلیٰ فوراً چلا اٹھی۔

”اس کھیل کا نام ولھس یا ٹنس ہے!“

حاجی علی نے دانت پیستے ہوئے کہا ”ہاں، ہاں ٹینس جیسا ہی کوئی نام ہے۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے فوراً کوئی فیصلہ کرنا چاہیئے۔ دروہ دانیال کے علاقہ میں میرے خاندان سے معزز کوئی خاندان نہ تھا مگر آج اس عورت

کی وجہ سے خاندان ذلیل ہو رہا ہے!"

یہ کہہ کر حاجی علی چُپ ہو گیا۔ پھر لیلیٰ کی لڑکی دلبر سے کہنے لگا۔

"گدھے صلاح الدین سے جا کر کہہ دے کہ تھوڑی دیر کے لئے گانا بجانا موقوف کر کے ابھی فوراً میرے پاس آئے۔"

صلاح الدین ننگے سر دوڑ کر آیا۔ حاجی علی نے اُسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور ڈپٹ کر کہنے لگا۔

"قریب آؤ۔ اور کان کھول کر سن لو۔ چار برس سے تم مجھے بندر کی طرح نچا رہے ہو۔ میں اس رسوائی کو اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اب یا تو تم میرا حکم مانو یا میرے گھر سے اِس استنبولی فاحشہ کو لے کر نکل جاؤ!"

صلاح الدین ڈر سے کانپ اٹھا۔ کیونکہ باپ سے بہت ڈرتا تھا۔ کہنے لگا۔

"ابّا، میں نے آج تک کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی۔ میں ہر حکم بجالانے کے لئے اب بھی حاضر ہوں!"

حاجی علی نے حکم دیا کہ اُس کی سمدھن یعنی حکمت کی ماں بلائی جائے۔ حکمت کی ماں اقدریہ ہاتھ منہ پہ نقاب ڈالے آئی۔ سمدھی کو ادب سے سلام کیا۔ حاجی علی نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور تیوری چڑھا کر کہنے لگا۔

"ہاں تم سنو۔ اسلام کے احکام صاف ہیں۔ بتاؤ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

یہ کہہ کر حاجی علی نے تھیلی کی طرف اشارہ کیا۔ قدریہ خانم نے سانپ کا

سر اور بچھو دیکھے۔ تو چیخ مار کر کھڑی ہو گئی۔

حاجی علی نے فوراً کہا۔ اِس سوانگ کو رہنے دو۔ بہت مذاق ہو چکا۔ انجان بننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بتاؤ تم نے میرے لڑکے پر جادو کیوں کیا ہے؟"

قدریہ خانم کو یہ سن کر بہت تکلیف ہوئی۔ کہنے لگی:۔

"آپ میری توہین کر رہے ہیں۔"

حاجی علی نے چلا کر جواب دیا۔ بے شک ہم دیہاتی ہیں۔ مگر تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ دیہاتی اس قدر بے وقوف ہوتے ہیں کہ جادو بھی پہچان نہ سکیں۔"

یہ کہہ کر حاجی علی نے اپنے لڑکے، صلاح الدین کی طرف اشارہ کیا اور سمدھن سے باتوں کا سلسلہ جاری رکھا:۔

"اس لڑکے کو دیکھو، پھول تھا، مگر اب کُمھلا کر رہ گیا ہے تمہارا اور تمہاری لڑکی کا تو غلام بن گیا ہے۔ مگر اپنے ماں باپ سے برگشتہ ہے یہ جادو نہیں تو اور کیا ہے، تمہاری لڑکی نے اس گھر میں آنے کے بعد گانے بجانے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ اولاد تک پیدا نہ کر سکی۔ تمہاری لڑکی میرے کس کام کی ہے جب کہ میری اس سب جائداد کا وارث تک پیدا نہیں کر سکتی۔ صلاح الدین لاولد رہ گیا۔ تو میرا خاندان مٹ جائیگا تمہیں یہ مشہور مثل تو معلوم ہی ہے۔ کہ جو درخت پھل نہ دے اُسے کاٹ ڈالنا چاہیئے۔ یہ جادو کی تھیلی، میرے لڑکے کے سرہانے تم نے رکھی ہے یا تمہاری لڑکی نے؟"

قدریہ خانم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس نے عمر بھر کبھی کسی کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں سُنے تھے سب لوگ اُس کی عزت کرتے تھے۔ کیونکہ بہت شریف، بہت معزز اور مہذب خاتون تھی۔ حاجی علی کی گفتگو سے اُسے ایسا صدمہ ہوا کہ روتے روتے دفعتاً ہنس پڑی، اور کہنے لگی۔

"جب سے میں اِس گھر میں آئی ہوں، اسی قسم کی خرافات کے چرچے سن رہی ہوں۔ تم لوگوں کو شروع سے یقین ہے۔ کہ میں اور میری بیٹی، دونوں جادوگر ہیں۔ میں ہنسنے کے سوا تمہیں اور کیا جواب دے سکتی ہوں؟"

حاجی علی ہنسنے کا تاثر سمجھ نہ سکا۔ خیال کیا۔ اُس کا مذاق اُڑا رہی ہے۔ غصہ سے دانت پیس کر چلّایا۔ "اگر کوئی شریف عورت ہوتی تو ہنسنے کی جگہ روتی۔ مگر میں تمہیں کیا کہوں!"

قدریہ خانم نے حاجی علی کو حقارت سے دیکھا۔ پھر صلاح الدین کو ایسی نظر سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہے۔ باپ کو بدتمیزی سے باز رکھ۔ صلاح الدین اپنے باپ کے قریب گیا اور خوشامد کرنے لگا۔ مگر حاجی علی نے اُسے دھکا دے کر دُور کیا اور دانت پیس کر کہنے لگا۔

"بے وقوف تو نکما کمزور لڑکا ہے۔ آج سے تیری حفاظت اور نگہبانی میں کروں گا۔"

قدریہ خانم نے منہ بنا کر کہا۔ "یہ سب حماقت و جہالت ہے۔ ہم لوگ جادو کے قائل ہی نہیں ہیں۔ جادو پر بے وقوف ہی یقین کرتے ہیں!"

حاجی علی کو جادو کے اِس انکار پر بہت غصہ آیا۔ کیونکہ جادو کا بڑا قائل

تھا۔ سمد حسن سے بدلہ لینے کے خیال سے کہنے لگا۔" اچھا اور اپنی لڑکی کے بانجھ ہونے کے بارے میں کیا کہتی ہو؟ دیکھو کتنی بڑی جائداد میرے پاس ہے۔ اگر صلاح الدین، لاولد مر گیا۔ تو اس کا وارث کون ہوگا؟ اِس سے بڑھ کر اور جرم کیا ہو سکتا ہے۔ کہ تمہاری لڑکی بانجھ ہے، ہاں تم، غور سے سُنو۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم تم سو برس بھی ساتھ رہیں گے تو بھی ہمارے دِل مل نہ سکیں گے۔ تمہارا راستہ الگ ہے ہمارا راستہ الگ ہے۔ تم اپنی راہ چلو۔ ہم اپنی راہ چلتے رہیں گے۔ نکاح بھی حلال ہے اور طلاق بھی حلال ہے۔۔۔۔۔۔!"

صلاح الدین نے باپ کی زبان سے طلاق کا لفظ سُنا تو خوفزدہ ہو گیا۔ قدموں پر گر پڑا اور خوشامد شروع کردی۔ مگر حاجی علی نے اُسے ٹھکرا دیا۔ اور اپنے فیصلے پر اڑا رہا۔

قدریہ خانم نے دیکھا کہ اُس کی لڑکی، سازش پر قربان ہو رہی ہے۔ قدریہ اُن ماؤں میں سے تھی جو اولاد کے لئے سب کچھ کر گذرتی ہیں۔ فوراً کہنے لگی:۔

" میری لڑکی کو طلاق دینے کی ضرورت کیا ہے؟ اصلی قصور وار میں ہوں۔ یہ جادو میں نے ہی کیا تھا۔ حکمت بالکل بے گناہ ہے صرف مجھے سزا دو۔!"

حاجی علی نے غصّہ سے جواب دیا کہ وہ بانجھ عورت کو اپنے گھر میں رکھ نہیں سکتا۔ ساتھ ہی قدریہ خانم کو سخت لفظ کہے۔ صلاح الدین نے یہ سب سُنا تو بے ہوش ہو گیا۔ اُس کی ماں شریفہ چلا اُٹھی:۔

"آہ میرا بیٹا، عورتوں کو خدا مارے۔ میرے بچے کو کھا ہی کے چھوڑیں گی!"
صلاح الدین کو اٹھا لیا گیا۔ منہ پر گلاب چھڑکا گیا۔ لیکن حاجی علی پر اپنے لڑکے کی اس حالت کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے لٹے بیہوش صلاح الدین کو غصّے سے دیکھا اور کہنے لگا۔

"یہ مرد ہی نہیں ہے! مرد ہی نہیں ہے۔ طلاق ضروری ہے۔ آج نہیں تو کل!"

حکمت اپنے کمرے میں بیٹھی پیانو بجا رہی تھی۔ باجے سے نہایت ہی غمناک نغمے نکل رہے تھے۔ نغمے نہیں تھے خود حکمت کے اداس دل کی آہیں تھیں وہ پیانو بجا رہی تھی اور اپنی حالت پر افسوس کرتی جاتی تھی۔ اس گھر میں سب لوگوں کو اس سے نفرت تھی۔ حتیٰ کہ نوکر چاکر بھی منہ آنے لگے تھے۔ کھلے خزانے اس کی تحقیر کرتے تھے۔ مگر اپنے شوہر، صلاح الدین سے محبّت کرتی تھی۔ اس لئے سب ذلتیں اور مصیبتیں سہہ رہی تھی۔ لیکن صلاح الدین کمزور دل کا آدمی تھا۔ ذرا سی مشکل پیش آجاتی تو رونے لگتا تھا۔ حکمت کو اس کی اس حالت سے بہت رنج تھا۔ چاہتی تھی۔ اس کا شوہر بہادر اور مضبوط ارادے کا آدمی بن جائے۔

(۴)

حکمت انہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کسی کے آنے کی چاپ سنی اس نے پیانو چھوڑ دیا۔ اور دروازے کی طرف مڑی۔ پھر مسکرا کر کہنے لگی:-

"اچھا تم ہو نجم الدین!"

نجم الدین کے ہاتھ میں ایک خوبصورت چڑیا تھی۔ حکمت نے چڑیا دیکھی تو خوش ہو گئی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور پیار کر کے کہنے لگی "تمہیں کہاں ملی؟"

نجم الدین نے عجیب نظروں سے حکمت کو دیکھ کر جواب دیا۔

"جب سے تمہاری چڑیا مری ہے، میں دیکھ رہا ہوں، بہت رنجیدہ رہتی ہو۔ تمہارے رنج سے مجھے بھی رنج تھا۔ اسی رنج نے مجھے مجبور کیا کہ جنگل جاؤں اور وہاں ایک ہفتہ تک رہوں۔ روز جال لگاتا تھا۔ مگر یہ چڑیا پھنستی نہ تھی۔ میں اسی کو پکڑنا چاہتا تھا۔ کیونکہ تمہاری چڑیا سے بہت ملتی جلتی ہے۔ آخر پھنس ہی گئی۔ اب یہ تمہارے لئے حاضر ہے اسے پالو اور اپنا رنج بھول جاؤ۔"

حکمت نے شکریہ ادا کیا اور چڑیا رکھ لی۔

حکمت کو نجم الدین سے ہمدردی تھی۔ کیونکہ اس کے سسر کے گھر والے نجم الدین سے بھی جلتے تھے۔ اسے برا بھلا کہا کرتے تھے۔ صرف اس لئے کہ نجم الدین نے ایک فرانسیسی لڑکی کے پیچھے خودکشی کرنا چاہی تھی مگر خدا نے نجم الدین کے زخم اچھے کر دیئے اور جان بچ گئی۔ نجم الدین صلاح الدین کے لئے کا سگا چچازاد بھائی تھا اور اسی کے ساتھ رہتا تھا بے روزگار تھا۔ اسی لئے گھر والے اسے ایک بوجھ سمجھتے تھے۔

حکمت کی طرح نجم الدین بھی اس گھر میں آرام سے نہ تھا اسلئے حکمت

اُس سے ہمدردی رکھتی تھی۔ دونوں گھنٹوں بیٹھے موسیقی، ادب، شاعری تاریخ اور دوسرے علوم و فنون پر گفتگو کیا کرتے تھے۔

حکمت نے چڑیا اپنے ہاتھ پر بٹھاتے ہوئے کہا:۔

"نجم الدین، تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے آجانے سے مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے۔ میں اپنے غم تھوڑی دیر کے لئے بھول جاتی ہوں۔ افسوس اس گھر کے لوگوں کے دلوں پر میں قبضہ نہ کر سکی۔ جب کبھی میں نے اُن کی طرف رُخ کیا۔ اُنہوں نے مجھے ٹھکرا دیا۔ خود تمہارے ساتھ بھی اُن کا یہی برتاؤ ہے۔ حالانکہ تم حاجی علی کے سگے بھتیجے ہو۔ میں تمہیں اپنا دوست اور ہمدرد سمجھتی ہوں۔ لیکن صاف دل ہوں۔ اور ایک بات صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہوں۔ میری تم سے درخواست ہے کہ پھر کبھی مجھ سے محبت کا اظہار نہ کرنا، جیسا تم برابر کرتے رہے ہو۔ تم یہ حرکت پھر کبھی کرو گے تو تم سے ملنا ہی موقوف کر دوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم آپس میں سچے دوست اور ہمدرد بنیں۔ اور ایک دوسرے کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کریں۔"

نجم الدین نے بناوٹی تعجب ظاہر کر کے جواب دیا "میں سمجھا نہیں تمہارا مطلب کیا ہے؟"

حکمت نے کہا۔

"فرض کرو تم کسی خوبصورت کنواری سے محبت کرو اور اُس سے تمہاری شادی بھی ہو جائے تو کیا اُس سے بیوفائی گوارا کرو گے؟"

نجم الدین نے جواب دیا "کبھی نہیں!"

"اسی طرح دوسروں کو بھی سمجھو کہ اپنی محبت سے بیوفائی نہیں کر سکتے"۔
نجم الدین چپ ہو گیا۔ پھر اپنے سر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔
"یہاں سر میں گولی لگی تھی۔ اب تک میرا دماغ قابو میں نہیں ہے۔
میری غلطی معاف کر دو"۔

حکمت نے عذر قبول کرتے ہوئے سوال کیا "مگر تم نے خودکشی آخر کرنا ہی کیوں چاہی تھی؟"

نجم الدین نے پورا واقعہ بیان کر دیا کہ کس طرح ایک فرانسیسی لڑکی سے محبت کی تھی۔ مگر جب وہ دوسرے شخص کے ساتھ چلی گئی۔ تو نا امیدی اور حسرت کی وجہ سے اُس نے اپنے سر پر پستول مار لیا تھا۔

حکمت نے پھر سوال کیا۔
"کیا وہ لڑکی تمہارے زخمی ہونے کا حال سن کر ہاسپٹل میں نہیں دیکھنے آئی تھی؟"

نجم الدین نے جواب دیا "ہاں آئی تھی۔ بلکہ وہی میری تیمارداری کیا کرتی تھی"۔

حکمت نے پوچھا "کیا اُسے معلوم تھا۔ کہ تم نے اُس کی محبت کے جوش میں یہ حرکت کی ہے؟"

نجم الدین نے جواب دیا "میں کہہ نہیں سکتا۔ خود میں نے اُس پر کبھی نہ اپنی محبت ظاہر کی تھی نہ کبھی اُس کے الگ ہو جانے کی شکایت کی تھی۔ کیونکہ مجھے پہلے سے معلوم تھا اُس کی منگنی ہو چکی ہے"۔

حکمت نے کہا "اُسے ضرور تمہاری محبت کی خبر ہو گئی ہو گی کیونکہ عورت کا دل محبت کو فوراً جان لیتا ہے"

نجم الدین نے ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگا "اگر یہی بات ہے تو ضرور تم بھی سب کچھ جان چکی ہو گی!"

حکمت نے خوفزدہ ہو کر سر اُٹھایا اور کہنے لگی "یعنی کیا؟"

نجم الدین نے بہت گڑگڑا کر کہا "کیا آج تک تمہیں معلوم ہی نہیں کہ میں دو برس سے تمہاری محبت کا شکار بن چکا ہوں"

حکمت بہت خفا ہوئی کہنے لگی۔

"خبردار مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔ کیا تم بھول گئے کہ میں تمہارے سگے چچیرے بھائی کی بیوی ہوں۔ افسوس تم نے مجھ پر بڑا ظلم کیا اُس سچی اور پاک ہمدردی کو اپنے پیروں سے روند ڈالا۔ جو میرے دل میں تمہارے لئے تھی!"

نجم الدین نے نگاہیں نیچی کر کے جواب دیا۔

"بہت شرمندہ ہوں کہ ایسی بات منہ سے نکل گئی۔ واقعہ یہی ہے کہ میرا دماغ ابھی تک ٹھیک نہیں ہے مجھ پر کبھی کبھی عجیب قسم کا دورہ ہو جاتا ہے اور بکواس شروع کر دیتا ہوں۔ اُمید ہے ہماری دوستی اس میری بیوقوفی کے بعد بھی باقی رہے گی"

حکمت نے کہا "میں تمہارا یہ عذر قبول کرتی ہوں مگر وعدہ کرو پھر کبھی اِس قسم کی شرمناک بات زبان پہ نہیں لاؤ گے"

نجم الدین نے قسم کھانا چاہی۔ لیکن حکمت نے اُسے روک دیا۔ اور کہنے لگی :

"نہیں قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔ اصل میں غلطی خود میری ہے میں جانتی تھی۔ تم نوجوان ہو۔ مجھے نہیں چاہئے تھا تم سے اس قدر رسم بڑھاتی۔ لیکن مَیں بھی کیا کرتی۔ اس گھر میں میرا کوئی دوست ہی نہیں"

یہ کہہ کر حکمت نے سوچنا شروع کیا کہ اُس کی جان کیسے عذاب میں مبتلا ہے۔ کس طرح تنہائی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ خود اُس کے شوہر نے بھی کس طرح بے رُخی برتنا شروع کر دی ہے۔ مجبور تھی کہ کسی سے تو اپنے دل کا حال کہے۔ پورے گھر میں کوئی ایک آدمی بھی اُس کا روادار نہ تھا۔ بس اکیلا یہی نوجوان، نجم الدین تھا۔ جو اُس سے ہمدردی کرتا تھا۔ اپنی مصیبت اُس سے بیان کرتا تھا۔ اور اُس کی مصیبت خود سنتا تھا۔ ہوتے ہوتے دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔ اور مل کر خوشی حاصل کرنے لگے۔ لیکن اس میل جول کا نتیجہ وہ نکلا، جس کا حکمت کو وہم بھی نہ تھا۔ نجم الدین اس پر عاشق ہو گیا۔ حالانکہ وہ خود اپنے شوہر صلاح الدین سے سچی محبت کرتی تھی۔ اور ذرا بھی بے وفائی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لئے بہت تیز اور مضبوط آواز میں نجم الدین سے کہنے لگی :

"خوب کان کھول کر سن لو۔ مَیں اپنے شوہر سے محبت کرتی ہوں۔ وہ کتنا ہی بُرا ہو۔ مگر میں اُسے چھوڑ نہیں سکتی۔ اُس کے سوا کسی اور کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لا سکتی۔ مَیں کوئی آوارہ عورت نہیں ہوں۔

میری تربیت ہی ایسی ہوئی ہے۔ کہ کوئی بے وفائی مجھ سے سرزد ہی نہیں ہو سکتی۔ میں زمانہ کی سختیوں اور قسمت کی نیرنگیوں کا بہادری سے مقابلہ کروں گی۔"

نجم الدین نے چاہا اپنی نیک نفسی اور پارسائی ثابت کرے۔ مگر حکمت نے بولنے نہیں دیا۔ کہنے لگی:۔

"میں اس قسم کی پہاکاری کے بولوں پر یقین ہی نہیں کرتی۔ مجھے معلوم ہے محبت، بڑی سازشی اور مکار ہوا کرتی ہے۔ شروع شروع میں بہت نیکی اور پرہیزگاری کا جامہ پہن کر سامنے آتی ہے پھر فوراً جرم و بدکاری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہاری بیماری کی دوا صرف ایک ہے اور وہ دوا دائمی جدائی ہے!"

نجم الدین نے یہ سنا تو جوش سے کہنے لگا۔

"حکمت کیا کہتی ہو؟ میں اور تمہیں بے وفائی اور بدکاری پر آمادہ کروں! تم شریف خاتون ہو۔ میری التجا تم سے بس اتنی ہی ہے کہ کبھی کبھی مجھے اپنے پاس آنے دو۔ اور ہمیشہ کے لئے میری طرف سے ڈر اپنے دل سے نکال دو!"

حکمت نے جواب دیا:۔

"ڈرتی وہی عورت ہے جس کا دل کمزور ہوتا ہے۔ میں نہیں ڈرتی کیونکہ میرا دل مضبوط ہے۔ اور مجھے اپنے آپ پر پورا بھروسہ ہے ہاں تم کمزور ہو۔ اصلی خطرہ تمہیں ہے نہ کہ مجھے!"

یہ سنتے ہی نجم الدین کی عجیب حالت ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ اُس پر دماغی دورہ طاری ہو گیا ہے۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اور غصہ سے کانپتے ہوئے چلا اٹھا۔

"کیا بکتی ہے؟ میں چاہوں تو آج ہی رات تجھے اپنے کمرے میں اٹھا لے جاؤں!"

حکمت ڈر گئی۔ کہنے لگی:"معلوم ہوتا ہے تم پر دورہ شروع ہو گیا ہے؟"

نجم الدین نے اپنی ران پر زور سے گھونسہ مارا اور کہا"بے شک جب چاہوں، تمہیں سر کے بل میرے کمرے میں آنا پڑے گا۔"

حکمت کو بہت تعجب ہوا کہنے لگی"آخر تم کس زور سے مجھے مجبور کر سکتے ہو؟ معلوم ہوتا ہے۔ بلاوجہ بک رہے ہو یا دیوانے ہو گئے ہو!"

نجم الدین نے اور زیادہ غصے سے جواب دیا"زور؟ ——

سنو، میں تمہیں خودکشی کر لینے کی دھمکی دوں گا۔ اور تم میری جان بچانے کے لئے میرا حکم ماننے پر مجبور ہو جاؤ گی!"

حکمت تمسخر سے ہنسی اور کہنے لگی"ایسی کھوکھلی دھمکیاں مجھے ڈرا نہیں سکتیں!"

نجم الدین نے جواب دیا"اچھی طرح جانتی ہو کہ میں جھوٹ بول نہیں رہا۔ تمہارے سامنے میری سچائی کا ثبوت، یہ میرے سر میں موجود ہے، کیا تم بھی چاہتی ہو کہ ایک چھوٹا سا تجربہ کر کے تمہیں بھی دکھا دوں۔ ابھی ایک سیکنڈ کے بعد میری لاش، خاک و خون میں پڑی لوٹ رہی ہو گی!"

حکمت ڈر گئی۔ جانتی تھی کہ یہ شخص جوش میں آ کر ضرور خودکشی کر لے گا اسی لئے کہنے لگی "ٹھہرو۔ مجھ سے ذرا باتیں کر لو"

(۵)

عین اُسی وقت کسی کے آنے کی چاپ سنائی دی۔ حکمت نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ حکمت کی ماں کمرے میں آئی۔ اور بیٹی کی آنکھیں لال دیکھ کر کہنے لگی:۔

"بیٹی، میرے واقعہ کی تجھے کس نے خبر دی؟"

حکمت نے جواب دیا "اماں کسی نے بھی مجھ سے کچھ نہیں کہا ہے میرے آنسو یونہی خود بخود نکل آئے تھے"

واقعی حکمت کو اُس بات چیت کی ذرا خبر نہ تھی جو اُس کے سسر اور ماں میں ابھی ابھی ہوئی تھی۔ اور جس کی وجہ سے ماں نے اس کے گھر سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر ماں سمجھی کہ حکمت چھپا رہی ہے کہنے لگی "کیوں چھپاتی ہو؟ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہے ضرور لوگوں نے تمہیں رتی رتی کی خبر دے دی ہوگی۔ بیٹی! المختصر مجھے تیرے فائدے کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دینا چاہیے۔ میں اس گھر سے جا رہی ہوں!"

حکمت اُچھل پڑی اور حیرت سے چلائی۔ "کیوں؟ آخر کیوں یہاں سے جا رہی ہو؟ تم اپنے آپ کو کیوں قربان کرنا چاہتی ہو؟ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

ماں نے سنجیدگی سے جواب دیا" میں کل استنبول چلی جاؤں گی"۔
حکمت اور زیادہ پریشان ہوئی۔ اور سر پیٹ کر کہنے لگی "آخر کیا ہوا امّاں؟
ماں نے جواب دیا" بیٹی! تیری خوشی کے خیال سے میرا چلا جانا ہی ضروری ہے"۔
حکمت نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور رو کر کہنے لگی۔
"تمہاری جدائی کے بعد مجھے چین بل نہیں سکتا۔ جانتی ہوں اس گھر میں چار برس سے تم کس عذاب میں مبتلا ہو۔ لیکن بتاؤ تمہیں ہوا کیا؟ خدا کے لئے مجھ پر ترس کھاؤ۔ سب صاف صاف کہہ دو"۔
ماں نے طعنہ زنی کے لہجہ میں جواب دیا" ہوا یہ کہ میں نے تمہارے شوہر پر جادو کر دیا ہے! لیکن گھر کے عقلمند لوگوں نے میرا جادو پکڑ لیا ہے! اب وہ نہیں چاہتے کہ جادوگرنی اُن کے گھر میں رہے"!
حکمت نے روتے ہوئے کہا" امّاں، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم نے تو آج تک کبھی کوئی بات جھوٹ کہی نہیں۔ تم تو جادو کی قائل بھی نہیں ہو"۔
ماں نے جواب دیا" ہاں بیٹی، عمر بھر میں آج پہلی دفعہ مجھے تیری بھلائی کے لئے جھوٹ بولنا پڑا ہے۔ جھوٹ نہ بولتی تو تجھ پر آفت آجاتی۔ یہ لوگ تجھے جادوگرنی قرار دے دیتے۔ دراصل انہوں نے یہ سازش تم ہی کو پھنسانے کے لئے کی تھی۔ لیکن میں نے الزام اپنے سر اوڑھ لیا اور تم اُن کے شر سے بچ گئیں"!

حکمت زور سے چلائی "خدا کی پھٹکار اُس گھر پر! کل میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی جس طرح ان لوگوں نے تمہاری ذلت کی ہے۔ اُسی طرح میں بھی ان کی ذلت کروں گی ـــــــ سب کے منہ پر تھوک کر چلی جاؤں گی!"

ماں کے بھی آنسو نکل آئے۔ کہنے لگی "بیٹی یہ نہ کہو۔ میں نے تمہیں ہمیشہ یہی تعلیم دی ہے کہ عورت کے لئے اُس کا گھر کعبہ ہے۔ خبردار، نہ اپنا گھر چھوڑو نہ اُس کی ذلت کرو۔"

یہ کہہ کر حکمت کی ماں، نجم الدین کی طرف مڑی اور کہنے لگی:۔
"جانتی ہوں، اس گھر میں میری اکلوتی کا کوئی نہیں ہے۔ اب میں اسے تمہارے سپرد کرتی ہوں!"

حکمت نے فوراً کہا "لیکن نجم الدین خود ہی کل سفر کر رہا ہے۔ پھر مجھے کسی کی حمایت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

(۶)

حاجی علی کا خاندانی یہودی ڈاکٹر ابراہیم، بڑا چالاک آدمی تھا۔ خوب جانتا تھا۔ روپیہ کس طرح اینٹھا جاتا ہے۔ جب اُس نے دیکھا کہ حاجی علی اس بات کے لئے بیقرار ہے کہ پوتا پیدا ہو جائے۔ تاکہ اُس کے خاندان کا نام زندہ رہے۔ تو ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔ حکمت کا علاج، بجلی کے ذریعے سے کیا جائے۔ حاجی علی فوراً راضی ہو گیا۔ اور ڈاکٹر نے علاج شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ محض دھوکا تھا، اور اس سے مقصد، حاجی علی کو ٹھگنا تھا۔

لگاتار ایک مہینے سے علاج جاری تھا۔ مگر کوئی نتیجہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اسی لئے آج جب حکمت نے ڈاکٹر ابراہیم کو بجلی کا صندوق لاتے دیکھا تو کہنے لگی "اب وقت آگیا ہے کہ اس مذاق کو ختم کر دیا جائے"

ڈاکٹر نے مصنوعی تعجب سے سوال کیا "کونسا مذاق؟"

حکمت نے سنجیدگی سے جواب دیا "بجلی سے علاج کرنے کا مذاق۔"

ڈاکٹر نے کہا "معلوم ہوتا ہے تم خود مجھ سے مذاق کر رہی ہو"

حکمت نے جواب دیا۔ "میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اب اپنے اس ڈھکوسلے کو رہنے دو"

ڈاکٹر نے انجان بن کر کہا "میں اب تک کچھ سمجھ نہ سکا"

حکمت کہنے لگی "تم سب کچھ سمجھتے ہو۔ مگر لوگوں کو بے وقوف بناتے ہو مجھے جواب دو کیا تمہارے خیال میں کبھی میں بانجھ ہوں؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ خرابی صلاح الدین میں ہے نہ کہ مجھ میں؟ کیا تم نے استنبول کے ڈاکٹروں کی رپورٹیں نہیں پڑھیں جنہوں نے معائنہ کرنے کے بعد بالاتفاق فیصلہ کر دیا ہے کہ صلاح الدین کے اولاد پیدا ہی نہیں ہو سکتی؟"

ڈاکٹر ابراہیم نے جواب دیا "بیگم، وہ سب ڈاکٹر دغا باز اور جھوٹے ہیں"

حکمت نے ذرا غصے سے کہا "لیکن تم سب کو دھوکا دے رہے ہو"

ڈاکٹر نے کہا "بجلی کا علاج تمام یورپ میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اس

علاج سے بہت عورتوں کے اولاد پیدا ہو چکی ہے۔"

حکمت نے کہا "جھوٹ بولتے ہو۔ تمہارا پیشہ ہی یہ ہے کہ جھوٹ بول کر مالداروں کو لوٹو۔"

ڈاکٹر نے شرمندہ ہو کر کہا "میں کیا جواب دوں۔ بے شک تمہارا مزاج عصبی ہے۔ بہت غصہ ور ہو۔"

حکمت نے اور زیادہ بگڑ کر جواب دیا۔ "تم مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ اگر واقعی تم سمجھتے ہو کہ میں بانجھ ہوں، تو میرے سسر کی طرح تم بھی جاہل ہو۔"

ڈاکٹر نے خوشامد کے لہجے میں کہا "مہربانی کر کے آہستہ بولو۔ ایسا نہ ہو کوئی سن لے۔"

حکمت اور زیادہ چلا کر کہنے لگی "میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ میں ابھی جا کر سب کو جھڑکوں گی، سب کی تحقیر کروں گی۔ اور صاف کہدوں گی، تم سب جاہل اور بیوقوف ہو۔"

ڈاکٹر نے اور زیادہ خوشامد شروع کی تو حکمت نے کہا۔ "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ خرابی صلاح الدین میں ہے نہ کہ مجھ میں۔ پھر تم نے گھر والوں کے ساتھ ہو کر مجھے بانجھ کیوں قرار دیا؟"

ڈاکٹر نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا "فرض کرو میں سچی بات کہدوں تو کیا یہ لوگ یقین کر لیں گے؟"

حکمت نے کہا "تم اس خاندان کا علاج معالجہ پچیس برس سے کر رہے

ہو۔سب تم پر بھروسہ کرتے ہیں۔ پھر یہ بات نہ یقین کریں گے؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ اِن لوگوں کو مجھ پر بھروسہ اسی لئے ہوتا ہے، کہ میں ہمیشہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا ہوں۔"

حکمت ہنس پڑی۔ "تم بھی عجیب آدمی ہو۔"

ڈاکٹر نے کہا "بیگم تم ابھی اپنے سسرال والوں کے مزاج سے واقف نہیں ہو۔ تمہارا سسر حامی علی جاہل، مغرور اور متعصب آدمی ہے۔ اپنی بات کے سوا کسی کی بات مانتا ہی نہیں۔ اگر میں اُس کی ہاں میں ہاں نہ ملاؤں اور سچی بات ظاہر کر دوں تو فوراً کان پکڑ کے مجھے نکال دے گا۔ اور نئے ڈاکٹر کو مقرر کر لے گا۔ اگر یہ نیا ڈاکٹر بھی سچا ہو گا۔ تو اُسے بھی برطرف کر دے گا۔ برابر ڈاکٹروں کو بدلتا رہے گا۔ یہاں تک کوئی عقلمند ڈاکٹر مل جائے جو ہر بات میں اُس کی ہاں میں ہاں ملائے۔ خود ہی انصاف کرو میں اپنی روزی کیوں برباد کروں؟"

حکمت نے کہا "مگر تمہیں اپنے پیشے کی عزت کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "سچ ہے مگر روزی پیشے سے مقدم ہے۔ ڈاکٹری میری کس کام کی اگر جیب خالی ہے۔"

حکمت کو پھر غصہ آ گیا "تو تم سب لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو اور خود مجھے بھی۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر جواب دیا "نہیں، بلکہ تم خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو۔ اِن لوگوں کا دعویٰ ہے کہ تم بانجھ ہو، لیکن تم اُن کی تردید کرتی ہو۔

اور کہتی ہو کہ خرابی اُن کے لڑکے میں ہے۔ حالانکہ اگر تم عقلمند ہوتیں تو اس تمام جھگڑے سے بچ جاتیں۔ نہ تم پر کوئی الزام لگاتا نہ تمہیں صلاح الدین کی خرابی بیان کرنے کی ضرورت پڑتی۔"

حکمت نے بڑے تعجب سے سوال کیا "یہ کیسے ڈاکٹر؟"

مکار ڈاکٹر نے اپنا منہ حکمت کے کان کے قریب کر کے کہا "تم ذہین خاتون ہو اور میرا اشارہ تمہیں سمجھ لینا چاہئے۔ بات بالکل آسان ہے۔ کیا یہاں صلاح الدین کے سوا اور کوئی جوان موجود نہیں ہے؟"

حکمت کے گال شرم اور غصے سے سرخ ہو گئے۔ اُس نے فوراً کرسی اٹھا لی اور چلائی "بدمعاش، نکل یہاں سے ورنہ سر توڑ ڈالوں گی۔"

ڈاکٹر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر چلتے چلتے کہتا گیا "اچھی طرح سوچ لو۔ میری تجویز پر عمل کرو گی تو سب خوش ہو جائیں گے۔ سب کو بجلی کے علاج کے معجزے پر یقین آجائے گا۔"

یہ سن کر حکمت نے کرسی ڈاکٹر پر پھینکی۔ مگر وہ تیزی سے بھاگ گیا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد حکمت پر اداسی چھا گئی۔ زندگی ہی سے نفرت ہو گئی۔ شادی پر افسوس کرنے لگی۔ کیونکہ شادی کے بعد ایک دن بھی اُسے خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی شادی نے اُسے ایک ایسے گہرے اندھیرے غار میں گرا دیا تھا کہ باہر نکل ہی نہ سکتی تھی۔ شوہر کا گھر جہل و فساد سے لبریز تھا۔ سسر ناراض تھا کہ اولاد پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ساس سازش کر رہی تھی کہ طلاق ہو جائے۔ ڈاکٹر بدکاری کا مشورہ دے رہا تھا۔ حکمت اب تک

سب سے ڈرتی رہی تھی محض طلاق کے اندیشے سے۔ وہ طلاق کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ شوہر سے سچی محبت کرتی تھی۔ اگرچہ شوہر کمزور ارادے کا آدمی تھا۔ اور اپنی بیوی کی عزت بچا نہیں سکتا تھا۔

(۷)

حکمت اپنی اُداس خیالات میں تھی جبکہ لیلےٰ داخل ہوئی۔ ہاتھ میں دوا کا گلاس تھا جس کی بو دماغ کو پریشان کر ڈالنے والی تھی۔ جب اس نے گلاس آگے بڑھایا تو حکمت جھنجھلا کر چلّا اٹھی۔ "وہی حمل کی دوا! یہ خرافات کب تک جاری رہیگی؟"

لیلےٰ نے جواب دیا "یہ حکمی دوا ہے۔ ساٹھ برس کی ایک عورت کو اسی دوا سے جُڑواں بچے پیدا ہو چکے ہیں۔ جلدی کرو۔ خدا نے چاہا۔ تو دس ہی دن کے اندر نفع ظاہر ہو جائے گا۔"

حکمت نے منہ بنا کر گلاس لے لیا۔ اور سوچنے لگی کہ کسی طرح دوا پھینک دے۔ مگر لیلےٰ سر پہ کھڑی تھی۔ اور اپنی لال لال آنکھوں سے دھمکا رہی تھی۔

حکمت نے دل کڑا کر کے دوا پی لی۔ مگر فوراً تمام بدن میں ایسا معلوم ہوا کہ سنسنی پڑ گئی ہے ایک بجلی ہے جو رگ رگ میں دوڑ رہی ہے۔ حکمت نے ڈر کر سوال کیا "یہ تو کوئی نئی دوا ہے؟ بڑی ہی سخت بدبودار ہے۔"

لیلےٰ نے جواب دیا "نہیں کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اس میں صرف چند ہی اجزا ہیں۔ لونگ، سناگی، سانپ کے سر کا سفوف اور گیدھ

کی بیٹا؟"

یہ سنتے ہی حکمت کو اُبکائی آگئی۔ دوڑ کر کھڑکی پر گئی اور قے کر ڈالی پھر بچھونے پر لیٹ گئی اور کراہنا شروع کر دیا۔ کیونکہ پیٹ میں سخت درد ہونے لگا تھا۔ دفعتاً اُس کی ساس کمرے میں آئی اور کہنے لگی "تو نے قے کیوں کر دی؟ دیوانی ہو گئی ہے۔ بڑی ناسمجھ ہے۔"

حکمت نے روتے ہوئے کہا۔ اماں، مجھے چھوڑ دو......خدا کے لیے مجھ سے نہیں تو نکلواؤ۔"

ساس نے غصے سے جواب دیا۔ ہاں ہماری تو ہر بات بُری ہے۔ میں اس لیے آئی ہوں کہ تمہارے سُسر کا آخری فیصلہ سُنا دوں۔"

حکمت نے خوشامد سے کہا۔ اس وقت مجھے معاف رکھو، بڑی تکلیف میں ہوں۔ دھمکیاں سُن نہیں سکتی۔ جانتی ہوں کیا کہو گی۔ تمہیں تو بس اولاد کی فکر ہے۔"

ساس نے طعن آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "نہیں۔ میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں۔ تم جانتی ہو میری ہی کوشش سے تمہاری شادی ہوئی ہے خدا ہی جانتا ہے۔ مجھے کتنی تکلیف اٹھانا پڑی تھی۔ میں تم پر احسان نہیں جتاتی مگر سچ کہوں گی۔ گاؤں بھر شادی کا مخالف تھا۔ سب کہتے تھے فقیرنی ہے اس کے ماں باپ کے پاس گھر تو انک نہیں مگر میں نے سب کو یہی جواب دیا کچھ پرواہ نہیں۔ ہمارا گھر موجود ہے یہاں چین کرے گی۔ تمہارے باپ پر بھی لوگوں کا اعتراض تھا۔ کہتے تھے۔ ڈاڑھی منڈاتا ہے۔ فرنگی

ٹوپی پہنتا ہے۔ فرنگی زبانیں بولتا ہے۔ نماز روزے کا پابند نہیں۔"

حکمت نے یہ سنا تو اپنی تکلیف بھول گئی۔ اٹھ بیٹھی اور ساس سے کہنے لگی۔" جو چاہو کہہ لو۔ مگر میرے باپ کی توہین نہ کرو۔ وہ میری نظر میں مقدس ہیں۔"

مگر ساس نے جیسے سنا ہی نہیں کہتی رہی" تمہاری ماں پر بھی لوگوں کی زبانیں کھلیں۔ کہا گیا کہ پردہ نہیں کرتی ہیں۔ غیر مردوں سے ملتی اور ہنستی بولتی ہیں۔"

حکمت کو اب اور زیادہ غصہ آیا۔ کڑک کر بولی" میرے ماں باپ کا ذکر کیوں کرتی ہو؟ جو کچھ کہنا ہے مجھے کہہ لو۔"

ساس نے کہا" اچھا سنو۔ تمہیں چاہئے کہ ویسی ہی بن جاؤ جیسے ہم لوگ ہیں۔ ہماری عادتیں اختیار کر لو۔ ہمارے چلن چلو۔ استنبول کے برے طریقے بالکل بھول جاؤ۔"

حکمت نے سنجیدہ ہو کر سوال کیا" اس سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ استنبول کے کونسے طریقے برے ہیں؟"

ساس نے چمک کر جواب دیا" سب ہی طریقے برے ہیں۔ تمہیں چاہئے مہمانوں کے سامنے نہ آیا کرو۔ کسی نامحرم سے بات چیت نہ کیا کرو۔ گاؤں کی عورتوں سے بھی نہ ملو۔ سیر سپاٹا بند کر دو۔ گھوڑے کی سواری چھوڑ دو۔ مردوں کے اطوار تمہیں زیب نہیں دیتے۔ پھر تمہیں وہ میلاد شریف کی رات تو یاد ہوگی اور وہ بے ادبی بھی جو تم نے کی تھی۔"

حکمت نے تیوری چڑھا کر پوچھا "میں نے کیا بے ادبی کی تھی؟"

ساس نے جواب دیا "جب میلاد شریف پڑھا جا رہا تھا۔ اور سب عورتیں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ تو تم نے ہنسنا شروع کر دیا۔ کاش تم جانتیں اُس وقت مجھے کتنی شرمندگی ہوئی تھی"۔

حکمت نے جواب دیا "اماں! میں میلاد شریف پر نہیں ہنستی تھی۔ البتہ مجھے اُس عورت پر ہنسی آگئی تھی۔ جو دیوانوں کی طرح روتی اور دیوار پر سر مار رہی تھی۔ حالانکہ چند ہی روز پہلے پولیس نے اُسے ایک مرد کے ساتھ پکڑا تھا۔ اور تھانے لے گئی تھی"۔

ساس نے خفا ہو کر کہا "فضول نہ بکو۔ تمہیں اُس عورت پر ہنسنا نہیں چاہئے تھا۔ کیا عجب ہے خدا نے میلاد شریف کی برکت سے اُس کا گناہ معاف کر دیا ہو"۔

حکمت کو یہ سُن کر بہت تعجب ہوا۔ کہ اُس کی ساس کو عورت کی آبرو کا کبھی کوئی خیال نہیں ہے پھر وہ تمسخر سے مسکرائی اور کہنے لگی۔ "خیر اور کیا نصیحتیں کرنا چاہتی ہو؟ میں سب پر عمل کروں گی۔ اور نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کروں گی"۔

ساس اس جواب سے خوش ہو گئی۔ اور حکمت کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہنے لگی "ابھی فوراً سب عیسائی کتابیں پھاڑ کے پھینک دو۔ کیونکہ یہ کتابیں کفر اور بدچلنی سکھاتی ہیں"۔

حکمت بے اختیار ہنس پڑی اور کہنے لگی "میں اُسی طرح رہوں گی جس

طرح حکم دو گی۔"

ساس نے بہت سنجیدہ ہو کر کہا "اب میں اصلی بات کہتی ہوں۔ تمہیں اولاد پیدا کرنی چاہیئے۔ میں تمہیں وہ پیغام سنانے آئی ہوں جو تمہارے سسر حاجی علی نے دیا ہے۔"

حکمت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "وہ پیغام کیا ہے؟"

ساس نے جواب دیا "تمہارے سسر نے تمہیں تین مہینے کی مہلت دی ہے۔"

حکمت نے خفا ہو کر پوچھا "اور تین مہینے میں بچہ نہ ہوا تو؟ شاید طلاق اماں! یہی بات ہے نا؟"

ساس نے جلدی سے جواب دیا "نہیں، نہیں، شریعت نے ایک راہ باقی رکھی ہے۔"

حکمت سمجھ گئی کہ اُس کی ساس اپنی بھتیجی زہرہ سے صلاح الدین کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے کہنے لگی "کوئی حرج نہیں کہ زہرہ بھی گھر میں آجائے۔ میری قسمت میں جو لکھا ہے مجھے دیکھنا ہی پڑے گا۔"

(۸)

ساس کے جاتے ہی حکمت کے دل میں سونیا ڈاہ نے بڑی جلن ڈال دی رونے لگی۔ اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر آہستہ آہستہ کہنے لگی "خداوندا! کیا پارسائی محبت، سچائی کی کچھ عزت نہیں!"

دفعتاً اُس کے کان میں ایک آواز آئی۔ پہچان گئی کس کی آواز ہے۔

دوڑ کر بند دروازے پر گئی اور کان لگا دیا۔

نزہہ صلاح سے کہہ رہی تھی "ذرا ٹھہرو، میں کپڑے پہن لوں"

حکمت نے دروازے کے سوراخ سے دیکھا کہ نزہہ اپنے سونے کے کمرے میں سے نکلی، بہت بنی سنوری تھی۔ صلاح الدین اس سے کہہ رہا تھا "آہ نزہہ، آج تو تمہارا حسن غضب ڈھا رہا ہے"

حکمت نے دیکھا کہ نزہہ نے اپنے ہاتھ سے اس کے کمرے کی طرف اشارہ کیا جیسے منع کر رہی ہے کہ زور سے نہ بولو۔ ایسا نہ ہو حکمت سن لے۔ لیکن صلاح الدین نے فوراً جواب دیا "سننے بھی دو مردار کو۔ اُف تم نے تو میرا دل بالکل چھین لیا ہے۔ تمہارے بال اور ہونٹ کیسے خوبصورت ہیں"

حکمت نے یہ سنا تو اس کی عجیب حالت ہو گئی۔ رگوں میں خون جم گیا۔ گرتی پڑتی اپنے پلنگ پر پہنچی اور بے ہوش ہو گئی۔ ہوش اس وقت آیا جب منہ پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا پڑا۔ اس نے آنکھ کھول دی۔ کیا دیکھتی ہے۔ نجم الدین جھکا ہوا ہے اور منہ پر پانی ڈال رہا ہے"

نجم الدین نے کانپتے ہوئے کہا "افسوس، حکمت!"

یہ کہہ کر نجم الدین اس سے لپٹ گیا اور پیار کرنے لگا۔ مگر حکمت نے زور کر کے اُسے دھکا دیا۔ اور کہنے لگی "للہ ترس کھاؤ۔ میری کمزوری اور مصیبت سے فائدہ نہ اٹھاؤ۔ نجم الدین! اس وقت مجھے تمہاری دوستی کی ضرورت ہے۔ گناہ کے خیال سے باز آ جاؤ"

لیکن نجم الدین پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ وہ اُٹھا اور یہ کہتا ہوا پھر

لپٹ گیا "پیاری حکمت! پیاری حکمت! تیری محبت سے میرا دل جل رہا ہے
میں تجھے پوجتا ہوں!"

حکمت نے بہت زور کیا کہ نجم الدین کی پکڑ سے نکل جائے، لیکن کمزوری
اُسے بے بس کر چکی تھی۔ خود بخود اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اُس نے اپنے
آپ کو قسمت کے حوالے کر دیا۔

نجم الدین حکمت کے کمرے سے بہت ڈرا ہوا نکلا۔ دراصل وہ بھاگ
رہا تھا۔ مگر دروازے پر یہودی ڈاکٹر سے ٹکرا گیا۔ جو اپنا بجلی کا صندوق
لئے علاج کرنے آیا تھا۔ ڈاکٹر نجم الدین کی گھبراہٹ دیکھتے ہی سمجھ گیا، کہ
حکمت پر کیا گزری ہے۔ اور مسکرا دیا۔ نجم الدین نے بھی اُس کی شیطانی
مسکراہٹ دیکھ لی۔ سارے بدن سے کانپ اٹھا اور تیزی سے بھاگ گیا۔

(۹)

حکمت کی ماں، قدریہ خانم، اب لوٹ آئی تھی۔ کیونکہ یہ خوشخبری اُسے
پہنچ گئی تھی کہ حکمت کے بچہ ہونے والا ہے۔ دونوں ماں بیٹی بیٹھی تھیں۔
پاس ہی جھولے میں بچہ سو رہا تھا۔ حکمت کی ماں نے کہا "میں تمہاری ساس
سے ملنے جاتی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہا جائے میں نے اُس کی پروا ہی نہیں
کی!"

حکمت نے مسکرا کر جواب دیا "وہ زمانہ لد گیا۔ جب لوگوں کو اعتراض
کرنے کی جرأت ہوتی تھی۔ اب تو اس گھر کی ملکہ میں ہوں۔ کیونکہ ولیعہد
کی ماں بن چکی ہوں۔ جس دن سے بچہ میرے پیٹ میں آیا پورے گھر کی

حالت بدل گئی۔ سب کا غصّہ چلا گیا۔ سب میری عزت کرنے لگے"۔
یہ کہہ کر حکمت نے اپنی ماں کو چمٹا لیا۔ اور کہنے لگی "اب تم ہمیشہ میرے ہی ساتھ رہو گی"۔

ماں نے جواب دیا۔ "مگر میں کیسے رہ سکتی ہوں؟ جانتی ہو، سب کو مجھ سے بغض ہے؟"

حکمت نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کرکے کہا "جب تک یہ جیتا ہے تمہاری طرف کوئی نگاہ بھی اٹھا نہیں سکتا"۔

عین اسی وقت حبشن ماما لیلیٰ آئی اور کہنے لگی "سپہ سالار جواد پاشا آیا ہے اور کہتا ہے کہ حکمت خانم کا ماموں ہے"۔

ماں بیٹی کو جواد پاشا کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی۔ اور انہوں نے ماما سے کہا اسے لے آئے۔

جواد پاشا جنگی وردی پہنے اور بہت سے تمغے لٹکائے اندر آیا۔ اپنی بہن قدریہ خانم سے گلے ملا۔ پھر بھانجی کو چھاتی سے لگایا۔ دونوں خوب روئے، کیونکہ مدت کے بعد ملے تھے۔

جواد پاشا نے کہا "میں پطروگراڈ میں سفیر تھا۔ کہ جنگ شروع ہو گئی پھر مجھے قفقاز کی فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔ اب میں فوج لے کر درہ دانیال آ گیا ہوں"۔

بہن نے کہا "خدا کرے تم یہاں کچھ مدت رہو۔ اور ہم پانچ سال کی جدائی کے بعد تمہیں دل بھر کے دیکھ سکیں"۔

جواد پاشا نے جواب دیا "ہاں، میں یہاں رہوں گا۔ مگر امید نہیں تم سے زیادہ مل سکوں گا۔"

بہن نے کہا "یہ کیسے؟ تم یہاں رہو گے تو روز ہم سے ملنے آیا کرو گے۔"

جواد پاشا نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا "خفیہ خبر ہے۔ کہ اتحادی سلطنتیں درہ دانیال پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ تم جانتی ہو درہ دانیال ہمارے پایۂ تخت کی کنجی ہے مجھے اندیشہ ہے یہ لہلہاتے کھیت اور ہرے بھرے باغ جلد ہی برباد ہو جانے والے ہیں۔ یہاں خون کی ندیاں بہیں گی۔ اسی لئے میں نے حاجی علی نے دو ہفتے کی مہلت مانگی ہے۔ اسی بارے میں گفتگو کرنے کے لئے آیا ہوں۔ اب اجازت دو کہ حاجی علی سے مل لوں۔"

جواد پاشا کے جاتے ہی حکمت کی ساس آگئی۔ اور حکمت کی ماں سے چمٹ گئی۔ پھر چھوٹے آنسو بہا کر کہنے لگی "بڑی مروت ہو بی بی! اتنی دیر سے آئی ہوئی ہو اور بیٹی کے پاس بیٹھی ہو۔ مگر میرا ذرا خیال نہیں۔ آہ، تم کیا جانو مگر خدا جانتا ہے ہر لحظہ میں تمہیں یاد کرتی رہی ہوں۔ اچھا بہن! تم نے نواسے کو بھی دیکھا؟ کیسا اچھا بچہ ہے!"

یہ کہہ کر ساس نے بچہ اٹھا لیا۔ اور پیار کر کے کہنے لگی "کس نام سے پکاروں؟ ابھی تک اس کا کوئی نام نہیں ہے۔"

حکمت کی ماں نے سوال کیا "آخر نام کیوں نہیں رکھا گیا؟"

خانم نے جواب دیا۔ "اس گھر کا دستور ہے کہ خاندان کا سب سے زیادہ بوڑھا آدمی بچوں کے نام رکھتا ہے۔ ہمارے خاندان کا بڑا بوڑھا دریا کے ساحل پر رہتا ہے اُس کی عمر ایک سو آٹھ برس کی ہے۔ وہ آج ہی آئے گا۔ اور بچے کے ہاتھ میں خاندانی خنجر بچھا کر اُس کا نام رکھ دے گا۔"

(۱۰)

"سنگین واقعہ" کے بعد حکمت نے نجم الدین سے صاف کہہ دیا کہ پھر کبھی اپنی صورت اُسے نہ دکھلائے، کیونکہ مجرم ہے۔ اور اُس کی آبرو لے چکا ہے۔ واقعہ حکمت اس واقعہ کے بعد بہت ہی غمگین رہا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بچہ پیدا ہو گیا۔ اُس کی نظر جب بچے پر پڑجاتی۔ تو دل میں سخت ٹیس پیدا ہوتی۔ اپنی برباد آبرو کا خیال آجاتا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے خدا نے اولاد نہ دے دی ہوتی تو حکمت ضرور خودکشی کر لیتی۔ کئی دفعہ اس ارادے سے کھڑکی تک پہنچ بھی گئی لیکن اس لختِ جگر نے آکے زندگی اُس کی نظر میں پیاری بنا دی تھی۔"

واقعہ کے بعد ہی نجم الدین غائب ہو گیا۔ حکمت سمجھی کہیں دُور سفر پر چلا گیا ہے۔ لیکن ایک دن وہ اچانک آگیا۔ سفر کا لباس پہنے تھا۔ داڑھی بکھرا تھا۔ حکمت اپنے بچے کو چوم رہی تھی۔ دفعتاً نجم الدین پر نظر پڑی۔ منہ سُرخ ہو گیا۔ سارے بدن سے کانپنے لگی۔ پھر اپنے آپ کو سنبھال کے کہنے لگی۔ کیوں لوٹ آئے؟ یہاں کیوں آئے ہو؟ تمہارا وعدہ کہاں گیا؟ کیا یہی شرافت ہے؟"

نجم الدین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ شرم سے سر جھکا لیا۔ لیکن حکمت غصہ و جوش سے کھڑی ہو گئی اور چلائی "یہ تم اس لئے آئے ہو کہ مجھے جلاؤ۔ اپنا جرم مجھے یاد دلاؤ۔ نجم الدین! خدا تجھے مارے۔ تو شریف نہیں ہے۔ کمینہ ہے!"

نجم الدین نے جھٹ غمگین ہو کر جواب دیا "خفا نہ ہو۔ میں عمر بھر کے لئے جا رہا ہوں۔ لیکن میری درخواست صرف اتنی ہے کہ ایک لحظہ کے لئے اسے دیکھ لینے دو۔"

نجم الدین نے یہ کہہ کر بچے کے جھولے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر کہنے لگا "اسی کو بس ایک نگاہ دیکھنے اور پیار کرنے آیا ہوں۔ کس منہ سے کہوں تم سے بھی وداع ہونے آیا ہوں۔"

حکمت نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ دل نے کہا، باپ ہے اور اپنے بچے کو دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر بے اختیار یہ سوال کر بیٹھی "کب جا رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟"

نجم الدین نے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ جواب دیا۔ میدان جنگ کو! موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ دائمی راحت کی گود میں جا رہا ہوں۔ کیونکہ میں نے بہت کوشش کی کہ یہاں تسلی پاؤں۔ مگر دل کو قرار نہ آیا موت ہی میرے دل کو ٹھنڈا کر سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر نجم الدین آگے بڑھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ہاتھ پھیلائے تھے۔ اور بڑی لجاجت سے کہہ رہا تھا "اجازت دو۔ بچے

کو بس ایک دفعہ پیار کر لوں۔"

حکمت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن بچے کے منہ پر سے باریک نقاب ہٹا دیا۔ نجم الدین کانپتا ہوا جھولے کے پاس آیا۔ بچے پر جھک پڑا۔ آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر بچے کے منہ پر گرا۔ اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ باپ کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ نجم الدین یہ منظر دیکھ کر بے خود ہو گیا۔ جوش سے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ سینے سے لگا لیا۔ اور چلایا "میرا بچہ! خدایا، میرا بچہ!"

نجم الدین کی زبان سے یہ لفظ پورے بھی ہونے نہ پائے تھے کہ کمرے میں صلاح الدین داخل ہوا۔ اصل میں اس نے سب باتیں دروازے کے اس پار سے سن لی تھی۔ بڑے جوش میں تھا۔ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ تم نے ہی زور سے چلایا "تیرا بچہ؟ یہ تیرا بچہ ہے! خبیث، کمینے دھوکہ باز۔"

یہ کہہ کر نجم الدین پر ٹوٹ پڑا۔ اس کا گلا پکڑ لیا۔ اور پاس کے کمرے میں کھینچ لے گیا۔ نجم الدین پر ایک طرح کی غشی سی طاری ہو گئی۔ صلاح الدین نے اسے زمین پر گرا دیا اور کمرہ بند کرتے ہوئے کہا "یہاں موت کی راہ دیکھ! پہلے میں چھنال سے سمجھ لوں۔"

پھر صلاح الدین، حکمت کے کمرے میں لوٹ آیا۔ اس کے بال پکڑ لیے اور زور سے جھٹکا دے کر چلایا "بے وفا عورت، تو نے یہ کیا کیا؟"

حکمت نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "میرا ذرا قصور نہیں۔"

صلاح الدین جوش سے چلا اُٹھا " تو بدکار ہے، جا، میں نے تجھے تین طلاقیں دے دیں "

یہ سنتے ہی حکمت کے جسم میں نہ جانے کہاں سے قوت آگئی۔ شوہر کی پکڑ سے نکل گئی۔ اور پیچھے ہٹ کر، تن کر کھڑی ہو گئی۔ دلیری سے کہنے لگی " تم نے طلاق نہ دی ہوتی تو بھی مَیں الگ ہو جانے کا اپنے دل میں فیصلہ کر چکی تھی "

صلاح الدین نے دانت پیس کر کہا۔ آخر تُو نے یہ جرم کیوں کیا؟"

حکمت نے جواب دیا " صلاح الدین، انسانیت سے سُنو۔ تم طلاق دے چکے ہو۔ اب نہ میں تمہاری بیوی ہوں، نہ تم میرے شوہر ہو۔ وہ عذاب یاد کرو جو اِس گھر میں مجھے جھیلنا پڑا ہے۔ مَیں نے سب تکلیفیں صرف تمہاری محبت کے چلتے اُٹھائی تھیں۔ تمہارے باپ نے مجھے دھمکی دی کہ تین مہینے کے اندر مَیں حاملہ نہ ہوئی تو مجھے ضرور طلاق دے دی جائے گی۔ پھر مَیں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تم نزہہ سے عشق و محبت ظاہر کر رہے تھے۔ بچہ نہ ہو جاتا تو تم ضرور نزہہ سے شادی کر لیتے مَیں تم سے محبت کرتی تھی۔ اور ڈرتی تھی۔ کہ کہیں تم سے جُدا نہ ہو جاؤں۔ تمہاری اِسی محبت نے مجھے گناہ پر مجبور کیا ہے۔ تم ہی نے مجھے بدکاری کی طرف بڑھایا ہے۔ وہ تمہارا باپ ہے جس نے مجھے آمادہ کیا کہ اپنے شوہر سے غداری کروں۔ اب جو جی میں آئے کرو۔ مَیں اپنے ماموں جواد پاشا کے گھر جاتی ہوں۔ یاد رکھو، میرا اِرادہ اب بھی مَیلا ہو گا تو میرے ماموں

کے ہاتھ سے بڑی بھاری سزا پاؤ گے ۔ دروازہ کھول دو ۔ نجم الدین کو جانے دو ۔ بے شک نجم الدین ہی بچے کا باپ ہے ۔ اسی کو بچے کا کفیل بھی ہونا چاہیے میں عدت گزرتے ہی نجم الدین سے شادی کر لوں گی ۔ سن لیا تم نے ۔ اب جاؤ!"

صلاح الدین نے یہ سنا تو سارے بدن میں رعشہ پڑ گیا ۔ بھونچکا ہو کر رہ گیا ۔ حکمت نے جھپٹا مار کر کمرے کی کنجی اس کے ہاتھ سے چھین لی دروازہ کھولا اور نجم الدین کو باہر لا کر کہنے لگی "یہاں سے چلے جاؤ ۔ مجھے طلاق مل چکی ہے ۔ اب میں آزاد ہوں ۔ اب تمہارا فرض ہے مجھ سے شریفانہ برتاؤ کرو ۔ میرے عیب کو ڈھکو ۔ جو جرم تم نے کیا ہے ۔ اس کا کفارہ یہی ہو سکتا ہے کہ مجھ سے نکاح کر لو ۔"

یہ کہہ کر حکمت نے اپنا اسباب باندھنا شروع کر دیا ۔ نجم الدین جانے لگا تو حکمت نے اسے پکار کر کہا "ابھی فوراً میرے ماموں کے پاس جاؤ ۔ سب کچھ ان سے کہہ دو ۔ یہ بھی کہنا کہ میرے لئے موٹر بھیج دیں ۔"

(۱۱)

صلاح الدین کے ہوش اب ٹھیک ہوئے ۔ حکمت کے کمرے سے نکل کر اپنے باپ حاجی علی کے پاس پہنچا ۔ مگر کچھ نہ کہہ سکا ۔ گم صم کھڑا رہ گیا ۔ حاجی علی نے بیٹے کو اس حال میں دیکھا تو کہنے لگا "کیا ہوا؟ یہ تیری کیا حالت ہو رہی ہے؟"

صلاح الدین نے اکھڑی ہوئی آواز میں جواب دیا "حکمت ......

بچہ .... میں نے خود سن لیا۔"

حاجی علی نے کان کھڑے کئے۔ اور پریشان ہو کر سوال کیا "کیا سُنا؟ بچہ بیمار ہے؟"

صلاح الدین نے جوش سے جواب دیا "نہیں، نہیں ...... آہ میری بے آبروئی!"

حاجی علی نے دہاڑ کر کہا "کیا کہتے ہو؟ بھلا میری بہو میرے گھر میں ایسا کر سکتی ہے؟ عجیب! ...... عجیب! اس بات کا دھڑکا مجھے مدت سے تھا۔ افسوس میری اور خاندان بھر کی ناک کٹ گئی۔"

یہ کہہ کر حاجی علی ایک لمحہ چپ رہا۔ پھر اس نے پوچھا "وہ کون ہے جس نے یہ بدمعاشی کی ہے؟"

صلاح الدین نے جواب دیا "وہ نجم الدین ہے۔"

حاجی علی نے کہا "ناممکن۔ نجم الدین اپنے چچا کے لڑکے کی آبرو خراب ہی نہیں کر سکتا۔"

صلاح الدین نے بڑے جوش و اضطراب کے ساتھ پورا ماجرا سُنا دیا۔ حاجی علی نے سکون سے سب کچھ سن کر سوال کیا۔

"پھر تم نے کیا کیا؟"

صلاح الدین نے جواب دیا "میں نے تین طلاقیں دے دی ہیں حکمت اپنا اسباب باندھ رہی ہے۔ اپنے ماموں جوآد پاشا کو خبر بھیج

چکی ہے۔ موٹر آئی ہوگی۔ حکمت جو آدپاشا کے گھر اٹھ جائے"۔
حاجی علی نے سوال کیا "کیا طلاق کے وقت گواہ بھی موجود تھے ؟"
صلاح الدین نے کہا "نہیں، وہاں ہم دو کے سوا کوئی نہ تھا"۔
حاجی علی نے فوراً کہا "تو پھر طلاق نہیں ہوئی۔ کیونکہ طلاق کے لئے یہ شرط ہے کہ دو معتبر گواہوں کے سامنے دی جائے"۔
صلاح الدین نے بگڑ کر جواب دیا۔ اگر مسئلہ یہی ہے، تو میں گواہوں کے سامنے بھی طلاق دے دوں گا"۔
حاجی علی نے ڈانٹ بتائی "خبردار، ایسا نہ کرنا، کیا تو پاگل ہو گیا ہے ؟"
صلاح الدین کو اپنے باپ کا سکون و اطمینان دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ اور غصے سے کہنے لگا "ابا، کچھ ہو جائے۔ میں اس عورت کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کی خیانت کا حال خود اپنے کانوں سے سن چکا ہوں"۔
حاجی علی نے چلا کر فیصلہ کن لہجے میں کہا "خبردار، طلاق نہ دینا"۔
صلاح الدین نے جواب دیا "مگر میں ایک لحظہ بھی اس عورت کو برداشت نہیں کر سکتا"۔
حاجی علی پھر چلایا "بیوقوف، تو کیا بکتا ہے ؟ کیا تو اپنے خاندان کا دشمن ہے ؟"
صلاح الدین اب حیرت زدہ تھا۔ اُسے یقین تھا۔ کہ باپ جب

حکمت کی خیانت کا حال سُنے گا۔ تو ضرور قتل کر ڈالے گا۔ کیونکہ پرانے خیال کا آدمی تھا۔ اور متعصب مذہبی ہونے کا مدعی تھا۔ وہ حکمت کی ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ "فرنگی اخبار" پڑھنے کی وجہ سے اُسے کافر کہا کرتا تھا۔ مگر اتنا سنگین واقعہ ہو جانے پر بھی وہ چُپ ہے۔ بلکہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ طلاق کبھی نہ دے۔ یہ سوچ کر صلاح الدین کو پھر جوش آ گیا۔ اور چلا اٹھا۔ "میں اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس عورت کو اپنے پاس رکھ ہی نہیں سکتا۔"

حاجی علی نے لڑکے کے کندھے پکڑ کر زور سے ہلائے اور کہا "تو پاگل ہے۔ بیوقوف ہے! خبردار زبان پر طلاق کا لفظ کبھی نہ آئے۔"

صلاح الدین نے کہا "لیکن پہلے تو آپ ہی مجھے مجبور کرتے رہتے تھے کہ طلاق دے دو۔ اب آج آپ کا خیال کیوں بدل گیا ہے؟ بچہ تو آپ کا پوتا نہیں ہے۔"

حاجی علی نے صلاح الدین کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر کے کہا "یہ حکمت کا ماموں جو آدھا شاہ بڑے ایوان میں آیا بیٹھا ہے اگر اُس نے سن لیا کہ کہا تجی کو طلاق ہو گئی ہے تو غضب ہی ہو جائے گا۔"

صلاح الدین نے بے پرواہی سر ہلا کر جواب دیا "میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔"

حاجی علی نے بیٹے کے سینے پر گھونسہ مار کر کہا "تو مرد ہوتا تو بچہ تیرا ہی ہوتا۔ مگر افسوس تو بالکل نکما ہے۔ خبردار طلاق کا نام نہ لینا، کیونکہ

میری تمام جائداد اور دولت اس وقت جواد پاشا کے اختیار میں ہے۔ جواد پاشا نے مجھے ایک مہینے کی مہلت دے دی ہے کہ اپنا تمام سامان یہاں سے منتقل کر دوں وعدہ کیا ہے کہ سرکاری جہازوں پر کارخانے کی مشینیں بھی اندرون ملک کی طرف بھیج دی جائیں گی۔ میں نے اب طے کیا ہے کہ جہازوں کی ایک کمپنی قائم کر دوں جس کا کام یہ ہوگا کہ درۂ دانیال کی جنگ کے زمانے میں فوج کے لیے سامان رسد پہنچائے کیونکہ لڑائی کے دوران میں سرکاری جہاز بار برداری کا کام کر نہ سکینگے جواد پاشا نے مجھے ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس وقت میں کسی حال سے بھی جواد پاشا کو ناخوش کر نہیں سکتا۔ یاد رکھو کبھی طلاق کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ورنہ سارا خاندان برباد ہو جائے گا۔"

صلاح الدین پر اس تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ غصے سے چلایا "مجھے پروا نہیں کہ جائداد اور خاندان کا کیا حشر ہوگا۔ لیکن میں یہ بے آبروئی گوارا نہیں کر سکتا۔"

یہ سن کر حاجی علی غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ دوڑ کر صلاح الدین کے منہ پر طمانچہ لگایا۔ اور کہنے لگا "جب تک میں زندہ ہوں تجھے کوئی اختیار نہیں۔ جب مجھے دفن کر لینا تو جو جی میں آئے کرنا احمق! سوچتا نہیں کہ جواد پاشا نے خود ہی مجھے مشورہ دیا ہے کہ فوج کے لیے رسد پہنچانے کا ٹھیکہ لے لوں۔ اسی قدر نہیں بلکہ ہر قسم کی مدد دینے کا بھی وعدہ کیا ہے۔ یقیناً میری دولت بے شمار ہو جائے گی۔ اور میں ملک

پھر میں سب سے زیادہ روپے والا بن جاؤں گا۔ کیا تُو چاہتا ہے۔ کہ تیری حماقت کے چلتے اِن تمام خزانوں پہ لات مار دوں؟ آہ تو کیسا بیوقوف ہے۔ نادانی نہ کر۔ معاملہ اتنا سنگین نہیں ہے جتنا تو سمجھ رہا ہے"۔

صلاح الدین نے دیدے پھاڑ کر اپنے باپ کو دیکھا۔ گویا اُسے یقین نہیں آیا کہ یہ الفاظ اُسی کی زبان سے نکلے ہیں۔ پھر جوش سے کہنے لگا "کیا میرے کانوں نے ٹھیک سُنا ہے؟ کیا یہ میرے باپ ہی کی گفتگو ہے۔ حالانکہ آپ میں تو اس قدر غیرت تھی کہ عورتوں کو زور سے بولنے پہ مارا کرتے تھے تاکہ نامحرم آواز نہ سُن لیں ۔ ابا ۔ کیا آپ مجھ سے یہ خواہش کر رہے ہیں کہ بدکار، آوارہ، اور غدار عورت کو اپنی بیوی بنائے رہوں۔ حالانکہ غیر آدمی سے بچہ بھی پیدا کر چکی ہے؟"

حاجی علی نے متانت سے جواب دیا "تم مرد ہوتے تو تمہاری بیوی کو کسی اور طرف خیال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ تم میں غیرت ہوتی تو جونہی اس راز سے واقف ہوئے تھے تینوں کو، عورت کو، اُس کے بچے کو قتل کر ڈالتے۔ مگر تم سے یہ کچھ بھی نہ ہو سکا۔ اب وقت نکل چکا ہے۔ اور تمہاری یہ گفتگو بے معنی ہے۔ دیکھو، میرے سوا کوئی اس راز کی بھنک بھی نہ پائے"۔

صلاح الدین نے بڑی نفرت کے ساتھ کہا "ابا، مجھ پہ ترس کھایئے کیا آپ محض روپے کے لالچ میں ذلت کو برداشت کر لیں گے؟ بہ باز

ہو جائے۔ وہ دولت جو ذلّت اور بے آبروئی کی راہ سے آئے"۔

یہ سُن کر حاجی علی اور زیادہ نرم پڑ گیا۔ پھر بیٹے کے قریب آیا اور مدرسے کے معلّم کی طرح ایک ایک لفظ صاف صاف ادا کر کے کہنے لگا "بیٹا جوش سے کام نہ لو۔ تم آج بھی ناتجربہ کار الھڑ لڑکے ہو۔ تمہیں زندگی کی اُونچ نیچ کی کچھ خبر نہیں۔ اس آدمی کی بات توجہ سے سُنو، جو زندگی کا تجربہ کر چکا ہے۔ اور زمانے کے سرد گرم چکھے ہوئے ہے۔ یاد رکھو وہی آدمی دولت مند بن سکتا ہے جو عقل مند ہے اور لوگوں کی بکواس کی پروا نہیں کرتا۔ تمہارے پاس دولت ہے تو کوئی نہیں پوچھے گا۔ کہ کہاں سے تم نے پائی ہے۔ کسی کو جرأت نہ ہوگی کہ سوچے جائز طریقے سے دولت آئی ہے یا ناجائز طریقے سے، سب آدمی روپے کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ اور فقیر کو ٹھوکر مار کر دُور کر دیا جاتا ہے۔ دولتمند کفر کا کلمہ بھی کہے تو سب اُس کی تعریف کرتے ہیں۔ فقیر اچھی سے اچھی بات کہے تو سب اُسے گالیاں دیتے ہیں۔ امیر کی ہر بات اچھی ہے غریب کی ہر بات بُری ہے۔ روپیہ روپے سے آتا ہے۔ علم، مدرسہ، کالج، یونیورسٹی یہ سب چیزیں امیروں ہی کے لئے ہیں۔ عدالت بھی امیروں ہی کے لئے ہے۔ منصف سے منصف عدالت میں بھی غریب کا حق مارا جاتا ہے۔ یاد رکھو، پوری دُنیا صرف مالداروں ہی کے لئے ہے۔ تو بیوقوف ہے کہ دولت پر لات مار کے غربت ذلّت کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔ دولت نہ تقویٰ و عبادت سے ملتی ہے۔ نہ عزّت کے احمقانہ تصوّر سے"۔

(۱۲)

اس خاندان کا سب سے زیادہ معمّر رکن حاجی یاسین اونچی مسند پر قیمتی تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ دائیں بائیں خاندان کے دوسرے افراد ادب و احترام سے بیٹھے ہیں۔ اگر اور لوبان کا دھواں اٹھ رہا ہے

آج حاجی علی کے گھر میں جلسہ ہے۔ کیونکہ اُس کے پوتے کا نام رکھا جانے والا ہے۔

صلاح الدین کی ماں، شریفہ نے چاروں طرف دیکھا مگر حکمت نظر نہ آئی۔ آخر اپنے بیٹے سے کہنے لگی "صلاح الدین، تیری بیوی کہاں ہے؟"

صلاح الدین نے سر کے اشارے سے بتایا کہ پاس کے کمرے میں ہے پھر وہ اُٹھا اور اپنی بیوی کو بُلا لایا۔ جو گود میں بچہ اُٹھائے تھی۔ صلاح الدین نے مجلس میں پہنچ کر بیوی سے کہا "اپنا بچہ میری گود میں دے دو"

یہ کہتے ہی اُس کی نگاہ اپنے باپ حاجی علی کی نگاہ سے مل گئی۔ جو اِس جملہ پر سخت برہم ہو چکا تھا۔ صلاح الدین نے ڈر کر فوراً بیوی سے اِس طرح کہا "لاؤ، میرا بچہ میری گود میں دے دو"

پھر صلاح الدین نے بچے کو حاجی یٰسین کی طرف بڑھایا، جس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے لے کر گود میں لٹا لیا۔ اور دیر تک دعائیں پڑھنے کے بعد چلّایا۔ "مظفر پاشا، مظفر پاشا!"

یہ نام تمام لوگوں کو پسند آیا۔ پھر حاجی یاسین نے اطلس کی تھیلی کھولی اُس میں سے خنجر نکال کر بچے کے پہلو میں رکھ دیا۔ اور اُسے مخاطب کر کے

کہنے لگا "یہ تیرے جدِ امجد کا خنجر ہے۔ جو میں تیرے سپرد کرتا ہوں، خدا کرے تو اس خنجر کو اپنے بیٹوں اور پوتوں کے سپرد کر سکے۔ اور خاندان کے نورِ نظر اور اکلوتے وارث!"

پھر حاجی یاسین نے بچے کو چوما۔ اور صلاح الدین کی گود میں دے دیا، اُس نے بھی اپنے باپ کے خوف سے بچے کا بوسہ لیا۔ اور بیوی کی گود میں دے دیا۔

تقریب اس طرح جب ختم ہوئی۔ تو یہودی ڈاکٹر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر شیطانی تبسّم تھا۔ حاجی علی سے کہنے لگا "دیکھا آپ نے بجلی کے علاج کا معجزہ! اللیے اب میرا انعام"۔

جبشن لیلیٰ فوراً چلا اٹھی "ضرور ضرور! سب محنت تو میں نے کی ہے۔ میری ہی دعا سے تو بہو کے بچہ ہوا ہے۔ خدا جانتا ہے، چڑیوں کی بیٹ جمع کرنے میں مجھے کتنی تکلیف اٹھانا پڑی تھی۔ آج سب سے بڑا انعام مجھے ملنا چاہیے نہ کہ یہودی ڈاکٹر کو"۔

سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ لیکن صلاح الدین نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ تمام حاضرین بیک وقت چلا اُٹھے ......

"صلاح الدین کیوں رو رہا ہے؟"

حاجی علی فوراً کھڑا ہو گیا بیٹے کو چمٹا لیا۔ اور لوگوں سے کہنے لگا۔

"میرا بیٹا مارے خوشی کے رو رہا ہے"۔

پھر اُس نے زور سے صلاح الدین کو داب کر حکم دیا "اپنی بیوی کا

بوسہ لے۔"

صلاح الدین نے بادلِ نخواستہ بوسہ لیا۔ تو حاجی علی نے حکمت سے کہا۔
"تو بھی اپنے شوہر کا بوسہ لے۔ کیونکہ تم دونوں کا لڑکا میرے خاندان کا وارث بن چکا ہے۔"

حکمت نے بھی بوسہ لیا۔ لیکن یہودی ڈاکٹر اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔
"کچھ حرج نہیں۔ خاندان کو وارث تو کسی نہ کسی طرح مل گیا۔"

جب عورت غیرت دلائے

جب سیفی کو بتایا گیا کہ یورپ کا بین الملّی کمیشن اس کا بیان لینا چاہتا ہے۔ تو وہ اپنے صوفے سے جہاں وہ پاؤں پھیلائے لیٹا ہوا تھا۔ پہلے تو اُٹھ بیٹھا، پھر آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ اور اُس نے اپنے آپ پر ایک نگاہ ڈالی۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں غم و غصہ کا اثر تھا نہ رقت اور نرمی کا۔ اُس نے اپنا تمباکو کا ڈبہ جہاں تھا وہیں پڑا رہنے دیا۔ اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُس کے ہمراہی نوجوان افسر نے جو اُسے بلانے آیا تھا جب دو ایک بار سیفی کے سر کو جنبش کرتے دیکھا تو سوچ میں پڑ گیا۔ اور سیفی سے زیادہ خود گھبرانے لگا۔ اُسے ہونے والی ملاقات کے نتیجے کی طرف سے خوف تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس ملاقات کو سمرنا کے بچاؤ کے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ وہی سمرنا جس کے کھیت سوکھ گئے تھے جس کے پھول مرجھا گئے تھے۔ اور جس میں ہر طرف کھنڈر ہی کھنڈر نظر آ رہے تھے۔ اور جہاں کے اینٹ پتھر کے ڈھیروں کے نیچے وہاں کے رہنے والے بے شمار مردوں اور عورتوں اور بچوں کی

لاشیں دبی پڑی تھیں۔ اس نوجوان افسر کا فرض بس اسی قدر تھا۔ کہ جو شخص شہادت دینے آئے وہ مجلس کے مکان تک اُس کی مشایعت کرے۔ اور اُس کو کمرے میں داخل کر دینے کے بعد دروازہ بند کر کے خود باہر بیٹھا اُس کی واپسی کا انتظار کرتا رہے۔ اس مدّت میں اُس کا دل زور زور سے دھڑکا کرتا تھا۔ اور ان صبر آزما گھڑیوں میں جو کچھ اُس کے دل میں آتا وہ بے تکان آہستہ آہستہ کہتا چلا جایا کرتا تھا۔ یہ حسّاس اور سمجھ دار نوجوان ابھی تازہ ہی قسطنطنیہ سے یہاں آیا تھا۔ اُس کی دلی تمنّا تھی کہ برّی و بحری افواج مغربی کے فاتح سپہ سالار دں کو کسی طرح سمجھا اور یقین کرا دیا جائے کہ یونانیوں کے ہاتھوں سمرنا پر کیا کیا قیامتیں ٹوٹ چکی ہیں۔

لیکن سادہ مزاج سیفی کی حالت جسے وہاں کے باشندوں کے دماغ کی کلید کہنا چاہئے۔ اُس افسر کے برخلاف کچھ اور ہی تھی۔ اُس نے کمیشن کے پیام کو خاموشی اور ٹھنڈے دل سے سُنا۔ افسر چاہتا تھا کہ سوچ سمجھ کر باہمی مشورے سے کوئی رستہ نکال لیا جائے جس پر چل کر سیفی ولایتی پنچوں کے سامنے سمرنا کی نئی دفاعی تحریک کے نقطۂ نظر کو اچھی طرح واضح کر سکے۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ خود ایک تقریر دے کر سیفی کو رٹا دے۔

جس وقت نوجوان افسر اور سیفی کمیشن ہال کی طرف جا رہے تھے۔

افسر دل ہی دل میں ایسی تقریر ترتیب دینے میں مصروف تھا۔ اور چلتے چلتے اُس نے نصف کے قریب تقریر موزوں بھی کر لی تھی۔ اُس کا خیال تھا۔ کہ اگر اس کی تجویز کی ہوئی تقریر یہی سیفی افسروں کے سامنے دُہرا دیگا تو اُسے سُن کر چیتیلوں کی آنکھوں میں ضرور آنسو آ جائیں گے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ سیفی کو اپنی تقریر سُنا راستہ ختم ہو گیا۔ مجلس کا مکان سامنے آ گیا جس کا دروازہ کھُلا۔ اور سیفی اُس کے اندر داخل ہو گیا۔ اور ہمارا نوجوان افسر اپنے ہی خیالات کے سیلاب میں باہر پڑا غوطے کھاتا رہا۔

سیفی بہترین قسم کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اُس کی سُرخ ٹوپی پر ایک ہزار ایک پہاڑی پھولوں کا نشان "جگمگا رہا تھا۔ اُس کا مضبوط اور دوہرا بدن پستولوں، چاندی کے دستے والے چھُروں، خنجروں سے سجا ہوا تھا بندوق اُس کے ایک شانے پر پشت کی جانب لٹک رہی تھی۔ اُس کا بھاری اور پُر وقار سر اپنی جگہ مضبوطی سے قائم تھا۔ اُس کا رنگ امر میں اتنا سفید تھا کہ "عدن" کی تیز دھوپ بمشکل اُس پر اپنا ہلکا سا سایہ ڈال دینے میں کامیاب ہوتی تھی۔ اُس کا چہرہ باشوکت و مردانہ تھا۔ اُس کی ناک ستواں تھی۔ چہرے کے تمام خطوط باقاعدہ تھے۔ اسی بارعب چہرے میں دو گہری آنکھیں اُٹھتے ہوئے شعلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اُس کی گردن مضبوط اور اونچی تھی جس کے گرد اُس کی قمیص

کا سفید کالر صاف نظر آرہا تھا۔ اور اُس کی گردن پر اُس کا سر تمکنت سے قائم تھا۔ اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں کا رنگ قدرتی طور پر گلناری تھا۔ اور بالائی ہونٹ پر چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں اپنی اثر اندازی میں کمی نہ کر رہی تھیں۔ سن و سال کی جوانی اور جسم کی تر و تازگی کے مقابلہ میں کیونکہ اُس کی عمر ابھی اکیس سال ہی کی بتائی گئی تھی سیفی زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اور یہ ایسی بات تھی جو یقیناً اُس کے سن و سال کا نتیجہ نہ تھی۔

ہاں تو جب سیفی اور اُس کا ہمراہی افسر مجلس کی طرف جا رہے تھے چلتے چلتے راستے میں افسر نے خاموشی کو ختم کرنے کے لئے اُس سے کہا کہ :-

"ابھی تو ہم کو بہت دور جانا ہے"

یہ سُن کر سیفی کے لب کھلے تو سہی۔ مگر ایسی انداز سے جیسے کوئی مسکرا رہا ہو۔ لیکن اُس کی آنکھوں پر وہی جذبۂ سکوت و سکون طاری رہا جواباً کہا بھی تو بس اسی قدر کہ "ہاں مجھے معلوم ہے۔ کہ ہمیں کتنی دُور اور کہاں جانا ہے"۔

نوجوان افسر نے ہر چند کوشش کی کہ کسی طرح سیفی کی تذبذبی کیفیت کی ایک جھلک دیکھ لے۔ مگر بے سُود۔ وہ ہر طرح مؤدب اور با اخلاق تھا۔ مگر اُس کی حالت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ اس وقت وہ خاموش

ہی رہنا چاہتا تھا۔

وہ کمرہ جہاں کمیشن اپنے اجلاس کر رہا تھا۔ اعلیٰ درجے کے قالینوں سے آراستہ تھا۔ اُس کے عین وسط میں ایک مستطیل میز بچھی تھی جس پر سبز رنگ کا میز پوش پڑا تھا۔ اس میز کے چاروں طرف یورپ کے چاروں اتحادی طاقتوں کے جرنیل بیٹھے تھے۔ وہ لوگ اپنی پوری فوجی وردی میں ملبوس تھے۔ اس لئے یہ منظر بھی بڑا ہی مسحور کُن تھا چاروں سپہ سالاروں کے ماتحت افسر اور سکرٹری جن کے چہرے مُہرے کے خدو خال سے رُعب و شوکت ہویدا تھی۔ اپنے اپنے جرنیلوں کے دائیں بائیں اور پیچھے ایک شانِ افتخار سے باقاعدہ کھڑے تھے۔ جُونہی کہ سیفی کمرے میں داخل ہوا۔ اُن سب کی نگاہیں اُس پر جم گئیں۔ وہ نگاہیں۔ جو اپنے اپنے طاقتور اور فاتح ملکوں کی سطوت کی آئینہ دار تھیں۔ جن کے ساتھ جنگی جہازوں اور دیگر آلاتِ مرگ آفریں کی قطاروں کی قطاریں فراہم و آراستہ تھیں۔ مگر سیفی پر اس سطوت و جلال کے مظاہرے کا کچھ بھی اثر نہ تھا۔ وہ اُن کے سامنے اس بے پروایانہ انداز سے جا کھڑا ہوا۔ جیسے مضبوط تناور شاہ بلوط کا درخت اپنی سرسبز شاخوں کے ساتھ کھڑا ہوا آسمان بوسی کیا کرتا ہے۔

جب سیفی ان جرنیلوں کی طرف بڑھا تو ایک تُرک افسر جس کے رُخسار داڑھی کے اثر سے) سیاہی مائل تھے جس کے سر پہ کلپاک

تھی۔ اُس کے دائیں طرف آن کھڑا ہوا سیفی نے کسی ایسی کیفیت سے متاثر ہو کر جسے وہ خود بھی سمجھ نہ سکا۔ اپنی بندوق کندھے سے اُتار کر دیوار سے لگا کر کھڑی کر دی۔ اور اپنے پستول وغیرہ اسلحہ یکے بعد دیگرے اُتار۔ اُتار کر میز پر رکھ دیئے۔ اپنے ہتھیار رکھ دینے کے بعد اُس نے فاتح جرنیلوں کی طرف ایسی نگاہ سے دیکھا جس میں نہ نفرت تھی، نہ شورش و بغاوت، نہ جوش و خروش، نہ خوف اور ڈر۔ اُس نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا۔

"پاشیاں! خوش آمدید۔"

سیفی کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے چاروں آدمی ان طاقتوں کے سردار اور سپہ سالار ہیں۔ جن کے خلاف درۂ دانیال میں ترک سرباز جنگ آزما ہو چکے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ اُن کے رُتبے اور عہدے کا خیال کر کے سیفی نے اپنے سر پر "ہزار و یک پہاڑی پھولوں کا طرہ" لگایا۔ اور اپنی نئی پوشاک پہنی تھی تا کہ وہ ان جرنیلوں کو ایسا احترام ظاہر کر سکے۔ جس کا اُس کے نزدیک ہر وہ سردار مستحق تھا۔ جو عدن کی گھاٹیوں کے حوادث کی تحقیقات و تفتیش کرنے کے لئے آیا ہو۔ جب اُس کو ایک کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ تو وہ کمال سادگی سے اُس پر بیٹھ گیا۔

پہلے فاتح جرنیلوں نے آہستہ آہستہ آپس میں کچھ کہا سُنا۔ جسے اُس نے سُنا تو ضرور مگر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے سمجھ نہ سکا۔ پھر اُس

کے قریب کھڑے ہوئے ترک افسر نے مخاطب ہو کر کہا :۔

"سیفی ! بیان کرو عدن میں کیا کیا حوادث پیش آئے ہیں ؟"

یہ سنتے ہی وہ یکبارگی یوں گویا ہوا :۔

"میں نے سنا تھا کہ یونانیوں نے اچانک سمرنا پر قبضہ کر لیا ۔ انہوں نے وہاں کی دکانوں اور مکانوں کو لوٹ لیا ۔ انہوں نے وہاں کی عورتوں اور بچوں کو بے دریغ تہ تیغ کر ڈالا ۔ انہوں نے عورتوں کو بے حرمت کیا یہ وہ باتیں تھیں جو ہم نے مدتوں پہلے سن لی تھیں ۔ لیکن ہم گڈریے لوگ ہیں ۔ ہم جیسا کہ ان حوادث کے ظہور سے پہلے اپنی بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کے ساتھ پہاڑوں میں گھوما کرتے تھے یہ داستانیں سن کر بھی اپنی بھیڑ بکریاں چراتے پھرتے رہے"

یونانیوں نے کھیتوں کو پامال کر دیا ۔ بوڑھوں کی ڈاڑھیاں پکڑ پکڑ کر گھسیٹا ۔ بچوں اور نوجوانوں کو چیر پھاڑ ڈالا ۔ لوگوں کے ساز و سامان کو لوٹا اور بقیہ مال و متاع کو پھونک ڈالا ۔ مویشیوں کے گلوں کو ہنکا لے گئے ۔ ہم نے یہ سب کچھ بھی سنا اور تب بھی ہم اپنے گرد و پیش کے پہاڑی دامنوں میں اپنی بھیڑیں چراتے رہے ۔

یونانی دم بدم ہمارے ملک کے قلب میں دندناتے چلے آتے تھے انہوں نے ملک کے کھیتوں میں تمباکو کا ایک پتہ بھی نہ رہنے دیا ۔ اناج اور غلہ کا ایک دانہ اور بھوسے کا ایک تنکا باقی نہ چھوڑا ۔ انہوں نے زیتون کے باغیچوں کو جلا دیا ۔ انگوروں سے لدے ہوئے تاکستانوں

کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ اخروٹ، انجیر وغیرہ تمام پھل برباد کر دیئے ملک میں ہر طرف آہ و فریاد کا ہنگامہ بپا ہو گیا۔ گھر ویران ہو گئے۔ اور کھیت اُجڑ گئے۔ کیونکہ کوئی آدمی اپنے گھر یا باغ باغیچہ اور کھیتی باڑی کی حفاظت کرنے کے لیئے باقی نہ رہا۔ اجڑے ہوئے مکانات اور پامال کھیت اور برباد شدہ باغوں کو دیکھ کر ایسا نظر آتا تھا کہ ہمارے ملک کی آبادیوں پر موت و ہلاکت نے سایہ نہیں ڈالا تھا۔ جھاڑ و پھیوی تھی۔ اور ہم تھے کہ اب بھی انہی پہاڑیوں پر اپنی بھیڑوں کو چرانے میں مگن تھے۔

اب وہ وقت آیا کہ یونانی ہمارے اور قریب آن پہنچے۔ ہم نے سُنا کہ اُن کا مقدمۃ الجیش ہمارے قصبے کے پُل کی دوسری جانب متعین ہو گیا ہے۔ یہ رنگ دیکھ کر ہم دیہاتی لوگ بھی کسی قدر سوچ میں پڑ گئے ع

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز پڑھ کر ہم لڑکے لڑکے مل کر سیر و شکار کو آبادی سے باہر نکل گئے۔ لیکن جب ہم شام کے وقت کہ روشنی زائل ہو رہی تھی سیر و شکار سے واپس آئے تو ہم نے دُور سے دیکھا۔ کہ آبادی سے باہر جا بجا دس دس، بیس بیس لوگ کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ قریب جا کر معلوم ہوا کہ وہ ہمارے گاؤں اور قرب وجوار کی لڑکیاں تھیں جو روزانہ ہمارے سامنے کے پہاڑوں پر اپنی بھیڑ بکریاں

لی رکھوالی کیا کرتی تھیں۔ اُن کے سروں کے بُرقعے تار تار تھے۔ اُن کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اُن کے لباس خون کے دھبوں سے گلکار بنے ہوئے اور کیچڑ سے لت پت تھے۔ اور وہ سب کی سب رو رہی تھیں۔ مگر آواز اُن کے گلے میں رُکتی تھی۔ اور آنسوؤں کا طوفان تھمتا نہ تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی میرے چچا کی لڑکی خدیجہ نے، کہ وہ بھی اسی مجمع میں تھی اپنا پھٹا ہوا بُرقع اپنے سر پر اُتار کر میرے مُنہ پر دے مارا اور کہا "سیفی! جب یونانی سمرنا میں داخل ہوئے تم خاموش رہے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو لوٹ لیا تب بھی تم ٹس سے مس نہ ہوئے اور اب بھی کہ وہ تمہارے گھروں میں در آئے۔ تم بندوقیں لئے اپنی ٹوپیوں کو کلغیوں سے سجائے پہاڑوں پر شکار کھیلتے اور سیر کرتے پھر رہے ہو۔ یونانی سپاہیوں نے پُل کے پار ہمیں پکڑ لیا۔ ہماری بھیڑ بکریاں ہم سے چھین لیں۔ زبردستی ہمارے کپڑوں پر ٹکی ہوئی سنہری مُہریں نوچ لیں۔ اور ہماری گردنوں سے . . . . یہ کہتے کہتے اُس کی آواز اُس طوفان گریہ میں گم ہوگئی جو تمام عورتوں کے ایک ساتھ رونے سے اُٹھ رہا تھا۔ میری چچازاد بہن خدیجہ کا لباس چیتھڑے چیتھڑے ہو چکا تھا۔ خون کے قطرے اُس کے زخمی سینے سے ٹپک رہے تھے۔ جب لڑکوں نے یہ دیکھا تو سب کے سب بیک آواز چلّا کر دریافت کیا۔

"اُنھوں نے اَور کیا کیا"

اس کے جواب میں امام مسجد کی لڑکی نے کہا کہ "ہم سے یہ مت پوچھو کہ اُنہوں نے اَور کیا کیا۔ بلکہ یہ پوچھو کہ ابھی وہ اَور کیا کریں گے؟"

یہ کہا اَور اُس نے بھی اپنا بُرقع اُتار کر ہمارے منہ پر دے مارا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ اور اسی حال میں بولی کہ "ہمارے اِن بُرقعوں کو لے کر تم اوڑھ لو۔ اور اپنی بندوقیں اور چھرے ہمیں دے دو تاکہ ہم عورتیں خود اپنی آبرو کی حفاظت کریں گی"۔

ہم نے جوں توں کر کے اِن لڑکیوں کو تو گھروں کی طرف بھیج دیا۔ اور وہیں کھڑے کھڑے گاؤں کی دہلیز پر ہم سب لڑکوں نے قسم کھائی اور عہد کیا کہ اپنے قصبے کے بچے بچے کو اِن کتوں کے وجود سے پاک کر کے دم لیں گے

اُسی رات کو میرے چچا کی چھوٹی لڑکی اپنی بڑی بہن خدیجہ کا پیغام اِن لفظوں میں میرے پاس لائی کہ اگر تم اُس یونانی کو جس کا قد چھوٹا، رنگ نیلا۔ دانت ہونٹوں سے کسی قدر باہر نکلے ہوئے اور سر کے لمبے لمبے کالے بال اُس کی ٹوپی کے نیچے لٹکتے نظر آتے ہیں یا جاؤ تو زندہ نہ چھوڑنا"

جس وقت ہم اُن مکاروں۔ فریبیوں، بدکاروں، بزدل ظالموں کا خاتمہ کر رہے تھے۔ ہاں اُن کو چھید رہے تھے اور ہمارے پستول منہ دیکھ

چھُرے، کٹاریاں اور نیمچے اپنے اپنے جوہر دکھارہے تھے۔ اُس وقت ہمسایہ دیہات سے بھی ہم کو کمک پہنچ گئی تھی۔ اِدھر تو یہ حال تھا۔ اُدھر یونانی اگرچہ نوجوان لڑکوں کے ہتھیاروں کے سامنے یوں اُڑ رہے تھے۔ جیسے جنگلی بطیں شکاریوں کے سامنے اُڑا کرتی ہیں۔ مگر پھر بھی وہ کالی گھٹا کی طرح ہر طرف چھائے ہوتے تھے۔ مَیں نے مُردوں کے ڈھیر اور زخمیوں کے انبار میں کالے بالوں اور لمبے دانتوں والے یونانی کو بہت ڈھونڈا۔ مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ ہم نے اُڑتے ہوئے جھنڈے تک اُن کا تعاقب کیا اور جب ہم واپس عدن پہنچے۔ تو مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم قصبہ کے باہر ہی ٹھہر گئے۔ اور وہیں ہم نے اپنے ہتھیار بھی رکھ دیئے اور وہیں بیٹھ گئے۔ اب ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ ہم کیا کریں یا کیا کرنا چاہیئے؟

ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہم نے عدن کی آبادی سے آگ کے شعلوں کو بلند ہو کر آسمان بوسی کرتے ہوئے دیکھا۔ اسی کے ساتھ پیاپے بندوق چلنے کی آواز ہمارے کانوں میں آنے لگی۔ عورتوں، بچوں کی چیخ پکار، نالہ و فریاد اور یونانیوں کے جنگی نعروں اور ہنگامہ کی آواز ہمارے کانوں میں پہنچی۔ اب بھلا ہم کیسے بیٹھے رہ سکتے تھے۔ اُٹھے اور گویا اُڑ کر شاہینوں کی طرح شہر پر ٹوٹ پڑے مسلمانوں کے محلّوں میں موت اور ہلاکت کی تاخت و تاراج جاری تھی۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ زخمیوں، مجروحوں،

خون میں نہلائے ہوئے تڑپنے والوں کے چیخنے چلانے سے کان پھٹے جاتے تھے۔ بڑھتی ہوئی آگ کے شعلے اونچے درخت کی لمبی لمبی شاخوں کی طرح ایک چھت سے دوسری چھت پر ہاتھ پھیلاتے چلے جا رہے تھے مکانوں کے بالاخانوں پر یونانی لٹیرے چڑھے ہوئے لوٹ کے مال کی گٹھریاں باندھ باندھ کر اپنے ساتھیوں کی طرف جو ہاتھ پھیلائے نیچے کھڑے تھے گرائے جاتے تھے۔ جن کو لے کر نیچے والے ہوا ہو جاتے تھے۔ اسی دوران میں میں نے ایک بوڑھی ناتوان عورت کو دیکھا۔ اُس کا برقع چیتھڑے ہو چکا تھا۔ اور ایک یونانی سپاہی اُس کو بے دردی کے ساتھ پتھروں پر سے گھسیٹے لئے جا رہا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اُس دُکھیا کے گلے کا طلائی ہار نوچ لے۔ ایک دوسرے یونانی پر نظر پڑی کہ اُس نے ایک نوجوان لڑکی کو پکڑ رکھا تھا جس کا گلا دونوں ہاتھوں سے اُس نے دبایا ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ زبردستی لڑکی کا مُنہ چوم لے۔ لڑکی کے جسم پر لباس برائے نام رہ گیا تھا۔ اس کشمکش میں اُس کا سینہ بھی برہنہ ہو گیا تھا۔ اور ایک اتنی سی چھوٹی لڑکی (اُس نے ہاتھ سے اندازہ بتایا) کوشش کر رہی تھی۔ کہ اُس یونانی سپاہی کو کاٹ کھائے۔ جو اُس کی ماں کو قتل کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک اور یونانی آیا اور اُس نے اپنی بندوق کا کُندہ اس زور سے لڑکی کے سر پر مارا کہ اُس کا سر پھٹ گیا۔ اور بھیجا نکل کر باہر جا پڑا۔ اِس آگ، دھوئیں اور خون کی بارش اور گریہ وبکا کے طوفان میں ہم یونانیوں میں آندھی کی طرح نہیں نہیں، جہنم کے

شعلوں کی طرح گھس پڑے"۔

یہ کہتے ہوئے سیفی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مترجموں نے کیا کہا؟ جرنیلوں نے کچھ نہیں سنا۔ ہاں اُن کی نگاہیں سیفی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جس پر کوئی گھنٹی، کوئی شکن، کوئی جھری نہ تھی۔ اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اکیس برس کا نوجوان لاکھوں برس کا بوڑھا آدمی ہے۔ اُس کی سیاہ آنکھیں اُبلتے ہوئے دو چشمے تھے۔ اگرچہ اُس کے رُخسار خشک تھے۔ مگر اُس کی آنکھیں کالے کالے آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس وقت اُس کی آواز اتنی مدھم ہو گئی تھی کہ وہ الفاظ جو اُس کی زبان سے نکل رہے تھے تقریباً سنائی نہیں دیتے تھے۔ وہ صاف اور نمایاں سرگوشی کی طرح زبان پر جاری تھے۔ اگرچہ اُن میں صوت و صدا کا نام نہ تھا۔ ہاں وہ کانوں سے سُنے نہیں جا سکتے تھے۔ صرف آنکھوں سے دیکھے جا سکتے تھے۔

"پاشایان! تین گھنٹے تک ہم نے وہ کیا جو انسانوں کو نہیں کرنا چاہیے۔ آخر کار یونانی درندے آبادی کو چھوڑ کر نکل گئے۔ ان کی لگائی ہوئی آگ بُجھا دی گئی۔ تب کہیں جا کر ہم کو ہوش آیا۔"

پھر اُس نے جرنیلوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ ایسے انداز سے دیکھا گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اُس کے آخری الفاظ یہ تھے:۔

"پاشایان خدا حافظ۔"

مِصر

(۱)

لوحِ گِلی ۔ مصنّفہ طاہر جوّاد ۔ مترجمہ سیّد حسن ایم ۔ اے

(۲)

ساربان کی داستان :۔ مترجمہ مسعود حسن شمسی دانا پوری

لوحِ گلی

شفتاح، شاہی کتبہ نویس، محل کے اندر اپنے خاص کمرے میں بیٹھا ہوا خاندانِ فراعنہ کے سب سے جلیل القدر بادشاہ طاح دوم کے عہدِ سلطنت کی تاریخ مرتب کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک شاہی قاصد نے کمرے میں داخل ہو کر بادشاہ کی طلبی کی خبر سنائی۔ بادشاہ شفتاح کی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے اُس کی بہت قدر کرتا تھا۔ اور غلام اور آقا کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ طاح حددرجہ ظالم اور بے رحم شخص تھا۔ روز روز کے کثیر التعداد واقعاتِ قتل ایک انسان کو اُس سے خائف و متنفر بنا دینے کے لئے کافی تھے۔ لیکن ان واقعات کی طرف شفتاح نے کبھی دھیان نہ دیا تھا۔ وہ اپنے دل میں کہتا "مجھے بادشاہ کے جور و ستم سے کیا سروکار اور اگر سروکار بھی ہو تو میرے بس ہی میں کیا ہے۔ بھلا فرعونِ مصر کے خلاف دم مارنے کی کس کو مجال ہو سکتی ہے"۔ اپنے متعلق اسے پورا اطمینان حاصل تھا۔ کیونکہ اُس کے ساتھ بادشاہ کا سلوک دیگر تھا۔ اور چونکہ وہ تمام کتبہ نویسوں کا سردار تھا۔ اِس لئے اُس کو

یقین تھا کہ بادشاہ میری ہلاکت کی طرف قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ اُس کے مر جانے سے بادشاہ کا بہت حرج ہو جاتا۔ لہٰذا جب قاصد نے آ کر طلبی کی خبر سنائی تو شفتاح ذرا بھی ہراساں نہیں ہوا۔ اگر اُس کی بجائے کوئی دوسرا ہوتا تو ڈر کے مارے اُس کا بُرا حال ہو جاتا۔ اور سوچنے لگتا کہ کل صبح وہ طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھنے کے لئے دُنیا میں زندہ رہے گا یا نہیں۔ خوف و تردّد کی بجائے شفتاح نے نہایت دلجمعی کے ساتھ آخری جملہ کی کتابت کی اور پھر اُٹھ کر قاصد کے ساتھ ہو لیا۔

جس وقت وہ شاہی خلوت خانے میں داخل ہوا بادشاہ بالکل تنہا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر اپنی پیشانی زمین پر ٹیک دی۔ اور رسم کے مطابق تعظیم بجا لا کر "بادشاہ زندہ باد" کا ایک نعرہ لگایا۔

"شفتاح!" بادشاہ نے اُس کی جانب دیکھ کر کہا "میں اس وقت تجھ سے ایک اہم کام لینا چاہتا ہوں۔ اس کام کو تجھ سے بڑھ کر کوئی انجام نہیں دے سکتا۔"

"عالیجاہ! حضور اپنی خواہش کا اظہار فرمائیں۔ بندہ تعمیل کے لئے بسر و چشم حاضر ہے۔"

بادشاہ نے آنکھیں کتبہ نویس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اُس کے لب پر ایک تبسّم تھا۔ یہ تبسّم دوسروں کے حق میں زہر ہلاہل کا حکم رکھتا تھا۔ مگر شفتاح اس سے بالکل بے فکر تھا۔ بادشاہ نے دفعتہً پوچھا "کیا تمہیں میرے خزانے گھر کی بھی خبر ہے؟"

عالیجاہ کا خزانہ گھر! شفتاح نے ہکلا کر کہا۔ وہ حیرت زدہ ہو رہا تھا۔ آخر اُس نے اپنے آپ کو سنبھال کر اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "جی ہاں۔ ضرور۔ عالی جاہ کا خزانہ گھر ملک مصر کی ساری زمین اور وہ ممالک ہیں جن کے باشندوں پر مصر کا قانون چلتا ہے۔"

بادشاہ پھر مسکرایا۔ "شفتاح! تو ٹھیک کہتا ہے۔ لیکن میرا ایک عجیب خزانہ گھر بھی ہے۔ جس کا راز صرف مجھ کو معلوم ہے۔" چند لمحوں کے بعد اُس نے پھر دُہرایا۔ "ہاں صرف مجھ کو، میرے سوا کسی کو بھی اس راز کا علم نہیں کہ میرا خزانہ کہاں مدفون ہے۔ میں تجھے اس اہم راز سے آگاہ کرتا ہوں۔ تاکہ تو اس راز کو لکھ ڈالے۔ بھوج پتر پر نہیں جس پر لکھا ایک ہی رات میں ملیامیٹ ہو جائے۔ بلکہ مٹی کی تختیوں پر جو سالہاسال تک باقی رہے۔ میں ابھی تجھے اس راز سے آگاہ کرتا ہوں اور تو اُسے اپنی صنعت کے ذریعہ سے چیدہ چیدہ الفاظ میں لوح پر منتقل کر ڈال۔"

شفتاح ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا۔ بادشاہ نے یکے بعد دیگرے اُسے بتایا کہ کس طرح اُس نے بے شمار زر و جواہر جمع کئے۔ اس اندوختہ کو اُس نے کہاں مدفون کیا۔ اور کیونکر ایک انسان کی وہاں رسائی ہو سکتی ہے۔ اُس نے اخفائے راز کی وجہ یہ بتائی کہ وہ نہیں چاہتا کہ اُس کی زندگی میں کوئی شخص، حتیٰ کہ اُس کا بیٹا بھی، اِس بھید

سے باخبر ہونے پائے۔ اِس لئے اُس نے اِس راز کو تختیوں پر لکھوا کر رکھنا چاہا، تاکہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کا بیٹا ان تختیوں کو پڑھ کر باپ کے دفینے کا پتہ لگائے اور اُس کو صرف میں لائے۔

شفتاح کو بادشاہ کا ہمراز بننے پر بڑا فخر ہو رہا تھا۔ وہ نہایت تندہی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ بادشاہ نزدیک بیٹھا ہوا چپ چاپ اُس کو کنکھیوں سے دیکھتا اور مسکراتا جاتا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ میں ایک خاص قسم کی تلخی تھی۔ جس کو شفتاح اُس وقت محسوس کرنے سے معذور تھا، آخر کار کتابت پوری ہو گئی۔ اور مٹی کی ایک تختی جس پر صاف و روشن تحریر شفتاح کی چابکدستی کی داد دے رہی تھی۔ بادشاہ کے سامنے میز پر پڑی تھی۔

ایک اور ضروری کام رہ گیا ہے" بادشاہ نے ایک بار تختی کا معائنہ کر کے کہا: "اور تب میری غرض پوری ہو جائے گی۔ میں نے ابھی تجھ سے کہا کہ میرے سوا کوئی شخص اس اہم راز سے واقف نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج تک یہ خزانہ محفوظ نہ رہ سکتا۔ جب میں خزانہ گھر کی تعمیر کرا رہا تھا تو مجھے معمار اور مزدور لگانا پڑے تھے۔ اُن کو اس راز کی خبر لگ گئی تھی۔ لیکن وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے اور ہم اب دو آدمیوں کے سوا تیسرا اس بھید سے واقف نہیں" بادشاہ ایک معنی خیز طریقے پر مسکرایا۔ اور اپنی نگاہیں شفتاح کے چہرے پر جما دیں۔

جیسے اندھیری رات میں بجلی کی چمک سے اُجالا ہو جاتا ہے۔ اور اس روشنی میں ایک تھکا ماندہ مسافر یہ دیکھ کر کہ وہ ایک عمیق غار کے کنارے کھڑا ہے۔ بدحواس ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی بادشاہ کی اس گفتگو سے شفتاح پہ جس کے دل میں ابھی تک کسی قسم کا خوف و ہراس نہ تھا ساری حقیقت روشن ہو گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو موت کے غار کے کنارے کھڑا پایا۔ جس سے چھٹکارا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ وہ بادشاہ کی اس سزائے موت کا شکار ہو رہا تھا جس کی بدولت ہزاروں معصوم انسان ملکِ عدم کو سدھار چکے تھے۔ وہ شدّتِ ہراس سے زرد پڑ گیا۔

طاح نے چاندی کی ایک گھنٹی جو سامنے میز پر رکھی ہوئی تھی بجائی فی الفور نصف درجن غلام کمرے میں داخل ہو گئے۔ بادشاہ نے کچھ کہے بغیر شفتاح کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ شفتاح کا بازو تھام لیں کہ معاً کسی خیال کے پیدا ہوتے ہی اُس نے جلدی سے لپک کر میز پر سے لوح اُٹھالی۔ اور اپنے آہنی قلم کی ایک ضرب سے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کے بعد وہ ہاتھ باندھ کر غلاموں کی طرف مُڑا۔

لوح کو ٹوٹتے دیکھ کر بادشاہ غضب ناک ہو گیا۔ انتہائے غضب میں اُس کی آواز حلق میں پھنسی معلوم ہوتی تھی۔ اسی آواز میں اُس نے رُک رُک کر شفتاح کو حکم دیا۔ کہ وہ دوبارہ کتابت کرے۔ لیکن شفتاح بُت بنا کھڑا رہا۔ موت کی صورت اُس کی آنکھوں کے

سامنے پھر رہی تھی۔ اپنی موت کا یقین ہوتے ہی وہ بادشاہ کے حکموں کی خلاف ورزی کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ شفتاح کی اس جرأت پر بادشاہ کا غصہ اور بھڑک اٹھا۔ اُس نے اپنی مہیب آواز میں کڑک کر کہا "لے جاؤ۔ کال کوٹھڑی میں لے جاؤ۔ اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کرو۔ تاکہ وہ میرا حکم ماننے کو تیار ہو جائے۔"

غلام شفتاح کو کشاں کشاں لے چلے۔ اُس کی آدھی رُوح کال کوٹھڑی کے نام ہی سے فنا ہو چکی تھی۔ وہ راستہ بھر سوچتا جاتا تھا۔ کہ اس سزا اور خاص کر سزائے موت سے کیونکر نجات مل سکتی ہے۔ جس وقت وہ کال کوٹھڑی کے قریب پہنچا تو یک بیک چلتے چلتے رُک گیا۔ اور پکار اُٹھا۔ "اے غلامو! بس رحم کرو۔ میں بادشاہ کے حکم کی تعمیل کے لئے تیار ہوں۔"

اُس کے ہونے والے جلاد مایوس سے ہو گئے۔ اُن کی زبانیں طاح نے بدگوئی سے بچنے کے لئے بہت پہلے کٹوا ڈالی تھیں۔ اس لئے وہ بول تو نہ سکتے تھے۔ مجبوراً شفتاح کو پھر بادشاہ کے سامنے لے آئے۔

"کیا؟" طاح نے چلا کر پوچھا۔ "کیا تو تیار ہے؟"

"بسر و چشم، عالی جاہ!" شفتاح نے جواب دیا: "کال کوٹھڑی کے نام ہی سے میری روح پرواز کرتی ہے۔ میں حضور کے فتوے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ راز کو پھر ایک بار لکھ دیتا ہوں۔ اس کے بعد مرنے کو تیار ہوں۔"

یہ کہکر شفتاح نے ایک دوسری تختی اُٹھالی - اور اس کو چکنا کر کے ایک گھنٹے تک راز کو از سر نو لکھتا رہا - مکمل ہو جانے پر اُس نے تختی بادشاہ کے ہاتھ میں دے دی - اور حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر بولا " اب میں مرنے کو تیار ہوں "۔

طاح کا غصہ کچھ فرو ہو چکا تھا " شفتاح " اُس نے کہا " میری عین خواہش تھی کہ تو بچ جاتا - لیکن کیا کروں - تو خزانے کا بھید جانتا ہے - تجھ کو بچانا میری قدرت سے باہر ہے - لہٰذا مرنے کے لئے تیار ہو جا - لیکن میں تیری موت خوشگوار کر دوں گا - اتنی خوشگوار جیسے صبح کی نیند "۔

بادشاہ نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ شفتاح کو معبد کے نیچے والے تہ خانہ میں بند کر دیں - تاکہ وہ فاقہ کشی کی تکلیف سے مر جائے - اور اس تہ خانے میں ایک پیالہ زہر سے بھر کر رکھ دیں "۔

" شفتاح " اس نے کتبہ نویس سے مخاطب ہو کر کہا " جب تجھ کو بھوک اور پیاس کی شدید تکلیف محسوس ہونے لگے - تو زہر کا پیالہ اُٹھا کر پی لینا - اس وقت موت تیرے لئے ایک خوشگوار خواب بن جائیگی ہاں تیرے لئے تہ خانہ کے اندر مٹی کی تختیاں بھی رکھ دی جائیں گی - جب تک بھوک اور پیاس کی تکلیف کو برداشت کر سکے اُن تختیوں پر مصر کی تاریخ کی کتابت جاری رکھنا - مجھے افسوس ہے کہ آج میں اس اہم کام میں مخل ہوا "۔

اس کے بعد زبان بُریدہ غلاموں نے شفتاح کو شاہی حکم کے مطابق لے جا کر تہ خانے میں بند کر دیا۔ اُس وقت سے پھر مصر میں کسی نے شفتاح کا نام تک بھی نہ سُنا۔ عرصہ دراز کے بعد جب طاح دوم کے مرنے پر اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ تو اُس نے اپنے کتبہ نویسوں کو بُلا کر لوح کی عبارت پڑھوانا چاہا۔ مگر وہاں چند مہمل اشعار، مذاقیہ جملوں اور طاح کے نام غلیظ گالیوں کے سوا اور کوئی ایسی تحریر نہ تھی جو خزانہ گھر تک رہنمائی کر سکتی۔ جملے بھی ایسے بے معنی و بے ربط تھے۔ کہ اُن سے کوئی خاص مفہوم نکالنا ناممکن تھا۔ اس بادشاہ نے دوسروں کو عبرت دلانے کے لئے چند کتبہ نویسوں کو مروا بھی ڈالا۔ مگر تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ اور فرعون کے خزانہ گھر کا راز ہمیشہ کے لئے پوشیدہ ہو گیا۔

(۲)

پروفیسر شوکت اپنی لائبریری میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے میز پر متعدد مٹی کی تختیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان تختیوں کے دو ڈھیر تھے۔ ایک اُس کے بائیں جانب اور دوسرا اُس کی دائیں طرف، اور اس کے ٹھیک سامنے ایک بڑی مستطیل تختی رکھی ہوئی تھی۔ اور پاس ہی ایک تختہ کاغذ رکھا ہوا تھا۔ نزدیک سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس تختی پر جس کو پروفیسر نہایت غور کے ساتھ اپنی سنہری کمانی والی عینک کے اندر سے مطالعہ کر رہا تھا عجیب و غریب نقوش اور اشکال

بنے ہوئے تھے۔ جس کو دیکھ کر مصریات کا طالب علم بتا سکتا تھا کہ یہ قدیم مصری حروف سے لکھی ہوئی ایک تحریر ہے۔

پروفیسر شوکت مصریات کا بڑا ماہر گنا جاتا تھا۔ اُس کی شہرت کا سکہ تمام عالم میں جما ہوا تھا۔ ممی کی جستجو اُس کا خاص مشغلہ تھا۔ اور اسی سلسلے وہ ملک مصر کے جملہ اہرام پر یکے بعد دیگرے چڑھ چکا تھا۔ اور اُس نے اپنی عینک لگا لگا کر مصر قدیم کی اِن پُر اسرار یادگاروں کا بخوبی مطالعہ کیا تھا۔

پروفیسر شوکت کی شہرت کو دیکھ دیکھ کر اُس کے بہت سے حریف بھی پیدا ہو گئے تھے۔ بلکہ ایک حریف نے اپنے سفر تحقیقات کے سلسلے میں ایک قدیم مصری معبد میں جو ریگستان میں ریت کے اندر مدفون تھا۔ ایک عجیب انکشاف کیا تھا۔ اس معبد میں وہ ایک راستے سے ایک تہ خانے کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ جہاں اُس نے ایک انسانی ڈھیر پڑا دیکھا۔ اس ڈھیر نے اپنی استخوانی انگلیوں میں ایک آہنی قلم پکڑ رکھا تھا۔ اور اُس کے آس پاس متعدد مٹی کی تختیاں مصری خطوط سے بھری ہوئی پڑی تھیں۔ چاندی کا ایک خالی پیالہ بھی اس تہ خانے میں پڑا ہوا ملا تھا۔

ان تختیوں کو حفاظت سے بکس میں بند کر کے تاکہ ان کی تحریروں کو نقصان نہ پہنچے۔ پروفیسر شوکت کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ ان تحریروں کو پڑھنے اور ترجمہ کرنے میں شوکت کو انتہائی ذہانت و ذکاوت سے

کام لینا پڑا تھا۔ آج صبح اُس کے بُشرے سے پتہ چل رہا تھا کہ اُس نے کوئی غیر معمولی چیز دریافت کی ہے۔ وہ بار بار سامنے پڑی ہوئی تختی پر لکھی ہوئی عبارت کو پڑھتا۔ اور سادہ کاغذ پہ عربی میں لکھتا جاتا تھا۔ جب اُس کا لکھنا ختم ہو گیا تو وہ اپنی کرسی پہ پیچھے کی جانب ٹِک گیا۔ اور کاغذ کو اٹھا کر ذرا آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کا ترجمہ یہ تھا:۔

"سلام اُس انسان پہ جو میرا پیغام پڑھے چاہے وہ کوئی ہو۔ مَیں شاہی کتبہ نویس شفتاح ہوں۔ اور عنقریب فرشتہ اجل سے دوچار ہونے والا ہوں۔ مَیں مُردوں کی دُنیا میں جا رہا ہوں۔ کیونکہ فرعون نے کسی کو بھی زندوں کی دُنیا میں نہیں چھوڑا۔ خداوند اولیریس مجھ پہ اپنی رحمتیں نازل کرے۔ ہاں تو میں شفتاح ہوں۔ جس پہ فرعونِ مصر نے موت کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ مَیں تجھے فرعون کے خزانہ گھر کا راز بتاتا ہوں۔ شہر سمناد سے تقریباً پچاس میل مشرق کی جانب ایک عظیم الشان ہرم ہے۔ اُس ہرم کے اندر فرعون کا بیش بہا خزانہ دفن ہے۔ خزانے تک پہنچنے کے لئے بہت سے دروازے ہیں۔ لیکن ان دروازوں میں سے صرف ایک ہی دروازہ ایسا ہے جس سے انسان سلامتی کے ساتھ اندر داخل ہو سکتا ہے۔ باقی دروازے مرگِ ناگہانی، ہاں فوری موت کے دروازے ہیں۔ بادشاہ نے

ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ بدنیت اور چور اپنے کئے کی سزا پائیں۔ بس ایک ہی دروازہ سلامتی کا دروازہ ہے۔ اس دروازے کا پتہ لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص چھ گھڑی رات گزرے ہرم کے اندر روشن دانوں سے آسمان کی جانب دیکھے تو ایک روشن دان سے اُس کو قطب ستارہ چمکتا نظر آئے گا۔ اس روشندان کے نیچے مطلوبہ دروازہ پوشیدہ ہے۔ بدمعاشوں کو فریب دینے کے لئے بہت سے روشندان بنے ہوئے ہیں۔ مگر قطب ستارہ صرف ایک روشن دان سے چمکتا نظر آتا ہے۔ فرعون سے یہ میرا انتقام ہے۔ جا اے اجنبی جا۔ اور فرعون کی دولت کو قبضے میں کر۔ خدا تیری مدد کرے۔"

"فرعون کا خزانہ" شوکت نے استعجاب کے ساتھ دبی ہوئی زبان سے کہا "خدایا! کیا یہ ممکن ہے؟" وہ بے اختیار اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور حالتِ اضطراب میں کمرے کے اندر ٹہلنے لگا۔ اُس وقت گھڑیال نے ایک بجایا۔ کلاک کی آواز رُکتے ہی اُس کا ملازم طشت میں اُس کا کھانا لئے ہوئے داخل ہوا۔ یہ ملازم مصری تھا۔ اور شوکت نے اپنے سفرِ مشرق کے دوران میں ملازم رکھ لیا تھا۔ ملازم طشت لئے ہوئے میز کی طرف بڑھا اور کچھ دیر تک رکابیوں اور قابوں کو میز پر سجاتا رہا۔ سجانے میں اُس نے معمول سے زیادہ دیر لگادی حتیٰ کہ

شوکت اس تاخیر سے گھبرا اُٹھا۔ اور بولا" بس حسن! رہنے دو کافی ہے"
حسن ایک فرشی سلام کر کے کمرے سے نکل گیا۔

(۳)

جہاں تک نظر کام کرتی تھی ریت ہی ریت تھی۔ یہ سرزمین افریقہ کا صحرائے اعظم تھی۔ آفتاب پوری تمازت کے ساتھ آسمان پر جلوہ گر تھا۔ اس کی گرم گرم شعاعیں ریت کے ذرّوں سے منعکس ہو رہی تھیں۔ ناگہاں اُفقِ مشرق پر ایک سیاہ نقطہ نمودار ہوا۔ اس کے بعد ایک دوسرا اور پھر تیسرا نقطہ بھی نظر آیا۔ یہ تینوں نقطے حرکت کرتے معلوم ہوتے تھے۔ اور ایک ہی سیدھ میں تھے۔ آدھ گھنٹے کے بعد ان تینوں نقطوں نے تین سانڈنیوں کی شکل اختیار کر لی۔ جو بہت تیزی سے گامزن تھیں۔ سب سے اگلی سانڈنی پر ایک مصری سوار تھا۔ اور اُس کے ہاتھ میں باقی دونوں کی مہار تھی۔ یہ مصری سفید سوتی لباس میں ملبّس تھا۔

جیسے جیسے ریگستان کی جھلس دینے والی گرمی بڑھتی گئی سانڈنیوں کا یہ قافلہ بھی صحرا کے اندر آگے بڑھتا گیا۔ شام کے قریب سامنے کی سمت ایک عظیم الشان عمارت دکھائی دی۔ مصری نے اس ہرم کی طرف اپنی سانڈنی کا رُخ پھیر دیا۔ اور ایک طویل سفر کے بعد اُس نے ہرم کے دامن میں، جو صدیوں سے اس لق و دق صحرا میں کھڑا ہوا فراعنہ مصر کی یاد دلاتا رہا تھا، پہنچکر دم لیا۔ مصری اپنی سانڈنی پر

سے اُتر پڑا۔ اور اپنے جانوروں کو غذا دے کر خود کھانا پکانے کی تیاری کرنے لگا۔ کھانا تیار ہونے تک رات آگئی۔ آسمان پر تارے چھٹک گئے۔ اور شب کی خنک و خوشگوار ہوا ریگستان میں چلنے لگی۔

کھانا کھا کر مصری اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے ایک متجسسانہ نگاہ ہرم پر ڈالی۔ ہرم کا باریک سرا رات کے نیلگوں آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اور تاروں کے درمیان ایک سیاہ سا خلا پیدا کر رہا تھا۔ وہ ہرم کے چاروں طرف گھومنے لگا۔ اکثر وہ اُس کا بغور معائنہ کرنے کے لئے ٹھہر جاتا۔ یہ پُراسرار قدیم عمارت انسانی آبادی سے کوسوں دُور ریگستان کی ہولناک فضا میں تنہا کھڑی تھی۔ اس کے دیکھنے سے انسان کے دل پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اور عجیب و غریب خیالات دماغ میں آنے لگتے تھے۔ "کاش مجھے اور زیادہ وقت ملتا" اُس نے ایک بار ہرم کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تو میں اپنا کام کل صبح تک کے لئے ملتوی کر رکھتا۔ مگر لوگ میرا تعاقب کر رہے ہوں گے۔ اب دیر کرنے کا بالکل موقع نہیں۔"

یہ کہکر وہ جلد جلد ہرم کے زینوں کو طے کرنے لگا۔ نصف بلندی پر پہنچ کر وہ تھم گیا۔ یہاں ایک دروازہ بنا ہوا تھا جس سے آدمی ہرم کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ یہ دروازہ بند تھا۔ اور صحرا کی ریت اُڑ اُڑ کر اُس کے سامنے جمع ہو گئی تھی جس سے داخلہ کی راہ مسدود ہو گئی تھی۔ مصری نے ایک کارتوس کے ذریعہ دروازہ پاش پاش کر

دیا۔ کارنوس کی بلند آواز نے صحرا کی خاموش فضا میں ایک ہولناک
اثر پیدا کر دیا۔ لیکن اس اثر سے بالکل نہ متاثر ہو کر اُس نے اندر
کی طرف جھانکا۔ اندر اندھیرا گھُپ تھا۔ وہ جھجکا۔ وہ اپنے ساتھ ایک
لالٹین لایا تھا۔ اُس کو روشن کر کے اُس نے اندر کی طرف روشنی
ڈالی۔ اس روشنی کی مدد سے وہ فرعون کی اس عظیم الشان یادگار
کے اندر داخل ہو کر آگے بڑھا۔ چند قدم چلنے کے بعد اُس نے اپنے
آپ کو ایک تنگ کمرے میں پایا۔ یہ کمرہ ساخت میں مربع تھا۔ اور چاروں
طرف سے بند تھا۔ اس میں اس کمرے کے سوا جس سے وہ ابھی
داخل ہوا تھا۔ اور کوئی دروازہ نظر نہ آتا تھا۔ فرش سے تقریباً دس
فٹ کی بلندی پر متعدد چھوٹے چھوٹے روشندان بنے ہوئے تھے۔
جن سے تازہ ہوا کے جھونکے آ رہے تھے یہ روشن دان بھی شکل میں
مربع تھے۔ اور ہر دیوار میں دو دو تھے۔

ان روشندانوں سے مصری آسمان دیکھ سکتا تھا جس میں تارے
جھلملا رہے تھے۔ چند لمحے تامل کرنے کے بعد وہ اپنی لالٹین اونچی
کر کے دیواروں کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ بظاہر دیوار بالکل مستحکم تھی۔
اور کوئی بھی سوراخ معلوم نہ ہوتا تھا۔ لیکن چند منٹ کے بعد مصری
نے اپنے بازوؤں کو ایک خاص انداز سے جنبش دی۔

"سمنٹ سے پلستر کر دیا ہے۔" وہ خود بخود بڑبڑایا۔ "تاکہ دروازے
نظر سے پوشیدہ ہو جائیں۔ مگر الحمد للہ کہ بچارے شفتلاح نے ساری

باتیں من و عن لکھ دیں۔ اور پروفیسر بھی قدیم زبانوں کا ماہر ہے۔ کبھی کوئی چُوک نہیں ہو سکتی۔ جس روشندان سے رات کی اس ساعت میں قطب ستارہ چمکتا نظر آئے گا۔ اُسی کے نیچے تو وہ دروازہ نہاں ہے۔ جو فرعون کے خزانے تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔"

اب اُس نے روشندانوں میں سے جو شمالی دیوار میں بنے ہوئے تھے ایک کی طرف رُخ کیا۔ دائیں طرف کے روشن دان سے قطب ستارہ کی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ مصری نے اپنی کمر سے ایک کُھاتی اور ایک ہتھوڑی نکالی۔ جنہیں وہ اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ فوراً ہی وہ خاموش کمرہ اُن ضربوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ جو مصری پے در پے دیوار کے پلستر پہ لگا رہا تھا۔ پلستر کافی موٹا تھا۔ اس کے بڑے بڑے ٹکڑے دیوار سے چھوٹ چھوٹ کر فرش پہ گر رہے تھے۔ آخر چند منٹ کی محنت کے بعد ایک پوشیدہ دروازہ نمودار ہوا۔ جو بند تھا۔

مصری نے اس دروازے کو بھی کارتوس کی مدد سے پاش پاش کر دیا۔ یہ وہ دروازہ تھا جو پچاس صدی سے بند پڑا تھا۔ وہ باہر کھڑا فرطِ جوش سے کانپ رہا تھا۔ آخر اُس نے اپنی لالٹین اُٹھائی اور اس کی روشنی ڈال کر اندر کی طرف نگاہ کی۔ اندر ایک مختصر سا تنگ راستہ تھا جو آگے جا کر زاویہ قائمہ بناتا ہوا ایک طرف کو مُڑ جاتا تھا۔ یہ راستہ بالکل صاف تھا۔ لیکن موڑ کی

اس طرف کیا تھا؟ وہ یہ جاننا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ تھوڑی دیر تک لالٹین اونچی کیئے ہوئے بغور دیکھتا رہا۔ لیکن وہاں اُسے کوئی چیز نظر نہ آئی۔ جو اُس کو خطرے سے مطمئن کر دیتی۔ شفتاح کے الفاظ ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے "خزانہ گھر کے اندر داخل ہونے کے کئی دروازے ہیں۔ لیکن اُن میں صرف ایک ہی ایسا ہے جس سے انسان سلامتی کے ساتھ داخل ہو سکتا ہے۔ باقی دروازے ناگہانی اور فوری موت کے دروازے ہیں"۔

وہ کھڑا سوچ رہا تھا "اُس کی غلطی کا نتیجہ کیا ہو گا؟ ذرا سی چوک بھی جان لیوا ثابت ہو گی۔ لیکن قطب ستارہ شمالی روشن دان سے چمکتا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ نہیں یقیناً کوئی غلطی نہیں ہو سکتی"۔ رات کی خنک ہوا روشندانوں سے آ رہی تھی۔ خاموشی ہولناک تھی اور تنہائی وحشت خیز۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جیتے جی دفن کر دیا گیا ہے، ہرم اُس کا مقبرہ ہے۔ اور اُس کے چاروں طرف پھیلا ہوا ریگستان ابدیت کا منظر پیش کر رہا ہے۔

وہ کھڑا ہوا سوچتا اور لرزتا تھا۔ اب اُسے کیا کرنا چاہیئے تھا؟ باہر نکل کر صبح کا انتظار کرے؟ لیکن اس کا تعاقب کرنے والے سراغ لگاتے ہوئے نزدیک آ چکے ہوں گے۔ صبح تک بہت ممکن تھا کہ ہرم تک آ پہنچے۔ اگر وہ دولت مند بننا چاہتا ہے۔ تو فی الفور کارروائی شروع کر دینا چاہیئے۔

"ہر لمحہ سونے سے وزنی ہو رہا ہے۔" اُس نے ایک فیصلہ کن انداز میں اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا۔ "اگر میں اُس کو ہاتھ سے نکل جانے دُوں گا تو دولت بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

(۴)

دوسری صبح کو گرم آفتاب چمکتا ہوا طلوع ہوا۔ اور ریگستان کا جلا دینے والا دن پھر شروع ہو گیا۔ ہرم کا سیاہ سایہ ریت پر پڑ رہا تھا۔ پچاس کوس کے حلقے میں صرف یہی ایک سایہ دار چیز تھی۔

ٹھیک دوپہر کے وقت اُونٹوں کا ایک قافلہ صحرائے اعظم میں گامزن نظر آیا۔ جو کل کی سانڈنیوں کے قافلے کی طرح ہرم کی جانب رواں تھا۔ سب سے اگلے اُونٹ پر پروفیسر شوکت اپنی سخت اور پتلی ناک پر سونے کی کمانی والا چشمہ چڑھائے بیٹھا تھا۔ کئی سائنس دان چند مصری پولیس کے سپاہی اور ایک پولیس افسر دوسرے اونٹوں پر سوار ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ سانڈنیوں پر نظر پڑتے ہی اس قافلے نے اپنے اونٹوں کی رفتار تیز کر دی۔

"وہ ہم لوگوں سے بہت آگے نکل گیا ہے۔" پروفیسر نے پولیس افسر کو مخاطب کر کے کہا۔

"جی ہاں، بجا ہے۔" افسر نے اپنی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن ہم لوگ وقت پر آ پہنچے ہیں۔ سفر کی واپسی میں وہ ہم لوگوں سے آگے نہیں نکل سکتا۔ اُسے ہمارے ساتھ ہی لوٹنا ہو گا۔"

ہرم کے پاس پہنچکر پولیس کے لوگ الگ الگ جماعت میں تقسیم ہو کر ہرم کے چاروں طرف گشت کرنے لگے تا کہ راہِ فرار مسدود ہو جائے۔ پروفیسر، افسر اور سائنس دان حضرات ہرم کی سیڑھیوں کو طے کر کے اور اُسی دروازے سے داخل ہو کر جس سے کل مصری داخل ہو چکا تھا، مربع کمرے میں پہنچے یہاں ان لوگوں نے ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ کمرے میں اُنہیں جو چیز نظر آئی وہ پلستر کے ٹکڑے تھے جنہیں گذشتہ رات مصری نے اپنے اوزار سے اُکھاڑا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ کسی نے بھی اُس کو کھولنے کی جرأت نہ کی۔ لوح کی خوفناک اطلاع کے بعد بھلا اتنی ہمت کس میں تھی۔ کہ اُسے کھول کر اندر داخل ہو۔

"حضرات!" پروفیسر نے ایک سنجیدہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ "ہم لوگ ایک ناواقف سرزمین پر کھڑے ہیں۔ اور ماضی کے اُس دَور کی ایک یادگار فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ جس کا ذرّہ ذرّہ جور و ستم کے واقعات سے پُر ہے۔ ہمیں خوب ہوشیار رہنا چاہئے۔ کیونکہ ہمارا ہر غلط قدم فوری موت کا باعث ہو سکتا ہے۔ ہم لوگوں کو رات کی آمد کا انتظار کرنا چاہئے۔ اُس وقت ہم ستاروں کو دیکھ کر پتہ لگا سکیں گے کہ کونسا دروازہ ہماری صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس اثنا میں ہمیں اُس دروازے کی بھی دیکھ بھال کرنا چاہئے۔ جسے معلوم ہوتا ہے کہ حسن نے اپنے لئے منتخب کیا ہے۔"

گھنٹے پر گھنٹے گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ شام ہونے کو آئی۔ مصر کی

مدھم تاریکی تمام فضائے بسیط پر مسلط ہو گئی۔ آسمان پر ساکت وصامت ستارے جگمگانے لگے۔ اُس وقت پروفیسر نے روشندانوں سے یکے بعد دیگرے جھانکنا شروع کیا جس دروازے کو حسن نے کھولا تھا۔ اُس کے اُوپر والے روشن دان سے قطب شمالی چمکتا ہوا صاف نظر آرہا تھا۔ شوکت چند لمحوں تک دروازے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ قطب شمالی پوری آب وتاب کے ساتھ آسمان پر جلوہ گر تھا۔

"صرف ایک ہی روشندان سے قطب شمالی چمکتا نظر آتا ہے"۔ شوکت نے اپنے حافظے سے کام لے کر لوح کے الفاظ کو دُہرایا کیونکہ لوح کے خبردار کرنے والے الفاظ اُس کے دماغ پر مرتسم ہو گئے تھے"۔ وہ بس یہی صحیح دروازہ ہے"! اُس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھ کر کہا۔" حسن یقیناً اس کے اندر فرعون کے خزانے کے درمیان پوشیدہ ہے۔ دیکھو قطب شمالی دروازے کے اُوپر والے روشندان سے صاف دکھائی دیتا ہے۔ آؤ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوں"۔

ایک ہلکا سا دھکا کھاتے ہی دروازہ کھُل گیا۔ دو تین لالٹینوں کی مدد سے جن کو اس چھوٹی سی جماعت کے چند ممبر ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے تھے۔ تاریک راستہ روشن ہو گیا۔ پروفیسر نے اندر کی طرف جھانک کر دیکھا۔ لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔

"یہ راستہ چند قدم تک ہرم کے اندر چلا گیا ہے"۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے اطلاعاً کہا۔" اور تب یکایک بائیں طرف کو مڑ گیا ہے۔ راستہ

بالکل صاف معلوم ہوتا ہے۔ آیئے پتہ لگائیں کہ یہ راستہ کدھر کو جاتا ہے۔"

ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں ایک ریوالور تھا، شوکت نہایت ہوشیاری اور آہستگی سے اندر کی طرف بڑھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے اُس کے ساتھی روانہ ہوئے۔ موڑ پر پہنچ کر وہ سب بائیں طرف کو مڑے۔ دفعتہً خوف و دہشت کی ایک بلند چیخ پروفیسر کی زبان سے نکل گئی۔ اور وہ لڑکھڑا کر اپنے پیچھے آنے والے ساتھیوں پر گرا چاہتا تھا۔ اُس کے ہاتھوں سے لالٹین چھوٹ کر زمین پر گر پڑی اور بجھ گئی ایک روشنی کے گل ہو جانے سے دھندلاہٹ میں اضافہ ہو گیا تھا۔

پروفیسر کے ساتھی جنہیں اس کی کچھ خبر نہ تھی کہ شوکت نے کیا دیکھا اور جن کا دماغ اس سراپا حیرت ناک مہم کی پُراسرار کیفیت، رات کے تاثرات وحشت انگیز تنہائی اور غیر محفوظ مقام کے خیال سے پہلے ہی دہشت زدہ ہو رہا تھا۔ ایک فوری ہیبت سے کانپ گئے۔ لیکن شوکت نے بہت جلد ان الفاظ میں اُن کی تشفی کر دی۔ "بھائی اب مجھے معاف کرنا کہ مَیں نے تمہیں دہشت زدہ کر دیا۔ لیکن موقع کی ناگہانی کیفیت نے مجھے ہراساں کر دیا۔ ذرا گوشے سے پرے ہٹ کر دیکھو۔ وہاں ایک ایسا خوفناک منظر ہے جس سے یکبارگی دوچار ہو جانے سے انسان کا ہیبت زدہ ہو جانا یقینی امر ہے۔"

سب کی نظریں ایک ساتھ اُٹھ گئیں۔ راستہ چند قدم آگے جا کر ختم

ہو جاتا تھا۔ آگے پتھر کی ایک مضبوط دیوار تھی۔ اور اُسی کے نزدیک ایک آدمی مرا پڑا تھا۔ اُس کی لاش ٹھنڈی اور سخت ہو چکی تھی۔

"ہا۔ بیچارہ احسن ہے جہاں وہ خزانے کی جستجو میں آیا تھا۔ وہاں اُسے فرشتۂ اجل سے دوچار ہونا پڑا۔ آج پانچ ہزار برس کے بعد بادشاہ طاح دوم نے ایک نیا شکار کیا"۔

پولیس افسر کا خوف لاش دیکھ کر کم ہو گیا تھا۔ اور چونکہ کوئی مافوق الفطرت بات نہ تھی۔ اس لئے ڈر کی بھی کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ لاش کا معائنہ کرنے کے لئے جھک گیا۔ "اوہو" اُس نے کہا "اسے چھرے سے زخمی کیا گیا ہے۔ جو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس کے ایک پہلو سے دوسرے پہلو تک پیوست ہو گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسے زخمی کیا تو کس نے؟ معلوم ہوتا ہوتا ہے کہ صحرا کا کوئی آوارہ بدمعاش چھپ کر اُس کے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچا۔ اور اُس کا کام تمام کر گیا"۔

یہ کہتے ہوئے وہ ایک بار پھر گھٹنوں کو زمین پر رکھ کر لاش کو دیکھنے کے لئے جھک گیا۔ اُس کے جھکتے ہی ایک کھٹکے کی آواز آئی جو کسی اسپرنگ کے دبنے سے آتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک آبدار فولادی تیغہ بغل والی دیوار سے بجلی کی سُرعت کے ساتھ نکل پڑا۔ اگر افسر سیدھا ہوتا تو یہ تیغہ ٹھیک اُس کے پہلوؤں میں پیوست ہو گیا ہوتا۔ لیکن چونکہ وہ جھکا ہوا تھا۔ اُس کے سر کے چند بالوں کو کاٹتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اور پھر اسی تیزی کے ساتھ دیوار میں گھس کر نظروں سے غائب ہو گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے اُسے نیام میں کر لیا ہو۔

دہشت کی ایک بلند چیخ سب کے منہ سے نکل گئی۔ پولیس کا افسر جھٹ پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بدحواس ہو رہا تھا جب کچھ ہوش بجا ہوئے تو اُس نے سر کھجاتے ہوئے فرش کی ایک جگہ کو اُنگلیوں سے بتا کر کہا۔

"دیکھئے یہاں ایک اسپرنگ پوشیدہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جب میں نے یہاں تختہ رکھا۔ تو اُس وقت یہ دبتا ہوا معلوم ہوا۔ تمہارے ملازم نے اسی پہ قدم رکھا ہو گا۔ اور چونکہ وہ سیدھا کھڑا ہوا ہو گا۔ تیغہ دیوار سے نکل کر اپنا کام کر گیا۔ خدا نے مجھے خوب بچایا۔ کہ چند بالوں کی حجامت ہی تک نوبت پہنچی"۔

"کوئی حیرت کی بات نہیں"۔ پروفیسر نے اطمینان کے لہجے میں کہا تختی تو صاف صاف بتا رہی ہے کہ باقی دروازے ناگہانی اور فوری موت کے دروازے ہیں۔ شفتاح نے سب کچھ لکھ دیا ہے۔ تاہم اُس نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جو چیز مجھے حیرت میں ڈال رہی ہے۔ وہ یہ کہ غلط دروازہ کیونکہ ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اس ساعت میں قطب شمالی اس کے اُوپر والے روشندان میں سے چمکتا نظر آ رہا ہے۔ شفتاح کا تو بیان ہے کہ صرف وہ دروازے جن کے اُوپر والے روشندانوں سے قطب شمالی نظر نہیں آتا موت کے دروازے ہیں اُسے ضرور دھوکا ہوا ہو گا۔ طاح نے ہر دروازے کی حفاظت کا یکساں انتظام کر رکھا ہو گا۔ لیکن یہ بات میری بڑی خوش قسمتی کا باعث

ہوئی۔ کہ حسن نے تختی چھپائی۔ ورنہ اُس کی جگہ میں ہی آج اس فرمانِ تیغ کا شکار بن گیا ہوتا۔"

"مصر کے قدیم باشندے بڑے دانا تھے جناب۔" پولیس افسر نے حقارت آمیز انداز میں کہا۔ اس بھیانک منظر کے دیکھنے کے بعد اب تو میں کسی دروازے پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا۔ چاہے اس کی صحت کے متعلق ہزاروں تختیاں ہی کیوں نہ اطمینان دلائیں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم صحیح کہتے ہو۔" پروفیسر نے سراسیمگی کی حالت میں جواب دیا۔ "لیکن مجھے اس کا اقبال ہے کہ میری عقل کام نہیں کرتی۔"

اس گفتگو کے بعد یہ مختصر سی جماعت لوٹ کر چھوٹے کمرے میں چلی آئی۔ مزدوروں کو دروازے پر پلستر کرنے کا حکم دے کر پروفیسر اور اُس کے ساتھی سب کے سب باہر نکل آئے۔ اور اِس طرح ہرم کو جو اس وقت فرعونِ مصر کا خزانہ گھر اور بدقسمت حسن کا مزار بن رہا تھا اپنی حالت پر چھوڑ کر ناکامیاب لوٹے۔

- - - - - - -

گذشتہ واقعہ کے چند مہینے بعد شوکت معمول کے مطابق اپنے شاگردوں کے درمیان مصریات پر لکچر دے رہا تھا۔ ناگہاں ایک خیال اُس کے دماغ میں بجلی کی طرح دوڑ گیا۔ شاگردوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ دیوانوں کی طرح چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ "ستارہ اپنی جگہ سے

ہٹ گیا۔ ستارہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا" جب اُس کے حواس کچھ درست ہوئے تو کلاس کو برخاست کر کے اپنی لائبریری میں چلا آیا۔

"خدایا" جب وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر منہ پر سے ایک تارے کا فارم کھینچ رہا تھا۔ چلا کر بولا" میں بھی کیسا بیوقوف ہوں۔ اُس وقت میرے ذہن میں یہ بات بالکل نہ آئی کہ پانچ ہزار سال کی طویل مدت میں تو ثواقب بھی اپنی جگہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ شمالی ستارہ بھی اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں دھوکا ہوا۔ ہرم کی شمالی دیوار میں دو روشندان تھے۔ شفتاح کے زمانے میں ستارہ بائیں طرف والے روشندان سے چمکتا نظر آتا ہوگا۔ لیکن پانچ ہزار برس کا عرصہ گزر جانے پر ستارے نے اپنی جگہ بدل دی اور اب وہ یقیناً دائیں جانب چمکتا ہوگا۔ حسن کو اور مجھے دونوں کو دھوکا ہوا۔ اب میں نے حقیقت کا پتہ لگایا۔ شفتاح کا بیان بالکل ٹھیک ہے۔

پروفیسر اپنی اس حیرت ناک دریافت کے چند ہفتے بعد پھر ایک جماعت کے ساتھ ہرم کی طرف رواں تھا۔ جہاں فرعون کی دولت مدفون تھی۔ وہ ریگستان میں بہت دور تک گھستا چلا گیا۔ لیکن ہرم کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ریگستان کے باشندوں نے اُسے خبر دی کہ چند ماہ پیشتر صحرا کی طرف سے ایک زبردست زلزلہ آیا تھا۔ بہت ممکن ہے۔ کہ اس زلزلے کی وجہ سے زمین پھٹ گئی ہو۔ اور وہ ہرم اپنے سارے خزانے اور حسن کی لاش کے ساتھ زمین میں سما گیا ہو۔ خیر جو کچھ بھی ہو۔ وہ ہرم

اس طرح غائب ہوا گویا اس سے قبل کہیں موجود ہی نہ تھا۔

اب بھی رات کے وقت صحرائے اعظم میں قطبِ شمالی آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہے۔ لیکن اُس کی روشنی اس ہرم کے اندر پہنچنے سے معذور ہے۔ جہاں راستے میں ایک انسان کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ اور جس کی دیوار میں ایک تیغہ چھپا ہوا اپنے شکار کا انتظار کر رہا ہے۔ اور انتظار کرتا رہے گا۔

ساربان کی داستان

جیسا کہ میرے کپڑوں سے ظاہر ہے میں مصر کے ایک گاؤں کا باشندہ ہوں۔ اور وہیں میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن میں آج کی طرح ہمیشہ سے غریب نہیں ہوں۔ میرا باپ متعدد اونٹوں کا مالک تھا۔ جنہیں وہ اُن تاجروں کو کرائے پر دیا کرتا تھا جن کے قافلے ہر سال شہر سے باہر دُور دُور جایا کرتے تھے۔ جب وہ مر گیا۔ تو اس کی کل جائداد میرے قبضے میں آگئی۔ اس کے علاوہ میرے باپ کے وقت کے پرانے گاہکوں کا حُسن ظن بھی میرے ساتھ قائم رہا۔ اس لئے میرے کاروبار کو خوب عروج ہوا۔ میرے اُونٹ ہمیشہ کرائے پر لئے جاتے اور میں اپنے اُونٹوں کے ساتھ ہمیشہ جایا کرتا تھا۔ تاکہ اُنہیں بے دردی سے استعمال نہ کیا جائے۔ چنانچہ متعدد بار مکہ معظمہ سے بھی ہو آیا تھا۔ جس کی شہادت پر سبز پھندنے والی ٹوپی دے سکتی ہے۔ میری زندگی پریشانی اور مسرت کا مجموعہ تھی۔ سفر کی صعوبت اور تکلیف برداشت کر کے خوش خوش اپنی بیوی اور بچوں کے پاس آتا۔ اور جتنے دنوں میرا

کاروبار مجھے اجازت دیتا گھریلو زندگی کی چہل پہل سے لُطف اندوز ہوتا۔ اِن دنوں میں نے خوب محنت کی اور دولت مند ہو گیا۔

ایک بار جبکہ میں ایک قافلے کے ساتھ ایک دشوار گزار ریگستان میں سے ہو کر گزر رہا تھا میری ایک پیاری اُونٹنی نے بچہ دیا۔ چونکہ میرے اُونٹ کافی سے زیادہ تھک چکے تھے۔ اس لئے پہلے مجھے خیال ہوا کہ اس "گوشت پوست" کو اس کی قسمت پہ چھوڑ دوں۔ لیکن پھر اس کے خوبصورت بدن، اس کے قوی جُثّہ اور اُس کے متناسب اعضا کو دیکھ کر گھرے آنا پسند کیا۔ مَیں نے ایک اُونٹ کا نصف بوجھ دوسرے اُونٹوں پر تقسیم کر دیا۔ اور باقی ماندہ جگہ پہ اُسے باندھ لیا۔ ہم لوگ جب قاہرہ پہنچے تو ننھا جانور کچھ سیانا ہو گیا تھا۔ اس لئے اُس کی جان بچا کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ اُونٹ کے ماہروں نے اُسے دیکھ کر غیر معمولی حسین اور طاقتور بتایا اور خوشخبری سنائی کہ چند روز کے بعد سفرِ حج کے موقعہ پہ یہ مبارک جانور قرآن شریف لے جانے کے لئے منتخب ہوگا۔ اور پانچ سال کے بعد ایسا ہی ہوا۔ اِس پانچ سال کی مدت میں مَیں حسبِ دستور قافلوں کے ساتھ جاتا اور اپنی دولت میں اضافہ کرتا رہا۔

اب میرا اُونٹ نشوونما کی آخری منزل پہ پہنچ چکا تھا۔ وہ جب کھڑا ہوتا تو اور اُونٹوں سے تین فٹ بلند رہتا۔ جب سفرِ حجاز کی تیاری ہونے لگی اور قرآن شریف لے جانے کے لئے اچھے سے

اچھے اونٹ کی تلاش ہوئی تو میں اُسے شیوخ کے پاس لے گیا۔ اور اس عزت و شرف کے اُمیدوار کی حیثیت سے پیش کیا۔ یہ لوگ میرا اونٹ فوراً چُن لیتے اگر ایک شاہ صاحب نہ ہوتے۔ جنہوں نے نہ معلوم کیوں میرے اونٹ کا کرائے پر لیا جانا ناپسند کیا۔ اور کہا کہ اگر یہ اونٹ قرآن مجید لے جانے کے لئے منتخب ہوا تو قافلے کی شامت آ جائے گی چونکہ شاہ صاحب پیر و مرشد سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے شیوخ سہم گئے۔ اور کوئی فیصلہ کُن جواب نہ دے سکے۔ شاہ صاحب کی اس مداخلت سے برہم ہو کر میں نے اُنہیں سخت سُست کہہ دیا انہوں نے شور واویلا مچا دیا۔ اس پر لوگ مجھ پر پل پڑے۔ اور اس قدر مارا کہ میں نیم مردہ ہو گیا۔ پھر جب میں بھاگنے لگا۔ تو اس کمبخت نے مجھ پر تھوڑا سا بالو پھینکا اور چلّا کر کہا "اسی طرح عذابِ الٰہی سے قافلہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اگر اللہ کا پاک کلام اس کے منحوس اونٹ کو لے جانے کی اجازت دی گئی" آخر کار اُس سے معمولی درجے کا اونٹ چُن لیا گیا۔ اور مجھے ناکامی ہوئی۔ لیکن دوسرے سال شاہ صاحب قاہرہ میں موجود نہ تھے۔ اور چونکہ خوبصورتی میں میرے اونٹ کا ہمسر ایک اونٹ بھی نہ تھا۔ اس لئے شیوخ نے بالاتفاق اُسے پسند کیا۔ اور مخالفت کی ایک صدا بھی بلند نہ ہوئی۔

اپنی اس خوش قسمتی کو میں اپنے کُل خاندان کے لئے رحمت تصوّر کرتا تھا۔ شاداں و فرحاں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا میں اپنی بیوی کے

پاس جا پہنچا۔ میری طرح وہ بھی مسرور ہوئی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ میرا خوبصورت اُونٹ بھی اپنے اس اعزاز سے جس کا وہ مستحق قرار دیا گیا تھا۔ آگاہ ہے کیونکہ اُس نے ہمارے پیار کے جواب میں اپنی لانبی گردن کو جھکا دیا۔ اور اپنے سر کو ہم لوگوں کے کندھوں پر رکھ دیا۔

قافلے والے جمع ہو گئے۔ سالہا سال گزرے قاہرہ سے اتنا بڑا کارواں روانہ نہ ہوا تھا۔ یہ اٹھارہ ہزار اُونٹوں کی جمعیت پر مشتمل تھا۔ آپ میری بے پایاں مسرت کا اندازہ اس سے کر سکتے ہیں۔ کہ جب جلوس سڑک پر سے گزر رہا تھا تو میں نے دُور سے اپنی بیوی کو اپنا شاندار اُونٹ دکھایا جس کی مُہار زرد جواہر سے مرصّع تھی جسے محترم شیوخ جو سبز لباس میں ملبّس تھے لے جا رہے تھے جس کی پشت پر وہ صندوق رکھا ہوا تھا۔ جس کے اندر اسلامی شریعت کی مقدّس کتاب محفوظ تھی۔ اور جو اپنے چاروں طرف مسرور و مطمئن گانے بجانے والے مردوں اور عورتوں کے بے شمار جھنڈ دیکھ کر بصد عزّ و تمکنت چل رہا تھا۔

چونکہ اگلے دن قافلے کو شہر سے رخصت ہونا تھا۔ اس لئے میں اپنے اور اُونٹوں کو جو زیارتِ کعبہ کے لئے کرایہ پر لئے گئے تھے۔ اپنے ایک ملازم کے سپرد کر کے اپنی بیوی اور بچوں کے پاس چلا آیا۔ کہ باقی وقت اُن کی معیت میں گزار سکوں۔ دوسرے دن صبح کو میں نے بیوی بچوں کو الوداع کہا اور گھر سے جُدا ہو رہا تھا کہ میری سب سے چھوٹی بچی نے جو کم و بیش دو سال کی تھی آواز دی۔ اور یہ خواہش ظاہر کی کہ میں

ذرا سی دیر کے لئے اُس کے پاس آؤں اور اُسے اپنا بوسہ دیتا جاؤں۔ میں نے اُسے اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ اُس نے اپنی عادت کے موافق اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو میرے ڈھیلے ڈھالے لبادے کی جیب میں ڈال دیا وہ شاید پھل تلاش کر رہی تھی۔ کیونکہ میرا معمول تھا کہ میں بازار سے واپس آتے ہوئے اُس کے لئے ہمیشہ کچھ پھل لایا کرتا تھا۔ لیکن آج جیب میں کچھ نہ تھا۔ میں نے اُسے اُس کی ماں کی گود میں دے دیا۔ اور اس خیال سے کہ مقررہ وقت سے دیر نہ ہو جائے۔ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا روانہ ہو گیا۔ شاید آپ کو اس کا علم ہو گا۔ کہ ہم مصری لوگ جیسا کہ اکثر قافلوں کا دستور ہے یکے بعد دیگرے ترتیب وار نہیں چلتے۔ بلکہ ایک صف میں ہو کر پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ روانہ ہونے کی تاریخ سے ایک روز قبل تمام ضروری انتظامات درست کئے جاتے ہیں۔ اور آفتاب غروب ہونے کے بعد فوراً ہی کوچ کرتے ہیں۔ شام کے وقت ہم لوگوں کا قافلہ روانہ ہوا۔ دو روز کی مسافت طے کر کے ہم نے تین دن قیام کیا۔ تاکہ اپنی اپنی مشکوں کو سویز کے پانی سے بھر لیں اور التیاح جیسے ریگستان میں چلنے کے لئے جانوروں کو تازہ دم کر سکیں۔

تیسرے دن جبکہ میں اپنے حُقّے کا کش لگا رہا تھا۔ اور میرا اُونٹ میرے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا مجھے قاہرہ کی جانب سے ایک سواری آتی ہوئی نظر آئی۔ جو بہت تیزی سے آ رہی تھی۔ اگرچہ یہ میرے سامنے سے بجلی کی طرح گزر گئی۔ لیکن پھر بھی مجھے سوار کے

پھپلنے کا کافی موقع مل گیا۔ یہ سوار وہی شاہ صاحب تھے جنہوں نے گذشتہ سال کے حج میں میرے اُونٹ کے قرآن شریف لے جانے پر منحوس پیشگوئی کی تھی*

شاہ صاحب نے اپنی اونٹنی کو حاجیوں کے امیر کے سامنے روکا جو قافلے کے حکمران تھے۔ اُس کے اِس تعاقب کا سبب، جسے مَیں نے پہلے ہی سے یہ سمجھ رکھا تھا۔ کہ وہ میرے اُونٹ کے متعلق پیشگوئی کریگا۔ معلوم کرنے کے لئے مضطرب ہو کر مَیں جلدی سے اس جگہ پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ امیر اور اُن لوگوں کے سامنے جو اُس کے گرد حلقہ باندھے ہوئے تھے۔ تقریر کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر میرا اُونٹ مار نہ ڈالا گیا۔ اور اس کی جگہ دوسرا نہ چُنا گیا۔ تو تمام کے تمام قافلے کو ہولناک مصیبتوں کا سامنا ہوگا۔ تھوڑی دیر تک سخت پُر جوش تقریر کر کے اور ہمارے قافلے میں ہلچل مچا دینے کے بعد اُس نے اپنی اونٹنی کا رُخ پچھم کی طرف کیا۔ اور تھوڑی دیر میں نظر سے اوجھل ہو گیا*

امیر سخت پریشان تھے۔ مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگ آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔ مَیں ڈرا کہ یہ لوگ شاہ صاحب کی تجویز قبول کر لیں گے۔ مجھے یہ بھی خطرہ ہوا۔ کہ میرا اُونٹ جان سے جائیگا اور جس اعزاز کے لئے وہ مخصوص کیا گیا تھا۔ اُس سے محروم ہو جائیگا مَیں نے ایک جُرم کا ارتکاب کیا۔ مَیں نے جھوٹ بولا*

مَیں نے کہا" امیر! آپ اس شخص کی بات نہ سُنیں جو میرا دشمن

ہے۔ ایک مرتبہ جبکہ وہ میرا مہمان تھا میری روٹیاں کھانے کے بعد میری بیوی کی عصمت پر حملہ کر کے سخت نمک حرامی کا ثبوت دینا چاہتا تھا۔ اور اس پر میں نے اُسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ اب یہ اس طرح اپنا انتقام لینا چاہتا ہے۔ میرے اونٹ کو قافلے کے ساتھ جانے دیجئے۔ کیونکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل سچ ہے" میری بات بھی مانی گئی۔ شاہ صاحب کے الہامات بے اعتبار سمجھے گئے۔ اور اسی شب کو ہم لوگ الیتاح کے لق ودق میدان میں چل پڑے۔

شاید آپ نے حج کا سفر نہ کیا ہو اس لئے ہم لوگ جس سرزمین سے گزر رہے تھے۔ اس کا تصور بھی آپ ذہن میں قائم نہیں کر سکتے۔ یہ بالو کا ایک وسیع خطۂ زمین ہے۔ جہاں مسافروں کے نقوش قدم سے بنے ہوئے راستے آندھی اور جھکڑ سے مٹ مٹ جاتے ہیں۔ بے پانی کا ایک وسیع سمندر —— دور تک پھیلا ہوا ایک سنسان ریگستان۔ اب ہم لوگ لق ودق بیابان میں داخل ہو گئے۔ چونکہ جانوروں کا طویل جھنڈ جو حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا بالکل خاموش جا رہا تھا۔ اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اونٹ نہیں بلکہ سائے چل رہے ہیں۔

شاہ صاحب کی پیشگوئی کے باوجود ہم لوگوں کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ سات راتوں کے تھکا دینے والے سفر کے بعد ہمارا قافلہ بخیریت تمام نخیل پہنچا۔ یہاں ہم نے اپنے اپنے خالی مشکیزوں کو

دوبارہ پانی سے بھر لیا۔ جن لوگوں سے میری ملاقات تھی۔ انہوں نے کنوئیں پر میرے دشمن شاہ صاحب کی غلط پیش گوئی کا خوب خوب مضحکہ اڑایا۔ اب قلعہ عقابہ پہنچنے سے قبل تین دن سخت مصیبتوں کا مقابلہ کرنا تھا۔

دوسرے دن صبح کا وقت تھا۔ اپنا اپنا خیمہ نصب کئے ہوئے ایک ہی گھنٹہ گزرا تھا کہ شاہ صاحب پر جھوٹی تہمت لگانے کے جرم میں خدا کا قہر اور ان کی ہولناک پیشینگوئی حرف بحرف صحیح اتری۔

ایک سیاہ بدلی افق پر نمودار ہوئی۔ یہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ اور چمکیلے زرد رنگ میں تبدیل ہو گئی۔ پھر اوپر بلند ہوتی گئی یہاں تک کہ اس نے آسمان کے نصف حصے کو چھپا دیا۔ اور دفعتہً ہم لوگوں پر آندھی کی شکل میں برس پڑی۔ وہ آندھی جو بالو کے بڑے بڑے پہاڑوں کو ان کے قدموں پر گرا گرا کر اور ہم حاجیوں کے سروں پر انہیں زور زور سے پھینک کر اپنے سامنے کی ہر چیز کو بہالے گئی۔ امیر کا عظیم الشان خیمہ جو سب سے پہلے آندھی کی نذر ہوا۔ میرے قریب سے اڑتا ہوا گزرا۔ دوسرے لوگ یا تو زمین کے برابر ہو گئے۔ یا انہیں آندھی اڑا لے گئی۔ اور وہ چرخی کی طرح چکر کھا رہے تھے۔ ریت کے بڑے بڑے ستون ہم پر گر رہے تھے۔ اور بے شمار آدمی اور جانور گھٹ گھٹ کر مر رہے تھے۔ بعض اونٹ اپنا منہ زمین میں چھپائے ہوئے تھے۔ ان کی اس ذکاوت سے فائدہ اٹھا کر میں نے بھی ایسا ہی کیا

مگر حد درجہ خوف زدگی اور سکتے کے عالم میں قسمت میں لکھے ہوئے کا منتظر تھا۔ ابھی تک آندھی ہم پر اپنی پوری تباہ کاریوں کے ساتھ حملہ آور نہیں ہوئی تھی۔ چند منٹ کے بعد تو ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا ——— ہر جگہ تاریکی تھی..... خوفناک تاریکی، جیسے آخری سانس لینے والوں کے ہذیان، عورتوں کے نالہ و شیون اور ہزار ہا گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کی بھاگ دوڑ نے جو رسیوں اور ڈوریوں کو توڑ کر اس طوفان کی ہلاکت آفرینی سے نجات پانے کی کوشش میں پاگل جانوروں کی طرح بدک رہے تھے۔ اور بھی مہیب بنا دیا تھا۔

میں اپنے اونٹ کی ایک بغل میں پڑا رہا تھا۔ اور اپنا منہ اس کے پہلو میں چھپائے ہوئے موت کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھ پر اس شخص کی سی دہشت طاری تھی جو یہ سمجھ رہا ہو کہ یہ عذاب الیم، یہ خدائی غیظ و غضب صرف اسی پر برس رہا ہے۔ کامل ایک گھنٹے تک اسی حالت میں رہا۔ اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ دوزخ کی کوئی تکلیف بھی اس تکلیف سے جو اس تھوڑی سی مدت میں اٹھائی زیادہ ہولناک نہیں ہو سکتی۔ گرم گرم ریت ہمارے کپڑوں میں گھس گئی تھی۔ بدن کے کل مسام بند ہو گئے تھے۔ اور مجھے مشکل سے کبھی کبھی گرم ہوا میں سانس لینے کا موقع مل جاتا تھا۔ جو میرے رشتۂ حیات کے باقی رکھنے کا واحد ذریعہ تھا۔ آخر کار میں نے ذرا آسانی سے سانس لینے

کی صورت نکالی۔ اب آندھی کا شور وشغب بھی سنائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنا سر بلند کیا۔ لیکن میری آنکھیں بینائی کھو چکی تھیں۔ میں زرد شعاع کے بغیر کچھ نہ دیکھ سکا۔ میں سمجھا کہ میں اندھا ہو گیا ہوں۔ اور البتاح جیسے بے آب وگیاہ ریگستان میں ایک اندھے کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنے سر کو زمین پر ڈال دیا۔ مجھے اپنے گھر کے لوگوں کا خیال آ گیا۔ میں مایوسی اور ناامیدی کے ہجوم میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

آنسوؤں کے بہنے سے میری آنکھوں پر خوشگوار اثر ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری تکلیف دور ہو چکی ہے۔ اپنے سر کو اٹھایا ——
—— اب میں دیکھ سکتا تھا۔ خدائے تعالےٰ کی اس عنایت کے شکریے میں بصد عجز ونیاز سر بسجود ہو گیا۔ ہاں میں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن کونسا منظر میرے پیش نظر تھا۔ آسمان اور لامتناہی فضا گرد و غبار سے پاک تھی۔ لیکن وہ ہزارہا نفوس جو میرے ہمراہ تھے۔ وہ جانوروں اور آدمیوں کا پرشوکت ازدحام، یہ سب کہاں گئے؟ امیر، حجاج اور اُس کے محافظ کہاں تھے؟ سلطنت کے وزراء، سپہ سالار، لشکر عظیم مقدس شیوخ، متبرک اونٹ اور گانے بجانے والے کہاں؟ مختلف قومیں اور بے شمار قبیلے جنہوں نے کارواں میں شرکت کی تھی وہ کہاں؟ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ ریگ کے اونچے اونچے ٹیلے اس جگہ کا نشان بتاتے تھے۔ جہاں وہ لوگ

مدفون تھے۔ مگر اُن پر سوائے آدمیوں اور جانوروں کے اُس حصہ جسم کے جواب تک بالُو کے ڈھیر میں چھپے نہ تھے۔ اور کوئی یادگار نہ تھی۔ سب کے سب رخصت ہو چکے تھے۔ سوائے ایک کے، اور وہ ایک وہ اکیلا گنہگار، خود میں تھا۔ جسے محض اس لئے زندہ رہنے کی اجازت دی گئی تھی کہ وہ اِس ہلاکت اور نقصانِ عظیم کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ جو اس کے اور صرف اُس کے گناہ کا نتیجہ تھا۔

چند منٹ یاس و ناامیدی سے بے خبر اس نظارے کو غور سے دیکھتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ان تمام لوگوں سے علیحدہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ میری موت ان کی موت سے بھی زیادہ دہشتناک ہو۔ لیکن فوراً ہی مجھے اپنی بیوی اور بچوں کا خیال آ گیا۔ اور اُن لوگوں کی خاطر میں نے اپنی زندگی بچانے کا تہیہ کیا۔ وہ زندگی جو روئے زمین پر اس ایک پابندی کے سوا اور کوئی پابندی نہیں رکھتی تھی۔ میں نے اپنی پگڑی سے ایک ٹکڑا پھاڑا۔ اور اپنے خون آلود نتھنوں سے بالُو صاف کرتے ہوئے اِس گورِ غریباں پر اِدھر اُدھر چلنے لگا۔

بہت سے ٹیلوں کے درمیان میں نے متعدد اونٹوں کو پایا۔ جو بالُو میں دفن نہیں ہوئے تھے۔ ایک مشک دیکھ کر اُس کی طرف دوڑا کہ اپنی ناقابلِ برداشت پیاس بجھا سکوں۔ لیکن وہ خشک ہو چکی تھی۔ اور ایک قطرہ بھی باقی نہ تھا۔ مجھے ایک اور مشک

نظر آئی۔ لیکن یہاں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ مجبوراً ایک اُونٹ کا پیٹ چاک کر کے اُس کے معدے میں بچا ہوا پانی نکالنے پر آمادہ ہوا۔ اور اپنی پیاس بُجھا کر۔ وہ پیاس جیسے پیٹ کے اندر سے نکالا ہوا گرم پانی بھی خوش ذائقہ معلوم ہوا۔ مَیں جلدی سے اور جانوروں کی طرف بڑھا تاکہ اُن کے پیٹ میں بچے ہوئے پانی کو قبل اس کے کہ اُس میں نقص پیدا ہو جائے اپنی مشک میں جمع کر لُوں۔ میں نے نصف مشک سے زائد پانی حاصل کیا۔ اور اپنے اُونٹ کے پاس جس کے پہلو میں آندھی کے وقت میں چھپا ہوا تھا واپس آیا۔ اُس کے بدن پر بیٹھ گیا۔ اور آگے بڑھنے کے بہترین ذرائع پر غور کرنے لگا مجھے معلوم ہوا کہ میں چشمے سے ایک دن کی مسافت کی دُوری پر ہوں۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی اُمید کتنی موہوم تھی۔ دن ختم ہونے کے قریب تھا۔ میں نے اپنی کوشش جاری کرنے کا قصد کیا۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ مَیں اُٹھا اور اپنی پیٹھ پر مشک لئے ہوئے اپنے مایوس کُن سفر کے لئے آگے بڑھا۔ ساری رات چلتا رہا۔ صبح سویرے مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس چلچلاتی ہوئی گرمی میں بغیر کسی پناہ کے ایک دن اور پھر ایک مصیبت بھری رات اور چلنا ہے۔ میرے پاس پانی کافی مقدار میں تھا۔ لیکن کھانے کی کوئی چیز بھی نہ تھی۔ آفتاب جب بلند ہوا۔ تو اُس کی گرم شعاعوں میں نہ ختم ہونے والے بارہ گھنٹوں تک جُھلسنے کے لئے ریت کے ایک

ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ دوپہر ہونے سے قبل ہی میرا دماغ کھو لنے لگا۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی تھی۔ آہ! زندگی کا خواب ایک سراب تھا۔ میں نے وہ چیز دیکھی جو عنقا تھی۔

دفعتہً میری مشتاق آنکھوں نے ایک جھیل دیکھی اور مجھے اس کا اس درجہ یقین ہوا۔ کہ میں اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا چلا۔ یہاں تک کہ اس کی تلاش میں تھک کر چور ہو گیا۔ پھر مجھے دور ببول کا ایک درخت نظر آیا جو ہوا میں حرکت کر رہا تھا۔ اپنے جسم کو اس کے سائے میں چھپانے کے لئے جلدی سے دوڑا۔ اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں پہنچ گیا۔ جو وہاں بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔

مجھے تمام دن جو پریشانیاں اُٹھانی پڑیں۔ اور جن جن مصیبتوں کا سامنا ہوا۔ اُن کی یاد اب بھی میرے دماغ میں تازہ ہے۔ آخر رات آگئی اور جھلملاتے ہوئے تاروں نے مجھے دوبارہ سفر کرنے کی ہدایت کی۔ اپنی مشک سے خوب جی بھر کر پانی پیا۔ اور تن تنہا چل پڑا۔ میں اس راستے پر جا رہا تھا۔ جہاں کسی زمانے میں ہلاک و برباد ہو جانے والے قافلوں کی ہڈیوں سے نشان بن گئے تھے۔ صبح ہوتے ہی کچھ فاصلے پر عقابہ کا قلعہ نظر آیا۔ از سر نو زندگی پانے کی مسرت میں میں نے اپنی مشک پھینک دی۔ اپنی رفتار چوگنی کر دی اور آدھ گھنٹے کے اندر اپنے آپ کو اس چشمے کے قریب ڈال دیا۔ جس سے چند روز قبل ٹھنڈا اور شیریں پانی پی چکا تھا۔ میری

مسہریوں کا کیا ٹھکانا تھا۔ سلے کے اندر لیٹنا، ٹھنڈی ہوائیں سانس لینا، چڑیوں کا دلکش نغمہ سُننا، پھولوں کی رُوح پرور خوشبو جس سے وہاں کی خوبصورت فضا معطر تھی۔ سونگھنا میرے لئے کس قدر فرحت بخش تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد لباس اُتارا، غسل کیا اور پھر پانی پی کر سو گیا۔

جاگا تو طبیعت بشاش تھی۔ لیکن بھوک کی جاں گسل تکلیف سے جس کا حملہ اب شدید ہو رہا تھا سخت بے چین تھا۔ میں تین دن سے بغیر غذا کے تھا۔ لیکن اب تک اُس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے کہ پیاس میرے ہوش و حواس پر غالب تھی۔ اب کہ بڑی مصیبت دُور ہو چکی تھی کم درجے کی تکلیف بڑھ گئی۔ اور اُس کی اذیّت مسلسل بڑھتی گئی۔ میں نے آسمان کے چاروں طرف اس اُمید میں کہ شاید کوئی کارواں گزرتا ہوا نظر آجائے۔ نگاہ دوڑائی۔ لیکن بے سُود۔ آخر چشمے پر واپس چلا آیا۔ اس طرح دو دن اور گزرے۔ مگر کوئی مدد نہ پہنچ سکی۔ اور میری رہی سہی طاقت نے بھی جواب دے دیا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں مر رہا ہوں۔ چشمے کا دل فریب ترنّم، چڑیوں کا دلکش نغمہ، رخساروں سے مس ہونے والی ہوا کا نرم و نازک جھونکا۔ ان نعمتوں کو پا کر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ بے آب و گیاہ اور سنسان ریگستان میں ہلاک ہو جانا اِس جنّتِ ارضی میں ترس ترس کر جان دینے سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔ مَیں مرنے کے لئے زمین پر پڑا رہا۔ اس لئے کہ اب مجھ میں بیٹھنے کی تاب نہ تھی۔ اور جیسے ہی

قریب بہنے والی آبشار پہ جو میری حیات میں اضافہ کا باعث ہوئی تھی ایک آخری نگاہ ڈالنے کے لئے کروٹ لینا چاہتا تھا۔ کوئی سخت چیز میرے پہلو میں چبھی۔ مَیں نے سمجھا کہ پتھر ہے۔ اور اُس کو الگ کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ زندگی کے آخری لمحات ذرا چین سے گزریں۔ لیکن جب مجھے معلوم ہُوا کہ زمین پہ نہیں بلکہ میری جیب میں کوئی چیز ہے تو اس سے بیخبر کہ کیا ہے۔ میں نے جیب کے اندر ہاتھ ڈال دیا۔ اور باہر نکال کر پھینکنے سے پہلے اُسے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ خشک روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ مَیں نے خیال کیا کہ یہ مجھے جنّت سے بھیجا گیا ہے۔ اور تھا بھی جنّت سے بھیجی ہوئی چیزوں کی طرح عمدہ اور خالص، کیونکہ یہ محبّت، الفت اور معصومیّت کا تحفہ تھا —— یہ وہی روٹی کا ٹکڑا تھا جو میری پیاری ننھی بچی کو ناشتے میں ملا تھا۔ اور جسے اُس نے میری روانگی کے وقت جبکہ مَیں یہ سمجھ رہا تھا۔ کہ وہ پھل تلاش کر رہی ہے۔ میری جیب میں ڈال دیا تھا۔ میں رینگتا ہُوا چشمے کے قریب گیا۔ روٹی کے ٹکڑے کو تر کیا اور کھا گیا۔ اُس وقت خُدا کے اِس احسانِ عظیم پر تشکّر و امتنان، اور شفقتِ پدری کے ملے جُلے والہانہ جذبات سے متاثر ہو کر میری آنکھوں سے سیلابِ اشک جاری تھا۔

اسی روٹی کے ٹکڑے نے میری جان بچائی۔ دوسرے دن ایک چھوٹا سا قافلہ پہنچا۔ جسے قاہرہ جانا تھا۔ یہ تاجر میرے ساتھ بہت ہمدردی

سے پیش آئے۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے ساتھ لے لیا اور میں ایک مرتبہ پھر اپنی پیاری بیوی اور اپنے عزیز بچوں کو جن سے پھر ملنے کی مجھے کوئی امید نہ رہی تھی۔ گلے لگا سکا ——— اسی زمانے سے میں غریب ہوں مگر قانع۔ اپنے جرم کی پاداش میں میں نے اپنی ساری جائداد سے محروم ہو جانا پسند کیا۔ اور اب مال و دولت سے دست بردار ہو کر خدائے بزرگ و برتر کی ہر مرضی پر سر تسلیم خم کرتا ہوں ؎

عرب

(۱)

خالد اور جبّیدہ ، مصنّفہ اصمعی ، مترجمہ منصور احمد

خالد اور حبیدہ

محارب اور ظہیر ایک ہی ماں باپ سے بھائی تھے۔ دونوں اپنی جرأت اور شجاعت کی وجہ سے ملک بھر میں مشہور تھے۔ لیکن محارب قبیلے کا سردار تھا اور ظہیر اُس کا وزیر۔ محارب اُس کے مشورے پر چلتا تھا۔ مگر ظہیر پھر بھی اُس کا تابع فرمان تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اُن کے درمیان کسی معاملہ پر سخت تکرار ہوئی اور بڑا بگاڑ پیدا ہو گیا۔ ظہیر اُٹھ کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔ وہ نہایت مغموم تھا۔ اور نہ جانتا تھا کہ اب کیا کرے۔ اُس کی بیوی نے اُس سے پوچھا "اے عربی سرداروں کے سردار! تم اس قدر آزردہ خاطر کیوں ہو؟ کیا تمہیں کسی نے ناراض کیا ہے۔ یا کسی نے تمہاری توہین کی ہے"؟ ظہیر نے کہا "میں کیا کروں وہ جس نے میرے دل کو زخمی کیا ہے۔ وہ ہے جس پر میں اپنا ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ جسے میں کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتا۔ وہ دُنیا میں میرا ایک ہی رفیق، میرا بھائی ہے۔ آہ۔ اگر وہ کوئی اور ہوتا تو میں اُسے بتا دیتا کہ وہ کیسے شخص کا مدِ مقابل ہوا ہے۔ اور اپنی قوم

کے رؤسا کے سامنے اُس کی مثال کو ایک عبرت بنا کر پیش کرتا۔"
اُس کی بیوی نے کہا۔ "تُم اپنے مال و متاع سے لُطف اُٹھانے
دو۔ اور تم یہاں سے چلو۔" اور ظہیر کو آمادہ کرنے کے لئے اُس نے
بڑے بڑے شعرأ کے شعر پڑھے جن میں مذکور تھا کہ توہین انسان کو
اپنے ماں باپ کی جانب سے بھی قبول نہیں کرنی چاہیئے۔

ظہیر نے اپنی بیوی کے مشورے کو مان لیا۔ اُس نے رُخصت کی
تیاری کرلی۔ اپنے خیمے لپیٹ لیئے۔ اونٹوں پر اسباب لادا۔ اور قبیلہ
سعد کی قیامگاہ کی طرف چل دیا۔ جو اُس کے حلیف تھے۔ مگر اُس کے
دل میں اپنے بھائی سے جُدا ہونے پر رہ رہ کر ایک درد اُٹھتا تھا۔
اور اُس نے کہا۔ "اس سفر میں جو مجھے تجھ سے دُور

لے جا رہا ہے مجھے یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ میں ہزار سال چلتا رہوں گا
اور ہر سال مجھے تجھ سے ہزار میل دُور لے جائے گا۔ . . . . .
اگر اب تو مجھ پر ہزار مصر کے برابر بھی احسان کرے۔ اور ہر مصر میں
ایک ہزار نیل ہوں تو میں اُنہیں حقارت کے ساتھ ٹھکرا دوں گا۔
جب تک میں تجھ سے دُور رہوں گا اپنی کم مائیگی پر قناعت کرونگا
اور جُدائی کے دنوں میں اس شعر کو پڑھوں گا جو تابناک موتیوں
کی لڑی سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ "جب کسی شخص کی اپنی ہی قوم
اور اپنے ہی وطن میں تحقیر کی جائے۔ تو اس کے لئے اس کے
سوا اور کیا چارہ ہے۔ کہ وہ اُسے چھوڑ دے۔ تو جس نے میرے

دل کو یُوں زخمی کیا ہے۔ بہت جلد رحمٰن و رحیم خدا کی قوت کو محسوس کرے گا۔ کیونکہ وہی میرے اور تیرے درمیان فیصلہ کرنے والا اور قائم و دائم ہے"۔

آخر ظہیر قبیلہ سعد میں پہنچ گیا۔ اور گھوڑے پر سے نیچے اُتر آیا۔ بنو سعد نے اُس کا نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اور اُسے اپنے پاس رہنے پر مجبور کیا۔ اُس کی بیوی جلد ہی ایک بچے کی ماں بننے والی تھی اور ظہیر نے اس سے کہا۔" اگر خدا نے ہمیں لڑکا دیا تو یہ اُس کی عین عنایت ہے۔ لیکن اگر لڑکی پیدا ہوئی تو اس کا چرچا نہ کرنا۔ اور لوگوں کو اس مغالطے میں رہنے دینا کہ ہمارے ہاں لڑکا ہوا ہے۔ تاکہ میرے بھائی کے لئے وجہ شماتت پیدا نہ ہو۔" آخر وہ وقت بھی آن پہنچا۔ اور ظہیر کی بیوی کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ اُنہوں نے اُس کا نام جبیدہ رکھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ باہر لوگوں میں اُسے جندرہ کہہ کر پکارا جائے۔ تاکہ وہ اسے لڑکا سمجھیں۔ اور لوگوں کو اس کا مزید یقین دلانے کے لئے اُن کے ہاں کئی دن تک صبح و شام دعوتیں اور جلسے ہوتے رہے۔

قریب قریب اسی زمانے میں دوسرے بھائی محارب کے گھر بھی لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اُس نے خالد رکھا۔ اُس نے یہ نام خدا کی بارگاہ میں شکرانے کے طور پر منتخب کیا۔ کیونکہ جب سے اُس کا بھائی اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اُس کے معاملات سُلجھ رہے تھے۔

دونوں بچے جوان ہو گئے۔ اور اُن کی شہرت عرب کے طول و عرض میں پہنچ گئی۔ ظہیر نے بیٹی کو گھوڑے کی سواری اور تمام وہ فنونِ جنگ سکھا دیئے تھے۔ جو ایک جری اور بہادر سپاہی کے لیئے سیکھنے لازمی ہیں۔ اُس نے اُسے سخت سے سخت محنت اور خطرناک سے خطرناک مہم میں کود پڑنے کا عادی بنا دیا تھا۔ جب کبھی وہ کسی جنگ پر جاتا قبیلے کے اندر عربوں کے ساتھ اُسے بھی ہمراہ لے لیتا۔ اور ان جنگی سواروں میں جیدہ نے اپنی شجاعت کے طفیل جلد ہی ایک امتیازی درجہ حاصل کر لیا۔ اور ایسا ہوا کہ وہ بہادری میں اپنے رفقائے سبقت لے گئی۔ یہاں تک کہ وہ تن تنہا شیروں پر اُن کے غاروں میں جا کر حملہ کر دیا کرتی تھی۔ اُس کا نام سُن کر لوگ کانپ جایا کرتے تھے۔ جب وہ کسی بہادر کو مغلوب کرتی تھی تو وہ ضرور کہا کرتی تھی: "میں جیدہ ابن ظہیر ہوں۔ جو قبیلوں کا شہسوار ہے"۔

اُدھر اُس کے عم زاد بھائی خالد نے بھی اپنے دلیرانہ کارناموں کے باعث بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اُس کے باپ محارب نے جو ایک نہایت عقلمند اور دانا سردار تھا۔ اجنبیوں کی تواضع کے لیئے محلات تعمیر کرا رکھے تھے۔ جہاں بہادرانِ ملک کی خصوصاً بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ خالد بڑے بڑے جنگجوؤں کی صحبت میں پلا اور بڑھا تھا۔ یہی وہ مکتب تھا جس میں اُس کے ذوق کی تربیت ہوئی تھی۔ یہیں اُس نے شہسواری کا فن سیکھا تھا۔ اور

اب ایک بے باک سپاہی اور ایک خوف انگیز مبارز بن گیا تھا۔ اُس کے سپاہیوں کو اب علم ہو چکا تھا کہ اُس کے جوش اور اُس کی قوت پر غلبہ نہیں پا سکتا۔

آخر اُس نے اپنے بھائی جندر کے متعلق سُنا اور اُس کے دل میں اُس سے ملنے، اُس کے حالات معلوم کرنے اور اس کے کرتب دیکھنے کا بے انتہا شوق پیدا ہوا۔ لیکن وہ اس شوق کو پورا نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اُس کا باپ اپنے بھائی کے اس بیٹے کے متعلق اکثر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ خالد کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کے باپ محارب کا انتقال ہو گیا جس سے اعزاز، دولت اور حکومت اُس کے اپنے قبضے میں آگئی۔ اجنبیوں کی تواضع غربا اور مساکین کی دستگیری اور بھوکے ننگوں کو کھانا کپڑا دینے میں وہ اپنے باپ کا پیرو تھا۔ اُس نے بہت سے قیمتی تحائف جمع کئے۔ اور اپنی ماں کو ساتھ لے کر اپنے چچا سے ملنے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ اُس نے اُس وقت تک اپنے گھوڑے کی لگام نہ کھینچی جب تک وہ ظہیر کے خیمے کے پاس نہ پہنچ گیا۔ ظہیر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور اُس نے اُس کی خاطر تواضع کا بڑا اہتمام کیا۔ کیونکہ اُس نے اپنے بھتیجے کی قابلیت اور شجاعت کی باتیں کئی موقعوں پہ سُنی تھیں۔ خالد جیدہ سے بھی ملا۔ اُس نے اُسے سلام کیا۔ اور پھر گلے سے لگا کر اُس کی پیشانی کو چوما یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ بھی

اُسی کی طرح مرد ہے۔ جیدہ کی رفاقت میں اُسے بے انتہا خوشی حاصل ہوتی۔ اور وہ دس دن تک اپنے چچا کے ہاں مقیم رہا۔ اس اثنا میں اُس نے شہسواری اور سپہ گری کے کتنے ہی مقابلوں میں حصہ لیا۔ اُدھر جیدّہ کا یہ حال تھا کہ جب سے اُس کی نظر خالد کی شجاعت اور حُسن پر پڑی تھی۔ وہ سَو جان سے اُس پر نثار ہو چکی تھی۔ اُسے نیند نہ آتی تھی۔ اُسے کھانا پینا بھول گیا تھا۔ اور اس کی محبت اس درجہ بڑھ گئی تھی اور اُسے اپنا دل یہاں تک خالد کے قبضے میں نظر آتا تھا کہ اُس نے اپنی ماں سے کہا "اے میری ماں! اگر خالد مجھے چھوڑ کر چلا گیا، تو میں اُس کی جدائی میں مرجاؤں گی"
اُس کی ماں نے جب یہ سُنا، تو اپنی بیٹی پر اُسے بڑا رحم آیا۔ اُس نے اُسے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی۔ کہ ناراض ہونا بے کار ہے۔ اُس نے کہا "جیدہ! اپنے جذبات کو چھپاؤ اور غم سے اپنے آپ کو نجات دو۔ تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ کیونکہ خالد تمہاری پسند کا لڑکا ہے۔ اور اس کی رگوں میں تمہاری قوم کا خون دوڑ رہا ہے۔ اُسی کی طرح تم خوبصورت اور دلربا ہو۔ اور اُسی کی طرح تم بہادر اور شہسواری میں فرد ہو۔ کل صبح جب اُس کی ماں ہمارے ہاں آئے گی۔ تو میں سب معاملہ اُس کے سامنے پیش کر دوں گی۔ پھر ہم جلد ہی تمہاری شادی خالد سے کر دیں گے۔ اور آخر کار ہم سب اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔"

ظہیر کی بیوی آنے والی صبح کا انتظار کرتی رہی۔ جب خالد کی ماں اُن کے ہاں آئی تو وہ اپنی بیٹی کو اُس کے پاس لے آئی۔ جیدہ کے لمبے لمبے بال کندھوں پر پڑے رہتے تھے۔ حُسن کی اس تصویر کو دیکھ کر خالد کی ماں ششدر رہ گئی۔ اور کہنے لگی: "کیا یہ تمہارا بیٹا جندر نہیں ہے؟" جیدہ کی ماں نے کہا: "نہیں! یہ جیدہ ہے ——— ماہِ حُسن کو دیکھو وہ طلوع ہو چکا ہے۔" پھر اُس نے وہ تمام باتیں سنائیں۔ جو اُس کے اور اُس کے شوہر کے درمیان بچے کی تذکیر و تانیث کو چھپانے کے متعلق قرار پائی تھیں۔ خالد کی ماں نے جس کی حیرت ابھی کم نہ ہوئی تھی جواب دیا: "میری پیاری بہن۔ ملکِ عرب کی تمام بیٹیوں میں جو اپنے حُسن کے لئے مشہور ہیں۔ میں نے کبھی اس سے زیادہ پیارا چہرہ نہیں دیکھا۔ اُس کا نام کیا ہے؟" جیدہ کی ماں نے کہا: "میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس کا نام جیدہ ہے۔ اور اس راز سے تمہیں آگاہ کرنے سے میرا مقصد یہ ہے۔ کہ میں یہ حُسن و جمال کا تحفہ تمہیں پیش کروں گی۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں اپنی بیٹی کو تمہارے بیٹے سے بیاہ دوں اور اس طرح پھر ہم اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔" خالد کی ماں نے فوراً اس تجویز کو مان لیا اور کہنے لگی: "جیدہ کی رفاقت یقیناً میرے بیٹے کو بہت مسرور کرے گی۔" وہ فوراً اُٹھی۔ اور خالد کو تلاش کر کے اُس نے جو کچھ دیکھا اور سُنا تھا اُسے بتا دیا۔ اور جیدہ کے

حُسن و جمال کا خاص طور پر ذکر کرتی رہی۔ اُس نے کہا "مجھے اپنے ایمان کی قسم۔ اے بیٹے! مَیں نے جمیدہ سے زیادہ خوبصورت لڑکی نہ کبھی صحرا میں دیکھی ہے۔ اور نہ کبھی شہر میں۔ کوئی چیز اپنے حُسن میں اس سے زیادہ کامل نہیں ہے۔ اور کوئی چیز اس سے زیادہ دلآویز اور اس سے زیادہ دلکش نہیں ہے۔ جلدی کرو میرے بیٹے۔ اور اپنے چچا سے مل کر اُس کی لڑکی کو اپنے لئے مانگ لو۔ اگر وہ تمہاری استدعا کو قبول کرلے۔ تو یقیناً تم خوش ہو گے۔ جاؤ اور جلدی سے اُسے حاصل کرلو۔"

یہ الفاظ سُن کر خالد کی آنکھیں جُھک گئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ کچھ متفکر سا ہو گیا۔ پھر اُس نے کہا "اماں۔ مَیں یہاں اب اور نہیں ٹھہر سکتا مجھے اب اپنے سواروں اور فوجیوں سمیت یہاں سے رُخصت ہو جانا چاہیئے۔ مجھے اب جمیدہ سے کچھ نہیں کہنا مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ کہ وہ ایک لڑکی ہے جس کا مزاج اور جس کا فلسفہ غیر معیّن ہے۔ اُس کی سیرت اور اُس کا طرزِ کلام استحکام اور استقلال سے عاری ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی زندگی سپاہیوں کے درمیان گزاری ہے۔ جن پر مَیں اپنا روپیہ صرف کرتا ہوں۔ اور جن کے ساتھ مل کر مَیں نے اپنی سپاہیانہ شہرت حاصل کی ہے۔ اب رہی جمیدہ کی میرے لئے محبت، سو یہ ایک عورت کی کمزوری ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کی۔" پھر اُس نے اپنا زرہ بکتر پہن لیا اپنے

گھوڑے پر سوار ہوا۔ چچا کو خدا حافظ کہا اور اسی وقت اپنی روانگی کا اعلان کر دیا۔ ظہیر نے پوچھا۔ "آخر اس جلدی کے کیا معنے ہیں۔" خالد نے کہا "میں اب یہاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔" اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر یکایک صحرا کی وسعت میں کود پڑا۔ خالد کی ماں بھی وہ تمام گفتگو جو اس کے اور خالد کے درمیان ہوئی تھی جبیدہ کو بتانے کے بعد ایک اونٹ پر سوار ہوئی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

جبیدہ کی حساس روح نے اس تحقیر کو بڑا محسوس کیا۔ وہ اسی سوچ میں ڈوب گئی —— اس کی نیند اڑ گئی۔ اور اس کی بھوک زائل ہو گئی۔ کچھ دن کے بعد جب اس کا باپ اپنے سواروں کے ساتھ دشمنوں پر ایک حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ تو اس کی نگاہ جبیدہ پر پڑی۔ اسے یوں افسردہ اور پژمردہ دیکھ کر اس نے کچھ نہ کہا۔ اس نے سوچا۔ کہ کچھ دنوں کے بعد وہ یقیناً پھر اپنے آپ میں آ جائے گی۔

ابھی ظہیر نظروں سے اوجھل ہوا ہی تھا۔ کہ جبیدہ نے جو اپنے آپ کو موت کے بالکل قریب سمجھ رہی تھی۔ اور جس کی اداسی اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی، اپنی ماں سے کہا "اماں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں مر رہی ہوں۔ درآنحالیکہ یہ کمبخت خالد اپنی زندگی کی قوتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اگر خدا مجھے قوت دے تو میں چاہتی ہوں کہ اسے موت کے قہر و غضب کا تجربہ

کراؤں اور اُس کو درد و کرب کا مزہ چکھاؤں"۔ یہ کہکر وہ ایک شیرنی کی طرح اُٹھی۔ اس نے زرہ پہنی اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ماں سے کہنے لگی۔ کہ میں شکار کے لئے جا رہی ہوں۔ تیزی سے اور بغیر کہیں ٹھہرے وہ چٹانوں اور پہاڑوں کو طے کرتی ہوئی اور اپنے بڑھتے ہوئے جوش کو بڑھاتی ہوئی خالد کی قیامگاہ میں پہنچ گئی۔ چونکہ اُس نے بھیس بدل رکھا تھا۔ اس لئے کسی نے اُس کو نہ پہچانا۔ اور وہ اُس خیمے میں داخل ہو گئی۔ جو جنبیوں کے قیام کے لئے مخصوص تھا۔ اُس کے خود کی آنکھیں حجازی سواروں کی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ غلاموں اور خادموں نے اس کا استقبال کیا۔ اور اس طرح اُس کی خاطر و مدارات کی جیسے وہ ملک کی کوئی بہت عالی رتبہ شخصیت تھی۔ اس رات جیدہ نے آرام کیا۔ لیکن دوسرے دن فوجی ورزشوں میں اُس نے حصہ لینا شروع کر دیا۔ بہت سے بہادروں کو دعوتِ مقابلہ دی اور اپنی کاروانی اور بہادری کی ایسی نمائش کی۔ کہ دیکھنے والے حیرت زدہ ہو گئے۔ دوپہر سے پہلے اُس نے خالد کے سب بہادروں سے اپنی فوقیت تسلیم کرا لی۔ خالد اُس کی شجاعت کا نظارہ کرنے آیا۔ اور جب اُس نے اُس کا کمالِ فن ملاحظہ کیا تو وہ حیران رہ گیا۔ اور اپنے آپ کو اُس کے مقابلے کے لئے پیش کیا جیدہ فوراً مقابلہ کے میدان میں آگئی۔ اور پھر دونوں لڑائی میں گتھ گئے۔ ایک ایک کر کے اُنہوں نے حملے اور مدافعت کے تمام داؤں

آزما ڈالے۔ یہاں تک کہ رات کے سائے اُن پر چھانے لگے جب وہ جُدا ہوئے تو کسی کو کوئی مضرت نہ پہنچی تھی۔ اور دونوں میں سے کوئی بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ فریقِ غالب کون ہے۔ یوں جب جیدہ تماشائیوں پر اپنی بہادری کا سکہ بٹھا رہی تھی۔ تو اُس نے دیکھا کہ لوگ اپنے سردار کو ایک اجنبی کے ہاتھوں مجبور دیکھ کر کچھ چیں بہ جبیں ہو رہے ہیں۔ خالد اپنے حریف کے لئے ہر ممکن خاطر و مدارات کے احکام دے کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔ اُس کا دل آج کے معرکے کے خیالات سے بھرا ہوا تھا۔ جیدہ تین دن تک خالد کے ہاں مقیم رہی۔ ہر صبح وہ مقابلے کے میدان میں آ دھمکتی اور جب تک رات نہ ہو جاتی وہ اپنے ہتھیار ہاتھ سے نہ رکھتی۔ اُس نے ان مقابلوں سے خوب لطف اُٹھایا۔ مگر اپنے آپ کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ اُدھر خالد نے بھی اُس سے کچھ نہ پوچھا۔ کوئی سوال نہ کیا کہ وہ کون ہے۔ اور کس قبیلے سے ہے +

چوتھے دن صبح کے وقت جب خالد حسبِ معمول گھوڑے پر چڑھ کر باہر نکلا۔ اور مہمانوں کے خیموں کے پاس پہنچا۔ تو اُس نے جیدہ کو بھی ایک گھوڑے پر سوار دیکھا۔ اُس نے اُسے سلام کیا۔ اور اُس نے سلام کا جواب دیا۔ خالد نے کہا "اے شریف عرب! میں تجھ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ گو میں اب تک اظہارِ نیازمندی سے قاصر رہا ہوں لیکن اب میں اُس خدا کے نام پر تجھ سے التجا کرتا

ہوں جس نے تجھے یہ قوت اور چستی عطا کی ہے۔ مجھے بتا کہ تو کون ہے اور تیرا تعلق کس بادشاہ سے ہے؟ کیونکہ میں نے تیرے جیسا بہادر جنگجو آج تک نہیں دیکھا۔ مجھے بتا۔ میں تجھ سے عاجزانہ درخواست کرتا ہوں۔ کیونکہ میں یہ معلوم کرنے کے لئے سخت بیتاب ہوں"۔

جیدہ مسکرائی۔ اور خود کو اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"خالد! میں ایک عورت ہوں جنگجو نہیں ہوں۔ میں تیرے چچا کی بیٹی جیدہ ہوں۔ جس نے اپنے آپ کو تیرے سامنے پیش کیا تھا۔ اور اپنا آپ تجھے دے ڈالنے کی خواہش کی تھی۔ مگر تو نے انکار کر دیا۔ ——— اپنے اس غرور میں جو تجھے اپنی تلوار کے باعث ہے۔"

یہ کہکر اس نے اپنے گھوڑے کا منہ موڑا۔ ایڑ لگائی اور ہوا کی رفتار سے اسے اڑاتی ہوئی اپنے گھر کی سمت روانہ ہوگئی۔

خالد حیران پریشان اپنے خیمے میں واپس آگیا۔ وہ نہ جانتا تھا۔ کہ کیا کرے اور نہ جانتا تھا کہ اس بے تاب محبت کا جو یکایک اس کے سینے میں لہریں لینے لگی ہے۔ کیا انجام ہوگا۔ وہ اپنے اس جنگجویانہ ذوق اور اپنی ان سپاہیانہ عادات سے سخت بیزار ہوگیا جنہوں نے اسے اس رنج واندوہ کے کرب واضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ عورتوں سے اس کی نفرت یکایک محبت سے بدل گئی۔ اس نے اپنی ماں کو بلا کر سب ماجرا کہہ سنایا۔ ماں نے کہا "میرے بیٹے یہ تمام حالات ایسے ہیں کہ جیدہ تمہیں اس سے بھی زیادہ عزیز

ہونی چاہیئے۔ مگر تھوڑی دیر صبر سے انتظار کرو۔ تاکہ میں جاکر اُس کی ماں سے اُس کا رشتہ تمہارے لئے مانگوں" یہ کہکر وہ ایک اُونٹ پر سوار ہو گئی اور صحرا میں اُن نقوشِ قدم پر پڑلی جو جیّدہ کے گھوڑے کے سموں سے ریت پر بن گئے تھے۔ جیّدہ نے گھر پہنچ کر تمام واقعہ من و عن اپنی ماں کو سُنا دیا۔ خالد کی ماں نے آتے ہی اپنے آپ کو ظہیر کی بیوی کی جھولی میں ڈال دیا۔ اور اپنے بیٹے کے لئے جیّدہ کا رشتہ مانگا۔ کیونکہ ظہیر ابھی اپنی مہم سے واپس نہ آیا تھا جب جیدہ نے اپنی ماں سے خالد کی درخواست کو سُنا تو اُس نے کہا" یہ کبھی نہ ہوگا۔ خواہ مجھے اس کے لئے موت کا جام ہی کیوں نہ پینا پڑے۔ جو کچھ اُس کے خیموں کے پاس واقع ہوا۔ اس کا مقصد محض غم و اندوہ کی اُس آگ کو بجھانا تھا۔ جو میرے سینے میں شعلہ زن تھی۔ اور میری رُوح کو جُھلسے ڈالتی تھی"۔

یہ الفاظ سن کر خالد کی ماں مایوس واپس اپنے بیٹے کے پاس چلی گئی۔ جسے جیّدہ کی جدائی میں کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ ماں کو دیکھ کر وہ دفعتہً اُٹھ کھڑا ہوا اور مضطربانہ اپنی نسبت جیّدہ کے خیالات دریافت کرنے لگا۔ جب اُس نے جیّدہ کا جواب سُنا تو اُس کا اضطراب حد سے گزر گیا۔ اور جیّدہ کا انکار اُس کے سمندِ شوق پر ایک اور تازیانہ ہو گیا۔ اُس نے کہا "اے میری ماں۔ میں کیا کروں۔ مجھے اس دام سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا"۔ اُس نے جواب دیا

"مگر یہ کہ تم اپنے تمام شہسواروں کو اکٹھا کرو۔ اور ان دوسرے قبائل کے بہادروں کو بھی جو تمہارے حلیف ہیں اور اُس وقت تک انتظار کرو جب تمہارا چچا اپنی مہم سے واپس آ جائے۔ اور پھر اپنے آدمیوں کو لے کر اُس کے پاس جاؤ۔ اور اُن سپاہیوں کے درمیان کھڑے ہو کر اُس سے اُس کی بیٹی کا رشتہ طلب کرو۔ اگر وہ کہے کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے تو اُسے تمام قصہ سنا دو۔ اور اپنا دامن پھیلائے رکھو یہاں تک کہ وہ تمہارے مطالبے کو قبول کر لے۔" اس تجویز نے خالد کے غم کو کسی قدر کم کر دیا۔ جونہی اُسے معلوم ہوا کہ اُس کا چچا گھر واپس آ گیا ہے۔ اُس نے اپنے رؤسائے خاندان کو اکٹھا کیا اور اپنی کہانی انہیں کہہ سنائی۔ وہ سخت حیران ہوئے اور معدی کرب جو خالد کا بہادر ترین رفیق تھا یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ "یہ عجیب بات ہے۔ کیونکہ ہم تو ہمیشہ سے یہی سنتے آئے تھے۔ کہ تمہارے چچا کے ہاں ایک بیٹا ہے جس کا نام جُندر ہے۔ مگر حقیقت آج کھلی۔ اور یقیناً تم ہی ایک شخص ہو۔ جو اپنے چچا کی بیٹی پر سب سے بڑھ کر حق رکھتے ہو۔ اس لئے ہمارے واسطے بہترین طریق عمل یہ ہے۔ کہ ہم سب اُس کے سامنے جا کر اپنے سر جھکا دیں۔ اور اُس سے اپنے خاندان میں واپس آنے کی التجا کریں۔ اور کہیں کہ وہ اپنی بیٹی کسی اجنبی کو نہ دے۔" خالد کچھ اور سنے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے ساتھ اُن ایک سو بہادر سواروں کو جو بچپن سے محارب اور ظہیر کے ساتھ پلے اور بڑھے تھے اور پہلے سے

زیادہ قیمتی تحائف لے کر روانہ ہوا۔ اور اُس وقت تک دم نہ لیا۔ جب تک وہ قبیلۂ سعد میں پہنچ نہ گیا۔ سب سے پہلے خالد نے اپنے چچا کو جنگ سے اُس کی کامیاب واپسی پر مبارکباد پیش کی۔ خالد کی اس دوبارہ آمد پر سب سے زیادہ حیرت ظہیر کو تھی خصوصاً جب اس نے اپنے بھتیجے کو تمام اُمرا و اعیان کے ساتھ دیکھا۔ اُسے سان گمان بھی نہ تھا کہ خالد کے دوبارہ آنے میں اُس کی بیٹی جیدہ کا بھی کچھ تعلق ہے۔ اُس نے خیال کیا کہ وہ اُسے صرف وطن واپس چلنے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ ظہیر نے اُن کی بڑی عزت و توقیر کی۔ اُن کے لئے خیمے مہیّا کئے۔ اور نہایت تواضع سے پیش آیا۔ اُس نے اُونٹ اور بھیڑیں ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اور اُن کی ایک عظیم الشان دعوت کی اور تین دن کے لئے ہر قسم کی ضروریات کا انتظام کر دیا۔ چوتھے دن خالد نے کھڑے ہو کر اپنے چچا کا شکریہ ادا کیا۔ اور اُس کے بعد جیدہ کے رشتے کے لئے درخواست کی۔ اور اپنے ملک کو واپس چلنے کی التجا کی۔ ظہیر نے کہا کہ جُندر کے علاوہ میری کوئی اولاد نہیں۔ لیکن خالد نے جو کچھ اُسے معلوم ہو چکا تھا۔ کہدیا اور جو کچھ اُس کے ساتھ گذر چکا تھا بتا دیا۔ یہ باتیں سُن کر ظہیر شرمندہ ہو گیا۔ اور اُس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ کچھ دیر وہ خیالات میں غرق رہا۔ اور یہ سوچ کر کہ کہیں حالات بد سے بدتر نہ ہو جائیں۔ اس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا "میرے بھائیو! میں اس راز کو زیادہ

چھپانا نہیں چاہتا۔ اس لئے میری بیٹی کی شادی اب خالد ہی سے ہو گی۔ کیونکہ ہر اُس شخص سے جسے میں جانتا ہوں میں خالد ہی کو اُس کے لائق پاتا ہوں۔" اُس نے اپنا ہاتھ خالد کو پیش کیا۔ جس نے فوراً اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خالد کے اکابر و اعیان اس معاہدے کے گواہ تھے۔ پانچ سو کھورے سیاہ چشم اُونٹ اور یمن کی منتخب ترین پیداوار سے لدے ہوئے ایک ہزار اُونٹ جہیز قرار پائے لیکن قبیلۂ سعد پر جن کے پاس ظہیر کا قیام تھا اس معاملہ کا کوئی بار نہ تھا۔

جب اس بات کے متعلق ظہیر نے اپنی بیٹی کی منظوری کے لئے سوال کیا تو جیدہ کی طبیعت اپنے باپ کے اس طریقِ عمل پر درہم برہم ہو گئی۔ مگر جب اُس نے لڑکی کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ اب اُسے بن بیاہا نہیں رکھنا چاہتا۔ تو اس نے کہا:" ابا! اگر خالد مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میں اُس وقت تک اُس کے خیمے میں داخل نہ ہوں گی۔ جب تک وہ میرے بیاہ پر اُن اُونٹوں میں سے ایک ہزار اُونٹ حلال نہ کرے جو اس وقت "تلوار کے دھنی" قاسم بن مالک کی ملکیت میں ہیں۔" خالد نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ لیکن اُس کے افسروں اور سپاہیوں نے اُس وقت تک ظہیر کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک اُس نے تمام مال و اسباب اپنے وطن کو منتقل ہونے کی خاطر جمع نہ کر لیا۔ جیسے ہی یہ تیاریاں ختم ہوئیں خالد ایک ہزار

سواروں کو ہمراہ لے کر مہم پر روانہ ہو گیا۔ اور اُن کی مدد سے اُس نے قبیلہ عامرہ کو مغلوب کر لیا۔ "تلوار کے دھنی" کو اُس نے تین دفعہ زخمی کیا۔ بہت سے بہادروں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ اُن کو لوٹا۔ اور اُس سے بہت زیادہ مالِ غنیمت اُن کے ملک سے لے گیا، جتنا جیدّہ نے طلب کیا تھا۔ مال و دولت سے لدا ہوا اور فتح کے نشہ سے سرشار وہ واپس آیا۔ مگر جب اُس نے شادی کا دن مقرر کرنے کو کہا تو جیدّہ نے اُسے اپنے پاس بلا کر یہ الفاظ کہے "اگر تم مجھے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو تو سب سے پہلے میری فرمائشوں کو پورا کرو اور جو عہد میں تم سے کرتی ہوں۔ اُس پر قائم رہو۔ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی کے دن کسی ذی رُتبہ آدمی کی بیٹی، جو اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئی ہو۔ میرے اُونٹوں کی مہار پکڑے۔ وہ ملک کے کسی معزز ترین رئیس کی بیٹی ہو۔ تاکہ اُس دن میں عرب کی معزز ترین بیٹی سمجھی جاؤں۔" خالد نے مان لیا۔ اور اُس کی خواہشات کے حصول کے لئے تیار ہو گیا۔ اُسی روز وہ اپنے سواروں کو لے کر چل کھڑا ہوا۔ اور سرزمینِ یُمیر کو تلاش کرتا ہوا بہت سے میدانوں اور وادیوں کو طے کر گیا۔ یہاں تک کہ وہ مُلکِ حجاز میں پہنچا۔ اِس جگہ اُس نے معاویہ بن مصّل کے قبیلے پر حملہ کیا۔ وہ طوفان کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑا اور مدافعین کی صفوں کو چیرتے ہوئے عین اُس وقت اُس نے عنیمہ بنتِ معاویہ کو گرفتار کیا۔ جب وہ راہِ فرار اختیار کرنے کو تیار تھی ۔

اُس نے اپنی تیغ کے وہ وہ جوہر دکھلائے کہ دشمن کے بہادر سپاہیوں کی مدافعت سب بیکار ہو گئی۔ اور وہ بھاگ کر منتشر ہو گئے۔ اس علاقے کے عربوں کی تمام دولت اُس نے چھین لی۔ اور پھر گھر کی طرف رُخ کیا۔ مگر وہ اُس وقت تک اپنے خیموں میں داخل نہ ہوا۔ جب تک اُس نے وہ سارا مال و دولت اکٹھا نہ کر لیا جسے وہ صحرا کے مختلف مقامات پر چھوڑ آیا تھا۔

جوان لڑکیاں جھانجھیں اور کئی قسم کے دوسرے ساز بجاتی ہوئی اُس کے آگے آگے چلتی تھیں۔ سارا قبیلہ خوشیاں منا رہا تھا۔ اور جب خالد ظاہر ہوا تو اُس نے بیواؤں اور یتیموں کو کپڑے تقسیم کئے۔ اور رفیقوں اور دوستوں کو اُس دعوت پر مدعو کیا۔ جسے وہ اپنی شادی کی تقریب میں تیار کر رہا تھا۔ شادی پر اُس علاقے کے تمام عرب بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئے۔ شراب و کباب کی فراوانی سے اُس نے انہیں سرمست کر دیا۔ لیکن جس وقت سب مہمان کھانے پینے میں مصروف تھے خالد اپنے ساتھ دس غلاموں کو لے کر شیروں، شیرنیوں اور اُن کے بچوں کے شکار کے لئے جنگل کی طرف جانے کی تیاری کر رہا تھا تاکہ اس تقریب کے مہمانوں کے لئے ایک انوکھی ضیافت کا سامان مہیا کرے۔

لیکن جیدہ کو کسی طرح پہلے اُس کے ارادے کا علم ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو زرہ بکتر میں چھپا لیا۔ اور گھوڑے پر چڑھ کر

تیز تیز خالد کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ ابھی جشن کے تین دن باقی تھے کہ ایک غار میں ان دونوں کا سامنا ہوا۔ وہ ایک شدید حملے کے ساتھ چلا کر بولی۔ "اے عرب! اپنے گھوڑے پر سے اُتر جا۔ اور اپنی زرہ بکتر اتار ڈال۔ اگر تو نے ذرا بھی لیت و لعل کی تو میرا یہ نیزہ ابھی تیرے سینے سے پار ہو گا۔" خالد نے اُس کے مطالبے کے جواب میں فوراً مدافعت کا ارادہ کر لیا۔ ذرا سی دیر میں ایک شدید جنگ کی صورت پیدا ہو گئی یہ کشمکش ایک گھنٹے سے زیادہ تک جاری رہی۔ پھر خالد کو اپنے حریف کی آنکھوں میں ایک ایسی بات نظر آئی کہ وہ ڈر گیا۔ وہ پھر اپنے گھوڑے پر چڑھ گیا۔ اور لڑائی کی جگہ سے ہٹ کر اُس نے کہا۔ "مَیں تجھ سے دینِ عرب کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں مجھے بتا کہ تو اُس صحرا کا کونسا بطلِ جلیل ہے۔ کیونکہ مَیں محسوس کرتا ہوں کہ تیرا حملہ اور تیرے وار مجھ سے روکے نہیں جاتے۔ تو نے میرے ارادوں اور میری دلی خواہشوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔" یہ الفاظ سُن کر جیدہ نے اپنا خود اوپر اُٹھایا۔ تاکہ وہ اُس کا چہرہ دیکھ لے۔ اُس نے کہا "خالد! کیا اس لڑکی کے لئے جس سے تجھے محبت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ وحشی درندوں کا شکار کرے۔ تاکہ عرب کی بیٹیاں سیکھیں کہ اس کے واحد اجارہ دار جنگوں میں لڑنے والے مرد ہی نہیں ہیں۔" اس چُبھتی ہوئی ملامت پر خالد شرم میں غرق ہو گیا۔ اُس نے جواب دیا۔ "خدا کی قسم، جیدہ، تیرے سوا اور کوئی مجھے مغلوب نہیں کر سکتا۔

لیکن کیا اِس ملک میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے تجھے دعوتِ مقابلہ دی ہو یا لِس بھی پہ تجھے اپنے زور و قوت کو ثابت کرنا تھا؟" جیدؔہ نے کہا "خدا کی قسم، مَیں اس صحرا میں اس لیئے آئی ہوں کہ وحشی درندوں کے شکار میں تیری مدد کروں۔ تاکہ تیرے سپاہی تجھے بیوی کے انتخاب پر طعنہ زنی نہ کر سکیں"۔ یہ الفاظ سُن کر خالد جیدؔہ کی جرأت اور عزم پر تعجب اور حیرت سے مبہوت رہ گیا۔

پھر دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سے اُتر پڑے۔ اور ایک غار میں داخل ہو گئے۔ خالد نے دو خونخوار جانوروں کو اسیر کیا۔ اور جیدؔہ نے ایک شیر اور دو شیرنیوں کو مارا۔ یہ مہم انجام دے کر انہوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ اور جیدؔہ خالد کی ہمراہی پر خوش تھی۔ اُس نے کہا۔ "اور مَیں تمہیں اُس وقت تک اپنے خیموں سے جانے کی اجازت نہیں دُوں گی جب تک کہ ہماری شادی نہ ہو جائے۔" پھر یکایک وہ اُسے چھوڑ کر تیزی سے اپنی جائے سکونت کی طرف چل دی۔

خالد اپنے غلاموں کی طرف بڑھا جنہیں وہ کچھ فاصلہ پر چھوڑ آیا تھا۔ اور اُس نے اُنہیں درندوں کو اُٹھا کر خیموں کی طرف لے جانے کا حکم دیا۔ خوف سے کانپتے ہوئے کہ خالد نے کیا کیا ہے اُنہوں نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ خالد تمام بہادروں سے بڑا بہادر ہے۔

دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور جو لوگ آتے تھے اُن کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ دوشیزہ کنیزیں جھانجھیں بجاتی تھیں غلام اپنی تلواریں ہوا میں ہلاتے تھے۔ اور نوجوان لڑکیاں صبح سے شام تک گاتی رہتی تھیں ہاس نشاط و سرور کے درمیان خالد اور جبیدہ کی شادی ہوئی۔ عمیمہ بنتِ معاویہ دُلہن کے اُونٹ کی مہار تھامے ہوئے تھی اور عورتیں اور مرد جبیدہ کے نام کو بلند کر رہے تھے۔

ایران

(۱)

دماغ کی دوا مترجمہ انیس الدین احمد رضوی امروہی ایم اے۔ ایل ایل بی

دماغ کی دوا

شہزادے نے ایک چھوٹی سی شیشی کو موم بتی کی روشنی کے سامنے چمکا کر کہا "کوئی وجہ نہیں کہ دماغ کسی دوا کا رہینِ منت نہ ہو۔"

بے چارا میرزا قلی بیگ شیرازی حیرت و استعجاب سے اُس کا مُنہ تکنے لگا۔

"کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ آپ ایک ایسے شخص کے اندر دماغی قویٰ پیدا کر سکتے ہیں جو ان سے بالکل معرّا ہو؟"

شہزادہ عطا آفندی کو پہلے ہی اس سوال کی توقع تھی۔ وہ اُسے سُن کر مسکرانے لگا۔

"مجھے اس میں ذرہ برابر شک نہیں۔" اُس نے جواب دیا "یقیناً ہم اُتنی ہی آسانی کے ساتھ اعلےٰ دماغی قابلیتوں کے انسان بنا سکتے ہیں جس آسانی کے ساتھ اعلےٰ جسمانی قوتیں پیدا کر سکتے ہیں۔ دماغ کا مجموعہ مادہ بھی اُسی طرح غذا حاصل کرنے اور قوی بننے کی صلاحیت

رکھتا ہے جس طرح ایک بچے کی ہڈیاں، جو ام الصبیان میں مبتلا ہو
آمنہ کو دیکھئے۔ بارہ برس ہوئے کہ قسطنطنیہ اور سمرنا کے تمام اطبا
اس کی زندگی کے صرف چھ ماہ مقرر کر چکے تھے۔ میں نے اُن کے
مشوروں کو بالائے طاق رکھا۔ اور خود علاج کیا۔ اب آپ اُس
کی طرف دیکھئے اور فرمائیے! کیا خیال ہے آپ کا؟"

میرزا قلی بیگ نے آمنہ کی طرف نظر اُٹھائی۔ لیکن اسے دیکھا
نہیں۔ پیری اور شباب کے اِس تقابل نے ——— نوجوان
ترک لڑکی کے دلفریب حُسن اور اس متبحر عالم کے سفید بالوں نے
اس پر کوئی اثر نہ کیا۔ وہ حیران تھا کہ یہ سن رسیدہ شہزادہ کہاں سے
آیا ہے۔ جو طہران کے اِس مختصر سے مکان میں سکونت پذیر ہے۔ اور
جس نے تمام شہر کو اپنے علمی انکشافات سے انگشت بدنداں بنا رکھا
ہے۔ کیا وہ مشرق کا کوئی بہت بڑا جادوگر ہے؟ اس کے کھانے کی
میز جس پر اٹلی کا بنا ہوا شیشہ کا سامان اور چینی کے بیش قیمت برتن
سجے رہتے تھے۔ شاندار دروازے جن کے بھاری بھاری پردوں کے
پیچھے بخور اور لوبان کی ہلکی ہلکی بھینی بھینی خوشبو نکلتی تھی۔ نفیس ترکی
کھانے، ذرا دُور سے کسی باجے کی سامعہ نواز موسیقی کی آوازیں، اور سفید
بالوں والے بزرگ کا پیکر جس کی آنکھیں سمندر کی گہرائی سے نئے
نئے نکلے ہوئے قیمتی موتیوں کی طرح چمکتی تھیں۔ یہ سب باتیں مل
کر بہتوں کے دل پر گہرا اثر ڈالتیں۔ لیکن شیراز کے اس نو وارد

کے مقابلہ میں تقریباً ناکام رہیں۔

میرزا قلی اس مکان میں یہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے آیا تھا کہ اناطولیہ میں ایرانی اُونی کپڑے کی تجارت کے لئے کیا مواقع ہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں یہ خبر عام مشہور ہو رہی تھی کہ تُرکی میں کپڑے کی قلّت ہے۔ اور اناطولیہ کے باشندے تقریباً عریانی پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اور یہاں اُسے ایک شیشی کے اندر ایسی چیز دکھائی جا رہی تھی جس کی بابت اس کا میزبان کہہ رہا تھا کہ ایک غبی اور کُند ذہن کو اعلےٰ دماغی قابلیتوں کا انسان بنا دے گی۔

"یہ تو بہت دلچسپ چیز ہے شہزادہ صاحب!" اُس نے کہا "میں نے اکثر خیال کیا ہے کہ اگر میرا دماغ صحیح قسم کا ہوتا تو میں پبلک زندگی میں بہت بڑی شخصیت پیدا کر لیتا۔ وزیرِ اعظم آخر کیا ہے؟ صرف ایک انسان جو بات چیت کر سکتا ہے ——— ایک باتونی جو پلیٹ فارم پر پہنچ کر وہ باتیں کہتا ہے۔ جو وہاں کے دوسرے دو ہزار آدمیوں سے ایک بھی نہیں کہہ سکتا ——— درآنحالیکہ اگر کوئی اہم کاروباری معاملہ درپیش ہو تو خود شیراز میں سینکڑوں ایسے موجود ہیں جو اُسے تگنی کا ناچ نچا دیں۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ وہی خاص قسم کی چُستی اور چالاکی ہے۔ جسے دماغ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کے پاس اس بوتل میں یہی چیز ہے تو آپ حیرت انگیز انسان ہیں"۔

شہزادے نے ایک سبز پتھر کے ڈبے میں سے، جو اُس کے سامنے میز پر رکھا تھا، ایک سگریٹ نکالا۔ اور تھوڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ پیتا رہا۔

"آقائے میرزا قلی بیگ" بالآخر وہ کہنے لگا: "اگر آپ خود کو بالکل میرے ہاتھوں میں دے دیں۔ تو مَیں چھ مہینے کے اندر آپ کا نام تمام دُنیا میں مشہور کر دُوں گا۔ اور لوگ کہیں گے کہ اس قدر زبردست مفکر اور مدبّر آپ کے ملکِ ایران نے کبھی پیدا نہیں کیا۔ لیکن آپ کو مجھ پر کامل اعتماد کرنا پڑے گا۔ آپ کے ارادے میرے تابع فرمان رہیں گے۔ اور مَیں جو کچھ آپ سے کرنے کو کہوں گا آپ کو کرنا پڑے گا"۔

میرزا قلی نے اپنا سر ہلایا، گویا کہ اُسے شہزادے کی باتوں کا یقین نہیں آیا۔ مگر یقین کرنا چاہتا ہے۔

"میرے کاروبار کا کیا ہو گا؟" اُس نے پوچھا۔

شہزادے عطا آفندی نے اپنے شانوں کو حرکت دی۔

"آپ تو بہت مالدار آدمی ہیں۔ کیا نہیں؟"

"جی اچھا، ہاں ——— جی ہاں، ایک حیثیت سے یُوں ہی سمجھ لیجئے"۔

"اور آپ نے اپنی بے اندازہ شہرت کے خواب دیکھے ہیں؟"

"ضرور، ضرور! مَیں نے اکثر یہ سوچا ہے کہ دُنیا میں کپڑے کی تجا

کے علاوہ دوسری چیزیں بھی آزمائش کے قابل ہیں"۔

"اچھا تو خود کو میرے حوالے کر دیجئے۔ اور میں آپ کے لئے ایسا دماغ تلاش کروں گا، جس کی آپ کو اتنی خواہش ہے"۔

"اس بوتل سے شہزادہ صاحب؟"

شہزادے نے شیشی کو اٹھا لیا۔ اور ایک مرتبہ پھر روشنی کے سامنے گیا۔ اس کا رنگ چمکتا ہوا سنہری تھا۔ میرزا قلی بیگ اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا اور خیال کر رہا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب و غریب اور بعید از فہم تبدیلی رونما ہو رہی ہے اُس نے اپنے سامنے پھولوں کے ڈھیر پر نظر ڈالی اور دیکھا کہ وہ خوبصورت معلوم ہو رہے ہیں۔

آپ مذاق فرما رہے ہیں شہزادہ صاحب"۔ اُس نے بُوڑھے شہزادے کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا۔ اور آبِ زلال سے دل بہلانے لگا۔

(۲)

آمنہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں بلجے کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اور شہزادہ عطا آفندی غور سے اُس کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اُس کے تیز دماغ نے اپنی بیٹی کے تمام خیالات اس طرح پڑھ لئے گویا آمنہ اُنہیں بلند آواز سے کہہ رہی تھی۔

"اُس کا دل اس ایرانی کی طرف مائل ہو گیا ہے"۔ وہ اپنے

دل میں کہنے لگا۔" اور اس وقت خیال کر رہی ہے۔ کہ میرزا قلی اُن لوگوں سے بالکل مختلف ہے جن کو اُس نے ترکی میں دیکھا ہے۔ اور اُسے اُس کی راستبازی کا یقین ہو رہا ہے۔ ایرانی کے متناسب اعضاء اپنی سفارش کئے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن ایک بات ایسی ہے جسے صرف علم الابدان کے ماہرین ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس سیدھے سادے میرزا قلی کو قدرت نے دماغ عطا نہیں فرمایا ہے۔ گو اس کے جسم کی ساخت حیرت انگیز ہے۔ آمنہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔ اور اگر وہ عقل مند ہو جائے تو اس سے شادی کر لے گی۔"

اُس نے اپنی رائے کی تصدیق کرنے کے لئے آمنہ سے اس مہمان کے متعلق، جو ابھی ابھی رخصت ہوا تھا۔ ایک سوال کیا:۔

"آمنہ! تمہارا میرزا قلی بیگ کی نسبت کیا خیال ہے؟

وہ باجا بجاتے رُک گئی تھی۔ وہ ایک مدہوشی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اُس کا چہرہ آگ کی طرف پھرا ہوا تھا اور چمکتے ہوئے سنہری بالوں پر روشنی کی شعاعیں کھیل رہی تھیں۔ اُس کا دلفریب چہرہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تصویر کا چہرہ ہے جس کے سامنے ایک جھلملاتا ہوا چراغ روشن ہے۔ اکثر لوگ اُسے ایک انوکھی بات خیال کریں گے۔ کہ میرزا قلی آمنہ کو نہ دیکھ سکا۔ لیکن شہزادہ عطا آفندی کو تعجب نہ تھا۔ وہ بہر نوع اپنے سوال کا جواب سننے کے لئے اس انداز میں بیٹھا تھا جس سے کسی حد تک اشتیاق اور دلی بے چینی کا اظہار ہوتا تھا۔

"میں نہیں کہہ سکتی" آمنہ نے سادگی سے جواب دیا۔ "اِن اجنبیوں کا سمجھنا بہت ہی مشکل ہے۔ ان کی خاموشی بھی اکثر ہوشیاری پر مبنی ہوتی ہے۔"

شہزادے نے تائید کے طور پر سر ہلایا۔ "اِن کے دماغوں میں بھی عقل ہوتی ہے!" وہ کہنے لگا۔ "مگر ہمارے جیسی نہیں ہوتی۔ اِس امر کو ہم اُن کے ملک کی آب و ہوا اور اُن کے ماحول پر محمول کر سکتے ہیں۔ بیٹی یہ شخص اُون اور سوت کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اِس کو چراگاہیں اور بھیڑ بکریوں کے خواب نظر آتے ہیں۔ صرف اِس وجہ سے کہ اُسے دوسرے خواب دکھائے نہیں جاتے۔ دماغ کیا ہے؟ صرف ایک پردہ ہے جس پر آواز اور روشنی، بلکہ دوسرے لوگوں کی قوت ارادی بھی اسی کا نام تعلیم رکھا گیا ہے —————— یعنی اِس پردے پر کسی ایسے شخص کے تحریری اثرات جو عالم و فاضل ہو۔

"اگر میں چاہوں تو میرزا قلی بیگ اسی لمحہ عالم رؤیا کی سَیر کرنے لگیں، وہ ایک ایسی دنیا کا نظارہ کریں گے۔ جس سے وہ اب تک محض نابلد رہے ہیں۔ ایسے الفاظ سُنیں گے۔ جن سے اُن کے کان کبھی آشنا نہیں ہوئے۔ اور ان الفاظ کو باوازِ بلند دُہرائیں گے، لوگ آئیں گے اور کہیں گے۔ کہ ہم اب تک اِس شخص سے ناواقف تھے۔ کون جانتا ہے؟ —————— ممکن ہے اُن کا نام مشہور ہو جائے۔ اور وہ اپنی بکریوں کو بھول جائیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بخوشی اس پر تیار ہو جائیں گے۔ زمین قابلِ کاشت ضرور ہے۔ اور ممکن

ہے کہ اس میں بیچ ڈالنا میری ہی قسمت میں لکھا ہو۔ بیٹی اگر میں نے ایسا کیا تو کیا تمہیں مسرت ہوگی؟

آمنہ بے حد دلچسپی سے تقریر سنتی رہی۔ پھر وہ مڑی اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے شہزادے کو تکنے لگی۔

"ابا جان! آپ کئی مرتبہ ارشاد فرما چکے ہیں کہ آپ آدمیوں کو عقلمند بنا سکتے ہیں۔ کیا خود آپ کو اپنے الفاظ پر یقین ہے؟ کیا دماغی قابلیتیں پیدا کرنا ممکن ہے؟ جو نعمتیں قدرت نے آپ کو عطا کی ہیں۔ کیا آپ اُن سے دوسروں کو مستفید فرما سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے، ابا جان، یا آپ صرف خواب دیکھا کرتے ہیں؟"

شہزادے نے اُسے مفصل کیفیت نہ بتائی۔ اُس کی باتوں سے ہر فہیم انسان کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ابھی شہزادہ خود اس سوال کے متعلق تذبذب میں گرفتار ہے۔ اور ابھی تک کسی قابل یقین نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

"زمین پر ایسی دوائیں موجود ہیں۔" وہ کہنے لگا "جو انسان کو ساحر بنا دیتی ہیں دنیا کو اس بات کا علم ہے۔ اور ہم روزانہ ان دواؤں کو استعمال کرتے ہیں۔ جو شخص افیون کھاتا ہے۔ وہ خواب دیکھ سکتا ہے کہ وہ بادشاہ ہے۔ اور اُس کے نزدیک اُس کی بادشاہت اصلی اور حقیقی ہوگی۔ وہ مختارِ مطلق ہوتا ہے۔ وہ زندگی

کے بھرپور اسرار سے واقف ہوتا ہے ۔ وہ خواب کی حالت میں چیزوں کو سمجھتا ہے ۔۔۔۔ ایسی چیزوں کو جن کی بابت ہوش کی حالت میں اس کے دماغ کو مطلق علم نہیں ہوتا ۔ اگر ہم اسی فریب دہ مغالطے کو مستقل بنا دیں تو یہی دماغی قابلیت ہو جائے گی ۔ ہمارے سامنے بھی یہی پیچیدہ سوال ہے ۔ جو اس سے پیشتر تصویر اتارنے والوں کو درپیش ہو چکا ہے ۔ انہوں نے شیشے کی پلیٹ پر جما نہ سکے ۔ جب وہ تصویر اس پلیٹ پر جم گئی ۔ تو فوٹوگرافی کی ایجاد ۔۔۔۔ اس عظیم ترین اور حیرت انگیز فن کی ایجاد جو ہمیشہ کے لئے ہمارے سامنے تخیلات کے دروازے کھول سکتا ہے ۔۔۔۔ ظہور میں آئی ۔

"اگر اسی طرح ہم ان تخیلی تصویروں کو جو ہماری دواؤں سے پیدا ہوتی ہیں ۔ جما سکیں تو ہم بھی ایک جدید فن ایجاد کر لیں گے اور دنیا کے انسانیت میں انقلاب برپا کر دیں گے ۔ جب اس جنگ عظیم نے مجھے میرے وطن سے نکال دیا ہے ۔ بیٹی ، اور ہم ایک اجنبی ملک میں بے خانماں ہو کر رہنے لگے ہیں ۔ میں نے اس پر بہت زیادہ غور کیا ہے تخیلات کی کمی کی وجہ سے دنیا بے شمار ناقابل بیان بد بختیوں اور بد نصیبیوں میں مبتلا ہوئی ہے ۔ دماغ نے دنیا کو بچا لیا ہوتا ۔ تاہم انسان نے کبھی یہ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ آیا یہ طاقت بھی اسے ودیعت کی گئی ہے یا نہیں ۔

ہم جسمانی نشوونما کے لئے محنت کرتے ہیں۔ دماغ پیدا کرنے کی طرف توجہ بھی نہیں دیتے۔ تمام علماء اور حکما ہماری بیماریوں کا علاج کر سکتے ہیں۔ ہمارے جسم میں ہڈی گوشت پوست اور خون کا اضافہ کر سکتے ہیں ــــــــــ لیکن دماغ کے معاملہ میں ناکارہ

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ خود تخیلات سے بے بہرہ ہیں۔ لہٰذا اُن کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں۔"

"اور اباجان! کیا آپ انہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے؟"

شہزادے نے بہت آہستہ آہستہ اس کا جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ میں اُنہیں حاصل کر چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں انہیں دوسروں میں بھی پیدا کر سکتا ہوں۔ مثال کے طور پر اسی ساعت کو لے لو، ہمارے دوست میرزا قلی بیگ شہر شیرانہ کی مشینوں کو فراموش کر چکے ہوں گے اور اچانک طور پر رات کے عجائبات معلوم کر رہے ہوں گے۔ وہ بستر پر پڑے پڑے ستاروں کو دیکھ رہے ہوں گے اور اپنے دل سے عالمِ رؤیا کی بابت سوال کر رہے ہوں گے۔ ایک لمحہ کے بعد میرے الفاظ اُن کے کان میں گونجنے لگیں گے۔ اور اُن کے حسیات خیالات پر ہوس قبضہ جمالے گی۔ وہ اپنے دل سے سوال کریں گے کہ میں صرف ایک معمولی سیدھا سادہ سوداگر کیوں ہوں۔ اُن کو یاد آئے گا، کہ اُن کے شہر سے دوسرے لوگ

اُٹھے اور نہایت جرأت و دلیری کے ساتھ قوم کے سامنے کھڑے ہو گئے ۔ ایک آواز اُن سے کہے گی ۔ کہ تمہیں بھی ان لوگوں کا اتباع کرنا چاہیئے ۔ وہ اقتدار کا مفہوم سمجھنے لگیں گے ۔ وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کریں گے ۔ کون جانتا ہے، ممکن ہے وہ اِسے حاصل کر لیں!"

آمنہ نے ٹھنڈا سانس لیا، گویا اُسے ابھی پوری طرح یقین نہیں آیا تھا ۔

"اُن سے بات چیت کرتے ہیں مجھے بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا" وہ کہنے لگی "ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری ہستی سے بھی بالکل بے خبر ہیں"

شہزادہ مہربانی اور شفقت کے انداز سے مسکرانے لگا ۔

(۳)

شہزادے نے ٹھیک کہا تھا کہ بے چارہ میرزا قلی بیگ تخیلات کا شکار بن جائے گا ۔ ہاں! اگر وہ کھانا اس قدر زیادہ نہ کھا جاتا یا آب زلال کی دل خوش کن سُرخی سے ہونٹ تر نہ کرتا یا دیگر لذیذ اشربہ سے دل و دماغ کی تفریح کے سامان مہیا نہ کرتا تو شاید شہزادہ عطا آفندی اور اُس کے الفاظ کا خیال بھی اُس کے ذہن میں نہ آیا ہوتا لیکن وہ ان ارتکابات کا مجرم بن چکا تھا ۔ اور جب وہ ریاض ہوٹل میں اپنے کمرے میں واپس پہنچے ہے تو اُس کے اوضاع و اطوار اور اُس کی ذہنی

کیفیات کی غمازی کر رہے تھے۔ اُس نے کھڑکی کھول دی اور سامنے پارک کے خوش نما منظر میں محو ہو گیا۔ موسم سرما ابھی ابھی ختم ہوا تھا اور بہار کی آمد میں خوشگوار موسم ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ شفاف نیلگوں آسمان پر ہلال اپنی چھوٹی چھوٹی ہلکی ہلکی شعاعیں پھیلا رہا تھا۔ اور تارے پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہے تھے عموماً میرزا قلی بیگ ان قدرتی مناظر کی بہت کم پروا کیا کرتا تھا لیکن آج رات اُسے اُن کے حُسن کی، ان کی دلفریبی کی قدر معلوم ہو رہی تھی۔

"کتنا عجیب خیال ہے" وہ اپنے دل میں کہنے لگا۔ اور قلیان کی نے منہ سے لگا کر کھڑکی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور مسحور کن منظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔ "مرد خدا کہتا ہے کہ جس طرح دوسرے اطبا جسم کو بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ دماغ کو بنا سکتا ہے۔ ہاں، کیوں نہیں؟ خیال تو بہت صحیح ہے۔ اور حیرت ہے کہ آج تک کسی کے ذہن میں یہ بات آئی ہی نہیں۔

"در حقیقت میں یہ تو یقین نہیں کر سکتا کہ وہ ایک بے وقوف کو افلاطون بنا دے گا یا یہ کہ ہمارے زمانے میں سب سعدی اور خاقانی بن جائیں گے۔ لیکن ایک دوا کی مدد سے قوائے دماغی پیدا کرنے کا خیال ———— بہر حال ہے دلچسپ اور مجھے تعجب ہے کہ کسی حکیم نے اس کا خیال نہیں کیا وہ کہتا ہے" کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی، اور بہر صورت ایک انسان کے لئے مفید ہی ثابت ہوگی"!!

مجھے یاد آیا ۔ میں تو اس دوا کو لے آیا ہوں ۔ اور شاید میری کسی جیب ہی میں ہو گی ۔ میں ضرور استعمال کر دوں گا ۔ ابھی تبھی اگر نہ کروں ۔ بس ایک مرتبہ میں اس روش پر پڑ جاؤں جس کے متعلق ہمیشہ خیال آرائیاں کرتا رہا ہوں ۔ پھر کون جانتا ہے کہ میں کس حد تک پہنچ کر رکوں گا؟ پھر کونسی چیز میری شہرت کے ، میرے نام پیدا کرنے کے راستے میں حائل ہو گی؟ میرے پاس روپیہ ہے اور روپیہ بڑھا کرتا ہے ۔ لیکن اگر اس منزل کو مطمح نظر بناؤں جس کی طرف دوسرے رہنمائی کر چکے ہیں تو مجھے خود لڑنا پڑے گا ۔ مجھے ہر چیز کو سمجھنا پڑے گا ۔ لہٰذا اس کا وسیلہ حاصل کرنا میرے لئے ضروری ہے ۔ بڈھا کہتا ہے کہ یہ وسیلہ کی بوتل میں پوشیدہ ہے اگر واقعی ایسا ہی ہے تو خدا کی قسم بڑے تماشے کی بات ہے ۔

* ہے چالاک آدمی ——— میں نے دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا شاید ایسے شخص سے مجھے عمر بھر کبھی سابقہ نہیں پڑا ۔ اس کی نگاہیں جسم کے اندر پیرتی چلی جاتی ہیں ۔ اور جب وہ دیکھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دماغ میں آگ لگا دی ہے آہ یہ عثمانی شہزادہ جو اناطولیہ کے کسی پہاڑی قلعہ میں رہا کرتا تھا ۔ اور اب بھی اُمید رکھتا ہے کہ کسی دن وہیں واپس چلا جائے گا ۔ حقیقتہً مشرق کے لوگ علم و حکمت کی ایسی ایسی باتیں جانتے ہیں جو مغرب والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتیں ۔ مجھے تعجب ہے کہ آخر اس کی بوتل میں ہے ۔

کیا بلا؟"

اُس نے اپنے اوورکوٹ کی جیب کو ٹٹول کر وہ بیش قیمت شیشی نکالی۔ روشنی کی جھلک نے یہاں بھی اُس کی خوبصورتی کو اسی طرح ظاہر کیا جس طرح شہزادے کے کمرے میں کیا تھا۔ اور جب میرزا قلی بیگ سانے اُس کی ڈاٹ کھولی تو عرق کی لطیف خوشبو سے تمام کمرہ مہک اُٹھا ہنستے ہوئے اور خود کو یہ یقین دلاتے ہوئے کہ یہ صرف ایک مذاق ہے جسے شیراز میں بیان کر کے لطف اٹھایا جائے گا میرزا قلی نے شیشی میں سے پندرہ قطرے گن کر ٹپکائے پانی میں ملا کر پی لیے اور ہونٹ چاٹنے لگا۔ ذائقے کی بابت اُس کا قول ہے کہ کچھ نہ تھا، حالانکہ خوشبو ابھی کمرے میں بسی ہوئی تھی۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی شیراز کا آدمی وہاں موجود نہ تھا ورنہ اُس کی بے وقوفی کا مذاق اڑاتا، اور اس قدر مضحکہ خیز دعوے پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

دس منٹ بعد دوا اور اُس کے اثرات کا خیال اُس کے دماغ سے بالکل محو ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ بیٹھا ہوا پارک کے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ گویا رات کی دلفریبی اُسے مسحور کیے ہوئے تھی۔ اچانک اُس کے دماغ میں قوت کا ایک احساس پیدا ہوا ——— اُسے معلوم نہیں کہ کس طرح اُس نے خیال کیا کہ میں ان خالی سنسان میدانوں کو ایک ہجوم سے ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے بھر دوں گا، جو میرے الفاظ کو سن رہے ہوں گے۔ وہ ایسے جلسوں اور مجمعوں کی خیالی

تصویریں کھینچ رہا تھا جو اُس کی تقریر سے مسحور ہو رہے تھے۔ اُس نے تصور ہی میں ایک جمِ غفیر کو دیکھا جو پارلیمنٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اور اُسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ اس ہجوم کا رہنما وہ خود ہے۔ ایوانِ مجلس کے اندر اُس نے ایک معجز بیاں تقریر کی جو تمام مشرقِ قریب کی سیاسیات پر غالب آگئی۔ لوگ اُس کی تقریر سُن کر حیران ہو رہے تھے اور کہہ رہے تھے "ہمارا میرزا قلی بیگ کتنا اچھا مقرر ہو گیا ہے۔"

اُسے یاد آیا کہ پچیس برس پیشتر وہ خراسان کا رہنے والا پست قد آدمی جو آج وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہے ایسی ہی گمنامی میں زندگی بسر کر رہا تھا جس میں آج وہ خود پڑا ہے۔ پھر ترقی کی اس چوٹی تک پہنچنے کے لئے کون سی چیز اس کی سدِّ راہ ہے؟ "کچھ نہیں!" اُس نے کہا، اور یہ کہتے ہی وہ تخیلی استغراق کا عالم غائب ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ دو بج چکے ہیں۔ اور وہ فوراً بستر پر جا کر سو گیا۔

لیکن اس تمام عرصے میں اُسے آمنہ کا خیال بالکل نہیں آیا۔ ترک خاتون کا خوبصورت چہرہ اُس کے تخیلات میں کوئی جگہ نہ پا سکا۔

(۴)

تمام شیراز میرزا قلی بیگ کی ترقیوں کا حقیقی حیرت اور مسرت کے ساتھ اور بلند بانگ قہقہوں کے ساتھ مطالعہ کر رہا تھا۔ اہلِ شہر کا قول تھا کہ اس شخص میں کچھ ایسی نرالی باتیں پیدا ہو گئی ہیں جو جنون کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ انہوں نے سُنا کہ اُس نے طہران کے ایک مکان میں

بڑے بڑے مغنیوں اور گویوں کو دعوت دی ——— اُس نے
جو موسیقی کے کسی ساز سے بھی واقفیت نہیں رکھتا تھا۔ مشہور تصاویر
اس کے مکان کی دیواروں کو زینت دے رہی تھیں۔ بنگالی اور اطالوی آرٹ
کے شاہکار اس کے کمروں میں سجے ہوئے تھے ——— لیکن ان
چیزوں کو بھیڑ بکریوں سے اتنا ہی کم تعلق تھا جتنا ایک بناؤ سنگار کرنے
کی شیدا خاتون کے چہرے کو قدرتی حسن سے ہوتا ہے۔

اِس میں بہر صورت کوئی شک نظر نہیں آتا کہ میرزا علی بیگ کے دماغ
میں خبط سما گیا تھا۔

”تقریر کرنے والا بننا چاہتا ہے“۔ ایک مشہور شخص نے رائے ظاہر
کی ”اور مجلس میں ایک تقریر بھی کی ہے جس کا تمام شہر میں چرچا ہو رہا
ہے۔ اِس سے پہلے تو اس کے دماغ میں بالکل گوبر بھرا ہوا تھا۔ اور ایک
بے عقل گدھے کی طرح صرف تجارت کی ہڈی کو چچوڑے جاتا تھا“

اور اب ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس پر جادو کر دیا گیا
ہے۔ اعتراضات کا بجلی کی سی سرعت سے برجستہ جواب دیتا تھا۔ اور نامہ
نگاروں کے قول کے بموجب بہترین فصیح و بلیغ مقرر ہونے کے علاوہ
تقریر کے دوران میں ترنم کے شستہ فقروں کے پھول برساتا رہتا
ہے۔ اس کا ایک عجیب و غریب ہمراز بھی تھا ——— ایک
سن رسیدہ غیر ملکی شہزادہ جس کے متعلق کسی کو مطلق علم نہیں اور جس
کی بیٹی نے ایک مرتبہ شاہی حرم سرا میں رسائی حاصل کرنے کی بدولت

تمام شہر میں سنسنی پھیلا دی تھی۔"
لوگوں کے لیے یہ ایک انوکھی بات تھی کہ سیدھا سادا میرزا قلی ایسے باحیثیت لوگوں کا ہم پیالہ اور ہم نوالہ کیسے بن گیا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ انوکھی یہ بات تھی کہ وہ زبان کھول سکتا تھا اور کچھ کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ تمام شیراز میں اُس سے زیادہ کوڑ مغز، بالخصوص تقریر کے معاملہ میں، اور کوئی مشہور نہ تھا۔

خود میرزا قلی کو اپنی حیرت انگیز ترقی کا راز اِن تنقید کرنے والوں سے زیادہ معلوم نہ تھا۔ بہر کیف وہ اس کی وجوہ کے طور پر ادھر اُدھر کی عجیب غریب داستانیں سناتا ٹالتا اور اُن میں سے ایک داستان کا تعلق اُس کے تمام جلسوں میں شہزادے کی موجودگی سے وابستہ تھا. بوڑھا شہزادہ ہر جلسے میں موجود ہوتا۔ سب سے اگلی صف میں بیٹھتا آمنہ اُس کے ساتھ ہوتی۔ اور میرزا قلی خواہ کتنی ہی کوشش کرتا، کتنی ہی نگاہیں بچاتا۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی سحر آمیز کشش سے مفر نہ پا سکتا۔

اکثر اوقات اُسے ایسا محسوس ہوتا، گویا وہ نہیں بلکہ شہزادہ تقریر کر رہا ہے۔ جلسے میں جانے سے قبل وہ حسبِ معمول دوا کے پندرہ قطرے پی لیتا۔ اور اُسی وقت ایسا محسوس ہونے لگتا کہ اُس نے اپنی ہستی کو چھوڑ کر کوئی دوسری ہستی اختیار کر لی ہے ایسے وقت میں ایک غیر متوقع طلاقتِ لسانی اس پر مسلط ہو جاتی۔ اُس کے منہ سے الفاظ کا

برجستہ، مناسب، بامعنی الفاظ کا ———— ایک چشمہ بہنے لگتا۔ اور سننے والے مسحور ہو کر رہ جاتے۔

تاہم وہ جانتا تھا کہ یہ تحسین و آفرین خود اُس کا حق نہیں ہے۔ بلکہ اناطولیہ کی اُس عجیب و غریب ہستی کا حق ہے جس کے گذشتہ حالات کوئی نہیں بتا سکتا۔

"اے میرزا قلی! تُو تو اب کچھ اور ہو گیا"، شیراز کے ایک بوڑھے آدمی نے کہا جس سے اتفاقیہ اُس کی بازار میں ملاقات ہو گئی۔ "ارے خدا کی قسم! ہمیں تو ناز ہے تجھ پر، اور میاں لڑکے! بس وزیر بنا رکھا ہے تو ———— اُن کی ایسی تیسی اگر نہ بنائیں!"

میرزا قلی نے سرسری طور پر جواب دے کر اُسے ٹال دیا، اور خود نگار خانۂ ملی کی شاندار عمارت میں داخل ہو گیا۔ جہاں اُس نے یہ اعلان دیکھا کہ شیرِ روسیہ "لینن" کی ایک بہت بڑی حیرت انگیز تصویر حال ہی میں لا کر لٹکائی گئی۔

وہ روسی سیاسیات کی الف ب ت سے بھی نا آشنا تھا اور اس عظیم ترین محبِّ وطن کی بابت ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا۔ جس نے اپنے ملک کی اس قدر بیش بہا اور غیر فانی خدمات انجام دی تھیں بہرحال اب وہ اس تصویر کو ایک ناقابلِ تشریح خواہش کے ساتھ کھڑا دیکھ رہا تھا۔ کوئی چیز، کوئی اندرونی طاقت اُسے مجبور کر رہی تھی کہ یہاں سے لوٹ جائے اور روسی اور امریکی لوگوں کے جذباتِ انسانیت سے

ایسی اپیل کرے جو تمام دنیا کو امن واماں کا دلدادہ بنا دے۔ اور سیاسی مدبرین کی فرقہ آرائیوں کا خاتمہ کر دے۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ ایسا خیال اُس کے دماغ میں کیوں آیا۔ لیکن جب وہ نگار خانہ سے رخصت ہونے والا تھا تو اُس نے اچانک اپنے قریب شہزادہ عطا آفندی کو دیکھا اُس کی بھتیجی آمنہ اُس کے ساتھ تھی۔ لیکن یہ بات میرزا قلی کے نزدیک کوئی خاص وقعت نہ رکھتی تھی۔

"آپ لینن کی تصویر ملاحظہ فرما رہے ہیں ؟" شہزادے نے کہا۔

میرزا قلی نے اقرار کیا کہ وہ صرف اسی غرض سے نگار خانے میں آیا تھا۔ اور کہنے لگا "میں کہہ نہیں سکتا کہ کیوں، لیکن میں نے دروازے پر اعلان دیکھا اور میری طبیعت نے اندر چلنے پر مجبور کیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ گذشتہ رات اپنے وہاں کھانے کی میز پر آپ لینن کا تذکرہ کر رہے تھے ؟"

"جی ہاں"، شہزادے نے کسی خیال میں غرق ہو کر جواب دیا۔ اور میرزا قلی کا ہاتھ پکڑ کر وسیع کرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اور صرف روس امریکہ اور وہاں کے باشندوں کی نفسیات پر بحث کرتا رہا۔

"آقائے میرزا قلی! آپ کا یہ خیال عقلمندانہ ہے۔ کہ آپ اپنی قوم کو ایسی ہدایات دینی چاہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ شاید میرے وطن اور میری قوم کے غلط افعال پر تنقید کریں گے ؟"

"افسوس"، میرزا قلی نے کہا "مجھے ترکی کی بابت کچھ بھی علم نہیں۔"

"لیکن آپ مطالعہ کریں گے تو جان جائیں گے۔ اچھا اب میرے خیال میں ہمیں آمنہ کو ڈھونڈھ لینا چاہیے۔ آج دوپہر کا کھانا ہمیں آقائے تقی زادہ کے یہاں کھانا ہے۔"

"وہ سامنے کھڑی ہوئی ایک ایسی بھدی تصویر کو دیکھ رہی ہیں۔ جس کے لیے میں پانچ پھوٹی کوڑیاں بھی نہ خراب کروں۔"

یہ مشہور ایرانی مصور میرزا بہزاد کی کھینچی ہوئی ایک تصویر تھی۔ جو اگلے دن سات ہزار اشرفیوں کو فروخت ہو گئی۔ لیکن میرزا قلی نے اس پر غور نہ کیا کہ جس وقت آمنہ کھڑی اس کو دیکھ رہی تھی تو وہ تصویر بے انتہا نظر فریب اور خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔

(۵)

چند روز تک تمام طہران میں میرزا قلی کے مضمون "لینن" کا خوب چرچا رہا۔ اس نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ادبی حلقوں میں بھی وہ نمایاں وقعت حاصل کر چکا تھا۔ مقرر کی حیثیت سے اس نے پہلے ہی وقار قائم کر لیا تھا۔ اور اب لوگوں کا قول تھا کہ وہ مدبر بھی ہے۔

"وزارت خارجہ میں ہونا چاہیے۔" تمام شیراز کا متفقہ فیصلہ تھا۔ اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اس قسم کے دماغ زیادہ عرصے تک کابینۂ وزارت سے علیحدہ نہیں رکھے جا سکتے۔

شیراز کا یہ فیصلہ اور قوی ہو گیا جب لوگوں نے سنا کہ ایوانِ مجلس میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہونے والا ہے۔ جس میں صنعت و حرفت

کو قومی اور ملی بنانے کے متعلق بحث و مباحثہ ہو گا اور خاص مقربین میں سے وزیر اعظم اور میرزا قلی بیگ ہوں گے۔ اہلِ شیراز کا قول تھا کہ یہ میرزا قلی بیگ کی زریں موقع ہے۔ اور اس کے گذشتہ کارناموں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں ذرا سا شبہ بھی نظر نہیں آتا تھا کہ وہ اس کو حاصل کر لے گا۔

خود میرزا قلی کو اس میں کوئی شک نہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں یہ یقین کئے ہوئے تھا کہ وہ وزیر اعظم سے بہت اچھی تقریر کر سکتا ہے اور اس کی رعونت نے اس کامیابی کو کلیتہً شہزادہ عطا آفندی کی نوازشات پر محمول کرنے سے انکار کر دیا۔ مانا کہ شہزادے کی دوا وہ حیرت انگیز مرکب جو ایک سبز رنگ کی شیشی میں مقید ہے ——— ایسی دوا ہے جو وقت پر زبردست کرامتوں کا مصدر بن جاتی ہے۔ تاہم وہ بہر صورت ایک مقوی دوا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور جن ذہنی خصوصیات کا، جن دماغی قابلیتوں کا مظاہرہ میرزا قلی کر چکا ہے۔ وہ سب کی سب یقینی طور پر اس کی اور صرف اسی کی تھیں

"بڑے میاں نے صرف میری صحت کو بنا دیا۔" وہ اپنے آپ سے کہتا "مجھے معلوم نہیں کہ ان کی دوا ہے کیا، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ دماغ کو ضرور تہ و بالا کر دیتی ہے ——— بالخصوص جب وہ خود اپنے ہاتھ سے مجھے دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہم باتیں کرنے لگتے ہیں۔ انہیں ایوان میں ضرور آنا چاہئے۔ ان کے بغیر میں اپنے اصلی

رنگ میں نہ آسکوں گا ——— تقریر کرتے وقت میں اُنہیں اپنے نزدیک دیکھنا چاہتا ہوں"۔

شہزادے نے وعدہ کیا کہ وہ بخوشی اس جلسے میں شریک ہوگا۔

"آمنہ میرے ساتھ آئے گی"۔ وہ کہنے لگا۔ "اور آپ کو یہ دیکھ لینا چاہئیے کہ ہم سب سے اگلی صف میں بیٹھے ہیں۔ آپ کی زندگی میں بقول آپ کے یہ نازک موقع ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ دلائل کی ایک خاص روش اختیار کریں۔ اور اپنی تیاری کے دوران میں اسی پر زور دیں۔ اگر آپ کامیاب رہے تو حکومت میں جس وقت بھی کوئی جگہ خالی ہوگی آپ کو ملنی لازمی ہے"۔

میرزا قلی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ نکات سُننے لگا جو شہزادہ اُسے بتانا چاہتا تھا۔ اپنی تقریر تیار کرنے کے لئے ابھی اُس کے پاس ہفتہ بھر تھا۔ وہ اپنے کام میں اس درجہ محو ہوا کہ اس عجیب و غریب دوا کی بابت سب کچھ بھول گیا۔ حتیٰ کہ یہ سوچنے لگا۔ کہ جہاں سیاسیات کا تعلق ہے وہاں خود شہزادہ بھی ایک بہتر مشیر ثابت نہیں ہوسکتا۔ اُسے اپنی قابلیتوں کے متعلق ایک مغالطہ پیدا ہوگیا۔ یہاں تک کہ وہ کہنے لگا کہ "میں، میرزا قلی بیگ اس کام کو اپنی ہی ذہنی قوتوں کے ذریعہ سے انجام دوں گا"۔ تاہم اُسے کچھ کم پریشانی نہ ہوئی جب اُس نے جلسے کی تاریخ سے چند روز پیشتر یہ سنا کہ اُس کا دوست یکایک بہت زیادہ بیمار ہوگیا ہے۔ اور ایک ماہر خصوصی کو اُس کے علاج کے لئے طلب کیا

گیا ہے۔ میرزا قلی اُسی وقت شہزادے کے مکان پر گیا اور خود آمنہ کی زبان سے اُس نے یہ خبر سُنی۔

والد بہت بیمار ہیں۔" وہ کہنے لگی اور یہ کہتے وقت اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔" اگر آپ اُن سے ملیں تو وہ آپ کو نہیں پہچانیں گے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ نمونیا ہو گیا ہے۔ آپ بھی اُنہیں۔ دیکھ کر پہچان نہ سکیں گے، آقائے میرزا قلی"۔

اُس نے آمنہ سے اپنا رنج ظاہر کیا۔ اور حقیقت یہ ہے، کہ اُسے سن رسیدہ شہزادے سے ایک قسم کی محبّت سی ہو گئی تھی ——— اتنا عقل مند، اتنا خوش اخلاق، اِس قدر صوفی منش، جس کی تعلیم صرف مشرق کی رہینِ منت تھی ——— اور آمنہ سنہری بالوں والی ترک خاتون ——— میرزا قلی کو اُس کے ساتھ گہری ہمدردی تھی۔ وہ متعجب تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد وہ بیچاری کیا کرے گی

اُس نے ہمدردی کے انداز میں کہا۔" مجھے امیّد ہے۔ کہ جو کچھ میرے امکان میں ہے اُس کی آپ مجھے اجازت دے دیں گی۔ ہمیں بہترین طبّی مشورے کی ضرورت ہے۔ میں آقائے علی الجواد سے درخواست کروں گا کہ آج ہی تشریف لا کر شہزادہ صاحب کو دیکھ لیں۔ نمونیا کے مرض میں اُن کی تشخیص اور رائے مستند مانی جاتی ہے۔ آپ کے پاس کوئی اچھا تیماردار تو ضرور ہو گا؟

"بس میں ہی ہوں" اُس نے آہستہ سے جواب دیا" والد اور کسی

کو قریب بھی نہ آنے دیں گے"

میرزا قلی نے اسے حماقت خیال کیا اور رسمی طور پہ کہنے لگا کہ آپ میں اس کام کا بار اُٹھانے کی کافی طاقت نہیں ہے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیئے لیکن چونکہ آمنہ کی طرف متوجہ معلوم نہ ہوتی تھی۔ لہٰذا اُس نے رخصت چاہی اور ریاض ہوٹل میں اپنی جائے قیام پر واپس آ گیا۔

(۶)

اسے معلوم نہ ہو سکا کہ کیوں، لیکن ایوان مجلس والی تقریر کے متعلق ایک ناقابلِ تشریح بے چینی، ایک انتشار اُس کے دل میں پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ یہ احمقانہ خیال ہے۔ تاہم وہ اِس خیال سے نجات نہ پا سکا۔ کہ اس عظیم الشان جلسے میں اُس کی کامیابی کے لئے بہر صورت شہزادہ عطا آفندی کی موجودگی لازمی ہو گئی۔ ورنہ شہزادے کی عدم موجودگی میں اِس اعلےٰ موقع سے فائدہ اُٹھانے میں ناکامیاب رہے گا۔ اُسے یاد آیا کہ سفید بالوں والا سن رسیدہ شہزادہ ہر جلسہ میں، جس میں میرزا قلی کو تقریر کرنی ہوتی تھی، سب سے اگلی صف میں بیٹھا کرتا تھا۔ اور کس طرح اِس کی موجودگی کی مقناطیسی کشش ناقابل دماغ ہوتی تھی۔ ایک توہم پرست آدمی ضرور یہی کہتا کہ الفاظ ظاہری مقرر کے منہ نہیں بلکہ بوڑھے شہزادے کے ہونٹوں سے نکل رہے ہیں لیکن میرزا قلی صحیح الدماغ واقع ہوا تھا۔ وہ اِس قسم کی خرافات پر یقین

نہیں کر سکتا تھا۔

بایں ہمہ شہزادے کی بیماری اُس کے لئے سخت انتشار کا باعث ہو رہی تھی۔ اور جب عظیم الشان جلسے سے ایک رات قبل اُس نے سُنا کہ شہزادے کا انتقال ہو گیا۔ تو اُس صدمے نے تھوڑی دیر کے لئے اِس کے قوائے دماغی کو بالکل معطل اور ماؤف کر دیا۔

وفورِ خوف میں، جو ہیبت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اُسے دوا کا خیال آیا اور انتہائی دہشت کے ساتھ اُس نے دیکھا کہ بوتل میں بیش قیمت عرق کے صرف چند قطرے باقی رہ گئے ہیں۔ اُس نے شہزادے کے تجویز کردہ پندرہ قطرے نکالے تو اُسے یہ معلوم کر کے سخت مایوسی ہوئی کہ دوا کے اثرات اب قطعی مفقود ہو چکے تھے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ دوا میں اب نہ رنگ باقی رہا ہے نہ خوشبو۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ دوا کا سحر بھی اُس شخص کی روح کے ساتھ پرواز کر گیا ہو جو اُس کے اسرار سے واقف تھا؟ ——— یا اُس کے اندر درحقیقت کوئی طلسمی اثر تھا بھی یا نہیں؟

وہ اِس سوال کا جواب دینے سے قاصر رہا۔ اُس کی زندگی کی نازک ترین ساعت قریب آ رہی تھی۔ اور اب وہ اِس سے جھجک کر، اِس سے ہچکچا کر، پیچھے ہٹ گیا۔ اُسے اِس امکان کا کبھی وہم بھی نہ گزرا تھا۔

میرزا قلی بیگ کے میدانِ سیاست سے فرار ہو جانے کا قصّہ

سب کو معلوم ہے۔ شاید دُنیا کی تاریخ میں اِس قدر اُمید افزا آغاز اور اِس قدر ذلت آمیز انجام کی دوسری مثال مشکل سے مل سکے گی +

میرزا قلی خود اِس ناکامی اور ذلت کی کوئی صحیح توجیہ پیش نہ کر سکا۔ وہ اِس عظیم الشان جلسے میں مصمم ارادہ کر کے گیا تھا کہ اپنے لئے ایسی شہرت۔ ایسا نام پیدا کر کے رہے گا۔ جس کی آواز صدیوں تک ملک کے ایوانوں میں گونجتی رہے لیکن کامل دس منٹ کی بے ربطی اور بے سروپائی کی حالت میں پلیٹ فارم پر کھڑا لڑکھڑاتا رہا اور کئی ہزار حاضرین کو ایک دوسرے سے یہ سوال کرتے ہوئے چھوڑ گیا کہ ایسے گدھے کو اِس جگہ تقریر کرنے کے لئے کیوں بُلایا تھا +

حقیقتہً یہ قطعی ناقابلِ فہم واقعہ ہے کہ کوئی شخص عزت و رفعت کے انتہائی مدارج سے اِس قدر جلد گر کر مضحکہ اور استہزا کا نشانہ بن جائے۔ میرزا قلی کا دماغ یہ سمجھنے سے بالکل قاصر رہا کہ اُسے کیا ہو گیا تھا وہ پلیٹ فارم پر کھڑا بالکل اسی طرح لفظوں کی تلاش میں ٹامک ٹوئیے مار رہا تھا۔ جیسے کوئی شخص گھُپ اندھیرے میں دیا سلائیوں کو ڈھونڈا کرتا ہے +

اِس کی مصیبت زدہ نگاہیں کسی چہرے کی تلاش کرتی رہیں اور اُسے نہ پا کر وہ ایک ایسے کم سن ناسمجھ بچّے کی طرح بن کر رہ گیا۔ جو کسی بڑے شہر کے ہنگامہ پرور شور و غل میں راستہ بھول گیا ہو اُس کی روح پُوری خواہش کے ساتھ شہزادہ عطا آفندی مرحوم کی موجودگی کی خواہاں تھی۔ یہاں

تک کہ اُس کے منّہ سے بے اختیار یہ دُعا نکل گئی کہ کاش اُس کا دوست اپنی موت کے باوجود بھی اس سے دو لفظ کہہ دے۔ لیکن ایوان میں گہری خاموشی مسلّط تھی۔ اور متوفّی کی نہیں، بلکہ زندوں کی "ہمدردی" اُس کی مدد کرنے کو تیار تھی +

"بولو میاں لڑکے!" اُس کے شیراز سے آئے ہوئے دوستوں نے چلّا کر کہا۔ لیکن اب اُنہیں ایسا محسوس ہوا کہ اس کی وجہ سے اُن کے شہر کو ذلت اور بدنامی اُٹھانا پڑی۔ گو اس سے پیشتر نیک نامی بھی اسی کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی +

اِس طرح وُہ ہمیشہ کے لئے سیاسیات کی دُنیا سے کنارہ کش ہو گیا اور اُسی دُنیا میں واپس آ گیا جس سے پہلے واقف تھا۔ اخبارات نے اُس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ لیکن وُہ جانتا تھا کہ آدمی بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ اُس نے رکنیت سے دست برداری دے دی، اور اپنے پُرانے کاروباری معاملات میں پھر داخل ہو گیا۔ ہر مہینے طہران آتا اور چند روز ریاض ہوٹل میں بسر کر کے شیراز کو واپس چلا گیا +

اِسی آمد و رفت کے دوران میں ایک مرتبہ شہزادہ عطا آفندی کی وفات سے چھ مہینے بعد، اُسے اتفاقیہ دماغ کی دوا کا خیال آیا، اور وُہ اپنی بے وقوفی پر غور کرنے لگا۔ وُہ بھی کس قدر دھوکے

کی چیز تھی! کیا وُہ درحقیقت بالکل دھوکے کی چیز تھی ؟

وُہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوا پارک کی سیر کر رہا تھا، اور بیش قیمت دوا کی شیشی اُس کے ہاتھ میں تھی. لیکن اب اِس کے اندر دو یا تین قطرے باقی رہ گئے تھے۔ تاہم میرزا تلی کو اُن کا رنگ بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا. یہ چند قطرے اُس وقت میرزا کی زندگی کو اُس کے ماحول کو، ایسی فرحت افزا شعاعیں بخش رہے تھے جن کا اسے اپنی گذشتہ چھ مہینے کی اُداس اور بے رونق زندگی میں تجربہ نہ ہوا تھا +

اور اب، بالکل اُسی یادگار رات کی طرح، جب شہزادے نے اُسے پہلی مرتبہ دوا کی شیشی دی تھی۔ وُہ عالم تخیل میں غرق ہو گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا کوئی غیر مرئی ہستی اُسے شہر کی سڑکوں پر آنے اور ایک ہنوز نامعلوم تقدیر کو تلاش کرنے کا حکم دے رہی ہے +

وُہ اِس خیال پر قہقہہ مار کر ہنسا، لیکن چونکہ رات خوشگوار تھی۔ اور گرمیوں کا زمانہ ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا. لہذا اُس نے فوراً اپنی ٹوپی اوڑھی اور پارک کے سبزہ زار میں سے گزرتا ہوا قلعہ کی طرف چل دیا۔ اُسے تعجب ہو رہا تھا کہ اُس نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا، لیکن کوئی اندرونی طاقت زبردستی دھکیل کر اُسے لئے جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید کوئی نادیدہ ہاتھ اُس کی رہنمائی کر رہا ہے۔ اور جب مسجدِ شاہی کے قریب اُس نے آمنہ کو دیکھا تو اُس ملاقات

کو محض اتفاق پر محمول کیا +

آمنہ پھٹے پرانے سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ اُس نے میرزا قلی کو نہیں دیکھا۔ میرزا قلی نے بہرحال اُس سے بات چیت کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ اور سڑکوں کے ہجوم میں اِس کا تعاقب کرنے لگا۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ ایک فرضی لکھ پتی کی لڑکی ایسے محلّوں میں رہتی ہو! اُسے معلوم نہ تھا کہ شہزادہ عطا آفندی کی جائداد ریاست ہائے بلقان کے قضیوں میں بالکل ضائع ہو گئی۔ اور اب کسی صورت سے واپس نہیں ہو سکتی۔ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ متوفی شہزادے کے مال و دولت کے افسانے صحیح طور پر مشہور ہیں

یہ بات اُس کے حیرت و استعجاب کو فزوں تر کر رہی تھی کہ آمنہ خانم ایک ٹوٹے پھوٹے کچے مکان میں داخل ہو گئی۔ یہ مکان طہران کے اُس حصّے میں واقع تھا جہاں شہر کے انتہائی غریب باشندے سکونت رکھتے ہیں۔ آمنہ ایک زینے پر چڑھ کر بالاخانے پر جا پہنچی جو اس کی غربت و افلاس کا پردہ دار نہ تھا +

"بارِ الہا!" میرزا قلی کے منہ سے حیرت میں نکلا۔ "وہ یہاں نہیں رہ سکتی۔"

اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے اور کافی دیر تک دروازے کے سامنے متذبذب اور تقریباً بالکل خوف زدہ کھڑا رہا۔ اُس نے نہ تو دروازے پر دستک دی، نہ کنڈی کھٹکھٹائی، وہ اس کا صاف اقرار کرتا ہے +

"میں وہاں کھڑا تھا" وہ اپنے دوستوں سے بیان کرتا ہے۔ "کہ متوفی شہزادہ عطا آفندی کی شکل میرے سامنے آگئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ اُس نے دروازے کو چھوا اور کواڑ چوپٹ کھل گئے۔ آمنہ خانم اندر کھڑی تھی ایک مٹی کا چراغ اُس کے ہاتھ میں تھا اُس نے خوف زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اور چلا کر کہا۔ آقائے میرزا قلی بیگ۔

لیکن یہاں تک پہنچکر میرزا قلی بیگ اپنے بیان کو قطع کر دیتا ہے اُس نے آمنہ کو اُس رات پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ہمیں اُس کے دوستوں کی رائے سے اتفاق ہے کہ وہ اِس وقت تک کور ذوق اور بے بصر رہا تھا۔ اِس کے کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی، کہ آج آمنہ خانم اُس کے دو بچوں کی ماں ہے۔

افغانستان

(۱)

دلاور خان؛ مصنفہ کپلنگ؛ مترجمہ مظفر احمد

دلاور خاںؔ

ہندوستان کی شمال مغربی سرحد عبور کرنے کے بعد افغانوں کے نیم آزاد علاقے میں داخل ہوں تو زمین کی سطح یکایک بلند ہونی شروع ہو گی پھر چند گھنٹوں کا تکلیف دہ راستہ طے کرنے کے بعد آپ جنگئی پہنچ جائیں گے۔ جنگئی آزاد علاقے کے اُن گڈریوں کا مسکن ہے۔ جو انگریزی حکّام کی انصاف پسند طبیعتوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے۔ یہاں اِس امر کی توضیح کر دینا ضروری ہے کہ اِس علاقے کے کسان اپنے کھیتوں میں کھاد ڈالنے کی تکلیف سے بچنے کے لئے اپنے حصے کے جنگل میں آگ لگا دیتے ہیں۔ اگر آگ ضرورت سے زیادہ پھیل جائے تو اُس کی قسمت۔ مگر یہ امر یقینی ہے کہ ان درختوں کی راکھ سے اُن کی زمین ضرور زرخیز ہو جاتی ہے۔ اور آئیندہ فصل بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہاں کا کسان صرف دانوں کے خوشے اُتار لیتا ہے۔ اور باقی پودے کو اسی حالت میں چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ اِس کے کاٹنے پر محنت کرنا بے فائدہ ہے۔ آیندہ برسات میں اُنہیں پودوں سے لمبی لمبی شاخیں پھوٹ

نکلتی ہیں ۔ اور چند ہی سالوں میں سات آٹھ فٹ بلند جھاڑیوں کا ایک گھنا جنگل بن جاتا ہے یہی گھنا جنگل جنگئی کے نام سے پکارا جاتا ہے اس میں بلسیوں قسم کے درخت اور جھاڑیاں ہوتی ہیں جن کی شاخیں ایک دوسری میں گندھی ہوئی ہوتی ہیں ۔ اور سوائے کلہاڑی سے راستہ صاف کرنے کے اس میں گذرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اور بعض جگہ تو جنگلی بھیڑیں بھی اس جنگئی میں نہیں گزر سکتیں ۔

اگر آپ نے کوئی خون کیا ہے تو آزاد علاقے کی جنگئی تک پہنچ جایئے ایک اچھی قسم کی بندوق اور بہت سی بارود اور گولیاں اگر آپ کے پاس ہیں تو آپ امن سے زندگی بسر کر سکتے ہیں ۔ ایک خاکی چغہ بھی ضروری ہے ۔ جو پہننے کے علاوہ آپ کے بچھونے کا کام بھی دے گا نیک دل گڈریے آپ کی تواضع جنگلی پھل، دودھ اور پنیر سے کریں گے انصاف کے آہنی پنجوں اور مقتول کے رشتہ داروں سے اُس وقت تک آپ بالکل امن میں ہوں گے ۔ جب تک کو بارود کی تھیلی دوبارہ پُر کرنے کیلئے آپ کا شہر میں آنا لابدی ہوگا ۔

۱۸ئہ میں جبکہ میں اس علاقے میں مقیم تھا ۔ دلاور خاں کا مکان جنگئی سے نصف منزل کے فاصلے پر تھا ۔ وہ اپنے علاقے کے معیار کے مطابق امیرانہ اور شریفانہ زندگی بسر کرتا تھا ۔ یعنی ہر قسم کی محنت سے آزاد تھا اس کی آمدنی کا ذریعہ بھیڑوں بکریوں کے وہ ریوڑ تھے جنہیں اُس کے ملازم ارد گرد کی پہاڑیوں پر چراتے پھرتے تھے ۔

ذیل میں جو واقعہ بیان کرنے والا ہوں اِس کے دو سال بعد میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ پچاس یا اِس سے کچھ زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ آپ خود اس شخص کا تصور کریں۔ قد چھوٹا لیکن خوب مضبوط گھرے سیاہ گھونگریالے بال، عقابی ناک، باریک ہونٹ، موٹی موٹی بے قرار سی آنکھیں اور کھلی تیز دھوپ سے جلا ہوا چہرے کا رنگ، اُس کی بے خطا نشانہ بازی اس کے اپنے علاقے میں بھی ضرب المثل تھی۔ جہاں اعلےٰ درجے کے نشانہ بازوں کی کمی نہیں ہے۔ مثلاً دلاور خاں نے جنگلی بھیڑ کو کبھی چھرّوں سے نہیں مارا۔ بلکہ ایک سو بیس قدم کے فاصلے سے صرف گولی اُس کے سر یا کندھے میں یہاں اُس کا دل چاہے مار کر گرالیا کرتا تھا۔ وہ اندھیری رات میں بھی ایسی صحت کے ساتھ نشانہ کر سکتا تھا جیسا کہ دِن کے وقت۔ مجھے اسی قسم کا ایک واقعہ سنایا گیا، جو شاید ان لوگوں کو جنہیں اس علاقے میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا ناممکن سا معلوم ہو۔ ایک جلتی ہوئی موم بتی اسّی قدم کے فاصلے پر رکھی گئی۔ اور اُس کے آگے ایک گول کاغذ کا ٹکڑا ایک چھوٹی طشتری کے برابر رکھ دیا گیا۔ دلاور خاں نے پہلے نشانے میں موم بتی کو بجھا دیا۔ اور پھر مکمل تاریکی میں چار گولیاں سَر کیں، جن میں سے تین کاغذ کو چھیدتی ہوئی نکل گئیں +

انہیں غیر معمولی اوصاف نے اُسے تمام علاقے میں مشہور کر

رکھا تھا۔ وہ دوستوں کے لئے بہترین دوست اور دشمنوں کے لئے خونخوار ترین دشمن تھا۔ وہ مہمان نواز اور مخیر تھا۔ اور اپنے اردگرد کی آزاد دنیا کا ایک امن پسند باشندہ۔ لیکن مہمند دل ہلی جہاں اس نے شادی کی تھی اُس کا ایک رقیب تھا جو لڑائی اور محبت میں یکساں خوفناک سمجھا جاتا تھا۔ ایک روز جبکہ وہ اپنے مکان میں کھڑکی کے ساتھ ایک چھوٹا سا آئینہ لٹکائے حجامت بنا رہا تھا ایک سنسناتی ہوئی گولی معلوم نہیں کہاں سے آئی اور کھڑکی اور آئینے کو چھیدتی ہوئی اس کا کام تمام کر گئی۔ اس واقعہ کو دلاور خاں سے منسوب کیا گیا۔ لیکن جلد ہی یہ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ اور دلاور خاں کی شادی ہوگئی۔ اس بیوی کے بطن سے یکے بعد دیگرے اُس کی تین لڑکیاں ہوئیں جن کی پیدائش نے اُسے غم و غصہ سے دیوانہ کر دیا۔ اور آخر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اُس نے خوش حال خاں رکھا۔ اسی لڑکے سے اُس کے تمام خاندان کی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اور یہی بڑا ہو کر اپنے باپ کے اوصاف کا جائزہ وارث ہونے والا تھا۔ لڑکیاں اچھی اچھی جگہ بیاہی گئیں۔ اور دلاور خاں کو یقین تھا۔ کہ وہ ضرورت کے وقت اپنے دامادوں کی تلواروں اور بندوقوں پر کامل بھروسہ کر سکتا ہے۔ بیٹا اگرچہ ابھی دس ہی سال کا تھا لیکن ابھی سے اُس کے بہادرانہ اوصاف ظاہر ہو رہے تھے

موسم خزاں کے ایک دن کا ذکر ہے کہ دلاور خاں صبح سویرے ہی

بیوی کی معیّت میں اپنے ایک ریوڑ کی دیکھ بال کے لئے چلا گیا۔ ننھے خوشحال نے بھی جانا چاہا۔ لیکن وہ جگہ جنگنی کاٹ کر ریوڑ کے لئے جگہ بنائی گئی تھی بہت دور تھی۔ اور یہ ضرور تھا کہ گھر کی خبر گیری کے لئے کوئی نہ کوئی ٹھہرے۔ اس لئے باپ نے اُسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ اور شاید اِس انکار کی وجہ سے بعد میں اُسے پچھتانا پڑا ؛

دلاور خان کو گئے چند ہی گھنٹے ہوئے تھے ننھّا خوشحال نہایت آرام سے دھوپ میں لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی نظریں دُور نیلی نیلی پہاڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں اِس مسّرت انگیز خیال سے خوش ہو رہا تھا کہ آیندہ جمعہ کے روز اُسے کوہاٹ شہر میں اپنے حوالدار چچا کے گھر جانا ہے۔ وہ اُنہی خیالات میں محو تھا کہ یکایک کسی بندوق کے سر ہونے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے اُٹھ کر اُس طرف نظریں دوڑائیں جس سمت سے آواز آئی تھی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ آواز آئی اور ہر مرتبہ یہ آواز نزدیک تر ہو گئی۔ آخر اس راستے پر جو میدان کی طرف سے دلاور خاں کے گھر کو آتا تھا ایک پہاڑی شخص نمودار ہوا۔ اُس کا چہرہ ڈاڑھی سے ڈھنپا ہوا تھا، اور جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ وہ نہایت مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا اپنی بندوق کا سہارا لئے چلا آتا تھا۔ ابھی ابھی ایک گولی اِس کی ران میں لگی تھی ؛

یہ شخص ایک مفرور قاتل تھا جو رات کے وقت شہر سے بارود لینے گیا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے پولیس والوں نے اُسے پہچان لیا۔ وُہ نہایت ہمت سے مقابلہ کرتا ہوا آپسپا ہو رہا تھا۔ ہر ٹیلے پر ٹھہر کر وُہ اپنے دُشمنوں پر گولیاں سر کرتا۔ لیکن اب سپاہی اُس سے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ اور اُس کی ران کا زخم اُسے گرفتاری سے قبل جنگئی تک پہنچنے سے روک رہا تھا۔ آخر وُہ خوشحال خاں تک پہنچ گیا اور پُوچھا"تم دلاور خاں کے بیٹے ہو؟"

"ہاں"

"میں اکبر خاں۔ سُرخ پگڑی والے میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ مجھے کہیں چھپا دو۔ کیونکہ اب مجھ سے ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا!"

"اور میرا باپ کیا کہے گا اگر میں نے تمہیں اُس کی اجازت کے بغیر چھپا دیا؟"

"وُہ کہے گا کہ تم نے بہت اچھا کام کیا"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟"

"مجھے جلد چھپاؤ کیونکہ وُہ پہنچا ہی چاہتے ہیں"

"میرے باپ کے گھر آنے تک انتظار کرو"

بد بخت لڑکے میں کس طرح انتظار کر سکتا ہوں۔ چند ہی لمحوں میں وُہ یہاں پہنچ جائیں گے مجھے جلد چھپاؤ ورنہ میں مار ڈالوں گا۔"

خوشحال نے نہایت اطمینان سے جواب دیا" تمہاری بندوق

خالی ہے اور تمہاری پیٹی میں ایک بھی کارتوس نہیں۔"

"میری پیش قبض میرے پاس ہے۔"

"لیکن کیا تم میرے جیسا تیز دوڑ سکو گے؟" یہ کہتے ہوئے وہ ایک ہی چھلانگ میں اُس کی زد سے باہر ہو گیا۔

"تو دلاور خاں کا بیٹا نہیں ہے۔ کیا تو اپنے گھر کے سامنے مجھے گرفتار ہو جانے دے گا؟"

باغی نے اپنے چمڑے کے بٹوے کو ٹٹولا جو اُس کی پیٹی سے لٹک رہا تھا اور ایک اٹھنی نکالی جو اس نے بارود خریدتے وقت بچا لی تھی۔ خوشحال چاندی کے سکے کو دیکھ کر ہنسا اور اُس کے ہاتھ سے سکہ اُچک لیا۔

"اب کسی بات کا فکر نہ کرو۔"

آناً فاناً اُس نے گھاس کے اُس بڑے ڈھیر میں گڑھا کھود دیا، جو گھر کے نزدیک ہی پڑا تھا۔ اکبر خاں اُس میں بیٹھ گیا۔ لڑکے نے اس خوبی سے اُسے ڈھک دیا کہ وہ بغیر تکلیف کے سانس لے سکتا تھا۔ اور دیکھنے والے کو شبہ تک نہ ہو سکتا تھا کہ اس میں کوئی انسان چھپا بیٹھا ہے۔ لڑکے نے کچھ دیر اور سوچا اور جلدی سے ایک بلی اور اس کے بچے لا کر ڈھیر پر بٹھا دیئے۔ تاکہ ظاہر ہو کہ گھاس دیر سے نہیں ہلایا گیا۔ پھر اُس نے خون کے دھبوں کو جو اُس کے گھر کے نزدیک زمین پر تھے، مٹی سے ڈھک دیا۔ اور پہلے کی طرح مطمئن ہو کر

دھوپ میں آرام سے لیٹ گیا۔

چند ہی ساعت بعد پولیس کے چھ سپاہی اور ایک افسر دلاور خاں کے دروازے پر کھڑے تھے۔ یہ افسر دلاور خاں کا ایک دُور کا رشتہ دار شیر اللہ خاں تھا۔ اس کی مستعدی اور بہادری نے یہاں کے باغیوں کے دلوں کو مرعوب کر دیا تھا۔ بیسیوں کو اب تک یہ گرفتار کر چکا تھا۔

"السلام علیکم ننھے بھائی! ماشاءاللہ اب تو تم جوان ہو گئے ہو تم نے ابھی ابھی کوئی آدمی اِدھر سے گزرتا دیکھا ہے؟"

وعلیکم السلام۔ لیکن بھائی جان ابھی میں آپ جیسا جوان نہیں ہوا"۔ لڑکے نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا۔

"تم جلد ہی جوان ہو جاؤ گے۔۔ اچھا یہ تو بتاؤ کوئی آدمی اِدھر سے گزرتا ہوا دیکھا ہے"۔

"اگر دیکھا ہو تو؟"

"ہاں ہاں ایک آدمی جس کے سر پر سیاہ سی ٹوپی تھی۔ اور ایک کالدار واسکٹ پہنے ہوئے تھا"۔

"سیاہ ٹوپی اور کالدار واسکٹ؟"

"ہاں ہاں۔ جلد بتاؤ۔ میرے سوالوں کو دُہرانے کی ضرورت نہیں"۔

"آج صبح مولوی صاحب اپنے گھوڑے پر سوار اِدھر سے گزرے تھے۔ انہوں نے میرے باپ کی خیریت پوچھی اور میں نے کہا۔۔۔"

"خبیث بچے" تم مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو؟ جلد بتاؤ اکبر کس طرف گیا ہے؟ ہم اُس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اسی گھر کی طرف آیا ہے"۔

"کیسے معلوم ہے؟"

"مجھے معلوم ہے اور اچھی طرح معلوم ہے کہ تم نے اُسے دیکھا ہے"۔

"کیا نیند میں انسان گزرنے والوں کو دیکھ سکتا ہے؟"

"بدمعاش بچے، تم نیند میں ہرگز نہ تھے۔ بندوقوں کی آواز نے تمہیں جگا دیا تھا"۔

"خوب! تو تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ تمہاری بندوقیں بہت شور مچاتی ہیں۔ اس لحاظ سے میرے باپ کی بندوق کو ان پر تفوق حاصل ہے"۔

"لعنتی لڑکے، تمہیں شیطان لے جائے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم نے اکبر کو دیکھا ہے۔ اور شاید تمہیں نے اُسے چھپایا ہے۔ آؤ دوستو! اس گھر میں داخل ہو جاؤ۔ اور اپنی اسامی کو نکال لاؤ۔ وہ صرف ایک پاؤں پر چل سکتا تھا۔ اور بدمعاش میں اتنی سمجھ ضرور ہے کہ اس حالت میں جنگل تک پہنچنے کی کوشش کرنا بے سُود ہے۔ نیز خون کے نشان یہیں ختم ہو جاتے ہیں"۔

خوشحال نے حقارت سے کہا "اور میرا باپ کیا کہے گا جب اُسے معلوم ہوگا کہ اُس کی غیر حاضری میں اُس کے گھر کی تلاشی لی گئی ہے"۔

افسر نے خوشحال کو کان سے پکڑ لیا اور کہا "نابکار لڑکے، میں تیری گفتگو کا لہجہ بدل سکتا ہوں۔ شاید تمہیں بھی کوڑے کھا کر تم سیدھے ہو جاؤ گے"

خوشحال نے اسی حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا "میرا باپ دلاور خاں ہے"

ننھے شیطان، تم خوب سمجھ لو کہ میں تمہیں زبردستی کوہاٹ لے جاؤں گا۔ میں تمہیں پولس کے بستر پہ قید خانے میں بند کر دوں گا تمہارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دوں گا۔ اور اگر پھر بھی تم نے نہ بتایا تو تمہیں پھانسی بھی دے دوں گا"

بچہ ان تمام دھمکیوں کو سن کر ہنس دیا۔ اور بولا "میرا باپ دلاور خاں ہے"

ایک سپاہی آہستہ سے افسر کے پاس آیا اور کہنے لگا "آقا ہمیں دلاور سے خواہ مخواہ جھگڑا مول نہ لینا چاہیئے" افسر شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ ان سپاہیوں سے گفتگو کی، جو گھر کے اندر دیکھ آئے تھے۔ انہیں کچھ دیر نہ لگی تھی۔ کیونکہ گھر صرف ایک کمرے، ایک برآمدے اور صحن پر مشتمل تھا۔

اس اثنا میں خوشحال نہایت اطمینان سے بیٹھا اپنی بلی کو تھپکیاں دیتا رہا۔ اور پولیس والوں کی پریشانی پہ خوش ہوتا رہا۔

ایک سپاہی گھاس کے تودے کے پاس آیا۔ بلی کو دیکھا اور اپنی

سنگین گھاس میں چبھو دی۔ گھاس میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ سپاہی اپنی بے دقوفانہ احتیاط پر ہنسا اور چلا گیا۔ بچے کے چہرے پر ذرا سی گھبراہٹ بھی ظاہر نہ ہوئی۔

افسر اور اس کے سپاہی اپنی قسمت کو رو رہے تھے۔ اور واپسی کے خیال سے میدان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دفعتاً افسر نے سوچا کہ دلاور خاں کے بیٹے پر اگر دھمکیاں اثر نہ کر سکیں تو پیار اور تحفے ضرور اثر کریں گے۔

"ننھے بھائی، تم ضرورت سے زیادہ روشن دماغ ہو۔ تم دُنیا میں ضرور کامیاب ہو گے۔ لیکن میرے ساتھ اس وقت تم ایک بہت بُرا کھیل کھیل رہے ہو۔ اگر مجھے اپنے بھائی دلاور کا خیال نہ ہوتا، تو خدا کی قسم میں تمہیں ضرور گرفتار کر کے لے جاتا"۔

"خوب"!

"لیکن جب دلاور آئے گا تو تمام قصہ اُس سے کہوں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ مارے چابکوں کے تمہاری چمڑی اُدھیڑ دے گا"۔

"اچھا؟"

"تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ لیکن تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ ٹھہرو میں تمہیں کچھ انعام دیتا ہوں"۔

"بھائی جان، میں آپ کو نیک مشورہ دیتا ہوں۔ اگر تم زیادہ دیر تک اسی جھگڑے میں پڑے رہے۔ تو اکبر جنگی تک پہنچ جائے گا۔ اور

پھر اُسے پکڑنے کے لئے تم سے زیادہ پھرتیلے آدمی کی ضرورت ہوگی"۔
افسر نے اپنی جیب سے ایک قیمتی چاندی کی گھڑی نکالی۔ اور یہ دیکھ کر کہ خوشحال کی آنکھیں اُس کے نظارے سے چمک اُٹھی ہیں، گھڑی کو زنجیر سے لٹکاتے ہوئے کہا "بے وقوف، کیا تم نہیں چاہتے کہ یہ خوبصورت گھڑی تمہارے گلے کی زینت ہو اور تم نہایت شان سے کوہاٹ کی گلیوں میں پھرو۔ اور لوگ تم سے وقت پوچھیں گے"۔
"جب میں بڑا ہوں گا تو میرا حوالدار چچا مجھے گھڑی خرید دے گا"۔
"لیکن تمہارے چچا کے بیٹے کے پاس ابھی سے ایک گھڑی موجود ہے۔ اگرچہ عمر میں وہ تم سے چھوٹا ہے"۔
لڑکے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
"ننھے بھائی۔ لو یہ گھڑی تمہاری ہے"۔
خوشحال گھڑی کی طرف کنکھیوں سے اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے بلی کو سالم مرغی دے دی جائے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اُس کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے۔ اور اُسے پنجے مارنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ وہ بار بار پنجے اور ہونٹ چاٹتی ہوئی نظریں پھیر لیتی ہے۔ کہ اُس کا دل للچا نہ جائے۔ اور اپنے مالک کو یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کیا ستم ظریفی ہے۔
لیکن پولیس افسر نہایت سنجیدگی سے اپنا تحفہ پیش کر رہا تھا۔ خوشحال نے لینے کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا۔ لیکن زہر خند ہو کر کہا "تم مذاق

کرتے ہوئے:

"واللہ مَیں مذاق نہیں کرتا۔ صرف اتنا بتا دو کہ اکبر کہاں ہے۔ اور گھڑی کو اپنا سمجھو۔"

خوشحال ہنس پڑا۔ اُس نے اپنی سیاہ آنکھیں افسر کی آنکھوں میں ڈال دیں جیسے اُس کا دلی منشا پڑھ لینا چاہتا ہے۔ اور دیکھتا ہے۔ کہ اُس کی آنکھیں بھی اُس کے الفاظ کی تائید کرتی ہیں یا نہیں۔

افسر نے کہا۔ "لڑکے میرے ساتھی اس وعدے کے گواہ ہیں ان کی موجودگی میں اپنے وعدے سے پھر نہیں سکتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ گھڑی کو بچے کی طرف بڑھاتا گیا۔ یہاں تک کہ گھڑی بچے کے چہرے سے چھونے لگی۔ بچے کے چہرے کی زردی صاف بتا رہی تھی کہ اُس کے سینے میں لالچ اور مہمان نوازی کے درمیان جنگ ہو رہی ہے۔ اندرونی جذبات کے اثر سے اُس کا سینہ اُبھر رہا تھا۔ اور سانس رُکا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں گھڑی اُس کے رخساروں کے پاس ہل رہی تھی۔ اور بعض اوقات اُس کے گالوں سے چھو جاتی تھی۔ آخر کار اس کا دایاں ہاتھ آہستہ آہستہ اُٹھا۔ اُنگلیوں کے سرے گھڑی سے جا لگے۔ اور پھر تمام گھڑی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن افسر نے ابھی تک زنجیر کو نہ چھوڑا تھا۔ گھڑی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہی تھی۔ اور دھوپ میں اُس کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی تھی۔

تحریص زبردست تھی خوشحال نے اپنا بایاں ہاتھ اُٹھایا۔ اور اپنے کندھے پر سے تودے کی طرف اشارہ کیا۔ افسر فوراً سمجھ گیا۔ اس نے زنجیر چھوڑ دی اور خوشحال گھوڑی کا واحد مالک بن گیا۔ وہ ہرن کی سی چستی کے ساتھ اُٹھا اور گھاس کے تودے سے دس قدم کے فاصلہ پر جا کھڑا ہوا جسے اب سپاہی اُلٹ پلٹ کر رہے تھے ۔

گھاس میں حرکت ہوئی۔ اور خون میں لت پت ایک انسان ہاتھ میں خنجر لئے ظاہر ہو گیا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کی اکڑی ہوئی ٹانگ نے بوجھ نہ سنبھالا۔ اور وہ گر پڑا۔ افسر نے ایک ہی جست میں اُسے جا دبوچا۔ اور اُس کا خنجر چھین لیا۔ باوجود شدید مدافعت کے لحظہ بھر میں اُس کی مشکیں کس لی گئیں ۔

اکبر نے جو لکڑیوں کے گٹھے کی طرح بندھا ہوا زمین پر پڑا تھا۔ اپنا منہ خوشحال کی طرف پھیر کر کہا ــــ "کمینے" ان الفاظ میں غصے کی بجائے نفرت اور حقارت تھی ۔

خوشحال نے چاندی کا سکہ اس کی طرف پھینک دیا۔ اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اب وہ اُس کا حقدار نہیں ہے۔ اکبر نے اُس حرکت پر قطعاً کوئی توجہ نہ کی اور افسر سے مخاطب ہو کر کہا "شیر اللہ خاں! اب میں اپنے پاؤں پر چل نہیں سکتا۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ مجھے اُٹھا کر شہر میں لے چلو۔"

"ابھی ابھی تم گھوڑے سے بھی تیز بھاگ رہے تھے۔ لیکن خاطر

جمع رکھو۔ میں تمہاری گرفتاری سے اس قدر خوش ہوا ہوں کہ تمہیں اپنی پیٹھ پر اٹھا کر دس میل تک لے جا سکتا ہوں۔ دوستو! اس کے چغے میں دو ڈنڈے لگا کر ڈولی بنا لو اور پھر ہم نزدیک ترین چوکی سے گھوڑے لے لیں گے۔"

قیدی نے کہا "میں ممنون ہوں۔ لیکن اس قدر اور نوازش کرنا کہ ڈولی میں تھوڑی سی گھاس رکھ لینا تاکہ میں زیادہ آرام سے سفر طے کر سکوں۔"

بعض سپاہی اکبر کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ اور بعض ڈولی بنانے کے اہتمام میں تھے۔ کہ جنگی سے آنے والے راستے میں ایک موڑ پر دلاور خاں اور اس کی بیوی نمودار ہوئے۔ عورت جنگی ناشپاتیوں کا ایک بھاری بوجھ اٹھائے بمشکل چل رہی تھی اور دلاور خاں ایک بندوق ہاتھ میں اور دوسری کندھے سے لٹکائے ٹہلتا ہوا چلا آرہا تھا۔

سپاہیوں کو دیکھتے ہی دلاور خاں ٹھٹکا اور سمجھا کہ شاید مجھ ہی کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ پھر سوچا کہ میں نے کونسا جرم کیا ہے۔ انگریزی حکام کے ساتھ میری کوئی پرخاش نہیں۔ اور میری امن پسندانہ زندگی کا انہیں پورا پورا علم ہے۔ تاہم وہ ایک آزاد علاقے کا باشندہ تھا۔ اور اس کی رگوں میں بہادر اسلاف کا خون موجزن تھا۔ آزاد علاقے میں بہت کم ایسے انسان ہوں گے۔ جو اگر اپنی گذشتہ زندگی پر ایک

نظر ڈالیں تو اُنہیں بندوق کے ایک دو انسانی ہدف یا خنجر کا کوئی وار یا ایسی ہی کوئی معمولی سی بات یاد نہ آجائے۔ لیکن دلاور خاں کا ضمیر بالکل صاف تھا۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ پچھلے دس سال کے عرصے میں اُس نے کبھی اپنی بندوق کا رُخ کسی انسان کی طرف نہیں کیا۔ لیکن وہ ہمیشہ محتاط تھا۔ اُس نے فوراً ایسا انتظام کر لیا کہ اگر موقع آن پڑے تو وہ اپنی حفاظت بوجہ احسن کر سکے۔ "بیوی، اپنا بوجھ نیچے رکھ دو اور تیار رہو۔"

عورت نے فوراً تعمیل کی اور کندھے والی بندوق تھام لی۔ دلاور نے ہاتھ والی بندوق کا گھوڑا چڑھا لیا۔ اور سڑک کے کنارے کے درختوں کی پناہ لیتا ہوا آہستہ آہستہ گھر کی طرف روانہ ہو لیا۔ تاکہ دشمن کی طرف سے خفیف مخالفانہ حرکت پر بھی وہ اپنے آپ کو بہترین کمین گاہ میں پائے۔ اور پوری طرح مقابلہ کر سکے۔ اُس کی بیوی فالتو بندوق اور کارتوسوں کا ڈبہ لئے اُس کے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ نیک بیوی کا یہ فرض ہے کہ لڑائی کے موقع پر اپنے شوہر کی بندوق بھر کر اُسے دیتی جائے۔

دوسری طرف پولیس افسر دلاور خاں کو پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بندوق کی نالی کو سیدھا کئے اور اُنگلی کو لبلبی پر رکھے دیکھ کر سخت پریشان ہو رہا تھا۔

اُس نے سوچا کہ اگر اکبر خدا نخواستہ دلاور خاں کا دوست نکلا

اور دلاور نے اُسے بچانا چاہا تو اُس کی دونوں بندوقوں کی گولیوں کا ہمارے جسم میں اُترنا ایسا ہی یقینی ہے۔ جیسا چھٹی کا لیٹر بکس میں پڑنا۔ اس وقت وہ میری رشتہ داری کو بھی بالائے طاق رکھ دیگا۔

اس پریشانی میں اُس نے اِس بے باکانہ تجویز پر عمل کیا کہ معاملہ کو صاف کرنے کے لئے وہ اکیلا دلاور خاں کی طرف چل پڑا۔ لیکن تھوڑا سا فاصلہ جو اُن کے درمیان تھا شیر اللہ خاں کو کاٹنا مشکل ہو گیا۔

"بھائی دلاور خاں مزاج تو اچھے ہیں۔ میں تمہارا بھائی شیر اللہ ہوں۔"

دلاور خاں بغیر کچھ جواب دئے ٹھہر گیا۔ اور آہستہ آہستہ بندوق کی نالی بلند کرتا گیا۔ یہاں تک کہ جب شیر اللہ اُس کے پاس پہنچا تو بندوق کا رُخ اُس کے سر سے بلند تھا۔

شیر اللہ نے کہا: "السلام علیکم۔ بھائی بڑی مدّت کے بعد ملاقات نصیب ہوئی۔"

"وعلیکم السلام بھائی صاحب۔"

"میں راہ چلتے ہوئے تمہاری اور بچّے کی مزاج پرسی کے لئے ٹھہر گیا تھا۔ آج ہمارے پیش نظر بہت لمبا سفر تھا۔ لیکن اب شکایت کی کوئی وجہ بھی نہیں۔ کیونکہ آج ہم نے ایک مشہور مجرم کو گرفتار کیا ہے۔ یعنی اکبر خاں کو۔"

"الحمدللہ۔ بہت اچھا ہوا۔ کمبخت پچھلے ہفتے ہماری ایک بکری چُرا

کر لے گیا تھا۔"

ان الفاظ سے شیر اللہ کو کچھ اطمینان ہوا۔

دلاور نے کہا "کمبخت اُس روز بہت بھڑکا تھا۔"

بدمعاش شیر کی طرح لڑا ہے۔ میرا ایک سپاہی بھی مار دیا۔ اور اس پر ہی قناعت نہ کی۔ بلکہ میرے حوالدار رتن چند کا بازو بھی توڑ دیا اور پھر شیطان اس طرح چھپا کہ اگر میرا بھتیجا خوشحال اس موقع پر مدد نہ کرتا۔ تو مَیں ہرگز اس کے پانے میں کامیاب نہ ہوتا۔"

"خوشحال؟ دلاور خاں نے کہا۔

"خوشحال؟ دلاور خاں کی بیوی نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ اکبر سامنے والے گھاس کے تودے میں چھپ گیا تھا۔ لیکن خوشحال نے اُس کی چالاکی سے مجھے خبردار کر دیا۔ مَیں اُس کے چچا سے ضرور سفارش کروں گا۔ کہ اُسے کوئی اچھا سا تحفہ بطور انعام بھیجے۔ ہاں آپ کا اور خوشحال کا نام ابتدائی رپورٹ میں کپتان صاحب کے پیش کر دیا جائے گا۔"

"لعنت!" دلاور خاں نے زیرِ لب کہا۔

وہ اب سپاہیوں کے گروہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اکبر ڈولی میں پڑا ہوا تھا جب اُس نے دلاور اور شیر اللہ کو اکٹھے دیکھا تو ایک عجیب مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر ظاہر ہوئی۔ اپنا منہ دلاور کے گھر کی طرف پھیر کر اُس نے دہلیز پر تھوک دیا۔ اور کہا "غدّار کا گھر۔"

دلاور خاں کے سامنے ان الفاظ کے ادا کرنے کی جرأت صرف وہی شخص کر سکتا تھا جس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہو۔ اس تحقیر کا جواب خنجر کا صرف ایک وار ہو سکتا تھا جس کے دُہرانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ لیکن دلاور خاں نے سوائے اس کے حرکت تک نہ کی کہ اپنا ہاتھ پیشانی پہ رکھ لیا۔ جیسے کوئی چندھیا گیا ہو۔ خوشحال باپ کی آمد پر گھر کے اندر چلا گیا، لیکن اب وہ دودھ کا ایک پیالہ لئے ہوئے نکلا اور آنکھیں جھکائے ہوئے اکبر کو دینے لگا۔

"میری نظروں سے دُور ہو جاؤ۔" اکبر نے چلا کر کہا اور سپاہیوں کی طرف پھر کر کہا۔ "دوستو مجھے پانی دو۔"

ایک سپاہی نے اپنی پانی کی بوتل اُس کے ہاتھوں میں دے دی اور اکبر نے اُس شخص کے ہاتھ سے پانی پیا۔ جس کے ساتھ چند منٹ پہلے وہ گولیوں کا تبادلہ کر رہا تھا۔ اور پھر استدعا کی کہ اس کے ہاتھ بجائے پیٹھ کی طرف باندھنے کے سینے پر باندھے جائیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ آرام سے لیٹا رہوں۔"

سپاہیوں نے اُس کی اِس خواہش کو بھی فوراً پُورا کر دیا۔ اور پھر افسر نے روانگی کا حکم دے کر دلاور کو سلام کیا۔ لیکن وہ بغیر جواب دیئے میدان کی طرف چلا گیا۔

قریباً دس منٹ کے بعد دلاور کی زبان کھلی۔ لڑکا اپنی بیقرار آنکھوں سے کبھی ماں کی طرف دیکھتا اور کبھی باپ کی طرف جو بندوق کا سہارا لئے

اپنے تمام غصے کو ایک ہی نقطہ پر مرکوز کئے کھڑا تھا۔

"تمہاری اٹھان اچھی ہے"۔ دلاور نے نہایت دھیمی اور پُرسکون آواز میں کہا۔ لیکن جو لوگ اُس کی طبیعت سے واقف تھے جانتے تھے کہ اس میں کس قدر قہر و غضب پنہاں ہے۔

لڑکا روتا ہوا باپ کے پاؤں پر گر پڑا۔ لیکن دلاور نے غضبناک ہو کر کہا۔ "دُور ہو جاؤ"۔

لڑکا سسکیاں بھرتا ہوا باپ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ وہ خاموش تھا۔

دلاور کی بیوی نے خوشحال کی جیب سے گھڑی کی زنجیر لٹکتی ہوئی دیکھی اور نزدیک آ کر نہایت سختی سے پوچھا۔ "یہ گھڑی تم نے کہاں سے لی ہے؟"

"شیر اللہ نے دی ہے"۔

دلاور نے گھڑی چھین کر ایک چٹان پر اس زور سے دے ماری کہ اُس کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے۔

"بیوی، کیا یہ لڑکا میرا ہے؟"

بیوی کے رخسار شرم سے سُرخ ہو گئے۔ "تم کیا کہہ رہے ہو، میرے آقا، تمہیں معلوم ہے تم کس سے گفتگو کر رہے ہو؟"

"بہت اچھا، لیکن ہماری نسل میں یہ پہلا غدار پیدا ہوا ہے"۔

خوشحال باپ کی خوفناک نظروں تلے پسا جاتا تھا۔ آخر دلاور نے اپنی بندوق سے زمین کو ٹھکرایا اور پھر اُسے کندھے پر رکھ کر خوشحال

کو پیچھے آنے کے لئے کہا اور جنگی کی طرف چل دیا۔ اُس کی بیوی نے دوڑ کر دلاور کو بازو سے پکڑ لیا اور کہا "یہ تمہارا بیٹا ہے"۔ اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اُس نے اپنی خوبصورت سیاہ آنکھیں اپنے خاوند کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ وہ اس کا عندیہ معلوم کرنا چاہتی تھی۔

"عورت! میری بات میں دخل نہ دے۔ میں اس کا باپ ہوں"۔

عورت نے بیٹے کو زور سے گلے لگایا۔ اور روتی ہوئی گھر میں داخل ہوگئی۔ اُس نے اپنے آپ کو قبلہ رُخ سجدہ میں گرا دیا اور نہایت خضوع و خشوع سے دعا مانگنے لگی۔ اسی اثنا میں دلاور تقریباً دو سو گز راستہ چلا گیا۔ پھر ایک بلند ٹیلے پر چڑھ کر اپنی سنگین سے زمین کو ذرا سا کھودا اور اُسے حسب منشا نرم پاکر مطمئن ہوگیا۔

"خوشحال! اس بڑے ٹیلے کے نزدیک چلے جاؤ"۔

لڑکے نے حکم کی تعمیل کی اور وہاں کھڑے ہوکر سر جھکا دیا۔

"دُعا مانگ لو"۔

"باپ! باپ! خدا کے لئے مجھے نہ مارو"۔

"دعا مانگ لو"۔ دلاور نے خوفناک آواز میں چلّا کر کہا۔

لڑکے نے رُکتے رُکتے اور سسکیاں بھرتے ہوئے قرآن مجید کی چند دعائیں پڑھیں۔ ہر آیت کے آخر پر باپ آمین کہتا تھا۔

"لڑکے! کیا اتنی ہی دعائیں تمہیں یاد ہیں؟"

"ابّا، مجھے مولوی صاحب نے سورہ لیٰسین بھی حفظ کرا رکھی ہے"۔

"یہ تو بہت لمبی ہے۔ لیکن خیر کچھ مضائقہ نہیں۔"

لڑکے نے دھیمی آواز میں سورت ختم کی۔

"ختم کر چکے؟"

"ابّا مجھ پر رحم کرو۔ مجھے معاف کر دو۔ مَیں پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرونگا

مَیں شبیر اللہ سے کہہ کر اکبر کو چھڑا دُوں گا۔"

لڑکا ابھی بول رہا تھا کہ دلاور نے بندوق سیدھی کی اور نشانہ لیتے

ہوئے کہا "خدا تجھے معاف کرے۔"

لڑکے نے ایک آخری کوشش کی کہ دوڑ کر اپنے باپ کے گھٹنوں

سے چمٹ جائے۔ لیکن وقت گزر چکا تھا۔ دلاور نے بندوق داغ دی

اور خوشحال کی لاش گر پڑی۔

دلاور خاں بغیر نعش کی طرف دیکھے کدال لینے کے لئے گھر کو پلٹا۔

تاکہ اپنے بیٹے کو دفن کر دے۔ راستے میں بیوی ملی جو بندوق کی آواز

سُن کر گھبرائی ہوئی دوڑتی آتی تھی۔

"تم نے کیا کیا ہے؟"

"انصاف!"

"میرا بچہ کہاں ہے؟"

"باہر ٹیلے کے پاس۔ مَیں اسے دفن کرنے لگا ہوں۔ الحمد للہ

کہ وہ مسلمان مرا ہے۔ اس پر جنازے کی نماز پڑھی جائے گی۔ اپنے داماد گل خان

کو بُلا بھیجو۔ وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔"

ہندوستان

(۱)

میرے بچے ، میرے آقا (بنگالی) ، مصنفہ رابندرناتھ ٹیگور ، مترجمہ حامد علی خاں

(۲)

نُو دلیشیاں (گجراتی) ، مترجمہ امیر اللہ آسی رام نگری

(۳)

بیڑی والی (مرہٹی) ، مصنفہ ماما بریرگر ، مترجمہ اظہر علی فاروقی

(۴)

اُلٹ پھیر (ہندی) ، مصنفہ و مترجمہ ، ہیم لتا اشتھانہ

میرے بچے، میرے آقا

(۱)

رائے چرن جب پہلے پہل اپنے آقا کے گھر میں آیا۔ اُس کی عمر بارہ سال کی تھی۔ دونوں کے درمیان ذات پات کا کوئی فرق حائل نہ تھا۔ اور اسے اپنے آقا کے شیر خوار بچے کو بہلانے کا کام دیا گیا۔ اسی طرح کچھ عرصہ گزر گیا آخر بچہ رائے چرن کی آغوش سے نکل کر مدرسے میں داخل ہوا۔ مدرسے سے کالج میں گیا اور تعلیم کی تکمیل کے بعد عدالت کے محکمہ میں ایک عہدہ پر فائز ہوا۔ مگر جب تک اُس کی شادی نہ ہو گئی تنہا رائے چرن ہی اُس کا خدمت گار رہا۔ گھر میں بی بی کے آجانے کے بعد رائے چرن کو ایک کی بجائے دو آقاؤں سے سابقہ پڑا۔ اور پہلے گھر بار میں جو اختیارات اسے حاصل تھے۔ وہ سب کے سب اُس کے آقا کی بی بی کی طرف منتقل ہو گئے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ایک نئی ہستی کی آمد سے اس کے اس نقصان کی تلافی ہو گئی۔ انوکل کو خدا نے بیٹا دیا۔ اور رائے چرن نے بہت جلد اپنی اَن تھک توجہ سے بچے کو اپنے ساتھ مانوس کر لیا۔ وہ

اُسے ہاتھوں میں اُوپر اُچھالتا۔ اُس سے بچوں کی غوُں غاں میں باتیں کرتا، اپنا چہرہ اس کے چہرے سے ملاتا اور پھر مسکرا کر الگ ہو جاتا۔

آخر بچے نے گھٹنیوں چلنا سیکھا اور لڑھکتا پڑھکتا اندر باہر آنے جانے لگا۔ جب رائے چرن اُس کو پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے جاتا، تو بچہ شرارت سے کھلکھلا کر ہنستا اور اس سے بچنے کی کوشش کرتا۔ ان موقعوں پر بچے کی سُوجھ بُوجھ اور ہوشیاری دیکھ کر رائے چرن دنگ رہ جاتا۔ اور پھر اُس کی اماں سے کہتا "بائی جی! پرماتما نے چاہا تو ایک دن آپ کا بیٹا جج ہو گا۔"

رفتہ رفتہ رائے چرن کے لئے ہر صبح اپنے دامن میں نئے نئے معجزات لئے ہوئے نمودار ہونے لگی۔ جب بچے نے چلنا سیکھا تو رائے چرن کے لئے گویا تاریخ انسانی میں ایک نہایت اہم باب کا اضافہ ہوا۔ جب بچے نے اپنے باپ کو با- با اور اپنی ماں کو ام- آں اور رائے چرن کو چن آں کہنا سیکھا۔ اُس وقت رائے چرن کے دل میں خوشی کا ایک اتھاہ سمندر لہریں لینے لگا۔ وہ ایک جہان کو خبر سنانے کے لئے بے قرار نظر آتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد رائے چرن کو اپنی قابلیت کے اظہار کے لئے نئے نئے موقعے دے گئے۔ بعض اوقات وہ اپنے دانتوں میں لگام پکڑ کر گھوڑا بنتا اور اِدھر اُدھر کُدکڑے مارتا پھرتا۔ کبھی کبھی اُسے اپنے ننھے رستم سے کشتی بھی لڑنی پڑتی۔ اور اگر وہ پہلوانی کے کسی داؤں پر

چڑھ کر آخر کار پچھڑ نہ جاتا۔ تو کمسن راجہ نبتیاؤ ہانی تہائی سے آسمان سر پر اُٹھا لیتا۔

اُنہیں دنوں انوکل کا تبادلہ ایک مقام پر ہوا۔ جو ایک دریا کے کنارے واقع تھا۔ راستے میں کلکتے سے گزرتے ہوئے اُس نے اپنے بچے کے لئے ایک گڈولنا خریدا۔ اس کے علاوہ زرد اطلس کا ایک کوٹ کمخاب کی ایک زرق برق ٹوپی اور سونے کی پائلیں اور کنگن بھی بچے کے لئے خریدے۔ رائے چرن کا معمول تھا کہ سیر کو باہر جاتے وقت اپنے ننھے آقا کو یہ چیزیں نہایت چاؤ چوچلے کے ساتھ پہنا لیا کرتا۔

پھر برسات کا موسم آیا۔ اور آئے دن طوفانی بادل برسنے لگے۔ دریا ایک بھوکے اژدہا کی طرح۔ مکان قصبے اور کھیتوں کے کھیت نگلنے لگا۔ آس پاس کی لمبی لمبی گھاس اور خودرو پھول سیلاب میں ڈوب گئے۔ کنارہ گر گر کر ہر وقت دھما دھم دریا میں گرتا رہتا۔ اور طوفان کا بے پناہ شور دُور دُور تک سنائی دیتا۔ کف کے تیز بہتے ہوئے گالوں کو دیکھ کر دریا کی رَو کی تیزی کا اندازہ ہوتا تھا۔

ایک دن سہ پہر کے قریب بارش تھمی۔ اُس وقت بادل چھایا ہوا تھا لیکن آسمان روشن تھا اور ہوا میں خنکی تھی۔ رائے چرن کے خودمختار ننھے راجہ نے ایسے خوشگوار موسم میں گھر پر ٹھہرے رہنا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ مہاراج اُچک کر اپنے گڈولنے میں سوار ہو گئے۔ اور رائے چرن گھوڑا بن کر اُس کو کھینچنے لگا۔ آخر وہ دریا کے کنارے کے قریب دھان کے کھیتوں میں جا پہنچے۔ کھیتوں میں کوئی شخص نہ تھا۔

نہ دریا ہی میں کوئی کشتی نظر آتی تھی۔ دریا کے اُس پار مغربی اُفق پر ابر کچھ کھُل گیا تھا۔ اور بادل پھٹے پھٹے نظر آتے تھے۔ اس خاموشی میں غروب آفتاب کا دلکش نظارہ اپنی تمام جگمگاتی ہوئی تجلیوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے تھا۔ اُس وقت بچے نے دفعتہً اپنے سامنے ایک طرف اُنگلی سے اشارہ کیا اور کہا۔ "چن۔ آں! بیلم پُول" قریب ہی دلدل میں گڈہے کا ایک بہت بڑا درخت پھولوں سے لدا ہوا کھڑا تھا۔ ننھے راجہ کی حریفانہ نگاہیں اس درخت پر جمی ہوئی تھیں۔ رائے چرن اس کا مطلب بھانپ گیا۔ لیکن پھول لانے کے لئے اُسے گھٹنوں کیچڑ میں گھُسنا پڑتا۔ اس لئے اُس نے بچے کو ٹالنے کے لئے دوسری طرف اشارہ کر کے کہا "آہا! دیکھو ننھے دیکھو کیسے اچھے پرندے ہیں"۔ اس کے بعد اُس نے بچے کی توجہ ہٹانے کے لئے عجیب و غریب آوازیں نکالیں، اور گڈو لئے کو دھکیلتا ہوا پرے لے گیا۔

لیکن ایک ایسا بچہ جسے جج بننا تھا ایسی باتوں میں کہاں آنے والا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری طرف اس کی دلچسپی کی کوئی چیز نہ تھی۔ اور پھر کسی خیالی پرندے کا بہانہ بھی دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ ننھا آقا پھول لینے کا فیصلہ کر چکا تھا اور اب رائے چرن کی چترائی کام نہ آسکتی تھی۔ آخر اُس نے کہا۔ "اچھا ننھے میاں! تم گاڑی میں خاموش بیٹھے رہو اور میں جا کر پھول لاتا ہوں۔ لیکن دیکھنا پانی کے نزدیک نہ جانا۔"

یہ کہکر اُس نے گھٹنوں تک اپنا کپڑا اُوپر اٹھالیا۔ اور کیچڑ میں لت پت ہوتا ہوا آہستہ آہستہ درخت کی طرف جانے لگا۔ رائے چمن کے جاتے ہی میاں گڈو لنے میں سے اُچک کر نکلے اور بھلے ہوئے ممنوع پانی کے پاس جا پہنچے مبچے نے جب دیکھا کہ دریا جھینٹا چھینٹیں اُڑاتا اور شور مچاتا ہوا بہ رہا ہے۔ تو اُسے یوں معلوم ہوا کہ گویا نٹ کھٹ موجیں دس ہزار بچوں کے قہقہوں کے ساتھ کسی بہت بڑے رائے چمن کی نظر بچا کر بھاگا بھاگ جا رہی ہیں۔ اُن کی شرارت کو دیکھ کر اس ننھے سے آدم زاد کا دل بھی مضطرب اور بے قرار ہو گیا اور وہ گاڑی سے نکل کر چوری چوری دریا کی طرف بھاگا۔ راستے میں اُس نے کسی درخت کی ایک چھوٹی سی گری پڑی سوکھی ٹہنی بھی اٹھالی اور دریا کے کنارے پہنچکر اس سے مچھلیاں پکڑنے لگا۔ پانی کی شریر موجیں اپنی پُر اسرار آوازوں سے اُسے اپنے ساتھ کھیلنے کے لئے بلا رہی تھیں ۔

رائے چمن پھولوں سے اپنا دامن بھر کر مسکراتا ہوا واپس آرہا تھا۔ لیکن جب وہ گڈو لنے کے پاس پہنچا تو وہاں اُسے کوئی نظر نہ آیا۔

——— اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ لیکن اُسے کوئی نظر نہ آیا۔ اُس نے دوبارہ گڈو لنے پر نظر ڈالی۔ لیکن اُسے کوئی نظر نہ آیا ۔

خوف و ہراس کے اُس اولین لمحے میں اُس کا خون اس کے

بدن میں جم گیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے تمام کائنات ایک گہرے غبار میں چکر کھاتی ہوئی تیر رہی تھی۔ اُس نے اپنے ٹوٹتے ہوئے دل کی گہرائیوں میں سے ایک جگر دوز آواز نکالی۔ "میاں! میاں! ننھے میاں!"

جواب میں چمن۔ "آں" کی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ کوئی بچہ شرارت کی ہنسی نہ ہنسا۔ کسی بچے کی خوشی کی چیخوں نے واپس آنے پر اُس کا خیر مقدم نہ کیا۔ البتہ دریا اسی طرح چھینٹیں اُڑاتا اور گنگناتا ہوا بہہ رہا تھا۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ اور گویا اُسے انسان کے ایک بچے کی موت کے سے حقیر واقعہ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں۔

شام کا دھندلکا رات کی تاریکی سے بدلنے لگا۔ اور بچے کی ماں کی گھبراہٹ ہر گھڑی زیادہ ہونے لگی۔ اُس نے تلاش کے لئے ہر طرف آدمی دوڑا دیئے۔ وہ سب ہاتھوں میں چراغ لیئے اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے تھے۔ آخر دریا کے کنارے انھوں نے دیکھا کہ رائے چرن کھیتوں میں دیوانہ وار بھاگ رہا ہے۔ اور بچے کو چلا چلا کر آوازیں دے رہا ہے ——— "میاں! میاں! ننھے میاں!!"

جب نوکر رائے چرن کو گھر لے گئے تو وہ اپنی بائی جی کے قدموں پر گر پڑا۔ نوکروں نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اس سے بار بار پوچھا کہ تم نے بچے کو کہاں چھوڑا تھا۔ لیکن وہ بجز اس کے کچھ جواب نہ دے۔

سکا کہ مجھے یاد نہیں ؛

اگرچہ ہر شخص کا خیال یہی تھا کہ دریا کی موجوں نے بچے کو اپنا لقمہ بنا لیا ہے۔ مگر ایک ذرا سے شبہ کی گنجائش باقی رہ گئی تھی کیونکہ اسی دن سہ پہر کے وقت ایک خانہ بدوش قبیلہ گاؤں کے قریب سے گذرتا ہوا دیکھا گیا تھا ؛

لیکن بچے کی ماں غم سے دیوانی ہو رہی تھی۔ اس ممتا کی ماری کو خود رائے چمن پر بھی شبہ ہو رہا تھا۔ وہ اُسے حسرت آمیز التجاؤں کے ساتھ الگ لے گئی۔ اور رو رو کر اُس سے کہنے لگی "رائے چمن! میں تمہیں پرماتما کا واسطہ دے کر کہتی ہوں۔ میرا بچہ مجھے واپس دے دو ہائے میرا ننھا تم نے کیا کیا۔ رائے چرن! جتنی دولت کہو حاضر کرتی ہوں۔ تم میرا ننّھا میرا لال مجھے دے دو"؛

جواب میں رائے چرن نے صرف اپنے ماتھے پر دو ہتڑ مارا اور زار زار رونے لگا۔ بائی جی نے اُسے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ انوکل نے اپنی بی بی کو سمجھایا کہ تمہارا شبہ صحیح نہیں۔ کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ رائے چرن اس قسم کے جرم کا ارتکاب کرتا۔ لیکن اُس کی بی بی نے جواب دیا "اجی کیا معلوم کس وقت اِس مُوئے کی جڑے پیٹے اس مُونڈے کاٹے کی نیّت بگڑ گئی ہو۔ آخر سونے کا گہنا تو تھا ہی"؛

انوکل خاموش ہو گیا۔ اب زیادہ بحث بے کار تھی ؛

(۲)

رائے چرن اپنے گاؤں میں چلا گیا۔ اس وقت تک اُس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اور نہ اُسے اُمید تھی کہ اب کوئی بچہ پیدا ہوگا۔ لیکن سال بھر بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اُس کی بی بی کے ایک بچہ پیدا ہوا اور وہ مر گئی۔ اس نوزائیدہ بچے کو پہلی نظر دیکھتے ہی رائے چرن کا دل سخت ناخوش ہوا۔ اُس کے دل میں یہ دردناک خیال پیدا ہو گیا تھا۔ کہ یہ بچہ "ننھے میاں" کی جگہ غصب کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس کے علاوہ اس المناک حادثہ کے بعد جو اُس کے آقا کے بیٹے کے ساتھ گزر چکا تھا۔ اپنے بیٹے کی خوشیاں منانا اُس کی نظر میں ایک مکروہ جرم تھا۔ اور اگر اس کی ایک بہن جو بیوہ ہو چکی تھی بچے کی نگہداشت کا فرض اپنے ذمے نہ لے رکھتی تو بچے کی زندگی زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکتی تھی۔

لیکن رائے چرن کی طبیعت میں رفتہ رفتہ ایک انقلاب پیدا ہونے لگا۔ جب اس ننھے بچے نے گھٹنیوں چلنا سیکھا تو یہ بھی شرارت بھری نگاہوں کے ساتھ اندر باہر پھرنے لگا۔ اگر کوئی اُسے پکڑنے کو جاتا۔ تو اس سے بچنے کے لئے یہ بھی نہایت ہوشیاری اور عقلمندی کا ثبوت دیتا۔ اُس کی آواز، اُس کے قہقہے، اُس کا رونا اور اُس کے اشارے سب رائے چرن کے "ننھے آقا" سے ملتے تھے۔ جب یہ بچہ روتا تو رائے چرن کا دل اُس کے سینے میں دھڑکنے لگتا۔ اُسے یوں معلوم ہوتا کہ اُس کا "ننھا آقا" دُور، بہت دُور، کسی نامعلوم سرزمین میں اپنے

چن۔آں کے لئے رو رہا ہے ۔

نیا بچہ بہت جلد باتیں کرنا سیکھ گیا۔ اور بچوں کی تتلی تتلی زبان میں با۔ با۔ با۔ ام۔ آں کہنے لگا۔ رائے چمن نے جب یہ الفاظ سُنے جن سے پہلے بھی اُس کا دل مانوس تھا۔ تو اُس پر تمام حقیقت روشن ہو گئی۔ اُس نے دل میں کہا کہ میرا "ننھا آقا" چن۔ آں کی محبت کو کبھی فراموش نہ کر سکتا تھا۔ اِسی لئے اُس نے دوبارہ میرے گھر میں جنم لیا ہے۔ اس خیال کے حق میں رائے چمن کے پاس چند ناقابل تردید دلائل موجود تھے۔

(۱) نیا بچہ ننھے میاں کی موت کے بعد بہت جلد پیدا ہوا۔

(۲) رائے چمن کی بی بی ادھیڑ تھی اور عمر بھر کے بعد اب بچہ پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔

(۳) نیا بچہ بھی با۔ با اور ام۔ آں کہتا تھا۔ اور اُس کی باقی تمام حرکتیں بھی ننھے میاں سے ملتی تھیں۔

اب رائے چمن کو وہ سب الزامات یاد آ گئے جو ننھے میاں کی اماں نے اُس پر لگائے تھے۔ اُس نے اپنے دل میں کہا۔ آہ ماں کے دل سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی تھی۔ وہ سچی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں نے اُس کا بچہ چُرا لیا ہے۔ وہ یہ سوچ کر سخت پچھتایا کہ اب تک اُس نے بچے سے اتنی بے اعتنائی کیوں برتی ہے۔ اور پھر دن رات ایک وفادار خادم کی طرح بچے کی خدمت کرنے لگا۔ وہ اس کی پرورش اس طرح

کرتا تھا۔ گویا وہ کسی بڑے امیر کا بیٹا ہے۔ اُس نے بچے کے لئے ایک گڈولنا، کمخاب کا زرد کوٹ اور زری کی ٹوپی خریدی۔ اس کے علاوہ اُس نے اپنی بی بی کا زیور گلا کر اس کے لئے کنگن اور پائلیں بھی بنوائیں۔

رائے چمن گاؤں کے دوسرے بچوں کو اُس سے کھیلنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ بلکہ دن رات خود اُس کے ساتھ ساتھ رہتا۔ جب بچہ ذرا بڑا ہوا تو اُس کا مزاج لاڈ پیار سے بہت بگڑ گیا تھا۔ اور وہ اس قدر نفیس لباس پہنتا تھا کہ دوسرے بچے ٹھٹے سے اُسے "مہاراج ادھیراج" کہا کرتے تھے۔ اور گاؤں کے دوسرے لوگ حیران تھے کہ رائے چمن کیوں اس بچے کے پیچھے اس قدر پگلا ہو گیا ہے۔

آخر بچے کو مدرسے میں داخل کرنے کا وقت آیا۔ رائے چمن نے اپنی زمین فروخت کر دی اور کلکتہ کو روانہ ہوا۔ جہاں سخت جد وجہد کے بعد اُسے ایک امیر آدمی کے ہاں ملازمت ملی۔ اس کے بعد اُس نے بچے کو مدرسہ میں داخل کر دیا۔ رائے چمن نے اُس کو اعلےٰ تعلیم اعلےٰ لباس اور اعلےٰ خوراک بہم پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اس زمانے میں وہ خود صرف خشکہ کے دو چار نوالے کھا کر اپنے دن کاٹتا۔ اور دل ہی دل میں کہتا۔ "آہ میرے بچے، میرے آقا! تمہیں مجھ سے کتنی محبت تھی کہ تم میرے ہی گھر میں آ گئے۔ ننھے میاں خدا نہ کرے کہ تمہیں میری وجہ سے کوئی تکلیف ہو۔"

اس طرح بارہ سال گزر گئے اور لڑکے کو لکھنے پڑھنے میں شدبد ہو گئی۔ لڑکا خوش و خرم، تندرست اور خوبصورت تھا۔ اُسے اپنے جسم کی دیکھ بھال کا بہت خیال تھا، اور اکثر مانگ پٹی میں لگا رہتا تھا۔ وہ نفیس اور گراں قیمت چیزیں خریدنے میں بے دریغ روپیہ صرف کرتا۔ اُس کے دل میں رائے چرن کی وہ وقعت نہ تھی جو باپ کی ہونی چاہیئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رائے چرن بالکل نوکروں کی طرح اُس کی خدمت کرتا تھا۔ اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رائے چرن اِس بات کو لوگوں سے چھپاتا تھا کہ وہی پھیلنا کا باپ ہے۔

مدرسے کے جس اقامت خانے میں پھیلنا مقیم تھا وہاں کے لڑکے رائے چرن کے گنوارپن کی ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ اور اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ خود پھیلنا بھی اپنے باپ کی پیٹھ کے پیچھے اس ہنسی ٹھٹھے میں شامل ہو جاتا۔ لیکن دراصل اقامت خانے کے سب بچوں کو اس سیدھے سادے نیک دل بڈھے سے اُنس تھا۔ اور پھیلنا بھی اس کا بہت گرویدہ تھا۔ اگرچہ اُس کی محبت ویسی ہی تھی جیسی کسی وفادار نوکر سے ہو سکتی ہے۔

رفتہ رفتہ رائے چرن بڑھاپے سے کمزور ہونے لگا۔ اس کا آقا ہر وقت اُس کے ادھورے کاموں میں عیب نکالتا رہتا تھا۔ رائے چرن بچے کی خاطر ایک مدت سے فاقے کاٹ رہا تھا۔ اور اب اس میں کام کرنے کی طاقت باقی نہ رہی تھی۔ اُس کا حافظہ بہت کمزور ہو گیا۔ ہر بات

اسے بہت جلد بھول جاتی تھی۔ بلکہ کوئی بات اُس کے دماغ میں سما ہی نہ سکتی تھی۔ لیکن اُس کا آقا اس سے ایک تندرست جوان ملازم کی طرح خدمت لینا چاہتا تھا۔ اُس کی نگاہوں میں رائے چرن کے کسی عذر کی پذیرائی نہ ہوتی تھی۔ زمین کی فروخت سے جو روپیہ اُسے ملا تھا اُس میں سے ایک پائی باقی نہ رہی تھی۔ ادھر لڑکا ہر وقت اپنے کپڑے لتے کیلئے جھر جھر کو مرا جاتا تھا۔ وہ آئے دن روپے کے لئے جھگڑتا رہتا:

(۳)

آخر رائے چرن نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔ اُس نے ملازمت چھوڑ دی اور پھیلنا سے کہا کہ "تم یہاں ٹھہرو، میں ایک ضروری کام کے لئے گاؤں جا رہا ہوں۔ میں بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔"

یہاں سے چل کر وہ سیدھا اس شہر میں پہنچا، جہاں انوکل مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھا۔ انوکل کی بی بی ابھی تک بچے کے سوگ سے فارغ نہ ہوئی تھی۔ وہ غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔ پہلے بچے کی موت کے بعد اب تک کوئی دوسرا بچہ پیدا نہ ہوا تھا:

ایک دن انوکل کئی گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد گھر میں آ کر سستا رہا تھا، اور اُس کی بی بی ایک لپاڈئیے سادھو سے منہ مانگے دام دے کر کوئی بوٹی مول لے رہی تھی جس کے متعلق سادھو کا دعوے تھا کہ اس کے استعمال سے بے اولادوں کو اولاد کی نعمت میسر آ جاتی ہے۔ اس وقت صحن میں صاحب سلامت کی صدا سنائی دی۔ انوکل نے

باہر نکل کر دیکھا تو اُس کی نظر رائے چرن پر پڑی۔ پٹے برانے خدمتگار کو دیکھ کر اُس کا دل بھر آیا۔ وہ بہت دیر تک اُس سے باتیں کرتا رہا۔ اور دوبارہ اُسے ملازمت پر بحال کرنے کے لئے بھی اُس نے آمادگی ظاہر کی۔

رائے چرن کے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اُس نے کہا۔ "مَیں اپنی بائی جی کو ڈنڈوت کرنا چاہتا ہوں۔"

انوکُل اسے مکان کے اندر لے گیا۔ بائی جی رائے چرن سے انوکُل کی طرح تپاک کے ساتھ نہ ملیں۔ مگر رائے چرن نے اس بات کا خیال نہ کیا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔ "بائی جی! دریا کا قصور نہ تھا آپ کا بچہ مَیں نے چرایا تھا۔"

انوکُل چلّا کر بولا۔ "ہائیں! ہے پرماتما! ارے کیا کہتے ہو؟ بچہ کہاں ہے؟ اُسے لاؤ۔"

رائے چرن نے کہا۔ "وہ میرے پاس ہے۔ مَیں اُسے اترسوں یہاں لاؤں گا۔"

یک شنبہ کا دن تھا۔ عدالت بند تھی۔ میاں بی بی دونوں سڑک پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ اور صبح سے رائے چرن کے لئے ہمہ تن انتظار بن رہے تھے۔ دس بجے کے قریب رائے چرن نمودار ہوا۔ وہ پھیلنا کا ہاتھ تھامے ہوئے چلا آ رہا تھا۔ انوکُل کی بی بی بے قرار ہو کر آگے بڑھی اور کوئی سوال کئے بغیر اُس نے لڑکے کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ وہ خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی کبھی وہ روتی، کبھی ہنستی،

کبھی بچے کا سر اور ماتھا چومتی اور بہو کی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتی
بچہ خوبصورت تھا اور اُس کا لباس بھی شرفاء کا سا تھا۔ انوکل کا دِل
بھی اُس کو دیکھ کر شفقت سے بھر آیا۔ لیکن وہ آخر مجسٹریٹ تھا۔ اس
لئے اُس نے رائے چرن سے پوچھا:۔

"تمہارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟"

اِس بات کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ پرماتما ہی جانتا ہے۔ کہ مَیں نے
آپ کا بچہ چرایا ہے۔ دُنیا میں اور کوئی نہیں جانتا"

لیکن جب انوکل نے دیکھا کہ اُس کی بی بی لڑکے سے دیوانہ وار
لپٹ رہی ہے۔ تو اُس نے دل میں کہا کہ اب ثبوت مانگنا محض بیکار
ہے۔ اُس نے سوچا کہ آخر رائے چرن کا سا بڈھا آدمی اس قسم کا لڑکا
لا ہی کہاں سے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہمیں
ایسا فریب دے۔ مگر دفعتہً اُس نے درشت لہجے میں کہا "رائے چرن!
اب تم یہاں نہیں ٹھہر سکتے"

رائے چرن نے ہاتھ باندھ کر بھرّائی ہوئی آواز سے کہا "میرے
سوامی! میں کہاں جاؤں۔ مَیں بڈھا ہوں۔ ایک اپاہج کو کوئی پناہ
نہیں دے سکتا"

انوکل کی بی بی نے کہا "اب اسے رہنے بھی دو۔ فرد ا بچے کا دل
بہلا رہے گا۔ مَیں نے اس قصور معاف کیا"

انوکل آخر مجسٹریٹ تھا۔ اُس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا "نہیں۔

وہ یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ اُس کا جُرم ایسا نہیں کہ معاف کیا جائے"۔

رائے چمن نے اپنا سر انوکل کے قدموں پر رکھ دیا اور کہا "میرے آقا! مجھے یہاں رہنے دو۔ یہ میرا کام نہ تھا۔ یہ سب کچھ پدما تملکنے کیا تھا"۔

رائے چمن نے جب خدا پہ الزام لگایا تو انوکل کی رُوح کو اور بھی تکلیف ہوئی۔ پھر اُس نے کہا "مجھے اب تم پر اعتبار نہیں رہا۔ میں اب تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتا۔ تم اپنی غداری کا ثبوت دے چکے ہو"۔

رائے چمن اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "میرے سوامی! یہ میرا کام نہ تھا"۔

"تو آخر کون مجرم ہے؟"

"میرے پھوٹے ہوئے بھاگ۔ کرم ریکھا امٹ ہے"۔

کسی تعلیم یافتہ شخص کے سامنے اس قسم کے بہانے کارگر نہیں ہو سکتے۔ انوکل کا دل موم نہ ہوا۔

جب پھیلنا کو معلوم ہوا کہ وہ ایک مقتول مجسٹریٹ کا بیٹا ہے اور رائے چمن نے اُسے فریب دے رکھا تھا۔ تو پہلے اُسے بہت غصہ آیا لیکن پھر رائے چمن کو بپتا میں دیکھ کر اُس کا دل پسیجا۔ اور اُس نے انوکل سے کہا کہ پتاجی! اس کا قصور معاف کر دیجئے۔ اور اگر آپ اسے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے۔ تو پھر کم از کم اس کے لئے کچھ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیجئے"۔

یہ الفاظ سُن کر رائے چمن بالکل خاموش ہو گیا۔ اُس نے اپنے بیٹے کے چہرے پر ایک آخری نگاہ ڈالی۔ پھر اپنے آقا اور اُس کی بی بی کے سامنے جھک کر آداب بجالایا۔ اور گھر سے نکل کر باہر ہجوم میں غائب ہو گیا۔ مہینے بھر کے بعد الوکل نے رائے چمن کے لئے کچھ روپیہ اُس کے گاؤں میں بھیجا۔ لیکن روپیہ واپس آگیا۔ گاؤں میں اس نام کا کوئی شخص نہ تھا۔

زودِ پشیماں

رادھا نے آنسو بہاتے ہوئے کہا ——— " لیلا! تم سمجھتی ہو کہ مَیں خوش قسمت ہوں ——— ؟ اگر مَیں سُکھی ہوتی تو تمہارا اندازہ غلط نہ ہوتا . . . . . . "

لیلا نے بات کاٹتے ہوئے کہا " رادھا! دنیا کے دیکھتے ہیں تو تمہیں کوئی دکھ نہیں ہے۔ تمہارے پتی تندرست و توانا، ہنس مکھ، سُندر، سوت پیار کرنے والی، دھن، دولت تمہارے چرنوں کے داس، تمہارے آنے والے سنہرے دنوں کی منوہر تصویر کچھ دنوں میں تمہاری گود میں ہوگی۔ جس کے لئے بابو کرشن کانت کی دُنیا سُونی تھی۔ جس کے بغیر تمہارے خسر کا گھر اندھیرا تھا۔ ایشور کی کرپا سے اب وہی چاند تمہاری گود میں کھیلے گا۔ رادھا! تم کیوں دُکھی رہتی ہو؟ تمہیں تو اس وقت اور بھی خوش رہنا چاہیئے۔ نہیں تو ہونے والے بچے پر کتنا بُرا اثر پڑے گا"

رادھا اسی طرح آنسو بہاتی رہی۔ لیلا نے اُسے چھیڑتے ہوئے

پوچھا۔ "واہ ری پگلی سنوں بھی کیا دکھ ہے؟"

"دکھ سن کر کیا کرو گی لیلاوتی؟ دنیا کے دیکھنے کو ہمیں ہر طرح کا سکھ ہے۔ لیکن میرا دل دکھ درد کی جس آگ میں جل رہا ہے۔ اُسے کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ کسی دن تم سن لو گی کہ مجھے کیا دکھ ہے۔ اب جاؤ لیلا۔ بہن آتی ہوں گی۔ وہ بھی آتے ہوں گے۔"

لیلا چلی گئی۔ رادھا نے آنسو پونچھے اور منہ صاف کر کے چپ چاپ کچھ سوچنے لگی۔

. . . .

رادھا بابو کرشن کانت کی دوسری بیوی تھی۔ غریب ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ اور اُس کے ماں باپ اگر غریب نہ ہوتے تو اپنی پیاری بیٹی کو سوت پر بیاہ دینا کیونکر گوارا کرتے۔ شادی ہونے سے پہلے رادھا کی ماں نے سخت مخالفت کی تھی۔ کوئی ماں کتنی ہی غریب اور مصیبت کی ماری ہو اپنی آنکھوں کی پتلی کو سوت پر دینا ہرگز گوارا نہیں کر سکتی۔ لیکن شوہر نے بار بار سمجھایا کہ "سوت اپنی رضامندی دوسری شادی کرنے کی اجازت دے رہی ہے۔ اور جس عقلمندی سے دوسری شادی ہو رہی ہے۔ اگر پرماتما نے پورا کر دیا تو پھر تمہاری رادھا ہی راج رانی ہو گی۔ تم نہیں سمجھتیں کہ دوسری استری زیادہ پیاری ہوتی ہے۔"

بے چاری رادھا کی ماں سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اور بھولی بھالی

رادھا کرشن کانت بابو سے بیاہ دی گئی ٭

کرشن کانت بابو نے شادی کرنے کو تو کر لی۔ لیکن وہ خوشی اور من امنگ جو پرملا کو پیار کرنے میں تھی رادھا کی چاہت میں اُس کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ پرملا سے چودہ پندرہ برس کا ساتھ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی پریم ڈور میں بندھے تھے پھر کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ٭

کرشن کانت پرملا کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھتے تھے۔ اور اس کے رُوپ کنول پر تن من نچھاور کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پرملا کے دل پر بجلیاں گرائیں۔ لیکن نصیب کے لکھے کو کسی طرح ٹال نہ سکے۔ ایک ایک کر کے پندرہ برس گزر گئے۔ اُمیدوں کی پھلواری سوکھی جا رہی تھی آس ٹوٹی جا رہی تھی۔ لیکن آرزوؤں کی موہنی صورت نظر نہ آئی۔ پرملا کی گود سُونی ہی رہی ٭

دھیرے دھیرے پرملا کو بھی محسوس ہونے لگا۔ کہ اُس کا دل ایک لال کے لئے تڑپ رہا ہے۔ اُس کی اُمیدوں پر پانی پھر رہا ہے۔ لیکن وہ بے بس تھی۔ یہاں تک کہ اُس نے اِس راہ میں پتی تک کو کسی دوسری اِستری کو سونپ دینے کا تہیّہ کر لیا ٭

کرشن کانت کے باپ بڑے زمیندار اور پرانے رئیس تھے مدھن دولت اور عزت کے لحاظ سے دُور دُور تک اُن کا نام تھا۔ کرشن کانت اُن کے اکلوتے بیٹے تھے۔ بابو کملا کانت نے دنیا دیکھی تھی۔ اُنہوں نے

گھر کی اس اُداسی کو دُور کرنے میں کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی تھی ڈاکٹروں اور نرسوں پر پانی کی طرح روپیہ بہا کر تھک چکے تھے۔ دوا، دارو، جوگ، ٹوٹکے سب بے سُود ثابت ہو چکے تھے۔ پر مدا کی گود بھرنی تھی نہ بھری ۔

کرشن کانت کی بُوڑھی ماں پوتے کی آرزو ہی لئے چل گئیں۔ باپ بھی چل چلاؤ کے لئے کمر باندھ رہے تھے۔ ایک دن وہ اسی فکر میں بیٹھے تھے کہ اُن کے پرانے دوست منوہر سنگھ آئے۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے کے بعد کرشن کانت کی بے اولادی کی بات چلی۔ منوہر نے کہا "بھائی! ایک دو نہیں چودہ پندرہ برس ہو گئے۔ اب کیا اولاد ہو گی۔ نہ جانے آپ کی سمجھ کو کیا ہو گیا ہے۔ میں تو بار بار کہتا ہوں کرشن کانت کی دوسری شادی کرا دیجئے۔ ایک نہیں تو دوسری سے تو اولاد ہو گی۔"

"کیا کہوں منوہر! بہو کا مُنہ دیکھ کر چُپ رہ جاتا ہوں۔ کرشن کانت اُسے جتنا چاہتے ہیں، میں جانتا ہوں۔ کیا کہوں ایک بے قصور ابلا کی چھاتی پر کیسے مونگ دلوں؟"

چھاتی پر مونگ دلنے کی کوئی بات نہیں۔ اُسے سمجھاؤ۔ وہ ایسی ناسمجھ نہیں ہے۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہاری نسل کا نام و نشان مٹ جائیگا اور اس دھن دولت سے دوسرے موج اُڑائیں گے"۔

منوہر تو چلے گئے۔ لیکن کملا کانت کے دل پر ایک چرکا لگا گئے۔

- - - - - - - - - - - - - -

پرمدا سُندری تھی۔ پتی کو جان سے زیادہ چاہتی تھی۔ کرشن کانت بھی اُس پر دل و جان نچھاور کرتے تھے۔ جب پتی پتنی نے سُنا کہ پتاجی دوسرا بیاہ کرنے کے لئے زور دے رہے ہیں تو دونوں کے دل پر بجلی سی گر پڑی۔ کرشن کانت نے اس رائے کی سخت مخالفت کی۔ لیکن اُن کی ساری کوششیں بے سُود ثابت ہوئیں۔ اور یہ کسی طرح باپ کے اٹل فیصلہ کو بدل نہ سکے۔ کملا کانت پوتے کی صورت دیکھنے کے لئے دیوانے ہو رہے تھے۔ اُنہوں نے اس پاگل پن میں یہاں تک کہہ ڈالا کہ "کرشن کانت! اگر تم شادی نہ کرو گے تو میں کچھ کھا کر اپنی جان دے دُوں گا۔ پھر میرے بعد جو جی میں آئے کرنا۔"

کرشن کانت باپ کے فرماں بردار بیٹے ہونے کے ساتھ ہی دل کے کچے تھے۔ باپ کی اس دھمکی سے دل پر پتھر رکھ کر شادی کرنے کے لئے راضی ہو گئے۔

پرمدا کے دل پر جو کچھ گذر رہی تھی کچھ وہی جانتی تھی۔ لیکن پتی کے سُکھ میں سُکھی رہنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔ اور پھر بُوڑھے سُسر کا خیال اُس نے بھی اُف نہ کی اور اندر ہی اندر کلیجہ مسوس کر کرشن کانت کی دوسری شادی کی رائے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔

پرمدا چالاک عورت تھی۔ اُس نے سوچا کہ پتی دیوتا ابھی تو مجھے اتنا چاہتے ہیں۔ لیکن نئی دلہن کا مُنہ دیکھنے کے بعد میری صورت سے بیزار ہو جائیں گے۔ اور اگر میری بدقسمتی سے اُسے لڑکا ہو گیا۔ تب تو

کوئی میری بات بھی نہ پوچھے گا۔ یہ سب سوچ کر اُس نے مُنہ بنا کر اپنے سُسر سے کہا۔" بابا! ضرور دوسری بہو گھر میں آئے اور پرما تما کرے آپ سب کی آس پوری ہو۔ میں تو آپ کی داسی ہوں۔ اور آپ کی خوشی میں اپنی خوشی سمجھتی ہوں۔ ہاں جس طرح اب تک آپ مجھے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے چلے آئے ہیں۔ آگے چل کر بھی مجھ پر نگاہ رکھیں گے۔"

پرمدا نے کچھ اس طرح مُنہ بنا کر اور آنکھوں میں آنسو بھر کر سُسر سے ساری باتیں کیں کہ اُن کا جی بھر آیا۔ اور انہوں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا ——— "بیٹی پرمدا۔ تم اپنا دل چھوٹا نہ کرنا۔ آنے والی بہو تمہاری ہی داسی بن کر رہے گی۔ اور زیادہ اطمینان چاہو تو گاؤں علاقے تمہارے ہی نام لکھ دُوں۔"

کملا کانت نے سوچا کہ آخر اس بے چاری کا دل تو ٹوٹ ہی رہا ہے۔ گاؤں علاقے اس کے نام لکھ دینے سے اس کی تسلی بھی ہو جائے گی۔ اور یہ سب کچھ رہے گا کرشن کانت کا۔ کیونکہ یہ اسے چھوڑ کر تو کہیں جانے سے رہی۔ یہ سوچ کر کملا کانت نے سب کچھ پرمدا کے نام لکھ دیا۔

. . . .

کرشن کانت کی شادی ہو گئی۔ پرمدا کے دل میں چاہے جو کچھ ہو لیکن اُس نے اپنے ظاہری برتاؤ میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ شادی کے تمام کاموں کو ایسے ہنسی خوشی سے کرتی تھی جیسے اُس کے کسی بہت ہی قریبی عزیز کی شادی ہو۔ دیکھنے والے پرمدا کے اس تیاگ کو

دیکھ کر حیران رہ گئے :-

رادھا رانی بھوین کرتا گئی ــــــــ

رادھا خوبصورت نہیں تھی - یہ اس کی انتہائی بدقسمتی تھی - ایک تو غریب کی لڑکی - دوسرے رنگ روپ سے تہی دامن - پرمدا گوری تھی رادھا سانولی -

کہنے کو تو رادھا کالی تھی - لیکن اگر کوئی اُسے بدصورت کہے تو انصاف کی بات نہ تھی - اُس کے کالے پن میں بھی ایک رُوپ تھا - اُس کی موہنی صورت دیکھنے والوں کو موہ لیتی تھی - لیکن سانولی رادھا پر حُسن کے انتہا پسند پجاری کرشن کانت نہ ریجھ سکے *

پہلی ملاقات میں کرشن کانت نے رادھا کی اُمنگوں اور آرزوؤں پر پانی پھیر دیا - انہوں نے باتوں ہی باتوں میں ساری باتیں کھول دیں - کہ وہ اپنے دل کی رانی پرمدا کو بنا چکے ہیں - اگر کوئی اس میں حصہ دار بننا چاہے تو یہ بالکل ان ہونی بات ہے "

رادھا اپنی قسمت کو رو چکی اور اُس کی آنکھوں نے آغاز ہی میں انجام دیکھ لیا - اُس نے روتے روتے کہا ــــــ " پران ناتھ ! میں حصے دار نہیں ہوں - میں تو آپ کی اور بہن جی کی داسی بن کر رہوں گی آپ مجھے دیا کر کے لائے ہیں - یہی میرے لئے بڑے بھاگ کی بات ہے - آپ اطمینان رکھیں میں بہن جی کے پریم کی راہ کا روڑا نہ بنوں گی "

کچھ دن اسی طرح بیتے۔ پرمدا نے کبھی پتی کو منع نہ کیا کہ رادھا کو نہ چاہے۔ پرمدا کچھ اس طرح بے پروا تھی جیسے اُس کے لئے رادھا گھر میں تھی ہی نہیں۔

گرہستی کی باگ ڈور پرمدا کے ہاتھ میں تھی۔ رادھا اُسے اپنی ساس کے برابر سمجھتی تھی۔ اُس نے کبھی بھی پرمدا سے رشک و حسد کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن وہ نہ جانے کیوں اُداس اور دُکھی رہتی تھی۔ پرمدا کرشن کانت کے دل کی رانی تھی اور رادھا بھکارن ——!

رادھا اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ اُس کی صورت پر ہر وقت اُداسی برسا کرتی۔ وہ اُمنگ جو نئی دُلہن کی نئی عمر میں ہوتی ہے رادھا کے دل میں پیدا ہی نہ ہوئی۔ کلی کھلنے سے پہلے ہی مُرجھا گئی۔ رادھا یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ پرمدا کو چاہنا کم کر دیں۔ لیکن اس کے متعلق بھی تو اُن کا کچھ فرض ہے۔

کرشن کانت پرمدا کے مقابلے میں رادھا سے نام کے لئے بھی محبت کرتے تو اُس کے دل پر اتنی چوٹ نہ لگتی۔ رادھا اپنے گھر میں اس طرح رہتی جیسے چور ہو۔ اگر رادھا رنگ رُوپ کی مالک ہوتی تو کرشن کانت کبھی نہ کبھی ضرور اُس کی طرف مائل ہوتے۔ لیکن حُسن کی دولت سے محروم ہونے کے باعث یہ پتی کے دل کی رانی نہ بن سکی۔

معمولی معمولی باتوں میں اُسے معلوم ہوتا کہ گھر میں اُس کا کوئی وزن کوئی گنتی نہیں ہے۔ سُسر جی بھی جو اتنے حوصلے سے بیاہ لائے

تھے۔ اُس کی خبر نہ لیتے، بات تک نہ پوچھتے۔

پرمدا رادھا کے سامنے ہی خوب ہنس ہنس کر پتی سے باتیں کرتی۔ گھر کے سارے کام اسی کے صلاح مشورے سے ہوتے۔ رادھا اِس طرح چُپ رہتی جیسے پرمدا کی مہربانی سے جی رہی ہو۔ اس کا پتی پر وہ اختیار نہ تھا جو دوسری عورتوں کا ہوتا ہے۔

ایک دن وہ باتوں ہی باتوں میں شوہر کے دلی جذبات کی انتہائی تہ تک پہنچ گئی۔ جاڑے کی شام تھی۔ کرشن کانت اور پرمدا پلنگ پر تاش کھیل رہے تھے۔ بجلی کی تیز روشنی میں کرشن کانت نے دیکھا کہ پرمدا کچھ اُداس سی ہے۔ یہ دیکھتے ہی بے چین ہو گئے۔ کہ آج ہنس مکھ پرمدا اُداس کیوں ہے۔ انہوں نے اُس کی پیٹھ کو پیار سے تھپکتے ہوئے پوچھا

"پرمدا! آج تم سست سی کیوں ہو؟ کیا بات ہے؟ اُس نے کچھ کہا تو نہیں——؟"

"نہیں۔ اُس نے آج تو مجھے کچھ نہیں کہا۔ لیکن کبھی کہے گی ہی۔ آج نہ سہی کل سہی۔ آخر ہے تو سوت ہی"

"مَیں نے تو اُسے سر نہیں چڑھایا۔ تم خود دیکھتی ہو کہ مَیں اس سے سیدھے مُنہ بات بھی نہیں کرتا۔ اگر وہ تم سے کچھ کہے تو مجھے بتاؤ۔ مَیں اُس کی خبر لوں"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ تم ناحق پریشان ہوتے ہو۔ اُس کی کیا مجال ہے۔ جو مجھے تم سے الگ کرے"

"پھر کیا بات ہے ــــــ"

"پرماتما کی دیا سے اُس کی گود بھرنے والی ہے۔ اب گھر بھر اُسی کا مُنہ چومے گا۔ دیکھنا دادا جی بھی اُسی کے ہو کر رہیں گے۔ پھر تو تمہارے درشن بھی سُپنا ہو جائیں گے۔ تب یہ ابھاگنی کیا کرے گی؟"

"اوہو پرمدا! تم اسی لئے اداس ہو؟ تمہارا کدھر خیال ہے۔ کہنے کو بچہ رادھا کی کوکھ سے جنم لے گا۔ لیکن اصل میں اُس کی ماں تو تم ہوگی پرمدا! میں تمہارے تیاگ کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔"

"دیکھنا ہی ہے۔ بھلا وہ مجھے کاہے کو بچہ دینے لگی۔"

"اس کی کیا مجال ہے جو بچہ دینے سے انکار کرے۔ باپ تو میں ہوں۔ کیا ماں ہی بچے کی حقدار ہے؟ پرمدا تم دُکھی نہ ہو۔ رادھا کبھی تمہارے دل کو جیت نہیں سکتی۔"

رادھا پاس ہی کے کمرے میں تھی۔ دونوں کمروں کے درمیان لکڑی کی دیوار حائل تھی۔ رادھا ساری باتیں سُن رہی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کی چھاتی پھٹ جائے گی۔ آہ پتی پر اُس کا کچھ اختیار نہیں ہے۔ پتی دیو اسے اتنا پرایا سمجھتے ہیں؟ اس کا نرم و نازک نسوانی دل بے اختیار رو اُٹھا۔ کیا عورتیں اچھے گہنے اور کپڑے پر ہی جان دیتی ہیں؟ محل اٹاری ہی سے اُسے سارے سُکھ مل جائیں گے؟ اگر پتی پریم نہ کرے تو سب بے کار ہے۔ رادھا کو اپنا چاندی سونے کے گہنوں سے لدا ہوا جسم مٹی کی ڈھیری معلوم ہو رہا تھا۔ اُسے ایسا

محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی سجی ہوئی سیج اور چمکتے دمکتے گہنے کپڑے اُس کی بدحالی پر طنز کی ہنسی ہنس رہے ہوں۔

اُسے اپنے ماں باپ پر غصّہ آیا کہ کیوں دھن دولت دیکھ کر گر پڑے وہ سوکھی ہی روٹی کھاتی پر اپنے پریتم کی سیوا تو کر پاتی۔ اپنے دلی جذبات کے پھول تو اپنے پران ناتھ کے چرنوں پر نچھاور کر سکتی۔ اُسے اپنی زندگی تو بوجھ نہ معلوم ہوتی۔

پہلے تو رادھا پرمدا کے ساتھ اُٹھتی بیٹھتی بھی تھی۔ لیکن جب سے اُسے یہ معلوم ہو گیا کہ پتی اُس سے اتنی نفرت کرتے ہیں تو وہ اُن کی ہوا سے بھی بچنے لگی۔ کہ کہیں اس سے اُن کے غم و غصّہ میں اور بھی اضافہ نہ ہو۔

رادھا اب تک پرمدا کے تلخ برتاؤ تو سہتی رہی۔ لیکن جب اُسے معلوم ہو گیا کہ پتی کے نزدیک بھی وہ اتنی حقیر ہے تو اُس کے صبر و ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ لیکن غریب کر ہی کیا سکتی تھی؟ آنسوؤں کو پی پی کر زندگی کے دن بسر کرنے لگی۔

اُس دن ضبط کرتے کرتے بھی وہ اپنی بال سکھی لیلا سے اپنا دکھڑا کہہ بیٹھی۔ پھر بھی پچھتائی کہ کہیں سوت اور پتی کو معلوم ہو گیا تو کہیں کی نہ رہے گی۔

دن جاتے دیر نہیں لگتی۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب کرشن کانت

کی شاخِ تمنا میں پھل آیا۔ اور رادھا کے چاند سا بیٹا پیدا ہوا۔ گھر میں مسرّت و شادمانی کے نقارے بجنے لگے۔ کملا کانت کی دلی آرزو پوری ہوئی۔ گھر میں سب کی زبان پر ــــــــ "بچہ" تھا۔ لیکن غریب رادھا کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ سب بچے ہی کی دیکھ بھال میں لگے تھے۔ رادھا بیٹے کی صورت دیکھ کر باغ باغ تو ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی اپنی بدحالی پر اُسے رونا بھی آیا کہ دُنیا کتنی خودغرض ہے۔ کہ اس کی کوئی بات تک نہیں پوچھتا۔

زچہ خانے کا معقول بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے رادھا بیمار ہو گئی۔ اُس کی تو کسے پروا تھی۔ ہاں بچے کے خیال سے لوگ گھبرا اُٹھے اور ایک اچھی سی تجربہ کار نرس بچے کے لئے مقرر کر دی گئی اور سخت تاکید کر دی گئی کہ بیمار رادھا بچے کو ہرگز نہ چھوئے۔

اِس طرح بدنصیب رادھا اپنے دل کے ٹکڑے اور آنکھ کی ٹھنڈک سے بھی محروم کر دی گئی۔ نرس اور پرمدا کی نگرانی میں بچہ پلنے اور پروان چڑھنے لگا۔

اب رادھا کی زندگی اور بھی اجیرن ہو گئی۔ جس سُکھ کے تصور سے وہ جیتی تھی۔ وہ بھی آنکھیں دکھا گیا۔ آہ اُسے یہ بھی اختیار نہ تھا کہ وہ اپنے لال کو جی بھر کر پیار کر سکے۔ کرشن کانت اور پرمدا کو اعتبار ہی نہ ہوتا کہ وہ بچے کو اچھی طرح رکھ سکے گی۔ پرمدا کہتی وہ اناڑی ہے۔ بچہ بیمار ہو جائے گا۔ اُسے سردی لگ جائے گی۔ گویا پرمدا بچے کی ماں تھی اور

بدنصیب رادھا دائی ــــــــــ! کرشن کانت نے سچ مچ اپنی بات پوری کر دی ؛

ایک روز بچے کو بخار آیا۔ سارا گھر بے چین ہو گیا۔ جھاڑ پھونک دوا دارو ہونے لگے۔ پرمدا اور کرشن کانت ایک دم گھبرا اُٹھے۔ رات دن آنکھوں میں کٹنے لگے۔ جب دوسروں کا یہ حال تھا تو بھلا رادھا کی ممتا کس طرح مانتی۔ وہ تو ماں تھی۔ اُس نے کئی دیوی دیوتاؤں کی منتیں مانیں۔ لیکن اُس کی درد بھری التجاؤں پر بھی اُن کے دل نہ پسیجے۔ بچے کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ کتنے حکیم وید آئے۔ لیکن خدا کی مرضی کے آگے کسی کی پیش نہ گئی۔ اور جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ بچہ سب کی آرزوؤں پر پانی پھیر کر چل بسا ــــــــ!

رادھا اپنے لال کو گنوا بیٹھی۔ وہ جس لال کے لئے اس گھر میں آئی تھی وہ بھی نہ رہا۔ اب اُس کا رہا سہا سہارا بھی جاتا رہا۔ اب گھر میں اُس کی بات کون پوچھے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔؟

بچے کے نہ رہنے سے گھر بھر میں اُداسی برسنے لگی۔ کملا کانت کو پوتے کے صدمے نے چارپائی پر ڈال دیا۔ کرشن کانت کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔ پرمدا لے دُکھ درد سہے ماں بنتی بیٹھی تھی۔ اُس نے بھی کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پھر ممتا کی ماری بدنصیب رادھا کا کیا پوچھنا اُس کے لئے تو یونہی زندگی اجیرن ہو رہی تھی۔ بچے کے مرنے کے بعد خود بھی موت کی گھڑیاں گننے لگی۔

رادھا کی صحت دنوں دن خراب ہوتی گئی۔ لوگ اُس کی طرف سے بے فکر تھے۔ شوہر کی بے اعتنائی اور بچے کے صدمے نے اس کے دل کو چھلنی کر دیا۔ آخر غریب کو دق نے آ دبایا ؎

جو کرشن کانت پدما کے سر دُکھنے سے بے چین ہو جاتے تھے رادھا کی اس مہلک بیماری کا حال سُن کر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کبھی کبھی پدما کے کہنے سے دیکھ آتے تھے۔ پدما کو بھی اب رادھا کی حالت پر ترس آنے لگا تھا۔ وہ سوچتی اگر پتی اُس کے ساتھ اتنی بے پروائی نہ برتتے تو وہ اتنی جلدی نہ مرجھاتی۔ لیکن اب پچھتائے کا ہووت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت؟ اب تو ابھاگن کچھ دنوں کی مہمان ہے۔

. . . .

آج رادھا کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس پر رہ رہ کر غشی طاری ہو جاتی ہے۔ مُنہ سے برابر خون جا رہا ہے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کی رات نہ کٹے گی ؎

آج کرشن کانت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُن کا ضمیر اُنہیں ملامت کرنے لگا۔ انہیں رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ رادھا کی یہ حالت اُنہیں کی بے پروائی اور بے التفاتی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اگر وہ رادھا کے دل اور اُس کی اُمنگوں کو پامال نہ کرتے تو یہ نوبت نہ آتی ؎

جو رادھا اُن کی نگاہوں میں بدصورت تھی۔ جس سے وہ نفرت کرتے تھے۔ آج اسی کے سرہانے بیٹھ کر سر جھکائے ہوئے تاسف دملال

کی آگ میں جھلس رہے تھے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

رادھا برابر بدحواسی میں بک رہی ہے ——— "ہائے مجھے کہاں لئے جا رہے ہو۔۔۔۔؟ اچھا چلو۔۔۔۔۔۔۔ مجھے یہیں کونسا سکھ ہے؟ ۔۔۔۔۔۔۔ ہائے میری آنکھوں کا تارا چلا گیا۔۔۔۔۔ اور وہ۔۔۔۔۔۔۔ وہ تو مجھ سے نفرت ہی کرتے ہیں۔ آہ انہیں اپنا نہ سکی۔۔۔۔۔۔۔۔ اور کیسے اپناتی۔۔۔۔؟ اپنے ہوتے تب نہ۔۔۔۔۔۔"

رادھا کی آواز کرشن کانت کے دل میں تیر بن کر پیوست ہو رہی تھی۔ اُن کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ رادھا کراہ اٹھی ——— پھر زور سے منہ سے خون آیا۔ اُس کا جی بیٹھ رہا تھا۔ جو رادھا صبح سے بے ہوش سی تھی۔ اس وقت ہوش میں آ کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اور یکایک بول اٹھی ——— "جی جی وہ کہاں ہیں۔۔۔۔؟ ذرا بلا دو۔ کیا زندگی کی آخری گھڑیاں بھی اُن کے درشنوں کو ترستی رہ جائیں گی۔۔۔۔۔۔؟"

کرشن کانت تو پاس ہی بیٹھے تھے۔ فوراً سامنے آ کر رادھا کے پاس بیٹھ گئے اور اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگے۔ "رادھا میں تو تمہارے پاس ہی ہوں۔ کیا کہتی ہو میری رادھا ——؟" اُن کی آنکھوں سے اپنے آپ آنسو نکل پڑے۔

رادھا کراہ کر بولی ——— "اتنا سکھ ہے پران ناتھ۔۔۔۔

آخری وقت اتنا سکھ...... میرے لئے رو رہے ہیں؟ ہائے
اب تک تو مجھے مرنے میں سکھ تھا۔ پر اب دکھ ہو رہا ہے اب تو
جانے کو جی نہیں چاہتا۔ ہائے اس جیون میں آپ کو کچھ سکھ نہ دے
سکی میرے سوامی........ چرنوں کی دھول......" اس
کے آگے رادھا نہ بول سکی۔ ہچکیاں آنے لگیں۔

ایک گھنٹے بعد رادھا کرشن کانت کی گود میں سر رکھ کر اور
سوبھاگیہ سیندور پہن کر چل بسی ——— اور اس کی زندگی
کی کومل کلی ابھی بہار دکھانے سے پہلے ہی مرجھا گئی!

پرملا اور کرشن کانت ایک ساتھ رو پڑے۔

اُلٹ پھیر

سبھدرا اب شادی کے قابل ہو گئی ہے۔ جلدی کہیں بات ٹھیک ہونا چاہئے۔ چار بھائیوں میں ایک ہی بہن ہے۔ اس کی ماں بھی دو سال کی چھوڑ کر چلی گئی۔ رادھا کانت نے بڑے ناز و نعم سے پرورش کی ہے۔ منتوں سے مانگی ہوئی بیٹی کو کیسا گھر ملے گا؟ محبت مادری سے محروم سبھدرا کو کس کے ہاتھ میں دینا ہوگا؟ اسی فکر میں انہیں نہ دن کو چین آتا ہے نہ رات کو نیند آتی ہے۔

آج سال بھر ہوا نائی اور برہمن دیس دیس کی خاک چھان رہے ہیں۔ لیکن کہیں گھر ملتا ہے تو بر نہیں اور بر ملتا ہے تو گھر نہیں۔ اور اگر اتفاق سے گھر اور بر دونوں اچھے ملے تو بر کا باپ چاہتا ہے۔ کہ لڑکے کے برابر کوئی سونا تول دے۔

سبھدرا کے لئے رادھا کانت وہ بھی کر دیتے۔ لیکن چار لڑکے ہیں انہیں بھیک کیسے منگوائیں۔ دنیا کیا کہے گی؟ بڑے زمیندار ہونے پر بھی دولت کی ایک حد ہوتی ہے۔

ایک دن رادھاکانت نے اپنے بیٹوں کو بلا کر کہا ـــــ "بھائی!
اب ناتی برہمن سے کام نہیں چلے گا۔ سال ختم ہونے کو آیا۔ لیکن
بات پکی نہ ہوئی۔ میری یہ منشا نہیں کہ سبھدرا راجا ہی کے گھر جائے
لیکن ایسا گھر تو ہو کہ بیٹی دے کر اطمینان کی سانس لے سکوں۔
تم لوگ خود کوشش کر کے دیکھو۔ اگر اس سال بیساکھ میں سبھدرا
کی شادی نہ ہوئی۔ تو مشکل اور طول پکڑے گی۔ پھر میری زندگی کا بھی
کیا بھروسہ ندی کنارے کا پیڑ جب تک کھڑا ہے کھڑا ہے۔"

باپ کی دلی تکلیف کو چاروں بھائیوں نے محسوس کیا۔ سبھدرا
کے واسطے بر کی جستجو کرنے لگے۔ شہر میں، دیہات میں جہاں بھی کوئی ذریعہ
ملا خود جا کر بات کی۔ جہاں کہیں کسی رئیس کا پتہ چلا وہاں جا پہنچے۔

ایک جگہ کوشش کرنے پر معلوم ہوا کہ لڑکا تعلیم یافتہ نہیں ہے
"خیر رئیسوں کے لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لڑکی کو دولت کا آرام
تو ملے گا۔" دوسری جگہ لوگوں سے شکایت سنی بڑا بخیل خاندان ہے۔
کسی کو بدن کا میل بھی نہیں دیتا۔" اس میں کیا برائی ہے۔ دولت
اسی طرح بڑھتی ہے۔ اولاد تو عیش کرے گی۔" ایک جگہ اور گئے معلوم
ہوا لڑکے کا باپ حد درجہ بدمزاج ہے۔ "اجی، باپ کیا ہمیشہ بیٹھے
رہتے ہیں۔" لڑکے کی ماں نہیں ہے۔ "ہرج کیا ہے؟ گھر کی مالک تو لڑکی
بنے گی۔" مکان اچھا نہیں ہے۔ "بھائی سب چیزیں حسب منشا ملنا تو
مشکل ہیں۔ جہاں اچھے لوگ ہیں وہی اچھی جگہ ہے۔" یہاں تک کہ اس

بات سے اچھی طرح واقف ہو کر کہ لڑکا آوارہ ہے۔ ایک بار لڑکے کے باپ سے بات کھل گئی۔ لیکن سب محنت مشقت بے کار ہوئی۔

جو کوئی لوٹتا سو کیا منہ لے کر ہی آتا۔ ایسی ویسی جگہ کی بات بھی کوئی کرتا تو رادھا کانت کا دل گواہی نہ دیتا۔ جان بوجھ کر سبھدرا کو غار میں کیسے دھکیل دیں؟

لڑکے میں چاہے کوئی صفت ہو یا نہ ہو۔ باپ کیسا ہی ظالم ہو۔ دولت میں قرض کا کیڑا لگ گیا ہو۔ لیکن شادی کے بازار میں تو خرید و فروخت اور مانگ کا حساب ہے۔ بَروں کی تعداد کم ہے۔ لیکن بَروں کے خریدار بہت ہیں۔ اس لئے جب تک بَر کے سرپرست کی خواہش کے مطابق دام نہ مل جائیں لڑکی کی شادی کس طرح ہو؟

(۲)

پہلے سبھدرا کو دیکھتے ہی رادھا کانت کھل اُٹھتے تھے۔ لیکن اب اسے دیکھتے ہی اندر سے ایک آہ نکل پڑتی ہے۔ سبھدرا کو پھول کی طرح اپنی آغوش میں لے کر کھلاتے تھے۔ وہی آج چھاتی پر پتھر کے مانند معلوم ہوتی ہے۔ بابو رادھا کانت سبھدرا کے سامنے خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس زبردستی کی خوشی میں رنج اور زیادہ جھلکنے لگتا ہے۔ پہلے گلاب کے پھول سے آنکھیں نہیں ہٹتی تھیں۔ اب تو کانٹے ہی کانٹے چبھتے ہیں۔ رادھا کانت آج تک جسے آنکھوں کی پُتلی سمجھتے تھے اب اُسے دیکھتے ہی آنکھیں پھیر

لیتے ہیں جب سبھدرا کی شیریں زبانی سن سن کر پھولے نہیں سماتے تھے آج اس کی خاموشی بھی دل میں جلن پیدا کرتی ہے۔ جس کو ہمیشہ محبت سے چھاتی سے لگاتے تھے۔ آج اسے انتہائی روکھائی سے جواب دیتے ہیں۔

منجھلے لڑکے ہری کانت نے کہا ـــــــ "بابو جی خبر ملی ہے کہ کسم پور والے دوسری جگہ بات کر رہے ہیں"۔

رادھا کانت نے غمگین ہو کر کہا: "اچھا ہی ہے۔ وہاں نسبت کرنا میں خود ناپسند کرتا تھا۔"

ہری کانت باپ کی غمگینی دیکھ کر بولے ـــــــ "کہئے تو ایک بار پھر وہاں جاؤں۔"

رادھا کانت جھنجھلا کر بول اٹھے: "بار بار دوڑنے سے کیا ہوگا؟ دوسرا کوئی بہت رقم دینا ہے دے۔ میری اتنی بڑی حیثیت نہیں ہے۔"

ہری کانت خاموش ہو کر چلے گئے۔

اسی وقت سبھدرا نے آکر کہا۔ "ناشتہ لے آؤں بابو جی۔"

"نہیں میں ناشتہ نہیں کروں گا۔"

سبھدرا نے پیار کے ساتھ کہا: "بڑی بھابی نے آم کا مربہ بنایا ہے۔ بابو جی۔"

رادھا کانت کا سوکھا چہرہ کچھ لال ہو گیا۔ وہ بولے: "میں نے ایک بار کہدیا۔ ناشتہ نہیں کروں گا۔"

سبھدرا کچھ دیر سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ

واپس آگئی۔"

رادھاکانت سوچنے لگے "میرا مزاج کیسا ہو گیا ہے۔ لڑکی کا اس میں کیا قصور؟ بلا وجہ میں اسے جلایا کرتا ہوں" کبھی کبھی اکیلے میں کہتے — ایشور یہ تو نے کیا کیا؟ ایک تو سارے حوصلے خاک میں مل گئے۔ جان سے عزیز ایک مورت بنائی۔ اُسے اب مجبور ہو کر ندی میں بہانا پڑ رہا ہے۔ نہ جانے کس گھاٹ لگے گی۔ لیکن کیا مجھ میں انسانیت بھی نہ رہے گی۔ میرا مزاج کیسا ہوتا جاتا ہے۔ ایشور! اب تیرا ہی بھروسا ہے۔"

(۱۳)

سبھدرا اپنے باپ کے دل کو پہچانتی ہے۔ اُسے اپنی تقدیر کی اتنی فکر نہیں ہے۔ جتنی باپ کی حالت کی پہلے وہ اپنے باپ کے دل کے ساتھ بے پروائی سے کھیلتی تھی۔ لیکن اب وہ دن رات اسی فکر میں رہتی ہے کہ کہیں اُن کے دل کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ دل کے سارے تار جھنجھنا اٹھیں۔ کوئی تار ٹوٹ نہ جائے۔ اسی لئے پہلے جہاں وحشت ہرنی کی سی چھلانگیں بھرا کرتی تھی وہاں اب سہم سہم کر پیر رکھتی ہے۔ جہاں آزاد پرند کے مانند چہچہایا کرتی تھی۔ وہاں اب تول تول کر منہ سے آواز نکالتی ہے

سبھدرا اب وہ سبھدرا نہ رہی جس کا زیادہ وقت کھیل کود ہنسی مذاق کرنے میں گزرتا تھا۔ سبھدرا کی شوخی سے تنگ آکر چھیڑتی

بھابی کہتی تھیں ـــــــــ "بی بی، اب تم بڑی ہوئیں جھک کر چلا کرو۔ آنچل سر پر رکھا کرو۔ اب بچی نہیں ہو۔" یہ سن کو سبھدرا کھِل کھِلا ہنس پڑتی اور بھابی کے گلے لپٹ کر کہتی۔ "بھابی کیا تو یوں ہی تمہاری طرح میں بڑی کبھی نہ ہوں گی؟" لیکن اب تو سبھدرا کو شباب کا احساس بھی بار معلوم ہوتا ہے۔ اب وہ جسم کو اتنا دبا کر چلتی ہے کہ بھابیوں کو بھی پہچاننے میں دھوکا ہو جاتا ہے۔

جس دن بڑے بھائی نا امید ہو کر آئے۔ سبھدرا کا کلیجہ پھٹ گیا۔ رات بھر اسے نیند نہ آئی۔ وہ پلنگ پر پڑی سوچتی رہی۔ کیا بابو جی کی پریشانی کسی طرح دور نہیں کی جا سکتی؟ اُس کے دل میں کتنے ہی خیال آئے اور آ کر چلے گئے۔ وہ سوچنے لگی "سارا خاندان میرے لئے بر ڈھونڈنے میں پریشان ہے۔ بابو جی کی حالت کیسی ہو گئی ہے؟ کیسی بری قسمت لے کر پیدا ہوئی تھی؟ پیدا ہوتے ہی ماں کو کھایا اب نہ جانے اس گھر پہ کیا کیا مصیبت آنے والی ہے۔ آہ میں سراپا مصیبت ہوں۔ کاش میں آج کسی طرح مر جاتی! اور یہ سب مصیبت ختم ہو جاتی۔" اُس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔ اور پھر سوچنے لگی "بابو جی کو اتنی پریشانی کیوں ہے؟ کیا میرے لئے بر اس دنیا میں ہے ہی نہیں؟ معمولی گھر تو بہت ملیں گے۔ مگر بابو جی مجھے کسی امیر گھر میں دینا چاہتے ہیں۔ لیکن جو جتنا امیر ہے۔ اُتنی ہی اُسے زیادہ ہوس ہے۔ بھلا پتا جی اتنی دولت کہاں سے لائیں؟ میرے چار بھائی ہیں

اُن کے بھی بال بچے ہیں۔ لڑکیوں کا بھی بیاہ شادی کرنا ہے۔ کاش میں بابوجی کو کہلا سکتی کہ مجھے معمولی گھر میں بیاہ دیں۔ امیر گھر میں نہیں جانا چاہتی۔ باپ بھائی کا خون سکھا کر امیر گھر میں کیا سُکھ مل جائے گا؟"

دوسرے دن سبھدرا کو دیکھ کر چھوٹی بھابی نے پوچھا "تمہاری آنکھیں کیوں لال ہو گئی ہیں؟"

رات کو نیند نہیں آئی بھابی۔"

بھابی نے مسکرا کر کہا "ابھی سے نیند کمبخت بھاگ کھڑی ہوتی۔"

سبھدرا نے سنجیدہ ہو کر کہا "مذاق نہ کرو بھابی۔ آج تم سے ایک بات کہنی ہے۔"

بھابی نے سبھدرا کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا "تم نے منہ تو ایسا بنا لیا ہے۔ جیسے ابھی سے خانہ داری کی فکر آ پڑی ہو۔ بولو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

سبھدرا بھابی کے ہاتھ سے ٹھوڑی چھڑا کر بولی "بابوجی سے کہہ دو میں امیر گھر میں جانا نہیں چاہتی۔ معمولی گھر میں بیاہ دیں۔ اُن کو دعا سے میں وہیں سکھی رہوں گی۔"

بھابی نے سبھدرا کی پیٹھ پر تھپکی لگا کر کہا "اپنی شادی کا انتظام بھی خود ہی کرو گی۔ تم تو بکا یک بزرگ ہو اٹھیں۔"

اتنا کہہ کر وہ وہاں سے چل دیں۔ سبھدرا نے پکارا "ذرا سُن تو و بھابی۔"

بھابی نے جاتے جاتے کہا "ہٹ پگلی کہیں کی۔"

لیکن یہ بات چھوٹی بھابی سے بڑی بھابی اور بڑی بھابی سے بڑے بھائی لچھمی کانت کے کانوں تک پہنچ گئی۔ ایک دن جب باپ بیٹوں میں شادی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ لچھمی کانت جی نے سبھدرا کی باتیں رادھا کانت جی کے کانوں میں ڈال دیں۔ وہ غمگین ہو کر بولے "لچھمی! سبھدرا اب بچی نہیں ہے۔ وہ سب سمجھنے لگی ہے۔ جب وہ میری پریشانی دور کرنے کو اتنی فکرمند ہے تو کیا میرا کچھ فرض نہیں؟ پھر اپنی حیثیت کا بھی خیال کرنا پڑے گا۔ بھائی! آج تک جیسے گھروں میں ہمارے خاندان کی لڑکیاں گئی ہیں۔ سبھدرا بھی ویسے ہی گھر میں جائے گی۔ اس کے لئے چاہے جتنی مصیبت اٹھانا پڑے"۔

(۴۲)

بیساکھ کا مہینہ آ گیا۔ جیٹھ کے بعد پھر شادی کی ساعت نہیں ہے، لیکن ابھی تک سبھدرا کی نسبت نہیں ٹھہری۔ کہیں ٹھہرے گی بھی یا نہیں۔ کوئی کہہ نہیں سکتا۔ نائی برہمن کی کون کہے۔ چاروں بھائیوں نے کونا کونا ڈھونڈ ڈالا لیکن جیسے خدا نے سبھدرا کا جوڑا بنایا ہی نہیں۔

ایک تو ضعیفی دوسرے یہ دن رات کی فکر۔ بیچارے رادھا کانت کی تندرستی ایک دم گر گئی۔ آج چھ مہینے سے وہ پلنگ پر پڑے ہیں۔ علاج معالجہ میں کوئی کسر نہیں ہے۔ لیکن اچھے کیسے ہوں؟ ان کی دوا تو کچھ اور ہی ہے۔ سب جانتے ہیں بیٹی کی فکر ان کی دشمن ہو رہی ہے لیکن جو بات ہاتھ میں نہیں۔ اس میں کیا چارہ؟

پلنگ پر لیٹے لیٹے ہی رادھا کانت شادی کے متعلق پوچھا کرتے ہیں، پر اُمید کی جھلک نظر نہیں آتی۔ لوگ مایوس ہو کر واپس آ رہے ہیں۔ وہ اپنی ناکامی رادھا کانت سے چھپانا چاہتے ہیں، لیکن اُن کا تقاضا اتنا بڑھ جاتا ہے کہ آخر میں سچا حال بتانا ہی پڑتا ہے۔ تسکین اور اُمید دلائی جاتی ہے۔ لیکن مریض کے چہرے کی اُداسی دُور نہیں ہوتی جس کے دل میں فکر کا کیڑا لگ گیا ہو۔ اُسے دوا کیا فائدہ دے سکتی ہے زندگی سے بالکل مایوس ہو کر رادھا کانت نے کہا " لچھمی! کیا میں سمبھو کا بیاہ نہ دیکھ سکوں گا؟ اب میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ جیسے ہو مجھے بیٹی کا بیاہ دکھا دو"۔

لچھمی کانت نے بغیر کچھ جواب دیئے ایک بار بھیگی آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر آ گئے۔ اسی وقت کپڑے پہن کر کہیں چلے گئے۔

ایک ہفتہ بعد واپس آئے۔ تب بھی اُن کے چہرے پہ خوشی کی کوئی علامت نہ تھی۔ اُن پر نگاہ پڑتے ہی رادھا کانت نے پوچھا "کیوں لچھمی کیا حال ہے؟"

لچھمی کانت نے جواب دیا "بابوجی! میں ایک گھر دیکھ آیا ہوں۔ ایک طرح سے بات پکی ہو چکی ہے۔ آپ کو پسند ہو تو تلک بھیجنے کا بھی انتظام کر دوں"۔

"تم کو پسند ہے؟"

"بابو جی! اور کوئی گھر بھی تو نہیں نظر آتا۔"

"تو بھائی، میں اپنی پسند کی کیا کہوں؟ میرا تو دل ٹوٹ گیا۔ سارا حوصلہ پست ہو گیا۔ اب میں کیا پسند کروں اور کیا ناپسند کروں؟"

"لڑکا تو اچھا ہے۔ البتہ اتنا پڑھا ہوا نہیں ہے۔ مالی حالت اچھی ہے۔"

رادھا کانت نے ذرا بے صبری سے پوچھا۔ "روپیہ تو بہت مانگا ہوگا؟"

"بہت زیادہ تو نہیں مانگا۔ بات یہ ہے کہ لڑکے کے باپ کا مزاج ذرا سخت واقع ہوا ہے۔ اسی لئے لڑکا اب تک کنوارا تھا۔ لڑکے کی عمر زیادہ ہو جانے سے اب انہیں فکر لگی ہے۔"

رادھا کانت کا چہرہ اتر گیا۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور پوچھا۔ "آخر بات کتنے پر طے ہوئی؟"

"پانچ ہزار۔"

رادھا کانت نے لمبی سانس لی۔ لچھمی کانت نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا۔ "بابو جی! میں شربت نوشی تو کر آیا ہوں۔ آپ کا حکم ہو تو تلک کی رسم بھی ادا کرا دوں۔ کیونکہ اب دن بھی بہت کم رہ گئے ہیں۔"

رادھا کانت نے کروٹ بدل لی۔ اور بہت دھیمی آواز میں کہا۔ "بھئی مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ تم لوگ اب سمجھدار ہو گئے ہو جو مناسب سمجھو کرو۔ میں تو اب چند دن کا مہمان ہوں۔"

"آپ کو بالکل ناپسند ہو بابوجی تو اور گھر دیکھا جائے"۔

"اب پسند اور ناپسند کا کیا؟ سبھدرا کا بیاہ تو کرنا ہی ہوگا۔ اس کی تقدیر میں جیسا لکھا ہے وہی ہوگا۔ ہمارے تمہارے سر ٹپکنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے"۔

اس معاملہ میں ہامی بھرتے ہوئے رادھا کانت کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ لیکن جب انسان کی تمنائیں پوری نہیں ہوتیں تو قسمت کا پھیر سمجھ کر دل کو تسکین دینی ہی پڑتی ہے۔

(۵)

آج رات سبھدرا کی شادی ہے۔ چاروں طرف چہل پہل ہے۔ جلدی جلدی سب انتظام ہو رہا ہے۔ تمام لوگ کام میں مصروف ہیں۔ برات کے استقبال کا انتظام ہو رہا ہے۔ چند آدمی ضروری سامان جنواسے میں بھیج رہے ہیں۔ نوبت خانے میں نوبت بج رہی ہے۔ کام میں پریشان ہونے پر بھی لوگ آتے جاتے ٹھٹک کر شہنائی کی سریلی تان سن لیتے ہیں۔

شام کے وقت بڑی دھوم دھام سے برات آئی۔ برات دیکھنے کو لوگ دوڑ پڑے۔ دیکھ کر جو واپس ہوتا وہی سو منہ سے تعریف کرتا۔ اندر محل میں نہ جانے کتنے ڈھنگ سے خبر پہنچنے لگی۔ رادھا کانت بھی پلنگ پر پڑے ہوئے برات کی تعریف سننے لگے۔

دولہا دیکھنے کو سبھی بے چین تھے۔ محل کی عورتیں بھی دولہا کی

باتیں سننے کو بے چین ہو رہی تھیں۔ سبھدرا کی بھابیاں کام میں مصروف ہونے پر بھی بیچ بیچ میں پوچھ رہی تھیں کہ دولہا کیسا ہے؟"

قریب ایک پہر رات بیتے برات بڑی شان سے دروازے لگی۔ لچھمی کانت کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ایک بڑے شامیانے میں براتیوں کے بیٹھنے کا انتظام ہوا تھا۔ شامیانے کی سجاوٹ دیکھنے کے لائق تھی۔

لچھمی کانت نے سمدھی کے پاس جا کر بہت عزت کے ساتھ اپنے غریب خانے پہ قدم رنجہ فرمانے کی التجا کی لیکن سمدھی صاحب نے نہ کوئی جواب دیا اور نہ سواری پر سے اترے۔ دیر ہوتی دیکھ کر لچھمی کانت نے گھبرا کر کہا "ساعت بیتی جا رہی ہے۔ نیک کام وقت پر ہی ہونا چاہیے۔" یہ سن کر سمدھی صاحب کے ابرو پہ بل پڑ گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو اشارہ کیا۔ وہ لچھمی کانت کے پاس جا کر بولا "برات دروازے لگ گئی۔ اب ہم دولہا سمیت جنواسے چلتے ہیں۔ وہاں سے آپ پھر دولہا کو لے آئیں۔ اور شادی کی رسم ادا کریں۔ ہمارے یہاں کا یہی رواج ہے۔"

لچھمی کانت کے لئے یہ بالکل نیا رواج تھا۔ وہ عجیب کشمکش میں پڑ گئے۔ انہوں نے کہا۔ "مگر ساعت جو بیتی جا رہی ہے۔"

اس آدمی نے ہنس کر جواب دیا "ایسے کاموں میں دیر ہو ہی جاتی ہے۔ آپ کہاں تک جلدی کر سکتے ہیں بابو صاحب۔"

لچھمی کانت دوڑتے ہوئے باپ کے پاس گئے۔ رادھا کانت نے

ایک لمبی سانس لے کر کہا:"بھیّا جو وہ کہتے ہیں وہی کرو۔"

اِدھر سمدھی صاحب نے پہلے ہی کوچ کر دیا تھا۔ جب تک لچھمی کانت واپس آئیں دولہا کی سواری بھی بڑے پھاٹک سے باہر ہو چکی تھی۔ اس نئے چلن نے عورتوں کے حلقے میں کھلبلی پیدا کر دی۔ شادی کی تیاری ہو چکی تھی۔ سمدھی ابھی اوڑھنی سے ڈھک کر بیٹھا دی گئی تھی۔ منڈپ میں صرف دولہا کے آنے کی کمی تھی۔ لیکن یہ کیا ہو گیا؟

محل میں اتنا تقاضا ہوا کہ لچھمی کانت کو فوراً ایک موٹر میں بیٹھ جنوا سے جانا پڑا۔ اِدھر سب بے چینی سے اُن کا انتظار کرنے لگے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ گھبراہٹ پھیل گئی۔ سب کی زبان پہ یہی سوال تھا۔ اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟ جو آدمی خبر لاتے جاتا آکر ٹھیک حال نہ بتا سکتا۔ اتنے میں لچھمی کانت آئے اور سیدھے رادھا کانت جی کے پاس گئے۔ لوگوں کی بے چینی بڑھنے لگی عجیب عجیب افواہیں اُڑنے لگیں۔"

لچھمی کانت نے باپ کے پاس آکر اپنے بھائیوں کو بُلایا اور کئی بڑے بزرگوں کو ساتھ لے پھر جنوا سے کو روانہ ہوئے۔

جنوا سے سے واپس آئے۔ لیکن دولہا اُن کے ساتھ نہ تھا۔ لوگوں کی پریشانی دُگنی چوگنی ہو گئی۔ ان لوگوں کے پہنچتے ہی رادھا کانت جی نے آہستہ سے پوچھا "کیا ہوا؟"

لچھمی کانت نے مایوسی سے کمزور آواز سے کہا:"بابو جی! وہ ضد کئے بیٹھے ہیں۔ بغیر پانچ ہزار لئے وہ کسی طرح شادی نہیں کریں گے۔"

احساس کی کوئی وجہ بھی بتاتے ہیں؟"

"وجہ کیا؟ انہیں روپے کی بھوک ہے۔ کچھ یونہی بے سر پیر کی بات کہتے ہیں۔ ذرا خبطی مزاج کے ہیں۔"

بڑے بھائی نے ابھی اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ منجھلے بھائی ہری کانت جھلا کر کہہ اٹھے "وجہ کیوں نہیں بتاتے؟ وہ تو صاف ہی کہتے ہیں کہ تم نیچ خاندان کے ہو۔ تمہارے خاندان میں داغ لگا ہے۔ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ بھائی صاحب کی وجہ سے میں خاموش رہا ورنہ بتا دیتا۔"

لچھمی کانت نے بھائی کو خاموش کرتے ہوئے کہا "بھائی، نرمی سے کام لو۔ غصہ کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔"

رادھا کانت کے منہ سے ایک آہ نکل پڑی۔ وہ آپ ہی بول اٹھے "میں نہیں جانتا تھا کہ بیٹی سبھدرا کے لئے مجھے یہاں تک برداشت کرنا پڑے گا۔"

لچھمی کانت نے باپ سے کہا "بابوجی، آپ کہیں تو روپے کا بندوبست کیا جائے۔ بیاہ تو کسی نہ کسی طرح کرنا ہی ہوگا۔"

رادھا کانت جی کی آنکھوں سے دو بوند آنسو ٹپک پڑے۔ انہوں نے منہ پھیر کر کہا "وہ چلے جائیں۔ میں ان سے شادی نہیں کروں گا۔"

لچھمی کانت نے گھبرا کر کہا "یہ کیا بابوجی؟ سبھدرا چوکے پر بیٹھ چکی ہے۔"

"کوئی ہرج نہیں۔ وہ برات کے ساتھ واپس جائیں۔"

"بابوجی! ایک بار سوچئے تو۔ دُنیا کیا کہے گی؟"

رادھا کانت نے مُڑ کر لچھمی کانت کو دیکھا اور استقلال سے کہا۔

"میں کیا بغیر سوچے کہہ رہا ہوں۔ میری آنکھوں پر سے تاریک پردہ ہٹ گیا۔ میرا کہا مانو۔ اُن سے واپس جانے کو کہہ دو۔"

لچھمی کانت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا بابوجی۔"

رادھا کانت جی کی آواز میں اتنی طاقت نہ جانے کہاں سے آگئی وہ بولے "گھبراؤ مت۔ ابھی کسی کو بھیجکر ہیڈ ماسٹر کو بُلوا لو۔"

ہیڈ ماسٹر گوپی بلبھ آگئے۔ رادھا کانت نے سلام کا جواب دے کر کہا۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب! بہت دن ہوئے۔ میں نے آپ کے اسکول میں ایک گورا اکہرے بدن کا لڑکا دیکھا تھا۔ اُس کا کیا نام ہے؟"

گوپی بلبھ یاد کرکے بولے "جس کے لئے میں نے آپ سے مدد مانگی تھی؟"

"ٹھیک! جسے آپ بہت غریب بتاتے تھے۔"

"اُس کا نام ہری شنکر ہے۔ وہ تو میرے پاس ہی رہتا ہے۔"

"آپ اُسے بلوائیے۔ میں اپنی لڑکی اُس کو دان دوں گا۔"

سننے والے حیرت سے مُنہ دیکھنے لگے۔ گوپی بلبھ گھبرا کر بولے۔ "وہ تو بہت ہی غریب ہے بابو صاحب۔ یوں لڑکا تو بہت اچھا ہے۔"

رادھا کانت نے جوش سے کہا۔ "امیر اور غریب کا بھید آج میں

اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ گوپی بابو! افسوس ہے کہ پہلے معلوم نہ ہوا ورنہ میرے بچوں کو دردر کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑتیں!"

بات کی بات میں گوپی بلبھ نے ہری شنکر کو رادھا کانت جی کے سامنے لا کھڑا کیا۔ لڑکے کو دیکھ کر اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انھوں نے ہری شنکر کو پاس بُلا کر محبت سے کہا "بیٹا گوپی جیسا کہیں ویسا کرو۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے"

ہری شنکر بھونچکا سا رہ گیا۔ اُس کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ گوپی بلبھ نے اُسے لے جا کر کپڑے بدلوائے اور وہ لگنا گزرنے سے پہلے ہی منڈپ میں پہنچ گیا۔ رسوم ادا کرتے ہوئے وہ حیرت سے دیکھتا تھا اور برہمن کا کہنا کرتا جاتا تھا۔ اتنی جلدی میں یہ سب کچھ ہو گیا کہ گھر اور باہر کے سب لوگ اچنبھے میں رہ گئے۔ اُس کو دُکھ جانے یا سُکھ، یہ کوئی ٹھیک نہ سمجھ سکا۔

بیاہ ختم ہونے پر گوپی بلبھ نے ہنس کر ہری شنکر سے کہا "تُو اپنی قسمت سراہ ہری۔ آج تو رنگ سے راجا ہو گیا۔ اس پہ سبھدرا جیسی استری رتن ملی۔ بول مجھے گرو دکھشنا میں کیا دے گا؟"

ہری شنکر جیسے اُن کی بات نہ سمجھ سکا ہو۔ اس طرح اُن کا مُنہ دیکھنے لگا۔

اُدھر سبھدرا چھوٹی بھابی کے گلے مل کر خوب روئی۔ طبیعت کے کچھ سکون پذیر ہوتے پر اُس نے کہا۔ "آج مجھ کو مُنہ مانگی مراد مل گئی

بھابی! اب دُعا دو کہ سُکھ کے ساتھ اپنا جیون گزار سکوں۔ اور کبھی چار دن بھائیوں کے لئے بار نہ بنوں۔ آج پھانسی پہ لٹکتے لٹکتے میری رہائی ہو گئی بھابی!"

بیڑی والی

پاس پڑوس کے لوگ اُس کی تعریف کرتے تھے۔ کماٹھی پورے کی ایک آڑی گلی کی ایک شکستہ کوٹھڑی میں وہ رہتی تھی۔ اُس کا شوہر کوئی مخصوص پیشہ نہ رکھتا تھا۔ کبھی کسی کارخانے میں کام کرنے لگتا کبھی مزدوری کر لیتا اور کبھی کسی کام دھندے کے بغیر مہینوں پڑا رہتا۔ اس لئے ہنومنتا سے کسی کو کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اگر کبھی کوئی رشتے ناطے کے کام آتا بھی تھا تو اس بے چاری کی شرافت کی وجہ سے۔

گھر گرہستی کا سارا بار اُس کی نازک گردن پہ تھا۔ بیڑی بنا کر نشٹم پشٹم کام چلاتی۔ بیڑی بنانے کی مزدوری ہی کتنی۔ سارے دن جم کر بیٹھتی جب کہیں روپیہ سوا روپیہ ہاتھ لگتا۔ ایک دن میں ایک ہزار بیڑی بنانے کی طاقت بہت کم عورتوں میں ہوتی ہے۔ دکاندار تو صرف تمباکو اور پتوں کا بنڈل بیڑی بنانے والوں کو دے دیتے ہیں۔ پتوں کو بھگو کر برابر کاٹنا اور ایک ایک کو لے کر بیڑی بنانا۔ یہ کام بیڑی بنانے والیوں کے ذمّے ہے۔ لپیٹنے کا دھاگا اپنے پاس سے لینا پڑتا ہے۔ دھاگے کے

دام مزدوری سے وضع ہو جاتے ہیں۔ گھر کا سارا کام کاج کرنا اور دن بھر اتنی سخت محنت مزدوری کرنا رے نکا کے لئے کوئی آسان بات نہ تھی ۔

ہنو منتا، رے نکا کی مزدوری کے پیسوں کو حسب دل خواہ اڑا ڈالنے کا پورا استحقاق رکھتا تھا۔ مگر اس کے کام میں وہ کبھی ہاتھ نہ بٹاتا۔ اگر وہ بھلا آدمی صرف پتے بھگو دیتا۔ اور بابر کے کاٹ کر رکھ دیتا۔ تو رے نکا سو دو سو بیڑیاں زیادہ بنا لیتی۔ اور اس کو کچھ زیادہ مزدوری مل جاتی۔ لیکن ہنو منتا کو تو حرام خوری کا چسکا پڑ گیا تھا۔ وہ کم بخت تو بچے کھچے پیسے بھی لے جاتا۔ اور گھوڑ دوڑ میں برباد کر دیتا۔ اتنا اچھا تھا۔ کہ وہ اپنے پڑوسیوں کی طرح شراب نہ پیتا تھا۔ مگر رے نکا کا خیال تھا کہ اس سے تو وہ شرابی ہوتا تو اچھا تھا۔ ایک دن میں کتنی شراب پیتا۔ اگر بے ہوش ہو کر نالیوں میں گر جانے والی حد تک پیتا پھر بھی پورے ہفتے میں اتنی رقم نہ کھوتا۔ جتنی وہ گھوڑ دوڑ کے لئے ایک دن میں کھو دیتا ہے۔ لوگ تو اس کی تعریف کرتے ہیں کہ وہ شرابی نہیں ہے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ اس موئی گھوڑ دوڑ سے تو شراب ہی اچھی ؟

رے نکا کے پڑوس میں اور بھی بیڑی بنانے والی عورتیں تھیں۔ ان کے مرد شرابی تھے۔ اور اگرچہ ان کے شوہروں کو بھی اپنی اپنی بیویوں کی کمائی حلال تھی۔ پھر بھی وہ عورتیں رے نکا سے کہیں زیادہ خوشحال تھیں۔ وجہ صرف یہی تھی۔ کہ ان کی کمائی لٹنے کی کوئی حد تو تھی ۔

ہنومنتا جب کبھی چھٹے چھ ماہے نوکری کرتا تو اپنی تنخواہ کا ایک پیسہ رے نکا کو نہ دیتا۔ بیوی مزدوری کر کے کمائے اور آپ گھر میں بیٹھ کر بے حیائی سے کھلائے اور مزے اڑا لے۔ نائی، دھوبی کا بل بھی وہی بے چاری چکائے۔ اور تو اور اپنے بدن کے کپڑے بھی اسی کی کمائی سے خریدے جائیں۔ اس میں ہنومنتا کو ذرا بھی شرم نہ آتی تھی۔ جہاں لکشمی کا موسم شروع ہوتا تو رے نکا کی حالت اور بھی خراب ہو جاتی۔ شوہر ہونے کے استحقاق پر وہ رے نکا کی مزدوری کے پیسے باہر سے باہر ہی دکاندار سے وصول کر لیتا۔ اتنا ہی نہیں۔ کبھی تو وہ اس سے پیشگی پیسے لے لیتا جو بعد کو رے نکا کی اجرت سے منہا ہوتے رہتے۔

غریب رے نکا کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔

ادھر گھوڑ دوڑ کا سیزن شروع ہوا کہ رے نکا کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ کبھی کبھی تو ایک ہفتہ بغیر کھائے پئے گزر جاتا۔ اگر ہنومنتا کو کسی ہفتے گھوڑ دوڑ میں کچھ مل جاتا تو اسے ٹھکانے لگائے بغیر گھر واپس نہ آتا۔ اس کے بعد رے نکا کی کیا حالت ہو گی۔ اس کی پروا کس کو تھی۔

اگر دکاندار سے پیشگی پیسے نہ لے جاتا تو اس کی عدم موجودگی میں رے نکا اچھی طرح گزر بسر کر لیتی۔

وہ بے چاری تو ہفتہ وار اپنی اجرت لیا کرتی تھی۔ لیکن اس کے بے پروا شوہر کی بے انصافی کے باعث اس غریب کو فاقوں مرنا پڑتا تھا

ایک دن تو سارا معاملہ ہی بگڑتا نظر آیا۔ بیڑی کی کھپت روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ کوپن کے لالچ میں سگریٹ کا استعمال زیادہ ہونے لگا۔ اور بیڑی کی بکری کم ہ

بیڑی کی بکری کم دیکھ کر دکاندار بیڑی بنانے والوں کی تعداد کم کرنے پر مجبور ہوئے۔ اسی گڑبڑ میں رتے نکا کا کام چھوٹ گیا۔ بے چاری اسی امید میں اِدھر اُدھر پھرتی کہ اس دکان پہ نہیں تو دوسری پہ۔ دوسری پہ نہیں تو تیسری پہ کام مل ہی جائے گا۔ مگر سب دکانوں پہ وہی حالت دیکھ کر شام کو نا امیدی ہو کر اپنے گھر واپس آتی۔ کچھ دنوں بغیر مزدوری کے یہی حالت رہی ؂

ہنومنتا کو تو پہلے ہی سے کام کاج سے آزادی حاصل تھی۔ بیڑی بنانے کا کام چھوٹ گیا۔ اب بے چاری کیا کرے؟ ہنومنتا سے پوچھا تو کہنے لگا "دیکھو جلد کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ ذرا صبر کرو۔ اب کی گھوڑدوڑ میں ضرور گہرا داؤں ماروں گا۔ میں نے اصطبل کے ایک مشہور بڑے ٹَہ سے جان پہچان کرلی ہے۔ اس کا بتایا ہوا گھوڑا چوک نہیں سکتا۔ اس وقت تک جس طرح ہو سکے محنت مزدوری کرکے کام چلاؤ۔ پھر ایک پائی تک نہ مانگوں گا"

بے چاری رتے نکا اپنے شوہر کی ان چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی اور پڑوس کے ایک رئیس کے ہاں مہراجن کا کام کرنے لگی۔ سکھلنے کی فکر ٹلی۔ جب تنخواہ ملتی تھی تو ایک شوہر پرست بیوی کی طرح پوری

تنخواہ ہنو منتا کے حوالے کر دیتی۔ ہنو منتا بھی ایک سعادت مند شوہر کی طرح دوپہر کو چار آنے کی ایک پلیٹ اور شام کو صرف بارہ آنے میں چلئے پانی کر لیتا۔

یہ سوچ کر کہ میں تو پیٹ بھر کر کھانا کھا لیتی ہوں۔ مگر انہیں کھانے کی بڑی تکلیف ہے۔ رنے نکا کو بہت رنج ہوتا تھا۔ اس کے مزاج ہنو منتا کیا کرتے تھے۔ اُن کی حرکتوں کو اُس کو بالکل خبر نہ دی۔ سیدھی سادی عورتوں کی طرح اُس کو اپنے شوہر پر پورا اعتقاد تھا۔ اور ہنو منتا بھی اس کی سدھائی سے فائدہ اُٹھائے بغیر نہ رہتا۔

کچھ دنوں تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ لیکن ایک دن رنے نکا کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہے کہ جس گھر میں وہ مہراجن کا کام کرتی تھی وہیں پولیس کے سپاہی اُس کے شوہر کو گرفتار کر کے لائے ہیں۔ اس دن گھوڑ دوڑ کے میدان میں حسب معمول بہت سی چوریاں ہوئیں اور کسی شریف آدمی کی جیب سے گھڑی نکالنے کی کوشش ہنو منتا نے بھی کی تھی۔ مگر یہ راز طشت از بام ہو گیا۔ اور اسی جرم میں وہ گرفتار ہو گیا۔

پولیس کے سپاہی نے ہنو منتا کی تلاشی لی۔ اُس کی جیب سے پہلے کی گم شدہ کئی چیزیں برآمد ہوئیں۔ پولیس کو شک ہوا۔ کہ یہ شخص اور بھی چیزیں چرا کر لے گیا ہوگا۔ اس لئے وہ اس کو مکان پر لے گئے۔ کوٹھڑی کا قفل توڑ کر تلاشی لی۔ لیکن وہاں کچھ نہ ملا۔ پولیس

کے سپاہی یہ خبر پاکر کہ اُس کی بیوی کسی سیٹھ کے وہاں ملازم ہے. فوراً ہنومنتا کو وہاں لے گئے. سیٹھ جی کی خانہ تلاشی ہوئی. مگر غنیمت ہوئی کہ کوئی چیز برآمد نہ ہوئی. رے نکا کی وجہ سے بے چارے سیٹھ کی بڑی بدنامی ہوئی۔

رے نکا کا اس کام میں کوئی ہاتھ نہ تھا. مگر ساری بدنامی اسی کے سر آئی. اور سیٹھ جی نے اس کو نوکری سے برطرف کر دیا۔

ہنومنتا کو ڈیڑھ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی. ایک طرح سے رے نکا کو اس سے نجات تو ملی. لیکن وہ محض وقتی تھی۔

لوگ طرح طرح کے شک کرنے لگے. رے نکا اپنے شوہر سے ملی ہے. اور اُس کی لائی ہوئی چوری کی چیزوں کو بازار میں فروخت کر آتی ہے. یہ افواہ بھی یار لوگوں نے اڑا دی۔

ایک نوکری پہلے ہی چھوٹ چکی تھی. بیڑی بنانے کے علاوہ اُسے کچھ کام نہ آتا تھا. اب مہراجن یا معمولی خادمہ کا کام ملنا بھی دوبھر ہو گیا. کماٹھی پورے میں کوئی اُسے اپنے یہاں رکھنے کو تیار نہ تھا۔

وہاں سے نا اُمید ہو کر آخر کار رے نکا گرگاؤں میں آئی. کہیٹکمٹی ہونے کے سبب سے اُسے مہراجن کا کام ملنا تو بالکل ناممکن تھا. بہ وقت تمام ایک جگہ کہارن کا کام ٹہل خدمت کرنے کا مل گیا. لیکن اس کی گھات میں لگے ہوئے کماٹھی پورے کے جانی دشمنوں نے گرگاؤں میں بھی اُس کا پیچھا نہ چھوڑا. اور اُس کے شوہر ہنومنتا کی

سزا کا حال اور خود رے نکا کی بابت افواہوں کی رپورٹ اُس کے نئے سیٹھ تک پہنچا دی ۔

وہاں سے بھی نوکری چھوٹ گئی ۔ پیٹ بھرنے کا کوئی سہارا نہ رہا ۔ کچھ دنوں تک بھیک مانگ کر کام چلانے کا خیال اس کے دماغ میں موجزن رہا تھا ایک دن گڑگاؤں کی ایک انجان گلی میں ایک دروازے پر صدا دے ہی دی "۔ اچھی ۔ ہٹی کٹی ہے ۔ تجھ سے محنت مزدوری نہیں ہوتی "۔ اس قسم کی صلواتیں سن کر رے نکا نے کہا "اچھا ۔ کوئی کام ہی دے دو "۔ لیکن اس کو ڈانٹ پھٹکار کر وہاں سے بھگا دیا گیا ۔

بھیک مانگنے کا ارادہ فسخ کر دیا ۔ نوکری چاکری ملنے کی تو دشمنوں نے جڑ ہی کاٹ دی تھی ۔ رے نکا نے بھی نوکری کے خیال کو اپنے دماغ سے بالکل نکال دیا ۔ اس لئے کہ اُس نے سوچا جہاں اب اُسے کوئی جانتا بھی نہیں وہاں بے کار بدنام ہونے کے بجائے تو مرجانا ہی بہتر ہے ۔

ایک بار پھر بیڑی کی دکان کی طرف پھری ۔ مگر کوئی فریاد سننے والا نہ تھا "پاسنگ شو" کا بھوت کہیں اس کے پیر نہ جمنے دیتا تھا ۔ رے نکا کے دل میں کبھی کبھی شک ہوتا ۔ کہ شاید بیڑی والے جھوٹ بولتے ہیں اور اسی کی تصدیق کرنے کے لئے وہ گھنٹوں بیڑی کی ایک ایک دکان پر کھڑی رہتی تھی ۔ جتنے بھی سفید پوش خریدار آئے سب کے سب "پاسنگ شو" ہی مانگتے تھے ۔ اس میں ایسی کیا خاص بات ہے ۔ یہ رے نکا کی سمجھ میں نہ آسکا ۔ اس لئے اُس نے ایک گاہک سے دریافت

کیا —— "کیوں جی! نہیں! نہیں! پاسنگ شو ہی دو۔" آپ نے یہ کیوں کہا؟ کیا دُوسری سگرٹ خراب ہوتی ہے؟
ایک حقارت آمیز قہقہہ لگانے کے بعد ہندوستانی صاحب بولے۔
—— "ہاں! تم کو اس کا کیا مالم۔ ہمارے گلے کو اسی کا آڈٹ ہے۔ ڈوسرا سگرٹ میں وہ مانگ مزا نہیں۔"
رمے نکا چونک پڑی گویا اُس نے کوئی خوفناک خواب دیکھا ہے۔
"آپ بیڑی کیوں نہیں پیتے؟"
صاحب نے نہایت حقارت آمیز نگاہ سے رمے نکا کی طرف دیکھا اور دکاندار سے کہا:۔
"یہ عورت کہیں پاگل تو نہیں؟"
دکاندار نے جواب دیا۔ "صاحب! کیا معلوم! شاید ہو۔ بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ وہ گھنٹوں کسی نہ کسی بیڑی کی دکان پہ کھڑی رہتی ہے"
"ٹوپہ اس کو پاگل کاتے ہیں کاہے کو ناہیں بجواتا؟ ہم سے کو بولتا ہے تُم بیڑی کاہے کو ناہیں پیتا؟ اخاہ! اخا ہا ہا......"
یہ کہکر ہندوستانی صاحب نے راہ لی۔
رمے نکا کچھ نہ سمجھ سکی۔ کیا میں پاگل ہوں۔ یہ اُس نے کیوں کہا؟ ایسی کون سی بات میرے منہ سے نکلی۔ وہ اس کو بار بار سوچنے لگی۔
رمے نکا نے اپنے خیالات میں غوطہ لگایا تو اس کو اپنی کوئی بات مجنونانہ نظر نہ آئی۔ اُس نے اپنا شک دُور کرنے کے لیئے دکاندار سے

پوچھا۔ "کیوں سیٹھ جی! مَیں نے ایسی کونسی بات کہہ دی تھی؟ اُس نے مجھے پاگل کیوں سمجھا؟" نہایت اطمینان سے سوچنے کے بعد دکاندار نے جواب دیا۔

"اری، تجھے پاگل نہ کہتا تو کہتا کیا؟ ذرا اُس کی طرف دیکھنا تو چاہیئے تھا۔ اُس کی پوشاک تو دیکھتی۔ وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ کل کہیں کلکٹر یا مجسٹریٹ ہو گیا تو مجھے اور تجھے دونوں کو جیل کا رستہ دکھلائے گا۔ اتنے بڑے آدمی سے سات پیسے میں پچاس والی بیڑی پینے کو کہتی ہے۔ تجھے پاگل نہ کہتا تو کہتا کیا؟"

رینکا دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ دکاندار کا لکچر اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔ میں کہیں سچ مچ تو پاگل نہیں ہو گئی۔ اپنے متعلق اُسے شک ہونے لگا۔

دکاندار نے پھر کہا ——— "آج تو پاسنگ شو خرید رہا ہے۔ کل "گولڈ فلیک" خریدے گا اور پرسوں ایکسپریس۔ اس طرح اُس کا ٹھاٹھ بڑھتا جائے گا۔ اری دیکھ! سگرٹ بیچنے سے ہمیں کہاں کے سکھ ہیں۔ سگرٹ میں بیڑی سا منافع کہاں؟ پندرہ سال پہلے میری دکان پر تیس چالیس عورتیں بیڑی بناتی تھیں۔ اور گھر پر تمباکو لے جانے والیوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ اٹھارہ گھنٹے مرکھپ کر دو وقت کا پیٹ بھرنے کی فکر کرتے ہیں۔ اور اپنے غریب بھائیوں کو بھوکوں
۔ اس میں ہمارا کیا قصور؟ جب بیڑی کے گاہک ہی نہیں

تو ہم لوگ کیا کریں۔ ہمیں تو وہی چیز رکھنا پڑتی ہے جو گاہک مانگتے ہیں
اسی لئے ہیں تو خود کہتا ہوں کہ تو پاگل اور سگریٹ بیچنے والے بڑے
احمق۔ اگر عقلمند ہیں تو صرف "پاسنگ شو" پینے والے۔ مگر اس میں نہ کچھ
تیرا لیس ہے۔ اور نہ ہیرا ندولہ!"

اس لیکچر کا مفہوم رے نکا کی سمجھ میں کیا آیا۔ مگر وہ جس دکان پر
جاتی تھی وہاں یہی حالت نظر آتی تھی۔ بیڑی کی کھپت واقعی بہت کم ہے۔
لوگ سات پیسے کی پاسنگ چھوڑ کر چودہ پیسے کی دس سفید پڑیاں
کیوں پیتے ہیں۔ اس بات کو وہ بالکل نہ سمجھ سکی۔

راستہ میں پڑا "پاسنگ شو" کا کوئی خالی پیکٹ دکھائی دیتا۔ تو
وہ اس کو اٹھا کر اس ہی کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔ اپنے منہ کا ٹکڑا چھین
لینے والے پیکٹ کو دیکھتے دیکھتے اس کا سر چکرا جاتا۔

دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی شرم اب قریب معدوم
ہو چکی تھی۔ اتنے دنوں تک آدھے پیٹ رہتے اور فاقے کرتے کرتے
رے نکا اتنی سوکھ گئی تھی کہ اب اسے ہٹی کٹی کہتے کسی کو ہمت نہ پڑتی
تھی۔ بھیک مانگنے پر بھی پیٹ بھر کھانا نہ ملتا تھا۔ مگر پاسنگ شو کے
پیکٹ اکٹھا کرنے کی لت بڑھتی جاتی تھی۔

گلی کے لڑکے جب اس کو دیکھتے تو پاسنگ شو، پاسنگ شو کہہ کہہ کر
اس کے پیچھے چلانے لگتے۔ اور وہ اس سے چڑنے لگی۔ یہ لفظ سنتے ہی
اس کا دماغ خراب ہو جاتا۔ رے نکا اپنے آپ کو سنبھال لیتی کہ ...